اسلام میں عدلِ اجتماعی

سیّد قطب





مترجم: ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی

مطبوعات اشاعت اسلام ٹرسٹ ـ ۲۸

اسلام میں عدلِ اجتماعی

مصنّف

سیّد قطب شہید

مترجم

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

بارِ اوّل ——— اگست ۱۹۷۲ء ——— ۲۰۰۰

بارِ دوم — آفسٹ — اپریل ۱۹۸۱ء ——— ۲۰۰۰

قیمت :- ۲۳/-

مطبوعہ

شیروانی آفسٹ پرنٹرز، دہلی

فہرستِ مضامین

عرضِ ناشر		۷
مقدمہ طبعِ ثانی		۹
تعارف طبعِ اوّل		۳۵
بابِ اوّل۔	مذہب اور سماج	۴۳
	اسلامی اور مسیحی نقطۂ نظر کا موازنہ	۴۵
بابِ دوم۔	اسلام میں عدلِ اجتماعی کا مزاج	۶۷
بابِ سوم۔	اسلام میں اجتماعی عدل کی بنیادیں	۸۷
	آزادیٔ ضمیر	۹۱
	انسانی مساوات	۱۱۷
	اجتماعی کفالتِ باہمی	۱۳۴
بابِ چہارم۔	اسلام میں عدلِ اجتماعی کے قیام کے ذرائع	۱۵۹
بابِ پنجم۔	اسلام میں نظامِ حکومت	۱۹۳
	۱۔ حکّام کی جانب سے عدل	۲۰۳
	۲۔ محکوم کی طرف سے اطاعت	۲۰۵
	۳۔ حکّام اور محکومین کے مابین مشاورت	۲۰۷

باب ششم۔ اسلام کی اقتصادی پالیسی ۲۱۵

انفرادی ملکیت ۲۱۹

انفرادی ملکیت کا حق ۲۱۹

انفرادی ملکیت کا مزاج ۲۲۵

ذاتی ملکیت کے ذرائع ۲۳۲

۱۔شکار ۲۳۳

۲۔جن افتادہ زمینوں کا کوئی مالک نہ ہو ۲۳۴
ان کو کسی طریقہ سے کار آمد بنا لینا

۳۔زمین کے اندر جو کانیں (رِکاز) ہیں اُن کو نکالنا ۲۳۵

۴۔خام مواد سے مصنوعات کی تیاری ۲۳۵

۵۔تجارت ۲۳۵

۶۔اجرت کے عوض کسی دوسرے کے لیے محنت کرنا۔ ۲۳۵

۷۔جنگ ۲۳۸

۸۔لاوارث زمینوں میں سے سلطان کی طرف سے عطیہ ۲۳۹

۹۔بقائے حیات کی خاطر مال کا محتاج ہونا ۲۳۹

۱۰۔محنت کی مختلف نئی صورتیں ۲۴۰

ملکیت کو نمو بخشنے کے طریقے ۲۴۳

۱۔اسلام کاروبار میں بد دیانتی کو حرام قرار دیتا ہے ۲۴۴

۲۔اشیائے ضرورت کی ذخیرہ اندوزی خلافِ اسلام ہے ۲۴۶

۳۔سودی کاروبار ناجائز ہے ۲۴۷

صَرف کی راہیں ۲۵۸

فریضۂ زکوٰۃ ۲۷۲

فُقراء ۲۷۶

	مساکین	۲۷۶
	عاملینِ زکوٰۃ	۲۷۶
	مؤلفۃ القلوب	۲۷۷
	گردن چھڑانے میں	۲۷۷
	قرض دار	۲۷۷
	فی سبیل اللہ	۲۷۷
	مسافر	۲۷۷
	زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے محاصل	۲۸۱
	مصالحِ مرسلہ	۲۸۲
	ذرائع	۲۸۶
بابِ ہفتم۔	تاریخِ اسلام سے چند مثالیں	۲۹۵
	بیداریٔ ضمیر کے نمونے	۳۰۴
	مساوات کے نمونے	۳۱۷
	آزادیٔ ضمیر	۳۲۲
	مفتوحہ ممالک کے ساتھ برتاؤ	۳۳۱
	باہمی کفالت اور تعاون	۳۳۸
	سیاسی نظام	۳۴۳
	طریقِ حکمرانی کے نمونے	۳۴۸
	حضرتِ عثمانؓ کا طرزِ حکمرانی	۳۵۴
	حضرت عثمانؓ کے بعد	۳۵۹
	حضرت عمر بن عبد العزیزؒ	۳۶۴
	بادشاہت	۳۷۰
	مالی نظام	۳۷۱

چند بنیادی اُصول	۳۸۹
باب ہشتم۔ اسلام کا حال اور مستقبل	۳۹۶
اسلام اور مغرب	۴۰۵
عالمِ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ	۴۱۱
اسلامی فکر کا احیاء	۴۲۱
اسلامی ادب	۴۳۵
تاریخ	۴۳۹
اسلامی تاریخ کی تدوینِ جدید	۴۴۱
باب نہم دوراہے پر	۴۴۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

عرضِ ناشر

"الاخوان المسلمون" کے مشہور رہنما اور بلند پایہ مصنف اُستاذ سید قطب شہید کی مشہورِ عالم تصنیف "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" نے یورپ، امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ کے علمی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس کے عربی اور انگریزی زبانوں میں متعدد ایڈیشن شائع ہوئے اور اُس نے ہر گوشہ سے زبردست خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اس کو اُردو کے قالب میں ڈھالنے کا سہرا جناب ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی صاحب (شعبۂ معاشیات) مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ کے سر ہے۔ آپ نے ترجمہ اس خوبی اور عمدگی سے کیا ہے کہ اصل اور ترجمہ میں فرق کرنا دشوار ہے۔

ہم نے اس کا پہلا ایڈیشن "اسلام کا نظامِ عدل" کے نام سے پیش کیا تھا، اب ہم اُس کا تازہ ایڈیشن "اسلام میں عدلِ اجتماعی" کے نام سے پیش کر رہے ہیں۔

ضروری نہیں کہ مصنف محترم کے خیالات سے کلی اتفاق کیا جائے تاہم ہمارا یہ خیال ضرور ہے کہ بہ حیثیتِ مجموعی یہ کتاب اسلامی لٹریچر میں ایک گراں قدر اور مفید اضافہ ثابت ہوئی ہے۔ اور اسلامی نظامِ معیشت پر محققین کے لیے قیمتی مواد فراہم کرے گی۔

مینیجر
مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

مئی ۱۹۷۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

مُقدّمہ طبعِ ثانی

آج سے چند سال پہلے جب یہ کتاب اُردو میں پیش کی گئی تھی تو اس کا مصنف زندہ تھا۔ اگست ۱۹۶۶ء میں اسے اس کے پروردگار نے اپنے پاس بُلا لیا۔ اس عرصے میں تحریکِ اسلامی کا ایک پورا دور گذر گیا، وہ دَور جس کا امتیازی نشان سید قطبؒ اور اُن کے قریبی رفقاء کی شہادت ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام کے اُردو ترجمہ کے طبعِ ثانی کے ساتھ تحریکِ اسلامی کی تاریخ کے اس باب کا اضافہ کر کے ان یادوں کو محفوظ کر لیا جائے جو آئندہ عرصہ دراز تک تحریکِ اسلامی اور مسلمانوں کے لیے اہمیت کی حامل رہیں گی۔ ساتھ ہی ہم نے بعض اُن اعتراضات کے سلسلہ میں بھی چند اصولی باتیں پیش کی ہیں جو ترجمہ کے طبعِ اول کے بعد کتاب کے بعض حصّوں پر کیے گئے ہیں۔

شہادت اور اس کا پس منظر

دوشنبہ ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کو صبح سویرے مصری حکومت نے سیّد قطب اور اُن کے دو رفقاء محمد یوسف ہواش اور عبدالفتاح اسماعیل کو تختۂ دار پر چڑھا دیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔

سیّد قطب کو ۱۹۵۴ء میں گرفتار کیا گیا تھا۔ قید میں ڈالتے ہی اُن کو اذیت ناک سزائیں دی جانے لگیں جن کے نتیجہ میں اُن کی صحت گرتی چلی گئی اور ۳ مئی ۱۹۵۵ء کو اُنہیں فوجی اسپتال میں منتقل کرنا پڑا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۵۵ء کو جب اُن کے مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا تو سیّد قطب کو علالت اور معذوری کے سبب پندرہ سال قید سخت کی سزا سُننے کے لیے

عدالت میں حاضر کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ دس سال تک جیل میں تکلیفیں سہنے کے بعد اپریل ۱۹۶۴ء میں انہیں رہائی نصیب ہوئی۔ سابق صدر جمہوریہ عراق، عبدالسلام عارف مرحوم نے سید قطب کی علمی اور دینی تصانیف سے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے بار بار صدر ناصر سے ان کی رہائی کی سفارش کی[1] اس وقت مصر و عراق کے باہمی تعلقات ایسے تھے کہ صدر ناصر نے بالآخر یہ سفارش سن لی اور سید قطب کو رہا کر دیا۔ بعد میں تعلقات ایسے نہ رہے اور سید قطب کو سزائے موت ملنے کے بعد جب عراق کے موجودہ صدر عبدالرحمان عارف نے اس سزا میں تخفیف کی سفارش کی تو اُسے نہیں قبول کیا گیا۔[2]

رہائی کے بعد سید قطب اپنے مکان پر رہنے لگے جو قاہرہ کے مضافات میں حلوان میں ہے۔ پولیس اُن پر کڑی نگاہ رکھتی تھی اور آنے جانے والوں کے بارے میں چھان بین کرتی رہتی تھی جس کے سبب بہت کم لوگ ملاقات کی ہمت کر سکتے تھے۔ سوڈان کے ایک اسلامی کارکن کا بیان ہے کہ اسی دوران ایک ملاقات میں سید قطب نے سوڈان کی تحریکِ اسلامی کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ موجودہ جمہوری دور میں بھی اس بات سے غافل نہ رہنا چاہیئے کہ عوام آمریت، بالخصوص فوجی آمریت، کی منتروں سے پوری طرح باخبر رہیں تاکہ وہ کبھی بھی اُسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ سید قطب کی رائے میں فوجی آمریت کا خطرہ دو مختلف راہوں

---

[1] موامرۃ ضد الاسلام فی مصر، ص ۹۶۔ ۱۱۲ صفحات کا یہ کتابچہ اخوان المسلمون نے شائع کیا ہے۔ مگر اس پر ناشر اور مطبع کا نام یا سنِ طبع درج نہیں ہے جس کی وجہ ظاہر ہے۔)

[2] الشہید سید قطب، ص ۴-۱۰۰۔ ۱۶۰ صفحات کی یہ کتاب جس کی قیمت ۵ لیرا درج ہے لبنان میں شائع ہوئی ہے۔ ناشر جماعۃ اصدقاء سید قطب، ہیں۔ کتاب متعدد مقالات پر مشتمل ہے جو مختلف اصحاب علم وفضل نے سید قطب کی شہادت کی خبر سُن کر لکھے ہیں۔)

مذکورہ بالا انکشاف عراق کی اخوان المسلمون نے اپنے اس بیان میں کیا ہے جو ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کو سید قطب کی شہادت کے بعد جاری کیا تھا۔ یہ بیان خرطوم سے شائع ہونے والے روزنامہ "المیثاق" میں ۱۴ ستمبر ۶۶ء کو شائع ہوا ہے۔

سے پیش آسکتا ہے ۔ اشتراکیت جو جمہوری طریقوں سے کبھی اقتدار نہیں حاصل کر سکتی، یہ طریقہ اختیار کرنا چاہے گی، اور امریکہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ قبل اس کے کہ اشتراکیوں کو کامیابی حاصل ہو ایک ایسا فوجی انقلاب آجائے جو اشتراکیت کو کچل سکے اور امریکہ کا حامی ہو۔ سید قطب نے اس کارکن کو یہ مشورہ بھی دیا کہ سب سے زیادہ توجہ اسلامی جماعتوں کے داخلی نظم و نسق کام اور کارکنوں کو راہِ حق کی آزمائشوں سے صبر کے ساتھ گزرنے کی تربیت دینے پر ہونی چاہیئے[۱] عارضی رہائی کے دنوں میں اُن سے ملاقات کرنے والوں میں پیرس کے استاذ محمود الرکابی بھی شامل ہیں۔ انھوں نے بھی یہی لکھا ہے کہ پولیس ملاقات کرنے والوں پر کڑی نگرانی رکھتی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ سید قطب کو آنے والی شہادت صاف نظر آرہی تھی۔[۲]

رہائی کے مختصر دور میں سید قطب کے افکار و آراء پر شاید مستقبل میں مزید روشنی ڈالی جا سکے۔ اگست ۱۹۶۵ء میں انھیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ مرحوم کی بصیرت نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ دوبارہ گرفتاری حکومت کی جانب سے کسی انتہائی اندام کی تمہید ہے ۔ چنانچہ اس گرفتاری کے موقع پر انھوں نے فرمایا تھا:۔

" میں جانتا ہوں کہ اس بار حکومت میرا سر چاہتی ہے ۔ مجھے کوئی ندامت نہیں، نہ اپنی موت پر افسوس ۔ میری سعادت ہے کہ مجھے اپنی دعوت کی راہ میں موت نصیب ہونے والی ہے ۔ اس بات کا فیصلہ مستقبل کا مؤرخ کریگا کہ راہِ راست پر کون تھا، اخوان یا حکومت وقت "[۳]

سید قطب کے ساتھ اخوان کے ہزاروں ۔ ایک بیان کے مطابق چالیس ہزار[۴] ـــــ

---

[۱] الشہید سید قطب، ص ۹۲۔ بحوالہ روزنامہ "المیثاق" خرطوم ۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۶۶ء

[۲] ایضاً ص ۶۵

[۳] خلیل حامدی، مصر اور اخوان ۔ رسالہ ترجمان القرآن ۔ لاہور ۔ ستمبر ۱۹۶۶ء ص ۵۶ ۔

[۴] یہ اخوان المسلمون کا بیان ہے ۔ لندن ٹیلیگراف نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو یہ خبر شائع کی تھی، کہ اس وقت تک بیس ہزار افراد گرفتار کیے جا چکے ہیں اور پورے ملک میں پکڑ دھکڑ جاری ہے ۔ ملاحظہ ہو، خلیل حامدی، مصر اور اخوان ۔ ص ۲۷ ۔

افراد کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ ان پر حکومتِ وقت سے بغاوت، عوام کو بغاوت پر اُبھارنے۔ صدر ناصر کو قتل کرنے کی سازش اور تخریبی اور دہشت پسندانہ سرگرمیوں کے الزامات عائد کئے گئے۔ منتخب افراد کے مقدمہ کی سماعت کے لیے ایک خصوصی عدالت تشکیل دی گئی جس کے ارکان کا تقرر صدر جمہوریہ مصر نے کیا۔ یہ عدالت بجز اس کے کسی اور ضابطہ کی پابند نہ تھی کہ اس کے فیصلوں کے نفاذ کے لیے صدر جمہوریہ مصر کی توثیق ضروری قرار دی گئی تھی۔ اپنی تشکیل اور ضابطۂ کار دونوں کے اعتبار سے یہ ایک فوجی عدالت تھی۔

اس 'عدالت' کے سامنے بھی سید قطب اور اُن کے رفقاء کو اپنے دفاع میں بحث کے لیے وکیل مقرر کرنے کا حق نہیں دیا گیا۔ عدالت کی کارروائی کے دوران جب کبھی بھی 'ملزم' نے خود اپنے دفاع میں کچھ کہنا چاہا تو بالعموم اُسے ایسا نہیں کرنے دیا گیا۔ دفاع کے وکیلوں کا تقرر خود حکومت نے کیا، اور ان وکیلوں نے بلا استثناء اسی شخص کو مجرم گردانا۔ جس کے دفاع کے لئے اُس کی خدمات پیش کی گئی تھیں۔ عرب ممالک کے وکلاء کی ایک کانفرنس نے کچھ عرصہ پہلے یہ ریزولیوشن پاس کیا تھا کہ کسی عرب ملک کے سیاسی قیدیوں کے قانونی دفاع کا حق ہر عرب ملک کے وکلاء کو ملنا چاہیئے۔ حکومتِ مصر نے بھی اس ریزولیوشن کو منظور کر لیا تھا۔ لیکن اس موقع پر جب مختلف عرب ممالک کے وکلاء نے اخوان کے زیر مقدمہ افراد کے دفاع کی اجازت چاہی تو انکار کر دیا گیا۔ بلکہ سوڈان اور مراکش وغیرہ سے جو وکیل قاہرہ پہنچ چکے تھے انہیں فوراً واپس چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ واضح رہے کہ مصری قانون کی رُو سے سوڈان کے وکیلوں کو مصری عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کا عام حق حاصل ہے[1]۔

سیاسی قیدیوں کے حقوق کی محافظت کرنے والے بین الاقوامی ادارہ ــــ "انٹرنیشنل ایمنسٹی ــــ" نے جب حکومتِ مصر سے درخواست کی کہ اس کے ایک نمائندہ کو مقدمہ میں شرکت کی اجازت دی جائے تو اس درخواست کو رد کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس ادارہ نے یہ چاہا

---

[1] لماذا اُعدم سید قطب واخوانہ۔ ص ۱۷ اور ص ۲۳-۲۴ (صفحات کا یہ کتابچہ "الشباب المسلم" کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔ مطبع وغیرہ کا نام درج نہیں ہے۔)

کہ اس کے ایک رکن کو صرف مشاہد کی حیثیت سے کمرۂ عدالت میں بیٹھنے کا موقع مل جائے مگر اس کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ ۲۵ اپریل ۱۹۶۶ء کو اس ادارہ نے پریس میں ایک بیان جاری کیا جس میں ان حقائق کے بیان کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ حکومت مصر نے پریس اور پبلک کو کمرۂ عدالت میں جانے سے روک دیا ہے اور عدالت کی کارروائی پر سنسر بٹھا دیا ہے۔ اسی بیان میں بتایا گیا ہے کہ زیرِ مقدمہ افراد نے عدالت سے بار بار کہا کہ ان کو اذیت ناک سزائیں دے کر اُن سے 'اعتراف جُرم' کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ سید قطب نے بھی یہی شکایت کی، مگر عدالت نے اس سلسلہ میں کوئی قدم اُٹھانے سے انکار کر دیا۔[1]

سید قطب کے ساتھ اُن کے پورے خاندان پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی۔ اُن کے واحد حقیقی بھائی محمد قطب[2] کو جیل میں اتنی اذیت دی گئی کہ اُن کے انتقال کی افواہ مشہور ہو گئی۔ جن لوگوں نے انہیں دیکھا ہے اُن کا کہنا ہے کہ اُن کا جسم زخموں سے داغ داغ تھا۔ یہ اواخر ۱۹۶۶ء کا واقعہ ہے۔ ان کی دو حقیقی بہنوں حمیدہ اور امینہ کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا اور سخت اذیتیں دی گئیں۔ حمیدہ کو دس سال قید سخت کی سزا ملی ہے اور امینہ بھی نظر بند ہے۔ سید قطب کے بھانجے، ۲۵ سالہ رفعت بکر الشافعی کو، جسے انجینیرنگ کالج سے فارغ ہوئے بمشکل دو سال گزرے تھے گرفتار کر کے سخت ترین سزائیں دی گئیں۔ تاکہ وہ اپنے ماموں کے خلاف گواہی دینے پر آمادہ ہو جائے۔ یہ جوان بھی آخر ۱۹۶۵ء میں جیل ہی میں انتقال کر گیا۔[3]

---

[1] لماذا اعدم سید قطب و اخوانہ۔ صفحات ۳۰ تا ۳۳۔

[2] تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ یہ خبر غلط ہے اور محمد قطب جیل میں ہیں اور زندہ ہیں۔ خدا کرے یہی تازہ اطلاع صحیح ہو۔ یہ خبر ڈاکٹر سعید رمضان کے حوالہ سے 'الندوہ'، مکہ مکرمہ ۱۶ مارچ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوتی ہے۔ (بحوالہ ہفت روزہ آئین، لاہور۔ ۲۴ مارچ ۱۹۶۸ء)۔

[3] سید قطب کے خاندان پر ان مظالم کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: الشہید سید قطب صفحہ ۲۵ اور صفحہ ۱۳۱، حقائق حسن الحکم والمحاکمات فی مصر، ص ۲۰۔ (۱۱۲ صفحات کا یہ کتابچہ بھی مطبع اور ناشر کے ذکر کے بغیر شائع ہوا ہے۔) اور دمعر اور اخوان، ص ۴۳۔

سید قطب اور ان کے رفقاء پر لگائے جانے والے الزامات دو قسم کے تھے۔ تخریبی اور دہشت پسندانہ کارروائیاں کرنا اور بغاوت پر اُبھارنا۔ پہلے الزام کی حقیقت اس سے واضح ہے کہ گزشتہ پندرہ سال سے اخوانی برابر یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اُن کی تخریبی اور دہشت پسندانہ سرگرمی کی ایک بھی عملی مثال پیش کی جائے۔ مصر کا وہ کون سا فرد ہے جو اخوان کے ہاتھوں مارا گیا یا زخمی ہوا۔ یا جس کا گھر بار یا مال اخوان والوں نے لُوٹ لیا۔؟ آج تک حکومت ایک بھی مثال نہیں پیش کر سکی جو واقعتہً ثابت ہو۔ حکومت کا انحصار زیادہ تر اپنے ایجنٹوں کے انکشاف پر ہے جن کے ذریعہ اخوان کی دہشت پسندانہ اسکیموں کا سُراغ لگتا رہا ہے مجہول افراد کی بعض حرکتوں کو اخوان کی طرف منسوب کرنے کی بھی کوششیں کی گئیں۔ اور ایک آدھ مواقع پر اسلحہ جمع کرنے یا بم بنانے کا ثبوت فراہم کرنے کی بھی ناکام کوششیں کی گئی ہیں۔ عوام کو دھوکہ دینے کی ان کوششوں کی حقیقت بار بار واضح کی جا چکی ہے[1] اور کوئی غیر جانب دار مبصر اُنہیں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔

عدالت کی جو سنسر شدہ کارروائی روزنامہ الاہرام، قاہرہ میں شائع ہوتی رہی ہے اُسکے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ دوسرے الزام یعنی بغاوت پر ابھارنے کا ثبوت سید قطب کے افکار و آراء بالخصوص اُن کی تازہ کتاب "معالم فی الطریق"[2] کو قرار دیا گیا ہے۔ سرکاری موقف یہ ہے کہ اس کتاب میں سید قطب نے یہ لکھا ہے کہ موجودہ مصری معاشرہ جاہلی معاشرہ ہے، مصر کا موجودہ نظام حکومت جاہلی نظام حکومت ہے اور ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ نظام ختم ہو جائے۔

---

[1] خلیل حامدی: مصر اور اخوان، ص ۸۰

[2] یعنی 'نشانات راہ'، پیش نگاہ عربی نسخہ کے صفحات کی تعداد ۲۴۸ ہے۔ پہلی بار ۱۹۶۵ء میں سید قطب کی گرفتاری سے چند ماہ قبل قاہرہ میں شائع ہوئی تھی اس کے بعد متعدد ایڈیشن مختلف مقامات سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے اردو ترجمہ پاکستان میں اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور نے بہ عنوان 'جادہ و منزل' اور ہندوستان میں جامعۃ الفلاح، اعظم گڈھ نے بہ عنوان 'نقوش راہ' شائع کئے ہیں۔

اس کوشش میں طاقت کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے .... اس الزام کو اور اس کے ثبوت کو خود عدالت سے سُنئیے۔[۱]

صدرِ عدالت: "سید قطب! تم نے موجودہ نظامِ حکومت کے بارے میں کچھ رائیں ظاہر کی ہیں۔ تم نے کہا ہے کہ موجودہ نظامِ حکومت جاہلی نظامِ حکومت ہے۔؟"

سید قطب: "جاہلی کے معنٰی یہ ہیں کہ ...."

عدالت کے صدر نے سید قطب کو جملہ بھی پورا نہیں کرنے دیا بلکہ ان کی بات کاٹ کر کہا:

"تنظیم کے ارکان کا بیان ہے کہ تم نے انہیں یہ سمجھایا ہے کہ وہ ایک جاہلی معاشرہ میں رہنے والی مومن اُمّت ہیں .... اُن کے اور ریاست، سماج اور موجودہ نظامِ حکومت کے درمیان کوئی رشتہ نہیں .... وہ ریاست کے ساتھ حالتِ جنگ میں ہیں ...... قتل و غارت اور تخریبی کارروائیوں میں کوئی حرج نہیں، نہ اس پر گناہ ہوگا بلکہ اس کے برعکس ثواب ملے گا ....."

سید قطب: "میں جواب دوں؟"

صدرِ عدالت نے سید قطب کو جواب کا موقع دینے کے بجائے خود تقریر شروع کر دی جس میں اُن پر مسلح بغاوت کا الزام عائد کیا۔ سید قطب بولے کہ میں نے ایسی کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے۔ مگر عدالت نے کچھ نہ سُنا اور اُن پر الزامات کے ساتھ گالیوں کا اضافہ کر دیا ....

جب صدرِ عدالت نے یہ کہا کہ:

"سید قطب کی بہن حمیدہ قطب نے اعتراف کیا ہے کہ تنظیم کا مقصد موجودہ نظامِ حکومت کو ختم کرنا ہے۔"

تو سید قطب نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر عدالت نے اس کا موقع نہ دیا اور اُن کے مقدمہ کی سماعت ختم کر کے محمد یوسف ہواش کا نام پکارا۔ سید قطب نے اس کے باوجود یہ کہا کہ "ایک

---

[۱] یہ کارروائی روزنامہ "الاہرام"، قاہرہ، مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۶۶ء میں مذکور ہے، اور اسی حوالہ سے "لماذا اُعدم سید قطب و اخوانہ"، نامی کتابچہ کے صفحات ۱۱ تا ۱۳ پر نقل کی گئی ہے۔

منٹ کا موقع دیا جائے ۔ مگر عدالت نے انہیں بولنے کا موقع نہ دیا۔

عدالت کی تشکیل اور اس کی کارروائی کے بارے میں مذکورہ بالا تفصیلات ہم نے اس لیے پیش کی ہیں کہ کسی منصف مزاج انسان کو اس بارے میں شبہ نہ رہ جائے کہ سید قطب کو انصاف سے محروم کر کے ظلماً قتل کیا گیا ہے۔ عدالت اور اس کی کارروائی محض ایک ڈھونگ تھی۔ عدل وانصاف کے اس ابتدائی اصول کو بھی پامال کر دیا گیا کہ ملزم کو اپنے اوپر عاید کیے جانے والے الزامات کا جواب دینے، صفائی پیش کرنے اور اپنے دفاع میں ماہرینِ قانون کی امداد حاصل کرنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ کرسی عدالت پر بیٹھنے والوں نے مقدمہ کے دونوں فریقوں، حکومت اور سید قطب کے بیانات سن کر دلائل اور گواہیوں کی روشنی میں کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کے بجائے پہلے سے طے شدہ نتیجہ کے حق میں تقریریں کیں اور ملزم کی زبان بندی کر کے اسے جوابی کلمات کہنے سے بھی محروم کر دیا اور اس کارروائی کے بعد سید قطب کو وہ سخت ترین سزا دی گئی جو کسی انسان کو دی جا سکتی ہے۔

دس برس جیل میں رکھ کر رہا کرنے، پھر دوبارہ گرفتار کر کے پھانسی چڑھا دینے پر ہر ایک کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس درمیانی عرصہ میں سید قطب سے وہ کون سا نیا جرم سرزد ہو گیا تھا جس کی بنا پر یہ اقدام کیا گیا؟ عدالت نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ نیا جرم "معالم فی الطریق" میں مصری عوام کو حکومتِ وقت سے بغاوت کی تلقین کی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب میں مصنف نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی ہے جو وہ اصولی طور پر پہلے نہ لکھ چکے ہوں۔ جو رائیں پیش کی ہیں وہ بھی ایسی نہیں جو اس زمانہ میں یا ماضی میں دوسرے اسلامی مفکرین نے نہ ظاہر کی ہوں۔ جیسا کہ مصنف نے خود صراحت کر دی ہے۔ کتاب کے تیرہ ابواب میں سے چار ان کی تفسیرِ قرآن "فی ظلال القرآن" سے ماخوذ ہیں۔ یہ تفسیر اُن کی رہائی سے کئی برس پہلے مکمل ہو کر بارہا شائع ہو چکی تھی۔ کتاب کا وہ باب جس میں جہاد کے اسلامی نظریہ پر بحث کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ "اسلام طاقت کا استعمال کب اور کن مقاصد کے لیے کرتا ہے" اس تفسیر سے لیا گیا ہے۔

اس کتاب میں سید قطب نے یہ بتایا ہے کہ دنیا میں رائج طرزِ زندگی، ہدایت الٰہی سے انحراف اور انسانوں کے خود ساختہ نظاموں پر مبنی ہونے کی وجہ سے "جاہلی" طرزِ زندگی ہے ۔ آج اللہ کا نام لینے والے بھی، اللہ ہی کو حاکم تسلیم کر کے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تنظیم قرآنِ کریم اور

تعلیماتِ نبویؐ کے مطابق کرنے کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو حکمراں بنائے ہوئے ہیں۔
یہی وہ جاہلیت ہے جسے مٹانے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ اس معاشرہ میں جو افراد سچی اسلامی زندگی گذارنے اور اللہ کی زمین پر اللہ کا دین قائم کرنے کے خواہاں ہوں اُن کو چاہیے کہ موجودہ طرزِ زندگی کی جگہ اسلامی طرزِ زندگی رائج کرنے کی کوشش کریں۔ یہ کوشش اسی طریقہ سے کی جانی چاہیے جو طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا۔ یعنی انسانوں کو اللہ واحد کی بندگی اختیار کرنے اور غیر اللہ کی بندگی سے نکلنے کی دعوت دینی چاہیئے۔ اسلامی افکار و عقائد کو اپنا کر اپنی انفرادی سیرت و کردار کو اُن کے مطابق بدلنے اور اجتماعی زندگی کو اُن قدروں، اداروں اور قوانین کی بنیادوں پر از سرِ نو منظم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جو قرآن و سنت نے ہمیں عطا کئے ہیں۔ نظامِ حکومت اور معیشت کو ہدایتِ الٰہی کے مطابق ڈھالے بغیر زندگی کی اسلامی اصلاح و تعمیر ممکن نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جب ایک مسلم معاشرہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ تمام انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرانے، اُن کا حق خود ارادیت بحال کر کے ان کے سامنے حق کی دعوت پیش کرنے اور اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت قائم کرنے کا مشن لے کر اُٹھتا ہے، یہی اسلامی جہاد ہے۔ اسلام میں جہاد کا اصل مقصد ان مادی قوتوں کو راہ سے ہٹا دینا ہے جو بندگانِ خدا اور قبولِ حق کے درمیان حارج ہوں اور اللہ کی زمین پر غیر اللہ کی بندگی کا نظام قائم کرتی ہوں۔

بلاشبہ اس کتاب میں سچے مسلمانوں کو اس بات پر اُبھارا گیا ہے کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کی اور رائج الوقت نظام کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس کوشش کا طریقہ بھی تجویز کیا گیا ہے ؛ جمہوری اور پُر امن طریقہ سے تبلیغ افکار اور اشاعتِ دعوت۔ پھر سیرت کی تعمیر اور اس کے بعد تبدیلیٔ نظام۔ انھوں نے کسی خفیہ تحریک کی دعوت نہیں دی ہے، تخریبی کارروائیوں اور توڑ پھوڑ پر نہیں اُبھارا ہے، نہ یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ چند افراد کو کرسیٔ اقتدار سے ہٹا کر جاہلی نظام کی جگہ اسلامی نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک اسلامی نظام کے لیے تعلیم و تربیت کے ذریعہ ایک نئی نسل اٹھانی ہوگی جو فکر و عقیدہ اور سیرت و کردار کے لحاظ سے صحیح معنیٰ میں مسلمان ہو اور اپنی اجتماعی زندگی کو اللہ اور صرف اللہ کی مرضی کے مطابق منظم

کرنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔

ایک سوال

اگر "معالم فی الطریق" لکھ کر سید قطب نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا تو پھر وہ کون سا جرم تھا جس کی سزا میں ان کی جان لی گئی؟ دس برس جیل میں رہنے اور ایک سال پولیس کی نگرانی میں اپنے گھر میں نظر بند رہنے کی حالت میں سید قطب کے لیے کسی تنظیم کی قیادت یا خود حکومت کے خلاف کسی جارحانہ کارروائی میں حصہ لینا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ ان گیارہ برسوں میں انھوں نے اگر کوئی کام کیا تھا تو وہ تصنیف و تالیف کا کام تھا۔ مگر وہ ساری کتابیں جو اس عرصہ میں لکھی گئیں مصری حکومت کے سنسر سے گذر کر پریس میں آئی ہیں۔ خود "معالم فی الطریق" بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔ کیا وجہ ہے کہ حکومتِ مصر نے ایک ایسے جلیل القدر عالم دین کو ظلماً قتل کر دیا جس کی درجنوں تصانیف متعدد زبانوں میں شائع ہو کر ساری دنیا میں پھیل چکی ہیں۔ جس کے قدر شناسوں میں شاہ و گدا سب شامل ہیں۔ جس کی سزائے موت کے خلاف ساری دنیا کے مسلمانوں نے احتجاج کیا اور زندگی کی ہر صف کے افراد — علماء اور اساتذہ، اصحاب قلم اور ارباب اقتدار، سیاسی لیڈر اور صحافی، جج اور وکیل، طالب علم اور تاجر، مزدور اور کسان — سزائے موت کو نافذ کرنے کی درخواست کرنے میں ہم زبان تھے۔ کیا وجہ ہے کہ حکومتِ مصر نے ایک ایسے بے گناہ کی جان لی جو اپنی عمر طبیعی کے آخری مراحل میں داخل ہو چکا تھا اور بارہ سال قید و بند کے شدائد نے اس کے قویٰ کو کمزور کر کے اسے متعدد مہلک امراض میں مبتلا کر دیا تھا، اور قیاس یہی کہتا ہے کہ کچھ عرصہ میں وہ خود ہی داعی اجل کو لبیک کہتا۔

بظاہر یہ ایک معمہ ہے، لیکن اسے معمہ کہہ کر گذر جانا بے بصیرتی اور سطح بینی کا مظاہرہ ہوگا، کیونکہ اس سوال پر غور کر کے بڑی عبرت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اکسٹھ سال کی عمر میں معذوری کی حالت میں پھانسی چڑھانے کا مقصد صرف یہ نہیں ہو سکتا کہ سید قطب کے جسم کو روح سے محروم کر دیا جائے۔ اس مقصد کا سراغ لگانے کے لیے آگے نظر دوڑانے کی ضرورت ہے۔ بظاہر مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس اقدام کے ذریعہ الاخوان المسلمون کو بالخصوص اور مصر میں تجدید و احیاء اسلام کے خواہاں افراد کو بالعموم یہ جتلا دیا جائے کہ ان کی راہیں مسدود کرنے، ان کی سرگرمیاں بند

کرنے اور انھیں اس مقصد میں ناکام بنا دینے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے گا۔ اسلام کو زندگی کے نجی دائرہ میں محدود رکھنے پر قانع نہ رہ کر اُسے پوری زندگی میں نافذ کرنے کا حوصلہ رکھنے والوں کے لیے یہ ایک تنبیہہ ہے کہ اگر وہ اقتدارِ وقت کے قہر وغضب سے محفوظ و مامون رہنا چاہتے ہیں تو انھیں دعوتِ اسلامی سے باز آجانا ہوگا۔

اگر کسی کو اس توجیہہ سے اختلاف ہو تو ہم دعوت دیتے ہیں کہ حقائق کی روشنی میں مصری حکومت کے اقدام کی کوئی دوسری معقول اور اطمینان بخش توجیہہ پیش کرے۔

یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ مغرب زدہ مسلمانوں کا ایک طبقہ موجودہ زمانہ میں اسلامی طرزِ زندگی کے احیاء اور اسلامی قوانین کے نفاذ کو ایک ناقابلِ عمل تجویز سمجھتا ہو اور اس بنا پر اس کا شدت سے مخالف ہو۔ یہ بھی تسلیم کہ جن لوگوں کی نظر آخرت پر نہ ہو، اور جو اس دنیا کے حالات پر غور کرتے وقت بھی زیادہ گہرائی اور دوربینی سے کام نہ لے سکتے ہوں وہ نیک نیتی کے ساتھ اس نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں کہ اگر کسی ملک میں اسلامی نظام کے قیام کا تجربہ عملاً کیا گیا تو اس ملک کے مادّی مفادات مجروح ہوں گے اور موجودہ بین الاقوامی فضا میں وہ ملک طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہوگا۔ آج دنیا کے اکثر مسلمان ممالک میں یہی طبقہ برسرِ اقتدار ہے۔ اور نظامِ تعلیم پریس اور ریڈیو سب اسی کے ہاتھوں میں ہے۔ اپنی مخصوص رائے کی بنا پر یہ طبقہ تحریکِ اسلامی کو ناکام کر دکھانے کے لیے ہر اس حربہ کو استعمال کرنے کی طرف مائل ہو سکتا ہے جو اُسے میسّر آسکے۔

لیکن ہمیں یہ نہ بھول جانا چاہیے کہ انسانوں نے اپنی طویل تاریخ سے تلخ تجربوں کے بعد یہ سبق حاصل کیا ہے کہ مہذب زندگی کے قیام وبقا کا انحصار قانون کی حکمرانی Rule of Law پر ہے۔ جنگل کے قانون اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس Might is right کے تاریک اصول کی طرف واپسی تہذیب کی فنا کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ مصر میں تحریکِ اسلامی اور جمہوریت کی اس پامالی کا جو پہلو ساری دنیا کے انسانوں کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے خاص طور پر تشویش کا باعث ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ وہاں ایک پُرامن جمہوری تحریک کو پامال کرنے کے لیے قانون اور انسانیت دونوں کے دائرہ سے تجاوز کر کے ایسے طریقے اختیار کیے گئے جنھیں انسانی سماج کے لیے خوش آئند نہیں قرار دیا جا سکتا۔

سیدھا طریقہ جس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ تہذیب اور انسانیت سے میل نہیں کھاتا، یہ ہے کہ جن لوگوں کو تحریکِ اسلامی سے اُس طرح کا اختلاف ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ اس کا مقابلہ افکار و تصورات کی دنیا میں کریں۔ پریس، ریڈیو، سینما، ٹیلی ویژن اور نظامِ تعلیم سب کچھ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر اُن کے افکار میں ذرا بھی جان ہے تو انھیں عوام تک پہنچانے اور اسلامی افکار و تصورات کے مقابلہ میں اپنے افکار کو مقبولِ عام تک پہنچانے میں انھیں چنداں دشواری نہ ہونی چاہیے۔ اگر ان کوششوں کے باوجود کسی ملک کے عوام مروّجہ نظامِ زندگی سے بیزار ہونے اور ایک دوسرے طرزِ زندگی کے طالب ہونے پر اصرار کرتے ہیں تو مغربی طرزِ زندگی کے دلدادہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو سوچنا چاہیے کہ انسانیت کا تقاضا کیا ہے؟ انھیں کیا حق ہے کہ عوام پر ان کی مرضی کے خلاف طور طریقے طاقت کے بل پر مسلّط کیے رہیں؟ انھیں کس نے یہ حق عطا کیا ہے کہ وہ عام لوگوں کو اسی طریقے سے زندگی گذارنے کا موقع نہ دیں جو اُنھیں پسند ہو۔ اور اس بنیادی انسانی حقوق سے محروم کرنے کی کوشش میں ان کی زندگی کا سکون غارت کریں، ان کو جمہوری اداروں سے محروم کرکے اُن پر آمریت مسلّط کردیں، پریس پر سنسر بٹھادیں، جماعتیں بنانے اور تبلیغِ افکار کے لیے منظم ہونے سے روک دیں، اور جب اس سے بھی کام نہ چلے تو پورے ملک میں داروگیر، قید و بند، ظلم و ستم اور قتل و خون کا سلسلہ شروع کردیں۔ یہ کہاں کی انسانیت، کون سی روشن خیالی اور کیسی ترقی ہے۔؟

واقعہ یہ ہے کہ مصر میں اخوان کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا۔ اس تحریک کو کچلنے کی کوشش فوجی انقلاب سے بہت پہلے شروع ہوچکی تھی۔ مختصر سے وقفہ کے بعد ۵۴ء سے آج تک یہ کوشش پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔ ظلم و تشدد کا ہر نسخہ آزمایا گیا۔ مصر میں اخوان کے باضابطہ ارکان ہی کا نہیں بلکہ ان کا نام لینے والوں تک کا جینا دوبھر کردیا گیا۔ جس کے گھر سے اخوان کی کوئی کتاب برآمد ہوگئی اسے جیل خانہ میں منتقل کردیا گیا۔ جس نے خط میں مکتوب الیہ کو اخی فی اللہ لکھ کر مخاطب کردیا اُسے دھر لیا گیا۔ جیل خانے میں اُن قیدیوں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھے گئے جو نازی جرمنی کے رسوائے عالم سلوک کو بھلادیں۔ مگر اس ظلم و ستم کے باوجود اخوان کی دعوت پھیلتی ہی گئی اور احیاءِ اسلام کا جذبہ قوی تر ہوتا گیا۔ اربابِ اقتدار بڑی غلط فہمی کا شکار رہیں۔ انھیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ

ایک مسلمان معاشرہ میں اسلام کی دعوت جب ایک بار موثر طریقہ پر پیش کر دی جائے تو پھر اس کے پھیلنے کا انحصار کسی مخصوص جماعت یا اس کے کارکنوں پر نہیں رہ جاتا۔ مصر میں اسلام کی دعوت اب الاخوان المسلمون یا اس کے رہنماؤں ـــــ حسن البنا، حسن الھضیبی، عبدالقادر عودہ اور سید قطب ـــ کی سرگرمیوں کی محتاج نہیں۔ قرآن کی تلاوت جاری ہے، احادیث رسول پڑھی جارہی ہیں، اور اسلام کی وہ تعلیمات عام ہیں جو سلفِ صالح کے ذریعہ اُمت کو ملی ہیں۔ اس طرح اس دعوت کی تجدید ہر مسجد اور ہر گھر میں ہو رہی ہے جس کے اعلان کا شرف مصر کی حالیہ تاریخ میں اخوان کو حاصل ہوا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے نہ پا سکنے کی وجہ سے، یا سمجھ لینے کے باوجود ماننے سے انکار کر دینے کے سبب مصر میں اربابِ اقتدار نے بوکھلا کر جنگل کے قانون کا سہارا لیا ہے۔

یہاں تاریخ کا ایک اور سبق یاد دلانا مناسب ہوگا۔ قانون کی حکمرانی کے زوال اور جنگل کے قانون کی طرف واپسی کے خلاف واحد مؤثر ضمانت جمہوریت اور جمہوری ادارے ہیں۔ فردِ واحد کی آمریت یا گنے چنے افراد کی مطلق العنان بالاتری قانون کی حکمرانی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ نازی جرمنی اور اسٹالن کا روس ہو یا یورپ کے عہدِ تاریک کی مطلق العنان حکومتیں، سب میں آپ یہی دیکھیں کہ سماج کا جمہوری اداروں سے محروم ہو جانا قانون کی حکمرانی کے خاتمہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔ آج یہی داستان مصر میں دہرائی جارہی ہے۔ اور ہماری نگاہوں کے سامنے انڈونیشیا اس پُر خطر راہ پر دور تک جا کر اب سنبھل رہا ہے۔ تاریخ کا یہ سبق آج دنیا کی اسلامی تحریکوں کے لیے بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اور عام انسانوں کے لیے بھی اس کی اہمیت کچھ کم نہیں۔ سیاسی استحکام اور تیز رفتار معاشی ترقی کے نام پر آمریتوں کو خوش آمدید کہنے والے افراد کو سوچنا چاہیے کہ وہ چند فوری مگر عارضی مصالح کی خاطر اپنے اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے کتنا بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں۔

متعدد شواہد کی بنا پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اخوان کو کچلنے اور سید قطب کو سزائے موت دینے کا ایک محرک ان بیرونی طاقتوں کو خوش کرنا بھی رہا ہے جن سے مادی امداد حاصل کرنا حکومتِ مصر اپنے لیے ناگزیر سمجھتی ہے۔ سید قطب کی تصانیف اور اخوان کے وسیع لٹریچر نے

مسلمان نوجوانوں کو اشتراکیت سے بیزار کرنے اور مسلمان ملکوں میں اشتراکی پروپیگنڈے کو بے اثر بنا دینے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اخوانی حلقوں کا یہ بیان دُرست معلوم ہوتا ہے کہ روس کے ارباب اقتدار اور مصر کے اشتراکیت نواز عناصر کا دباؤ حکومتِ مصر کے حالیہ اقدامات کا بڑا محرک رہا ہے۔ واضح رہے کہ ۱۹۶۵ء میں اخوان کے خلاف اقدامات کا ارادہ صدر ناصر نے سب سے پہلے ماسکو میں ایک تقریر میں ظاہر کیا تھا، اور اُن کے دورۂ روس سے واپسی پر دار و گیر کا سلسلہ شروع ہوا جس کی انتہا سید قطبؒ کی شہادت تھی۔

صیہونیت Zionism اور اسرائیل کے خلاف اخوان کی جدوجہد ایک مشہور و معروف بات ہے۔ عالمی پریس میں صیہونیت کا جو اثر ہے اس کا عکس مصری دانشوروں پر بھی پڑتا ہے۔ اخوانی حلقوں کی اس بات میں وزن ہے کہ صیہونیت کے ایجنٹوں کی دسیسہ کاریوں نے ان کے خلاف فضا ہموار کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اسرائیل کے سرپرست اور صیہونیت کے عالمی مرکز، امریکہ کی اخوان دشمنی بھی ایک کھلی حقیقت ہے۔ اخوان کا لٹریچر اور اس کی تحریک مصری زندگی میں امریکی تہذیب کے اثرات کے خلاف سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہے۔ اخوان نے ہمیشہ امریکہ کے سیاسی اثرات، اس کا دباؤ قبول کرنے اور اس کی کاسہ لیسی کی مخالفت کی ہے مغربی ممالک میں سے کوئی بھی ملک اخوان سے خوش نہیں ہے کیونکہ اخوان مغربی ممالک کے تہذیبی اور سیاسی اثرات کو ختم کر کے مصر کو اسلام اور دنیائے اسلام کے مفادات و مصالح کے موافق خارجہ پالیسی اختیار کرنے کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ ان ممالک کو مصر کے ارباب اقتدار پر اثر انداز ہونے کے جو ذرائع بھی میسر ہیں ان سے کام لے کر انھوں نے حکومت کی اخوان دشمن پالیسی کو قوت بخشی ہوگی۔

فردِ واحد کا اقتدار بیرونی طاقتوں کے لیے ملک کی اندرونی سیاست میں دخل اندازی آسان بنا دیتا ہے۔ بہت سے افراد کو ہم نوا بنانا دشوار ہوتا ہے، ایک فرد پر دباؤ ڈالنا یا طرح طرح کے نفسیاتی حربوں سے کام لے کر اسے متأثر کر لینا نسبتہً آسان ہے۔ جب ملک کا پریس اور ریڈیو بھی ایسے ہی ہاتھوں میں ہو جو اپنے مخصوص افکار، مزاج اور اغراض کے تحت کسی خاص مقصد کی حد تک ان بیرونی اثرات کی تائید کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں، اور جب پورے ملک میں کسی اختلافی آواز کے بلند ہونے کا کوئی موقع باقی نہ رہنے دیا جائے تو صورتِ حال بد سے بدتر

ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ایک فطری بات ہے کہ جو فرد عرصۂ دراز سے بلا شرکتِ غیرے ملک کے سیاہ وسپید کا مالک ہو وہ اپنے اقتدار کو ہر آن خطرے میں محسوس کرنے لگے اور چاروں طرف شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ چونکہ فوجی آمریت کو ہٹانے کے لئے بالعموم آمر کی جان لینا بھی ضروری سمجھا جاتا رہا ہے اس لیے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ فرد اپنے اقتدار کے تحفظ کو اپنی جان بچانے کی لازمی شرط سمجھنے لگے۔ ایسا فرد جب جس گوشہ سے بھی اپنے اقتدار کے لیے کوئی خطرہ محسوس کرے گا اس کے ازالہ کے لیے ہر ممکن اقدام کرے گا۔ اس فرد کا اس معاملہ میں غیر معمولی طور پر شکی مزاج ہو جانا بھی قرینِ قیاس ہے۔ اخوان کے دشمنوں نے مصر میں اس مخصوص صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے صدر ناصر کے اس شبہ کو یقین سے بدل دیا کہ یہ تحریک اور اس کے بعض رہنما ان کی ذات اور اقتدار کے لیے زبردست خطرہ ہیں جس کو دور کرنے کے لیے اب انتہائی اقدامات ناگزیر ہیں۔ اس امر کی وضاحت ماہرینِ نفسیات ہی کر سکتے ہیں کہ ایسے افراد میں جھوٹے خطرہ کو حقیقتی، چھوٹے خطرہ کو بڑا اور دور کے امکان کو قریبی اور واقعی سمجھ لینے کا رجحان کیوں پیدا ہو جاتا ہے اور وہ کس طرح اپنے اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لئے عدل وانصاف، رائے عامہ، مفادِ ملکی، اور بنیادی انسانی قدروں، ہر چیز کو پامال کرتے ہوئے سخت سے سخت اقدامات کر گذرتے ہیں۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سیّد قطب اور اخوان نے اگر نرم روی اور مصالحت کا طریقہ اختیار کیا ہوتا تو یہ ان کے اور اسلام کے حق میں بہتر ہوتا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ حضرات اخوان کی کن باتوں کو نرم روی کے خلاف سمجھتے ہیں اور مصالحت سے ان کی کیا مراد ہے۔ اخوان نے بحیثیت جماعت اور سیّد قطب نے بحیثیت فرد کبھی پُرامن تبلیغ افکار اور جمہوری طریقوں سے رائے عامہ کو ہموار کرنے کا معروف طریقہ چھوڑ کر دہشت پسندی اور تخریبی کارروائیوں کا طریقہ اختیار نہیں کیا، نہ وہ ایسا کرنے کا کوئی ارادہ رکھتے تھے۔ پھر ان سے کس چیز کا مطالبہ ہے۔؟ کیا مصالحت کا یہ مفہوم ہے کہ وہ دین کی دعوت ترک کر کے عرب نیشنلزم اور سوشلزم کے نعروں کی تائید کرتے اور آنکھیں بند کر کے حکومتِ مصر کی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں پر صاد کر دیتے۔ بلاشبہ اخوان اس کے لیے کبھی نہیں آمادہ ہو سکتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک ایسا کرنا اسلام سے انحراف ہوگا۔ اسلام فرعونی تہذیب کے احیاء، فحش وعُریاں معاشرت، آمریت اور اشتراکیت پر مبنی اجتماعی نظام کی اجازت نہیں دیتا

اگر نرم روی کا یہ مفہوم ہے کہ دعوت اور اس کے مطالبات پیش کرنے میں حکمت اور تدریج کا لحاظ رکھا جاتا تو اخوان کا لٹریچر اور اُن کا پریس گواہ ہے کہ انھوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ پھر اس خیال کی بنیاد کیا ہے؟ ایسا تو نہیں کہ اس خیال کی جڑیں اُس احساسِ کمتری اور ضعفِ یقین سے غذا حاصل کر رہی ہیں جس میں آج تعلیم یافتہ اسلام پسندوں کی ایک بڑی تعداد مبتلا ہے، جن کے لیے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ آج کا تعلیم یافتہ برسرِ اقتدار طبقہ روشن خیالی، وسیع النظری اور عالی حوصلگی کی جگہ غیروں کی ذہنی غلامی، تنگ نظری، کم ظرفی اور پست ہمتی کا شکار ہے اور مغربی طرزِ زندگی کو رائج رکھنے اور اپنے مغربی آقاؤں کو خوش رکھنے کے لیے اپنے ملک میں بنیادی انسانی قدروں کو بھی پامال کر سکتا ہے۔

مصر کے حالیہ المیہ میں تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کے لیے کچھ سبق پنہاں ہیں۔ آج دنیا میں تحریکِ اسلامی کے حالات پر نظر ڈالیے تو عجیب نقشہ نظر آئے گا۔ ایک طرف یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ پچیس تیس برسوں میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کی وضاحت، دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق ان کی تعبیر اور اسلامی زندگی کی تعمیرِ نو سے متعلق جو وسیع لٹریچر پیش کیا گیا ہے اس نے تقریباً ہر ملک میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک معتد بہ تعداد کو مغربی افکار و تصورات کے اثر سے آزاد کر کے ازسرِ نو اسلام کا گرویدہ بنا لیا ہے۔ اکثر مسلم ممالک میں ان تحریکوں کو عوام کا حُسنِ ظن، تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک مؤثر تعداد کی تائید و حمایت اور خواص کے ایک طبقہ کی سرپرستی حاصل ہو چکی ہے۔ یہ رجحان ان مسلمان ملکوں میں زیادہ نمایاں ہے جو تمدنی طور پر اسلامی دنیا میں ممتاز اور پیش پیش ہیں۔ متعدد ملکوں میں نظامِ تعلیم اور قانون سازی کو اسلامی قدروں کا حامل بنانے، سماجی عدل کے اسلامی تصورات کو عملی جامہ پہنانے اور نظامِ حکومت کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کے مطالبے عوامی مطالبے بن چکے ہیں۔ ان ملکوں کی عام معاشرتی زندگی سے مغربی اثرات کی پیش قدمی رُک جانے اور اسلامی قدروں کے اثرات نمایاں ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ لیکن دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی تحریکِ اسلامی اس مرحلہ میں داخل ہوئی ہے اپنے مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں ظلم و ستم کا نشانہ بنی ہے۔ لٹریچر ضبط کر لیا گیا ہے۔ اخبارات بند کیے گئے ہیں۔ جماعتیں خلافِ قانون قرار دی گئی ہیں۔ لیڈروں کو جیل خانوں میں ڈالا گیا ہے۔ اور تحریکِ اسلامی کو طاقت کے ذریعہ کچل دینے کی کوشش کی گئی ہے اگرچہ ہر ملک میں حالات ایک سے نہیں۔ اور ایک ہی ملک میں بھی وقت گذرنے کے ساتھ حالات

بدلتے رہے ہیں۔ مگر کم وبیش یہی داستان بیشتر مسلم ممالک میں دہرائی جاتی رہی ہے۔ اور آج کسی ایک مسلمان ملک کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہاں یہ داستان نہ دہرائی جائے گی۔

اس کا سبب کیا ہے؟ اس سوال پر اصحابِ بصیرت کو غور کرنا چاہیئے اور تجزیہ وتحلیل کے بعد کسی ایسے جواب تک پہنچنا چاہیے جو تمام حقائق کی ٹھیک توجیہ کر سکے۔ یہاں اس کا موقع نہیں۔ لیکن آپ اس سوال کے جس جواب تک بھی پہنچیں، موجودہ حالات کا ایک عملی سبق بالکل واضح ہے۔ علم کی ترقی، تحقیق وجستجو کی ہمت افزائی، جمہوریت کے نعروں اور روشن خیالی کے ڈنکوں کے باوجود آج کی دنیا میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھنے والوں کو اپنے اور غیروں کے ظلم وستم کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ اور اس راہ میں آگے بڑھنے والوں کو اس کے لیے پوری طرح تیار رہنا چاہیے۔ اس راہ میں بڑے عزم اور صبر وثبات کی ضرورت ہے۔ صرف جسمانی اذیتوں کے مقابلہ میں نہیں، بلکہ حالات کے اس زبردست دباؤ کے مقابلہ میں بھی جو عجلت پسند اور خام کارکنوں کو تحریکِ اسلامی کے صحیح قرآنی طریقِ کار سے ہٹا کر غلط راہوں پر ڈال سکتا ہے۔ یہ عزم وثبات صرف اسے میسّر آ سکتا ہے جو اچھی طرح سمجھ چکا ہو۔ اللہ نے اُسے اس پر مامور نہیں کیا ہے کہ کسی بھی طریقہ سے کام لے کر اسلام کو کسی ملک میں غالب کر دکھائے۔ بلکہ اُس کا امتحان اس میں ہے کہ اسلام کی دعوت ٹھیک اس طریقہ سے لے کر آگے بڑھے، جو کتاب وسنّت نے اُسے سکھایا ہے۔ اس کی کامیابی اور ناکامی کے پیمانے دنیوی نہیں اُخروی ہیں، اور دنیا میں اسلامی نظامِ زندگی کا قیام آخرت کی بھلائی کے لیے مقصود ہے۔

اس راہ کی آزمائشوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے اور صحیح دینی طریقِ کار پر قائم رہنے کے ساتھ ہمیں اس بات کا بھی اہتمام کرنا چاہیے کہ اسلامی ملکوں میں ایسے حالات پیدا ہوں کہ بیرونی طاقتوں کو ملک کے اندرونی مسائل میں دخل انداز ہونے کا موقع نہ ملے، اور ملک کے اربابِ اقتدار کو دفاعی مصالح، سیاسی استحکام یا معاشی ترقی کے نام پر جمہوری حقوق کی پامالی اور بیرونی طاقتوں کی کاسہ لیسی کے مواقع نہ ملیں۔ ہر ملک میں آخری فیصلہ کن طاقت اس کے عوام کا عزم وارادہ، ان کی محنت، اُن کا نظم وضبط اور ان کی عالی حوصلگی ہے۔ عوام کے اسلام سے جذباتی لگاؤ کو اسلامی تعمیرِ نو کے اُن طاقتور عوامل میں تبدیل کرنا ضروری ہے۔ ملک کی اسلامی تعمیرِ نو

کے طویل المیعاد منصوبہ میں معاشی طور پر دنیا کی بڑی طاقتوں سے بے نیازی اور فوجی اعتبار سے اُن پر عدمِ انحصار کو بھی پوری اہمیت دینی چاہیے۔ تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اُن کے مخالف صرف اُن کے مغرب زدہ اربابِ اقتدار نہیں بلکہ دنیا کی بڑی طاقتیں بھی ہیں۔ آج ان بڑی طاقتوں کو اکثر مسلم ممالک میں فوجی اور معاشی امداد دینے کی وجہ سے حکومتِ وقت کی داخلہ اور خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہونے بلکہ خود حکومتوں کی تشکیل میں دخل حاصل ہو چکا ہے۔ اس فتنہ کے سدِ باب کے لیے بڑی طاقتوں کی امداد سے بے نیازی ضروری ہے۔ یہ بے نیازی صرف جذباتی خروش، مطالبوں اور احتجاج سے نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس کے لیے ہر معلّم ہر مزدور اور ہر کسان، غرض سماج کے ہر کارکن کو محنت کے ذریعہ اپنے ملک کو معاشی طور پر اتنا طاقتور بنانا ہوگا کہ وہ دوسروں کا اس طرح محتاج نہ رہ جائے جس طرح کی احتیاج میں آج دنیا کے سارے مسلم ممالک مبتلا ہیں۔ آج کی دنیا میں مسلمان ملکوں کی سیاسی آزادی اور تہذیبی خود مختاری معاشی استحکام وترقی اور اپنے دفاع کے سلسلے میں خود کفیل ہوئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، اور یہ نکتہ کسی تفصیلی بحث کا محتاج نہیں کہ اسلامی نظام اسی ملک میں قائم ہو سکے گا جو سیاسی طور پر آزاد اور تہذیبی اعتبار سے خود مختار ہو۔

سیّد قطب اور اسلامی تاریخ

اقامتِ دین کے داعی کی حیثیت سے سید قطب نے آج کے انسان کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کیا ہے اور ہم سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کس طرزِ عمل کا مطالبہ کرتا ہے۔ دورِ جدید میں اسلامی زندگی کی تعمیرِ نو کا پروگرام سید قطب نے اللہ کی کتاب، اس کے رسولؐ کی سنت اور خلافتِ راشدہ کے اجتماعی نظام سے اخذ کیا ہے۔ سلفِ صالح کی طرح وہ بھی نبی کریمؐ کے تربیت یافتہ صحابہؓ کرام کے بنائے ہوئے معاشرہ اور اس کے اجتماعی نظام کو اسلامی تعلیمات کا اعلیٰ ترین عملی مظاہرہ قرار دیتے ہیں اور اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اسلام کے ان نمائندوں کی انفرادی زندگیوں کو بھی وہ اسلامی زندگی کے اونچے نمونے قرار دیتے ہیں۔ مگر جیسا کہ سلفِ صالح کا بھی مسلک رہا ہے، وہ کسی غیر نبی کو معصوم عن الخطا نہیں سمجھتے۔ سیّد قطب کی جس کتاب کا ترجمہ آپ کے سامنے ہے اس کے

ساتویں باب کا موضوع یہی ہے کہ اسلام کی جو اصولی تعلیمات کتاب کے ابتدائی چھ ابواب میں بیان کی گئی ہیں ان کا عملی اظہار خلافتِ راشدہ کے دور میں بالخصوص اور اس دور کے بعد آنے والے صالح لوگوں کی زندگیوں میں بالعموم کس طرح ہوا۔

قرنِ اوّل کی تاریخ کے اس مطالعہ میں دوسرے محققین کی طرح سیّد قطب کو بھی چند نازک مسائل سے عہدہ برآ ہونا پڑا ہے۔ ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس دور کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کے سامنے مختلف اور بعض اوقات متضاد روایتیں آتی ہیں۔ جن کے درمیان ترک و انتخاب کے بغیر چارہ نہیں۔ انتخاب و ترجیح کے معروف معیاروں کا لحاظ رکھنے کے باوجود اس کا امکان باقی رہتا ہے کہ ایک مؤرخ اور دوسرے مؤرخوں کے درمیان روایات کے انتخاب میں اختلاف پایا جائے۔ اس کی مثالیں اکابرِ سلفِ صالح کی تصانیف میں بھی ملتی ہیں۔ سیّد قطب نے بھی بعض ایسی روایات پر اعتماد کیا ہے جنہیں بعض معاصر محققین ناقابلِ اعتماد قرار دیں گے۔ اس اختلاف کو دور کرنا ممکن نہیں۔ اُمت کی فلاح اس میں ہے کہ ہر محقق کو تحقیق کے معروف معیاروں کے مطابق ترک و اخذ کی پوری آزادی ہو اور وہ بلا جھجک اپنی رائے پیش کرے اور اس کے حق میں دلائل دے۔ تاکہ مطالعہ کرنے والے مختلف نتائجِ تحقیق میں سے جس کو زیادہ مدلّل اور معقول سمجھیں اختیار کر سکیں۔ مؤرخ یا محقق کو کسی دور کے مخصوص مصالح کے تحت کسی خاص رائے کا پابند بنا دینا ایک ایسا اقدام ہوگا جس کی اسلام میں کوئی سند نہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خود خلفائے راشدین نے پیش آمدہ مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف فیصلے کیے ہیں اور بعض اہم اجتماعی امور کے سلسلہ میں ایک خلیفۂ راشد کی پالیسی دوسرے خلیفۂ راشد کی پالیسی سے مختلف رہی ہے۔ اسلامی تاریخ کا ایسا مطالعہ جس کا مقصد زندگی کی اسلامی تعبیرِ نو کے لیے رہنمائی حاصل کرنا ہو ان مختلف فیصلوں کے درمیان ترجیح و انتخاب کے بغیر ممکن نہیں موزوں اور غیر موزوں، مفید اور مُضر، اور بعض اوقات صحیح اور غلط کی تمیز قائم کیے بغیر اس بات کا فیصلہ ممکن نہیں کہ آج ہمارے لیے کون سی پالیسی اختیار کرنے کے لائق ہے۔

سلفِ صالح کی طرح سیّد قطب بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ ہر خلیفۂ راشد حُسنِ نیت اور نیکیٔ ارادہ سے متّصف تھا۔ کسی خلیفۂ راشد نے جان بوجھ کر کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جو اسلام اور مسلمانوں کے

کے مفاد کے خلاف رہا ہو۔ لیکن وہ یہ رائے نہیں رکھتے کہ کسی خلیفۂ راشد سے امور مملکت کی تدبیر میں کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔ سلفِ صالح میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہ تھا۔ تدبیر کی غلطی کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کسی شرعی حکم کے اطلاق کے حدود متعین کرنے میں اجتہادی غلطی۔ دو مختلف شرعاً معتبر مصالح میں سے کم وزن رکھنے والی مصلحت کو زیادہ وزن دے دینا۔ کسی فیصلہ کے دور رس عملی نتائج کا بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے، پوری طرح اندازہ نہ ہونا۔ یا اپنے فیصلوں کو عمالِ حکومت اور کلیدی مناصب پر فائز افراد سے ٹھیک ٹھیک نافذ نہ کرا سکنا..... اچھے ارادہ اور پاک نیت کے باوجود ان جیسے اسباب کی بنا پر ناپسندیدہ نتائج رونما ہو سکتے ہیں۔

دورِ حاضر میں کسی مؤرخ یا محقق کو اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ ماضی میں کیے جانے والے مختلف فیصلوں کے ان نتائج کو بھی دیکھ سکے جو فیصلہ کرنے والوں کے سامنے رونما نہیں ہوسکے تھے، بعد میں ظاہر ہوئے۔ ان نتائج کو شرعاً مقصود اور مطلوب نتائج کے پیمانہ سے ناپ کر مؤرخ ان فیصلوں کے بارے میں موزوں یا غیر موزوں، صحیح یا غلط ہونے کا حکم لگا سکتا ہے۔ ایسا کرنا کسی طرح فیصلہ کرنے والے کی نیت یا ارادہ پر حملہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ خلفاء راشدین کے فیصلوں اور تدبیر مملکت کے باب میں ان کے طرزِ عمل کا مطالعہ کرتے وقت اسلامی مؤرخ کی نگاہ ان قدروں، اور خوب و ناخوب، اعلیٰ و ادنیٰ، عزیمت و رخصت کے ان پیمانوں پر ہوتی ہے جو اللہ کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی سنت نے ہمیں دیئے ہیں۔ بلاشبہ یہی صحیح مسلک یہی ہے۔ اور سید قطب بھی اسی مسلک پر قائم ہیں کہ ہر خلیفۂ راشد نے پوری کوشش کی ہے کہ اس کے فیصلے اور تدبیر مملکت میں اس کا طرزِ عمل کتاب و سنت کے دیئے ہوئے اصولوں کے مطابق اعلیٰ معیار کا ہو، مگر اس کوشش میں ان کی کامیابی کے درجے مختلف ہیں۔ اور چونکہ یہ بزرگ انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح معصوم عن الخطاء نہ تھے، لہٰذا مذکورہ بالا اسباب کی بناء پر کبھی کوئی خلیفۂ راشد کسی فیصلہ کی حد تک اس کوشش میں ناکام بھی ہوسکتا ہے۔ اس سے اس کے خلیفۂ راشد ہونے، فی الجملہ رشد و ہدایات پر قائم ہونے اور اول تا آخر حُسنِ نیت اور نیکی ارادہ سے متصف ہونے کی شان میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا۔ یہ بات قرآن و سنت کی دی ہوئی قدروں اور اس کے مقرر کردہ پیمانوں پر ظلم کے مترادف ہوگی کہ ہم ان کے عملی اظہار کا مطالعہ کرتے وقت اعلیٰ و ادنیٰ اور موزوں و غیر موزوں کی تمیز ختم کر دیں۔ یہ طریقہ ان قدروں کو مسخ کر دے گا، ان پیمانوں کو

کھوکھلا بنا دے گا۔ اسلام کے مستقبل، اور دورِ حاضر میں اسلامی زندگی کی تشکیلِ جدید کا نقشہ مرتب کرنے کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ ہمارے صحیح اور غلط اور اعلیٰ اور ادنیٰ کے معیار واضح اور متعین ہوں۔

تعظیم واحترام اور جذبۂ اتباع کی حقیقی اور پائدار بنیاد علم ہے نہ کہ جہل، حقیقت ہے نہ کہ تصنّع۔ اُمّت کی فلاح اسی میں ہے کہ اس کے عوام کے سامنے ان کے اسلاف بالخصوص صحابۂ کرام رضؓ اور خلفائے راشدین رضؓ کی تاریخ اُسی طرح بیان کی جائے جیسی کہ وہ تھی۔ اور اگر اس میں اختلافات پائے جاتے ہیں تو ان اختلافات کو سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے۔ اس بات کو عوام کا ذہن بھی آسانی سے قبول کرسکتا ہے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی یہ سمجھانے میں کوئی زحمت نہ ہوگی کہ انسان کی بزرگی بے داغ اور بے خطا نہیں ہوتی اور اجتہادی غلطی یا کسی ایک معاملہ میں سوءِ تدبیر سے بزرگی میں فرق نہیں آتا۔ احترام اور اتباع کے جذبہ کو حقیقت پسندانہ بنیادوں پر پروان چڑھانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جب یہی عوام آج اپنے علماء اور اکابر کو باہم اختلاف کرتے دیکھیں گے تو اُن میں وہ حیرت واستعجاب اور تمام معاصر بزرگوں کی جانب سے وہ بیزاری نہیں پیدا ہوگی جو آج جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں خاص طور پر پیدا ہورہی ہے۔

آج بھی جب کسی مُلک میں اسلامی بنیادوں پر قانون سازی، نظامِ تعلیم کی اصلاح اور سیاسی اور معاشی نظام کی تعمیرِ نو کا کام شروع ہوگا، تدبیرِ مملکت سے متعلق ان امور میں مخلص اور صاحبِ علم و تقویٰ مسلمانوں کے درمیان بھی اختلافِ رائے ناگزیر ہے۔ صحابۂ کرامؓ بالخصوص خلفائے راشدین کے طرزِ عمل میں اُمورِ مملکت کی تدبیر سے متعلق پائے جانے والے اختلافات پر غور وبحث اس ذیل میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس بحث میں اُمّت کو یہ معلوم ہوگا کہ اسلامی تعلیمات کی تعبیر وتطبیق میں تاویل وترجیح یا احوال ومصالح کے فرق کی بنا پر اختلاف ممکن ہے اور اس سے گھبرانا نہیں چاہیئے اسلام نے ہمیں اختلافی اُمور میں اجتماعی فیصلہ کا طریقہ بھی بتا دیا ہے۔ ہمیں اختلاف کو کتاب وسنّت کی روشنی میں باہمی مشورہ کے ذریعہ طے کرنے کی تربیت حاصل کرنی چاہیے، اور اپنے اندر یہ مزاج پیدا کرنا چاہیئے کہ اختلاف کے باوجود اصحابِ امر کی اطاعت میں کمی نہ ہو۔

اس اصولی گفتگو کے بعد ہم اختصار کے ساتھ یہ واضح کریں گے کہ اس کتاب کے ساتویں باب

میں مصنف کی جو رائیں بعض حضرات کے لیے تشویش کا سبب بنی ہیں ان کے اظہار سے مصنف کا منشاء کیا ہے۔

فئ کی تقسیم میں حضرت ابو بکرؓ نے مساوات برتنے کا فیصلہ کیا اور ہر ایک کو مساوی حصہ دیا۔ حضرت عمرؓ نے ایک وزنی دلیل کی بنیاد پر جو انھوں نے واضح کردی تھی اور مصنف نے نقل کی ہے بعض افراد کو بعض افراد سے زیادہ حصہ دیا۔ اور عدم مساوات برتنے کی پالیسی اختیار کی۔ مصنف نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ کئی برس تک عدم مساوات کی پالیسی پر عمل کی وجہ سے اور چند دوسرے اسباب کی بنا پر جو ساتھ ساتھ کام کر رہے تھے، اسلامی معاشرہ میں دولت کی تقسیم کے اندر بڑا تفاوت پیدا ہونے لگا۔ اور دولت کے سماج کے ایک طبقہ کے اندر مرکوز ہو جانے کا رجحان پیدا ہونے لگا۔ مصنف نے ایک تاریخی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس ناپسندیدہ نتیجہ کو محسوس کر لیا اور اپنے دورِ خلافت کے آخری سال میں یہ اعلان کر دیا کہ آئندہ یہ پالیسی تبدیل کر دی جائے گی۔ اور فئ کی تقسیم میں مساوات برتی جائے گی۔ مگر آپ کی شہادت نے آپ کو اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ دیا۔ مصنف کے نزدیک زیادہ موزوں پالیسی وہی تھی جسے حضرت ابو بکرؓ نے اختیار کیا تھا۔ اور جس کی طرف عمر رضی اللہ عنہ نے بھی رجوع کر لیا تھا۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو آپ نے فئے کی تقسیم میں عدمِ مساوات برتنے کا طریقہ جاری رکھا۔ مصنف کے نزدیک ایسا کرنا غلط ہوا۔ کیونکہ وہ خرابی جس کی ابتدا محسوس کر کے حضرت عمرؓ نے اس پالیسی کو بدل دینے کا ارادہ کر لیا تھا حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں برابر بڑھتی جارہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں اسلامی معاشرہ کے اندر دولت کی تقسیم کا توازن بہت بگڑ گیا۔ جب حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے تقسیمِ فئے میں مساوات برتنے کا طریقہ اختیار کیا۔ مصنف کے نزدیک حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ کا عمل اور حضرت عمرؓ کا رجوع اس نتیجہ تک پہنچنے کے لیے کافی ہے کہ تقسیمِ فئے میں مساوات برتنا اسلام اور مسلمانوں کے حق میں زیادہ بہتر ہے اور عدمِ مساوات برتنے کا طریقہ ٹھیک نہیں۔

دوسرا مسئلہ جس کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی پر مصنف نے تنقید کی ہے، اہم سرکاری مناصب پر خلیفۂ وقت کے رشتہ داروں کا تقرر ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت

ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ ایسا کرنے سے پرہیز کرتے تھے مگر حضرت عثمانؓ نے مختلف کلیدی مناصب پر ایسے افراد کو مامور کیا جو ان کے قبیلہ یا خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح ایک مخصوص گروہ کے لوگوں کو پوری اسلامی مملکت پر چھا جانے کا موقع مل گیا جس سے آگے چل کر دور رس ناپسندیدہ نتائج رونما ہوئے۔ بلاشبہ ایسا کرتے وقت حضرت عثمانؓ کے سامنے بعض اہم مصالح اور استحکام نظم کے تقاضے رہے ہوں گے، لیکن مصنف کی نظر ان فوری مصالح کے ماوراء ان عملی نتائج پر ہے جنہوں نے آگے چل کر تاریخِ اسلام کا رُخ بدل دیا۔ ان کی رائے میں اس مسئلہ میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی پالیسی صحیح تھی اور حضرت عثمانؓ کی پالیسی غلط تھی۔

تیسرا مسئلہ بیت المال سے عطیے اور ہدیہ یا انعام کے طور پر رقمیں دینے کا ہے۔ جس سے حضرت عثمانؓ کے دور میں بعض لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ حضرت عثمانؓ اس سلوک کو صلہ رحمی کی اسلامی تعلیم کا تقاضا سمجھتے تھے۔ مگر مصنف کے نزدیک یہ ان کے سمجھنے کی (بالفاظ دیگر ایک نص کی تعبیر یا تاویل میں) غلطی تھی۔ بیت المال سے اس طرح کے اخراجات مناسب نہیں۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بیت المال کے مال کے بارے میں سخت محتاط واقع ہوئے تھے۔ حضرت عثمانؓ اس بات سے بخوبی واقف تھے مگر وہ اس سخت پالیسی پر عمل کرنا نہ ضروری سمجھتے تھے نہ مناسب۔ اس رائے کی بنیاد ضرور بعض مصالح پر ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیت المال میں مال کی کثرت اِس توسّع کا سبب بنی ہو۔ لیکن مصنف کے نزدیک اس سے دو خرابیاں پیدا ہوئیں۔ پہلی خرابی یہ تھی کہ سماج کے ایک طبقہ میں دولت کے ترکُز کا جو رجحان دوسرے اسباب و حالات کی وجہ سے پیدا ہو رہا تھا اِس پالیسی سے اس کو مزید تقویت حاصل ہوئی، اور دوسری خرابی یہ کہ اس سے بعض لوگوں کو شکایت پیدا ہوئی جس سے فتنہ کو غذا ملی۔

اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کے دوران مصنف نے جن تاریخی روایات پر اعتماد کیا ہے اُن کی صحت پر یا خود مصنف نے ان روایات کو جس طرح سمجھا ہے، اُس پر کافی بحث کی گنجایش ہے۔ خود یہ بات بھی مختلف فیہ ہے کہ یہ انعامات آپ نے اپنے ذاتی مال میں سے دیئے تھے یا بیت المال سے۔ اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ دورِ عثمانیؓ میں اسلامی سماج کے اندر دولت کی تقسیم میں ترکُز کا رجحان پیدا کرنے میں چند دوسرے اسباب و عوامل نے بھی حصہ لیا تھا جو انعامات و ہدایا یا فئے کی غیر مساوی تقسیم سے زیادہ طاقتور قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ مصنف کے سادہ تجزیہ اور

ان کی اجمالی بحث میں مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ مترجم کے لیے اس بحث کو اٹھانا نہ ضروری ہے نہ مناسب۔ اسے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اگر مصنف کا موقف کسی دوسرے محقق کے نزدیک غلط ہے تو وہ دلائل کے ساتھ ان کی غلطی واضح کر سکتا ہے۔ لیکن اُسے مصنف کا یہ حق ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ دلائل کی روشنی میں جس رائے تک پہنچا ہو اُسے ظاہر کر سکے۔ مصنف نے اس مسئلہ میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ صحیح ہو یا غلط، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اس رائے میں منفرد نہیں، سلفِ صالح میں بھی بعض بزرگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ اسلوب نگارش کا فرق ضرور ہے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک اور فیصلہ جس پر مصنف نے تنقید کی ہے اکابر صحابہؓ پر سے اس پابندی کو اٹھا لینے کا فیصلہ ہے جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے ان پر مدینہ سے باہر جانے اور ممالک مفتوحہ میں نقل و حرکت یا وہاں مستقل اقامت اختیار کر لینے کے سلسلہ میں لگا رکھی تھی۔ تقسیم فئے میں عدم مساوات، انعامات کی تقسیم اور قرابت داروں کو منصب دینے کے ساتھ اس فیصلہ کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ "بلاشبہ یہ سب مسلمانوں اور بالخصوص ان کے اکابر کے ساتھ حسنِ سلوک اور مہربانی کے طور پر کیا گیا تھا لیکن اس پالیسی نے ایسے مفاسد کو جنم دیا جو ابوبکرؓ و عمرؓ کی دُور بین نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ اس نے اسلامی جماعت میں زبردست معاشی تفاوت اور سماجی امتیازات پیدا کر دیئے۔" مصنف کے نزدیک بھی "جہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اندر صحیح اسلامی اسپرٹ کے کارفرما ہونے کا سوال ہے ان پر الزام رکھنا یا شبہ کرنا مشکل ہے۔ البتہ آئندہ جو نتائج رونما ہوئے اُن کو دیکھتے ہوئے وہ ان فیصلوں کو نامناسب قرار دیتے ہیں اور اُن فیصلوں کو قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں جو ان امور کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے کیے تھے۔"

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ مصنف کی یہ رائے صحیح ہے یا غلط، ہم صرف اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ مصنف کا تنقیدی مطالعہ چند صحت مند اصولوں پر مبنی اور معقول حدود کا پابند ہے اور اسے کسی طرح بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تنقیص یا اُن کی شان میں گستاخی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس طرح کے تنقیدی مطالعہ کا دروازہ بند کرنے کی کوشش اُمت کے لیے خوش آئند نہیں قرار دی جا سکتی۔

مصنف نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت اور آپ کے طرزِ حکمرانی کے بارے جو عمومی اظہار خیال کیا ہے اس کے لب و لہجہ پر ان کی اس رائے کا اثر پڑا ہے جو انہوں نے مذکورہ بالا

فیصلوں کے بارے میں اختیار کی ہے، لیکن انھوں نے احترام میں کہیں بھی کوتاہی نہیں برتی ہے۔ افسوس کہ سیّد قطب پر تنقید کرنے والوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا اور اُن کے بارے میں بعض انتہا پسندانہ رائیں ظاہر کی ہیں۔ انہوں نے اپنی تنقیدوں میں سید قطب کی طرف یہ بات بھی منسوب کر دی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جان بوجھ کر اصولِ اسلام کی خلاف ورزی کی اور مفادِ اسلام کو نقصان پہنچایا۔ اس کتاب کا ساتواں باب بالخصوص اس کی وہ عبارت جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے گواہ ہے کہ یہ الزام بے بنیاد اور غلط ہے۔

ہمیں اس بات پر بھی افسوس ہے کہ بعض ناقدین نے اُردو زبان میں سیّد قطب پر تنقید کرتے وقت اُن کی کتاب کے ترجمہ یا العدالۃ الاجتماعیہ کے آخری عربی ایڈیشن کی عبارتوں کو سامنے رکھنے کے بجائے کسی پچھلے ایڈیشن کو سامنے رکھا ہے جس کی بہت سی عبارتوں کو مصنّف نے ساقط کر دیا تھا مزید افسوس اس بات پر ہے کہ بعض اصحابِ قلم نے توجہ دلانے کے باوجود بھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کی۔ حالانکہ یہ بات کسی طرح جائز نہیں ہوسکتی کہ کسی مصنف پر ایسی عبارتوں کے حوالہ سے شدید ترین تنقیدیں کی جائیں جن کو وہ حذف کر چکا ہو۔

تیرہ سو سال کی طویل مدّت میں اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ دورِ جدید میں اسلامی تاریخ کے کسی طالب علم کے لیے یہ جائز نہیں ہوسکتا کہ آنکھیں بند کر کے کسی ایک مصنّف کی رایوں کو یا اس کی بیان کی ہوئی تاریخ کو اس موضوع پر حرفِ آخر سمجھ لے۔ امید ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے بھی اس نکتہ سے غافل نہ ہوں گے۔ پھر یہ حقیقت بھی سامنے رہے کہ اس کتاب کا اصل موضوع تاریخ اسلامی کی تحقیق نہیں بلکہ اجتماعی عدل کے اسلامی اصولوں کی وضاحت ہے۔ اس کتاب کو اردو زبان میں پیش کرنے کا محرک یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مصنّف کو اس کام میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید ہے کہ اسے پڑھنے والے بھی اس کے اصل موضوع کو مرکزِ توجہ بنائیں گے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ انھیں محسوس ہوگا کہ مصنّف کی تاریخی بحثیں اُن کے اُصولی بیانات کے لیے نظائر فراہم کرنے کا کام کرتی ہیں، اور تاریخی اختلافات کے باوجود اُن کا اُصولی استدلال فی الجملہ اطمینان بخش ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ موجودہ ترجمہ "العدالۃ الاجتماعیہ" کے ساتویں

اور آخری ایڈیشن کے مطابق ہے جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اردو ترجمہ کا پہلا ایڈیشن جو "اسلام کا نظامِ عدل" کے نام سے ۱۹۶۰ء میں ہندوستان میں اور ۱۹۶۳ء میں پاکستان میں چھپا تھا، کتاب کے پانچویں ایڈیشن کے مطابق تھا۔ ساتویں ایڈیشن میں مصنّف نے پانچویں ایڈیشن کے مقابلہ میں بہت سی تبدیلیاں کردی ہیں۔ یہ تبدیلیاں حذف واضافہ اور ترمیم تینوں قسموں پر مشتمل ہیں۔ اور زیادہ تر کتاب کے ابواب ۵ تا ۹ میں کی گئی ہیں۔ محقّقین اور تحریکِ اسلامی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے موجودہ ترجمہ اور طبع اول کا تقابلی مطالعہ بصیرت افروز ہوگا۔ اس مطالعہ کے ذریعہ وہ بعض علمی مسائل، نظری مباحث، تحریکِ اسلامی کے طریقہ کار اور تاریخِ اسلامی کے بعض مباحث سے متعلق سیّد قطب کا ارتقاء سمجھ سکیں گے۔ ان تبدیلیوں کے امتیازی نکات یہ ہیں: حاکمیتِ الٰہ کے تصوّر کی وضاحت اور دین میں اس کے بنیادی مقام پر اصرار۔ دورِ جدید میں احیاءِ اسلام کی تحریک کے مقصد اور طریقِ کار کا بیان۔ خلافتِ راشدہ اور اس کے فوراً بعد کی اسلامی تاریخ کے مطالعہ میں مزید احتیاط واعتدال کا التزام۔ اور جدید اسلامی قانون سازی کے ضمن میں ایسی تجاویز پیش کرنے سے احتراز جو مختلف فیہ ہو سکتی ہیں۔

ترجمہ کے طبع اوّل کا مقدمہ چونکہ مصنّف اور کتاب کے بارے میں مفید معلومات پر مشتمل ہے لہٰذا اسے علیٰ حالہٖ قائم رکھا گیا ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محمد نجات اللہ صدیقی

۲۰ فروری ۱۹۶۸ء

تعارف طبعِ اوّل

استاذ سید قطب کی شخصیت ہمارے لیے اجنبی نہیں۔ آپ مصر کے ایک بڑے ادیب، الاخوان المسلمون کے چوٹی کے مفکر اور عالمِ اسلامی کے ان چند مصنفین میں سے ہیں جن کی تصانیف تمام اسلامی ممالک میں قبولِ عام حاصل کر چکی ہیں۔ عربی میں آپ کی تصانیف ہندوستان کے مختلف علمی مراکز میں عرصہ ہوا پہنچ چکی ہیں اور بعض مکتبے بھی انھیں فراہم کرتے رہے ہیں۔ اُردو میں آپ کے بعض مقالات کے ترجمے متعدد رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ چونکہ یہ پہلی کتاب ہے جس کا مکمل ترجمہ اُردو میں پیش کیا جا رہا ہے لہٰذا قدرے تفصیلی تعارف کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

سید قطب ۱۹۰۶ء میں مصر کے ایک صوبہ (مدیریہ) اسیوط کے موشا نامی گاؤں میں پیدا ہوئے والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد قطب بھی صاحبِ تصانیف ہیں اور اُن کی دو کتابیں "الانسان بین المادیۃ والاسلام" اور "شبہات حول الاسلام"، اچھے معیار کی حامل ہیں۔ ان کی بہن بھی سرگرم خادمِ اسلام اور صاحبِ قلم خاتون ہیں۔ ان کے اصلاحی اور معاشرتی افسانوں کا ایک مجموعہ "فی تیار الحیاۃ" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

والد کا پیشہ زراعت تھا۔ والدہ بڑی دیندار خاتون تھیں اور قرآن مجید سے بڑا شغف رکھتی تھیں۔ اُن کی آرزو تھی کہ اُن کے بچے حافظِ قرآن ہوں۔ چنانچہ سید قطب نے بچپن ہی میں قرآن حفظ کر لیا تھا اور اسی عمر میں ان کو قرآن کریم سے خصوصی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں

کے مدرسہ میں ہوئی۔ ثانوی تعلیم "تجہیزیۃ دار العلوم" نامی اسکول میں ہوئی۔ جہاں ابتدائی اسکول کے فارغ طلبہ کو "دار العلوم قاہرہ" میں داخلہ کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ آکر اس کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۳ء میں یہاں سے بی۔اے کی ڈگری اور ڈپلوما اِن ایجوکیشن حاصل کیا کالج میں اُن کا شمار بڑے ذہین طلبہ میں ہوتا تھا۔ لیکن اس دور میں ان کو شعروادب اور صحافت سے مناسبت پیدا ہوگئی اور یہ ذوق اکثر کالج سے غیر حاضری کا سبب بنتا رہا۔

تعلیم سے فارغ ہوکر وزارتِ تعلیم میں ملازمت کرلی اور انسپکٹر آف اسکولس کی حیثیت میں ۱۹۵۲ء تک ملازم رہے۔ ۴۹ء میں وزارت کی جانب سے طریقۂ تعلیم اور نظام تربیت کے مطالعہ کے لیے امریکہ گئے اور دو سال قیام کرکے ۵۱ء میں واپس آگئے۔

دورانِ تعلیم اور اُس کے بعد عرصہ تک اسلام سے گہرا اور عملی لگاؤ نہیں رہا بلکہ خالص ادبی رنگ غالب رہا۔ شاعری کے علاوہ ان کا خاص موضوع تنقیدِ ادب تھا اور یہ عقاد کے مکتبِ فکر کے ایک اہم رکن سمجھے جاتے تھے۔ اس دور کی شاعری کے کئی غیر مطبوعہ مجموعے موجود ہیں۔ مگر سید قطب اب انھیں شائع کرانا پسند نہیں کرتے۔ اسی دور میں انھوں نے قرآن کریم پر ادبی اور فنی زاویہ سے نگاہ ڈالی اور اپنے مطالعہ کے نتائج "التصویر الفنی فی القرآن" اور مشاھد القیامۃ فی القرآن" نامی دو کتابوں میں پیش کیے۔ ان کتابوں کو دار المعارف مصر نے شائع کیا اور یہ ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ قرآن کریم کا یہ مطالعہ اور ان دونوں کتابوں کی تصنیف سید قطب کی شخصیت میں ایک خوشگوار انقلاب کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ عقلی اور جذباتی دونوں اعتبار سے اسلام سے دلچسپی اور وابستگی بڑھنے لگی۔ اور اب اُن کی توجہات زیادہ تر اسلام کے مسائل کے مطالعہ کی طرف مبذول ہوگئیں۔

شخصیت میں انقلاب کا یہ عمل ۵۳ء تک جاری رہا۔ ۱۹۴۶ء میں جب انھوں نے "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" کی تصنیف شروع کی تو اُن کے مزاج کی اسلامیت پختگی کو پہنچ چکی تھی۔ اور اب اس کام کی برکت سے اس میں مزید نکھار پیدا ہوا۔ یہ کتاب ۴۸ء میں مکمل ہوئی۔ اور اس کے بعد مصنف کو دو سال کے لیے امریکہ جانے کا موقع ملا۔ وہاں انھوں نے مغرب کی مادی تہذیب کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ اس مطالعہ سے اُن کا یہ یقین اور پختہ ہوگیا

کہ اسلام دینِ حق ہونے کے ساتھ انسانیت کو موجودہ تہذیبی بحران سے نجات دلاکر ایک متوازن نظامِ زندگی دینے کی بھی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ امریکہ سے واپس آکر انھوں نے اپنے ان تأثرات کو "امریکا الّتی رأیتُ" نامی کتاب میں پیش کیا۔ دوسرے اسلامی ممالک کی طرح مصر بھی مغرب کی اندھی تقلید میں مبتلا تھا، لہٰذا مغربی تہذیب کے براہِ راست مطالعہ کا مصنف پر جو ردِّ عمل ہوا اس نے خود مصر میں مغربی اثرات کے مقابلہ، ابنائے وطن کو مغربی نظاموں کی تقلید کے خطرات سے آگاہ کرنے اور اسلام کے متوازن نظام کی طرف دعوت دینے کا داعیہ پیدا کیا۔

امریکہ میں اُن کا قیام تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رہا۔ واشنگٹن میں ولسن ٹیچرس کالج، گریلی، کولوراڈو میں ٹیچرس کالج اور کیلیفورنیا میں اسٹان فورڈ یونیورسٹی میں قیام رہا۔ اس کے علاوہ نیویارک، شکاگو، سان فرانسسکو، لاس اینجلز اور دوسرے شہروں میں جانے کا بھی موقع ملا۔ امریکہ سے واپسی کے دوران آپ نے انگلستان، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں بھی چند ہفتے گزارے۔

اسلام کی طرف توجہ اور ماخذِ اسلام کے مطالعہ کے ساتھ ہی سیّد قطب کو الاخوان المسلمون سے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن امریکہ جانے سے پہلے اخوان سے باضابطہ طور پر متعلق نہیں ہوئے تھے۔ ابتدا میں انھیں مرشدِ عام حسن البناء رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے خاصا اختلاف بھی تھا۔ امریکہ سے واپسی پر ان کا قلم اسلام کے لیے وقف ہوگیا۔ انھوں نے اخوان کے اخبارات و جرائد میں کثرت کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہفت روزہ "الدعوۃ" کا کوئی شمارہ ان کی نگارشات سے خالی نہ ہوتا تھا۔ اخوان کے باضابطہ ممبر اواخر ۱۹۵۳ء میں بنے۔ اخوان نے انھیں اپنے مرکزی شعبۂ نشر و اشاعت کا سکریٹری بنا دیا۔ سیّد قطب نے اخوان کے لٹریچر کو فرانسیسی، انگریزی، انڈونیشیائی اور دوسری زبانوں میں منتقل کرانے اور نئی تصانیف سامنے لانے کا ایک جامع پروگرام بنایا۔ مگر ابھی اس پر عملدرآمد شروع ہی ہوا تھا کہ جماعت خلافِ قانون قرار دے دی گئی۔ اس سے پہلے آپ اخوان کی تنظیم کے سلسلہ میں پورے مصر کا دورہ کرچکے تھے۔ مصر کی الاخوان المسلمون کے ساتھ سیّد قطب عالمی اسلامی تحریک میں بھی حصہ لیتے تھے۔ اور ایک زمانہ میں مؤتمر اسلامی برائے فلسطین کے سکریٹری بھی تھے۔ اسی سلسلہ میں آپ نے ۱۹۵۲ء میں شام اور بیت المقدس کا سفر کیا تھا۔ جب اخوان المسلمون

دوبارہ بحال ہوئی تو اُس نے ایک ہفت روزہ "الاخوان المسلمون" نکالنے کا فیصلہ کیا اور اس کا ایڈیٹر سیّد قطب کو بنایا۔

اخوان کے پہلی بار خلاف قانون قرار دیئے جانے کے ساتھ سیّد قطب کو بھی ۱۴ر جنوری ۵۴ء میں گرفتار کر لیا گیا، جس کے بعد سے اب تک انھیں رہا نہیں کیا گیا ہے۔ اس دوسرے دورِ اسیری میں ان پر جیل کے اندر جو بہیمانہ مظالم ڈھائے گئے ہیں وہ ناقابل بیان ہیں۔ یہ سختیاں اب باقی نہیں اور کچھ عرصہ سے انھیں جیل میں ہر طرح کا آرام اور مطالعہ و تصنیف کی آسانیاں میسر ہیں۔ آج کل وہ قاہرہ سے ۱۵ کیلو میٹر (تقریباً دس میل) کے فاصلہ پر طرّہ نامی مقام پر محبوس ہیں اور بخیریت ہیں صحت بھی اچھی ہے۔ انھوں نے اپنی کئی تصانیف پر جیل ہی میں نظرثانی کی ہے۔ اور "فی ظلال القرآن" نامی تفسیر بھی جیل ہی میں مکمل کی ہے۔

سیّد قطب کے خلاف فوجی عدالت میں جو مقدمہ چلایا گیا تھا اس کا ذکر مصری حکومت کے شائع کردہ کتابچہ "محکمۃ الشعب" میں آیا ہے۔ ایک معتبر راوی نے مجھے بتایا ہے کہ اِس عدالت کے سامنے سیّد قطب نے یہ کہا تھا کہ "اگر تمہیں ضرورت ہو تو میں اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر آیا ہوں۔" اپنے بیان میں سیّد قطب نے یہ انکشاف کیا کہ حکومت کی جانب سے وزارت کا عہدہ پیش کیا گیا تھا مگر انہوں نے اسے ٹھکرا دیا۔ انھوں نے یہ کہا کہ اگر انھیں وزارت تعلیم دی جائے اور غیر مشروط طور پر ملک کے تعلیمی نظام کو اسلامی نظریات کے مطابق ڈھالنے کی آزادی دی جائے تو وہ اسے قبول کر لیں گے مگر حکومت نے یہ شرط رد کر دی۔

یہاں مصنّف کی ۲۱ تصانیف کا جو اسلامیات کے علاوہ شعر و افسانہ، تنقید، سفرنامہ وغیرہ اصناف سے بھی تعلق رکھتی ہیں تفصیلی تعارف ممکن نہیں۔ ذیل میں ہم صرف چند اہم تصانیف کا اجمالی تعارف کرائیں گے۔

امریکہ جانے سے پہلے ۹ کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ جن میں سے دو کے علاوہ باقی سب کا تعلق ادب سے تھا۔ بعد کی بارہ تصانیف میں سے زیادہ تر کتابوں کا موضوع اسلام ہے۔

بعض اہم تصانیف یہ ہیں:

فی ظلال القرآن (قرآن کے زیرِ سایہ) ــــ یہ تفسیر ۸ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ یہ

اصطلاحی معنی میں کوئی تفسیر نہیں۔ مصنف نے وہ تأثرات قلمبند کر دیئے ہیں جو مطالعۂ قرآن کے دوران اس پر طاری ہوئے۔ مصنف کے نزدیک اس کے ہم عصروں کے لیے اپنے ہی جیسے ایک "جدید" ذہن کے ان تأثرات کا مطالعہ ایک مخصوص افادیت کا حامل ہے۔ ہمارا مطالعہ مصنف کی اس رائے کی تائید کرتا ہے۔ تفسیر میں جذباتی اپیل اور دعوتی اسلوب نمایاں ہے۔ قرآن کریم کے فنی محاسن کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ تفسیر کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا فارسی ترجمہ "درسایۂ قرآن" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

التصویر الفنی فی القرآن ــــ ہمارے نزدیک اپنے موضوع پر ایک اچھوتی کتاب ہے جس میں دورِ جدید کے ایک ادیب نے جدید فنونِ لطیفہ کے زاویۂ نگاہ سے قرآن حکیم کی بلاغت کے ایک خاص موضوع کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ پہلو قرآن کی تمثیلات، تشابیہ اور استعاروں سے متعلق ہے۔ ابتدائی صفحات میں مصنف نے عبدالقادر جرجانیؒ کی "اسرار البلاغۃ" جیسی بلند پایہ کتاب پر تنقید کرتے ہوئے بلاغتِ قرآن کے باب میں اپنے ذوق اور مسلک کی وضاحت کی ہے۔ کتاب میں منظر کشی، اشارہ و تلمیح اور بلندیٔ تخیل کے جدید معیاروں پر قرآنِ کریم کی تشابیہ اور استعاروں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ قدیم عربی درسگاہوں کے فارغین کو شاید یہ انداز پسند نہ آئے لیکن جو لوگ جدید لٹریچر اور آرٹ کے میدان میں فنی تنقید کے لئے معیاروں سے مناسبت رکھتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ اس سے قرآن کی عظمت کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ اور اس کی کشش اور جاذبیت کا ایک نیا باب کھل جاتا ہے۔ وللناسِ فیما یعشقون مذاھب۔

مشاھد القیامۃ فی القرآن میں بھی یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

معرکۃ الاسلام والراسمالیہ (اسلام اور سرمایہ داری کی کشمکش)

ــــ اور "السلام العالمی والاسلام" (اسلام اور عالمی امن) اپنے موضوع پر اچھی کتابیں ہیں۔ اسلوب دعوتی اور خطیبانہ ہے۔ اور یہ مصنف کے مزاج کا خاصہ ہے۔

العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (اسلام میں عدلِ اجتماعی) ــــ

جس کا ترجمہ "اسلام میں عدلِ اجتماعی" کے نام سے پیش نگاہ ہے۔ مصنف کی سب سے بڑی

تصنیف ہے۔ یہ کتاب زندگی کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی عدل کے بارے میں اس کے مزاج کی وضاحت میں پوری طرح کامیاب قرار دی جاسکتی ہے۔ سیّد قطب کے نزدیک اسلام کے قانونی ضوابط سے زیادہ اہم وہ روح اور مزاج ہے جس کا اسلامی نظام حامل ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اسی اسپرٹ کی وضاحت کی طرف زیادہ توجہ کی ہے۔ کتاب کی ایک امتیازی خصوصیت روحِ اسلام کی کسوٹی پر مسلمانوں کی تاریخ کو پرکھنے اور یہ یقین پیدا کرنے کی کوشش ہے کہ تاریخِ اسلامی جو اسی روح کے عمل کا نام ہے۔ ایک مسلسل عمل ہے جو آج بھی جاری ہے۔ کتاب کے ساتویں باب میں مصنف نے قرنِ اوّل سے آج تک کی تاریخ سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جو روحِ اسلامی کے مظاہر اور اُس کے بقاء و تسلسل کا ثبوت ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کتاب کا سب سے قیمتی حصّہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہم میں یہ اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی اسپرٹ صرف کتابوں کی زینت یا کسی خاص زمانہ کا طرّۂ امتیاز بن کر نہیں رہ گئی بلکہ تاریخِ اسلامی پر مسلسل اثر انداز ہوتی رہی۔

سیّد قطب کے نزدیک آج دنیا ایک تہذیبی بُحران سے گزر رہی ہے اور ہر طرف ایک متوازن نظامِ زندگی کی تلاش ہے۔ دنیا صدیوں کے طویل تجربات کے بعد مادّی تہذیب سے بیزار ہو کر جس صالح عقیدہ اور عادلانہ نظامِ اجتماعی کی متلاشی ہے وہ اسے صرف اسلام کی آغوش میں مل سکتا ہے۔ یہ حقیقت دنیا کو بآسانی سمجھائی جاسکتی ہے اور وہ اسے تسلیم بھی کرلے گی لیکن اس کے لیے خود اسلامی سماج میں انقلابِ حال ضروری ہے۔ اس کی خاطر تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کو بہت کچھ کرنا ہے۔ ان فکری اور علمی کاموں کی نشاندہی مصنف نے خاصی تفصیل کے ساتھ آٹھویں باب میں کی ہے۔ آپ نے علمی و فکری اور ادبی کام پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ جدید اسلامی قانون سازی کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے اس سلسلہ میں چند متعین تجاویز بھی پیش کی ہیں۔

فطری طور پر اس کتاب میں بالخصوص ساتویں باب میں مصنف نے بعض ایسی رائیں بھی ظاہر کی ہیں جن سے اتفاق کرنا کتاب کے ہر قاری کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ لیکن ایک صالح اور روشن مستقبل کی تعمیر کے لیے اپنے ماضی کا تنقیدی مطالعہ ناگزیر ہے۔ اور اس اہم ضرورت کے پس منظر میں مصنف کی ان رایوں کا مطالعہ بھی افادیت کا حامل ہے جن سے اکثر اصحابِ فکر کو اتفاق نہ ہو۔

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ "سوشل جسٹس اِن اسلام" کے نام سے امریکن کاؤنسل آف لرنڈ سوسائیٹز واشنگٹن کی جانب سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ کتاب کے پہلے ایڈیشن کے مطابق ہے اور ترجمانی، زبان، طباعت، ہر اعتبار سے ناقص ہے۔ اپنے ترجمہ پر نظر ثانی کے دوران ہم نے بعض مقامات پر اس سے استفادہ کرنا چاہا تو غلط ترجمانی کی متعدد مثالیں سامنے آئیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس کتاب کی تصنیف کا زمانہ ۴۸ء ہے۔ پہلا ایڈیشن غالباً ۴۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اور اس کے بعد سے چار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پانچواں ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں بہت سی اہم ترمیمات اور اضافے مصنّف نے دوسرے ہی ایڈیشن میں کر دیے تھے۔ لیکن نظر ثانی کا عمل اس کے بعد بھی جاری رہا اور پانچویں ایڈیشن میں پھر بہت سے اہم حذف و اضافے پائے جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے اس کتاب کے ابتدائی ایڈیشنوں کا مطالعہ کیا ہے ان کے لیے یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس حذف و ترمیم کا اثر زیادہ تر کتاب کے ان صفحات پر پڑا ہے جن کا تعلق امیر معاویہؓ اور بنو امیہ اور حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت سے ہے۔ ہم بڑی مسرت کے ساتھ یہ اطلاع بھی دینا چاہتے ہیں کہ مترجم کی درخواست پر مصنّف نے آخری مطبوعہ (پانچویں)[1] ایڈیشن کے بعض مقامات پر پھر نظر ثانی کی ہے اور مزید ترمیمات کی ہیں۔ یہ ترمیمات تمام تر امیر معاویہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے متعلق ہیں۔

اس کتاب کا اُردو ترجمہ اواخر ۵۳ء میں مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں شروع کیا گیا تھا اور ۵۵ء میں (علی گڑھ میں) مکمل ہو گیا تھا۔ بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر اس کے منظر عام پر آنے میں خاصی تاخیر ہو گئی۔ لیکن یہ تاخیر اس اعتبار سے بڑی بابرکت ثابت ہوئی کہ ہمیں مصنّف کی پے درپے نظر ثانی اور اہم ترمیمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔

ساتویں اور آٹھویں باب میں ذیلی سرخیوں کے اضافہ کے علاوہ ابواب اور ان کی ترتیب میں اصل کتاب سے کوئی انحراف نہیں کیا گیا ہے۔

---

[1] جیسا کہ طبع ثانی کے مقدمہ میں صراحت کر دی گئی ہے موجودہ اردو ایڈیشن کتاب کے ساتویں اور آخری عربی ایڈیشن کے مطابق ہے۔

دورانِ ترجمہ میں نے مدرستہ الاصلاح اور مرکز جماعت اسلامی ہند میں اپنے اساتذہ، بالخصوص مولانا جلیل احسن ندوی صاحب سے خاصا استفادہ کیا ہے۔ جس کے لیے میں بہت مشکور ہوں۔ مصنف کے بعض حالات مجھے محمد مصطفیٰ الاعظمی صاحب کی زبانی معلوم ہوئے ہیں جو ۵۴ء کے پُر آشوب زمانہ میں قاہرہ میں مقیم تھے اور مصنف کی صحبت سے استفادہ بھی کر چکے ہیں۔ تفصیلی حالات معلوم کرنے میں مصنف کے چھوٹے بھائی محمد قطب صاحب سے خط و کتابت بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ کتاب کے تازہ ترین اڈیشن کا ایک نسخہ بھی آپ ہی کے ذریعہ ملا۔ اپنے خاندان اور بھائی کی زندگی کے بارے میں تفصیلی حالات سے آگاہ کرنے کے علاوہ آپ نے میری درخواست پر حال ہی میں مصنف سے ملاقات کر کے بعض ترمیمات بھی کرائی ہیں جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

مولانا ابواللیث صاحب اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی ہمت افزائی اور قیمتی مشورے مختلف مراحل پر میرے مددگار رہے ہیں، اللہ ان تمام حضرات کو جزائے خیر دے اور ان متعدد ساتھیوں کو بھی جن کی دلچسپی، مشوروں اور رفاقت نے مجھے بڑا سہارا دیا ہے۔

سب سے زیادہ شکریہ مجھے خود استاذ سید قطب کا ادا کرنا ہے جنہوں نے کتاب کے اُردو ترجمہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے بڑی فراخ دلی سے ترجمہ اور اشاعت کی اجازت عطا فرمائی۔ اللہ ان کی مشکلات دور کرے، راہِ حق کی صعوبتوں کو ان کے لیے آسان بنائے۔ اسلام اور مسلمانوں کو ان کی خدمات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ اور ان کی اور ہماری خطاؤں سے درگذر کرتے ہوئے ہماری مغفرت فرمائے۔ آمین!

آفتاب ہوسٹل۔ علی گڑھ۔ محمد نجات اللہ صدیقی

۴ مئی ۱۹۶۰ء

باب اوّل

مذہب اور سماج

اِسلامی اور مسیحی نقطۂ نظر کا موازنہ،

مذہب اور سماج

اسلامی اور مسیحی نقطۂ نظر کا موازنہ

کوئی صاحب دولت اس وقت تک قرض نہیں لیتا جب تک وہ خود اپنی پونجی کا جائزہ لے کر یہ نہ دیکھ لے کہ وہ کافی ہے یا نہیں۔ اسی طرح کوئی حکومت اپنے اسٹاک، خام پیداوار اور قدرتی وسائل کا جائزہ لیے بغیر کوئی سامان نہیں درآمد کرتی۔ سوال یہ ہے کہ کیا روحانیت کے خزانہ، فکر و نظر کے ذخیرہ اور قلب و ضمیر کی پونجی کو اتنی اہمیت بھی حاصل نہیں جتنی اشیاءِ ضرورت اور سامانِ تجارت کو حاصل ہے؟ جواب ظاہر ہے۔ لیکن آج جن ممالک کو 'عالم اسلامی' کہا جاتا ہے اس میں لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنے روحانی خزانہ اور فکری ورثہ کی طرف مڑ کر بھی دیکھے بغیر لوگ نظریات و اصول اور قوانین و دستور سب کچھ سات سمندر پار سے یا آہنی پردوں کے پیچھے سے درآمد کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

لوگ اپنے سماج پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کا حال بہت خراب نظر آتا ہے۔ ان کے سامنے ایک ایسی اجتماعی فضا ہے جس کو عدل و انصاف سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ پھر ان کی نگاہیں یورپ، امریکہ، روس، چین اور یوگوسلاویہ کی طرف اٹھتی ہیں اور جس طرح وہ اُن سے سامانِ معیشت درآمد کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنی ان مشکلات کا حل بھی چاہتے ہیں۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ اشیاءِ ضرورت درآمد کرتے وقت تو وہ اپنے اندوختہ ذخیروں کا جائزہ لیتے ہیں، بازار میں موجودہ سامان کو دیکھتے ہیں اور اپنی قوتِ پیداوار کا اندازہ لگاتے ہیں، لیکن بنیادی اصول، قوانینِ حکومت اور نظامِ زندگی اخذ کرتے وقت اپنے فکری خزانوں کا جائزہ لینے کی زحمت بالکل نہیں گوارا کرتے۔ ان کے حالات، ان کی تاریخ اور اُن کی مادی، فکری اور روحانی قدریں سات سمندر پار بسنے والوں یا آہنی پردے کے پیچھے رہنے والی قوموں

کے حالات اور اقدار سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں وہ جمہوری، اشتراکی یا استحصالی اصولوں کے ذریعہ اپنے مسائل کا حل چاہنے میں کوئی حرج نہیں محسوس کرتے۔ وہ بہت آسانی سے اس کی خاطر اپنی تمام روحانی متاع اور فکری سرمایہ سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور اپنے مسائل کے ان حلوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں جو خود اپنے نظریات و اصول پر غور کرنے سے سامنے آ سکتے ہیں۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان کا دین اسلام ہی ہے۔ اور کبھی کبھی یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے حامی اور داعی ہیں! لیکن انھوں نے اپنی عملی زندگی سے اسلام کو خارج کر رکھا ہے۔ یہ وجدان کے گوشہ میں اس طرح خلوت نشین ہے کہ نہ زندگی پر حکم چلا سکے، نہ اس کے معاملات میں دخل دے اور نہ اس کی مشکلات کو حل کر سکے۔ . . . . ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ عام خیال کے بموجب دین بندے اور خدا کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے اور بس ــــ جہاں تک انسانی تعلقات، اجتماعی روابط، زندگی کے عملی مسائل، امورِ مملکت اور اقتصادی معاملات کا سوال ہے۔ نہ تو دین کو اُن میں کچھ دخل ہے اور نہ ان کو دین سے کوئی واسطہ۔ یہ تو ان لوگوں کا خیال ہے جو دین کے منکر نہیں۔ رہے دوسرے خیال کے لوگ، تو وہ کہتے ہیں کہ" ہمارے سامنے دین کا ذکر ہی نہ کرو۔ مذہب تو ایک افیون ہے جسے ظالم حکام اور سرمایہ دار، محنت کش عوام کو خوابِ غفلت میں مبتلا رکھنے اور بے روزگاروں کے احساس و شعور کو مردہ اور ان کے ذہنوں کو ماؤف کر دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔"

اسلام کے مزاج اور اس کی تاریخ کے بارے میں اُن لوگوں نے یہ انوکھی رائے کہاں سے اخذ کی؟ دوسری باتوں کی طرح اسے بھی انھوں نے سمندر پار یا آہنی پردوں کے پیچھے سے درآمد کر لیا ہے اس لیے کہ تفریق دین و دنیا کا فسانہ نہ تو شرقِ اسلامی کی پیداوار ہے نہ اسلام اس سے کبھی آشنا رہا۔ یہ خیال بھی اسلام کے زیر اثر نہیں پیدا ہوا کہ دین احساس و شعور کے لیے موت کا پیغام ہے۔ اسلام کے مزاج سے یہ بات ذرا بھی مناسبت نہیں رکھتی، لیکن یہ لوگ اِن باتوں کو طوطے کی طرح رٹ کر دہرایا کرتے ہیں اور بندر کی طرح دوسروں کی نقل اتارتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کی زحمت کبھی نہیں گوارا کی کہ اس کی حقیقت معلوم کریں۔ اور دیکھیں کہ بات کہاں سے نکلی اور کس پر صادق آتی ہے۔ آئیے اب ہم یہ تحقیق کریں کہ یہ عجیب رائے کہاں سے اور کس طرح نکلی ہے۔

مسیحیت رومن امپریلزم کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے۔ اس وقت یہودیت جمود کا شکار

ہو کر بے جان رسموں اور کھوکھلے بے روح مظاہر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ رومن ایمپائر کے پاس اُس کے وہ مشہور قوانین تھے جو اَب بھی جدید یورپ کے قوانین کا منبع ہیں۔ رومن سماج اپنی مخصوص سماجی قدریں اور خود اپنا بنایا ہوا اجتماعی نظام رکھتا تھا۔ مسیحیت نے نہ تو اس کی ضرورت محسوس کی اور نہ وہ اس کی قدرت رکھتی تھی کہ مضبوط جمی ہوئی رومن اسٹیٹ اور منضبط رومن سماج کے لیے ایک نیا نظام اور نئے قوانین وضوابط تجویز کرے، تاکہ سماج اور ریاست اس کی ہدایات کے سانچہ میں ڈھل سکیں۔ اس نے یکسو ہو کر روحانی تزکیہ وتربیت اور وجدان کی تہذیب وتطہیر کی طرف توجہ کی۔ اس نے اسی کو زیادہ ضروری سمجھا اور اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے یہودیت کی جامد رسوم اور اس کے بے روح مظاہر پر تنقید کی اور مردہ اسرائیلی ضمیر کو ازسرِ نو بیدار کر کے اُسے روحِ تازہ بخشنے کی کوشش کی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صفائے روحانی، مادّی علائق سے بے نیازی اور صبر وتحمّل کے سلسلہ میں مسیحیت منتہائے کمال کو جا پہنچی۔ اس نے انسان کی روحانی زندگی کے اس پہلو کے سلسلہ میں وہ سب کچھ دکھایا، جو کسی مذہب کے لیے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس نے روح ووجدان کو بلندی و پاکیزگی عطا کی، قلب وضمیر کی تطہیر کی اور انسان کو خواہشاتِ نفس پر اتنا قابو یافتہ بنا دیا کہ فکرِ آخرت دنیوی ضروریات پر بھی غالب ہو گئی اور ان کی اصل منزلِ عالم خیال کی مقدس تمنّائیں قرار پائیں۔ اس کی خاطر اس نے اجتماعی زندگی کو حکومتِ وقت کے حوالہ کر دیا کہ وہ اپنے سیکولر قوانین کے ذریعہ اُسکی تنظیم عمل میں لائے۔ کیونکہ خود مسیحیّت کی توجہ تمام تر قلب وضمیر کی دنیا پر مرکوز تھی۔ اہل کلیسا نے عیسائیت کو جو مخصوص شکل دیدی تھی اور جس مخصوص فضا میں مسیحیت پروان چڑھی تھی اس کے ساتھ یہ پالیسی منطقی ربط رکھتی تھی۔ یہی طریقہ اس زمانہ میں اسرائیلی قوم کی ضروریات کے بھی مطابق تھا۔

جب مسیحیت اپنی اس شکل میں سمندر پار کر کے یورپ میں داخل ہوئی تو وہاں اُسے یونان کی صنم پرستانہ مادّی تہذیب کی وارث رومن قوم ملی۔ یورپ کے دوسرے اطراف وجوانب میں اسے ان قبائل سے سابقہ پڑا جو ابھی ابھی وحشت وبربریت کی زندگی سے نکلے تھے اور جن کے چھوٹے چھوٹے خطّوں پر بسنے والی گھنی آبادیاں باہمی جنگ وجدال اور خونریزی میں مصروف تھیں۔ یہ مزاج کے سخت سرکش تھے اور حرص وبخل ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ایسے خطّوں میں بسنے والوں کے لیے کچھ عرصہ بھی امن وچین کے ساتھ گذارنا ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے ہتھیار رکھ دینا

ممکن نہ تھا۔ یہ بات ان کے لیے اور زیادہ ناممکن تھی کہ اپنی عملی زندگی میں مسیحی نظریات اس کے عالم بالا کی طرف رجحان اور دنیا کی عملی زندگی سے کنارہ کشی کی طرف مائل ہو سکیں۔

ان اقوام نے جب یہ دیکھا کہ یہ مذہب عملی زندگی کے لیے کچھ زیادہ موزوں نہیں نظر آتا تو انھوں نے یہ نظریہ گھڑا کہ مذہب صرف خدا اور بندے کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے انھیں اس میں کوئی خاص زحمت نہیں نظر آئی کہ چند گھڑیاں چرچ میں مذاہب کے زیرِ سایہ گزار لیں۔ یا ہیکل مقدس میں چند سانس اس کی فضا میں بھی لے لیں اور پھر سماجی زندگی میں اپنے ہی وحشیانہ طور طریق اختیار کئے رہیں۔ دورِ وحشت کی طرح وہ اب بھی قانونِ شمشیر کو حکمراں بنائے رہے، یا پھر متمدن ہو جانے کے بعد انھوں نے قانونِ ملکی کو فیصلہ کن قرار دیا۔ چنانچہ مذہب ہمیشہ قلب و ضمیر کی خلوتوں میں گوشہ گیر رہا اور کبھی بھی ہیکل مقدس یا کرسیِ اعتراف سے آگے نہ بڑھ سکا۔ مسیحیت کبھی بھی ایک ایسا نظام بن کر قائم نہ ہو سکی جو پوری زندگی پر حاوی ہو اور اس دنیا کو عالم بالا سے مربوط رکھے۔

اہلِ یورپ کی زندگی میں دین و دنیا کی تفریق یہاں سے پیدا ہوئی۔ یہ ساری باتیں ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتی ہیں کہ یورپ کبھی بھی، ایک دن کے لیے بھی مسیحی نہ تھا۔ جب سے دین نے اس سرزمین پر قدم رکھا تب سے آج تک ہمیشہ عملی زندگی کی تنظیم و تعمیر سے کنارہ کش رہا۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر چرچ معاشرتی اور سیاسی زندگی سے کنارہ کش رہتا تو مذہبی افراد، مثلاً قسیس، کارڈینل اور پاپاؤں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے مادی مفادات کا تحفظ کر سکیں یا اپنے اثر و رسوخ کو قائم رکھ سکیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ چرچ امراء و سلاطین کی قوت کے مدِمقابل ایک الگ قوت بن کر عام زندگی میں اپنے روحانی اقتدار سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔

بعض ادوار میں چرچ کے پاس اتنی جائدادیں اور فوجیں تھیں اور اُسے اس قدر غلبہ حاصل تھا جو کسی طرح بھی بادشاہوں کے غلبہ، ان کی فوجوں اور ان کی جائدادوں سے کم نہ تھا۔ اس صورتِ حال کے قدرتی نتیجہ کے طور پر چرچ اور اسٹیٹ، پاپاؤں اور شہنشاہوں کے مابین کش مکش کا آغاز ہوا اس کش مکش میں عوام نے زیادہ تر چرچ کا ساتھ دیا۔ پھر ان دونوں طاقتوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ جس کا منشاء محض یہ تھا کہ دونوں اپنے وہ مفادات محفوظ رکھ سکیں جو لوگوں کو مسخر رکھنے اور عوام الناس کو لوٹنے سے وابستہ تھے۔ یہ مفادات تمام تر مالی اور مادی مفادات تھے اور یہ ساری نزاع دنیا وی

اقتدار کے مسئلہ پر تھی۔

یہ ہے اصل صورتِ حال۔ اور کہا یہ گیا کہ " دین اہلِ اقتدار اور مذہبی طبقات کے ہاتھ میں عوام الناس کو مغلوب رکھنے کے لیے ایک آلۂ کار ہے " ۔ صرف اس لیے کہ یورپ والوں کے یہاں دین کی پوزیشن یہی تھی۔

چرچ ایک مقدس اتھارٹی بن کر لوگوں کی دنیا اور آخرت دونوں پر حکمرانی جتاتا رہا۔ وہ پروانۂ مغفرت بیچتا اور فرامینِ محرومی جاری کرتا۔ عوام کے جذبات و احساسات اور ان کے افکار و خیالات دونوں پر وہ یکساں چھایا رہا۔ اس کی پشت پناہ وہ تحقیقاتی عدالتیں تھیں جو ہر اس شخص کو قتل کر دیتیں یا آگ میں جلا دیتیں، جو ذرا بھی سر اٹھاتا، یا جس پر الحاد و کج روی کی تہمت لگا دی جاتی۔ نشأۃ ثانیہ تک یہی حال رہا، مگر یہ دور آیا تو چرچ کو سجھائی دیا کہ تاریکی کی صدیاں گذر جانے کے بعد اب آنکھیں کھل رہی ہیں اور سوئے ہوئے جذبات انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ جدید فکر اور زندگی سے گہرا تعلق رکھنے والے سائنس کے سامنے اتنی آسانی سے اپنے غلبہ سے دست بردار ہو جانا چرچ کو کبھی گوارا نہ تھا۔ چنانچہ وہ جرأت مندوں کی زبان بندی کرنے اور قدیم و فرسودہ نظریات کے مخالف نئے خیالات کو مٹا دینے پر تل گیا۔ اسی دن سے آزادیٔ فکر اور چرچ کے درمیان شدید نزاع چلی آرہی ہے۔ چرچ نہ تو مسیحیت کی طرح صرف دین پر قانع ہو سکا اور نہ پاپائیت کی طرح صرف آخرت کے بارے میں حکم چلانے پر اکتفا کر سکا۔ زمین و آسمان اور مادہ کے بارے میں چرچ کے نظریات سائنس کے ان نظریات سے ٹکرائے جو کلیسا کے مقرر کردہ طریقۂ تحقیق سے آزاد تھے۔ خود یہ طریقۂ تحقیق بھی ناقص انسانی علم پر ہی مبنی تھا اور اُسے بنیادی طور پر دین سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر علماء اور مفکرین کی کئی کئی پشتیں ایسی پیدا ہوئیں جو چرچ کو نفرت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں اور ان کے دل میں علمبرداران مذہب سے سخت دشمنی اور نفرت کے جذبات موجزن تھے۔

یہاں سے یورپ کی زندگی میں مذہب اور سائنس، اور چرچ اور فکر و نظر کے درمیان کش مکش کا آغاز ہوتا ہے۔[1]

---

[1] ہماری کتاب " المستقبل لھذا الدین " کا باب " الفصام النکد " ملاحظہ ہو

اب زندگی کی گاڑی آگے بڑھی، جدید علوم و فنون پھل پھول لائے اور اُن کے طفیل صنعتی دنیا میں بڑے پیمانہ پر سامانِ حیات کی تیاری کا طریقہ رائج ہوا۔ سرمایہ میں بے حد اضافہ ہوگیا اور دو مختلف کیمپ بن گئے۔ سرمایہ داروں کا کیمپ اور مزدوروں کا کیمپ۔ دونوں کیمپوں کے مفادات و مصالح کے درمیان جو خلیج حائل تھی وہ بڑھتی چلی گئی۔ اقتدار عملاً حکومت کے ہاتھوں سے نکل کر سرمایہ داروں کے ہاتھ میں منتقل ہوگیا۔ چرچ کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ اقتدارِ وقت کا کاسہ لیس بن کر رہے اور وہ سرمایہ دار کیمپ سے جا ملا۔

بہرحال چرچ کے تمام افراد کو مطعون قرار دینا صریح ظلم ہوگا۔ ان میں مفاد پرست بھی ہیں جو ہمیشہ طاقت و اقتدار کے مرکز سے وابستہ رہتے اور مذہب کو، محنت کش عوام کو جمود و غفلت میں مبتلا رکھنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کو اپنے حقوق کی خاطر جد و جہد کرنے اور دنیا میں انصاف چاہنے سے روک کر یہ لوگ اُن کو صرف آخرت کے اچھے بدلے کی تمناؤں سے بہلاتے رہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی اُن میں ایسے افراد بھی لازماً رہے ہوں گے جو پُورے خلوص کے ساتھ اس بات کی تلقین کرتے ہوں۔ کیونکہ یہی اُن کے اس مسیحی عقیدہ کے مطابق تھا جو چرچ نے مرتب کیا تھا۔ یہ مسیحیت اصلاً زہد، ظاہری زندگی سے بے رغبتی، پروردگار کی جانب توجہ اور اس دنیا اور عالمِ بالا کے درمیان کامل تفریق پر مبنی ہے۔

بہرحال جب محنت کش طبقات نے جو اب اپنے حقوق کی خاطر ٹکر لینے پر آمادہ تھے، یہ محسوس کیا کہ مذہب اس کش مکش میں اُن کا ساتھ نہیں دے سکتا بلکہ چرچ اسے اپنا آلۂ کار بنائے ہوئے ہے تو انھوں نے مذہب کے خلاف کھلم کھلا اعلان بغاوت کر دیا اور اسے عوام کے لیے "افیون" قرار دیا۔ مادّیت کے یہ مبلغ چرچ کے سلسلہ میں یہ موقف اختیار کرتے وقت مخلص رہے ہوں یا نہ رہے ہوں، واقعہ یہی ہے کہ چرچ محنت کشوں کی صف میں نہیں بلکہ دوسری صف میں شامل تھا۔ اس طرح مذہب اور کیمونزم کے درمیان علانیہ دشمنی کا آغاز ہوا۔[1]

---

[1] ساتھ ہی ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ فری میسن تحریک کی طرح اشتراکیت بھی ایک یہودی تنظیم ہے۔ اور غیر یہودی دنیا کی تخریب کے سلسلہ میں یہودیت کے منصوبہ کا پہلا قدم اسے دین سے محروم کرنا اور اُسے تعمیرِ حیات کے اس بنیادی اصول سے برگشتہ کر دینا ہے۔

لیکن ہم سے ان باتوں کا کیا تعلق، جب کہ ہماری تاریخ اور اسلام کا مزاج دونوں اسطرح کی باتوں سے کوسوں دور رہے ہیں! اسلام ایک آزاد ملک میں پروان چڑھا، جن پر کسی شہنشاہ یا کسی ایمپائر کا تسلّط نہیں تھا۔ اس کی نشوونما ایک قبائلی بدوی معاشرہ میں ہوئی جس میں رومن ایمپائر کی طرح کے قوانین اور ادارے نہیں پائے جاتے تھے۔ یہ اس دین کی ابتدائی نشوونما کے لیے سازگار زرین حالات تھے، کیوں کہ اسے بلا کسی حقیقی رکاوٹ کے وہ معاشرہ برپا کرنے کا موقع ملا جو یہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس معاشرہ کی تنظیم کے لیے قانون سازی اور اس کی نشوونما و ارتقاء کے لیے مختلف تدابیر کو روبکار لانا یہ سب پوری طرح اس کے ہاتھ میں رہا۔ اس کو اس بات کا موقع ملا کہ انسان کے قلب اور ضمیر اور اس کے معاملاتِ زندگی دونوں پر بیک وقت چھایا رہے اور اپنی قانون سازی اور ہدایات میں دین و دنیا دونوں کو سامنے رکھے۔ چنانچہ اسلام نے انسان کے عالمِ نفسی میں ارضی و سماوی دونوں جہانوں کو جمع کر دیا۔ وہ فرد کے ضمیر اور جماعت کی عملی زندگی دونوں کی روح رواں بن کر رہا۔ اس کے نظام میں عملی سرگرمیاں کبھی بھی اس دینی حس سے جدا نہیں ہوئیں جو برائیوں کے خلاف سب سے بڑی روک ہے۔ چاہے وہ کتنے نت نئے روپ دھارے اور اچھوتے پیرایہ میں سامنے آئے لیکن اس کا اصل جوہر ہمیشہ اپنی صحیح شکل میں باقی رہتا ہے اور کبھی رنگ نہیں بدلتا۔

اسلام جس کا اوّلین کام پوری انسانی زندگی کی ایک جدید تشکیل ہے، عملی زندگی سے کنارہ کش ہو کر وجدان میں گوشہ گیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی طرح وہ اپنے تاریخی ارتقاء میں بھی ایک لمحہ کے لیے اس پر نہیں مجبور ہوا کہ کسی بادشاہ یا سامراج کے خوف سے اپنا دائرۂ عمل محدود کر لے۔ وہ ہمیشہ اپنا فرماں روا آپ رہا۔ یہاں تک کہ اس دور میں بھی جب جاہلیتِ عرب اس سے نبرد آزما تھی۔ کیونکہ یہ جاہلیت گہری جڑیں رکھنے والی سماجی روایات اور اس طرح کے مستحکم اجتماعی نظام سے محروم تھی جس طرح کے اجتماعی نظام سے مسیحیت کو اپنے ابتدائی دور میں سابقہ پڑا تھا۔ اسلام کا میدانِ عمل پوری انسانی زندگی ہے۔ روحانی بھی اور مادّی بھی، دینی بھی اور دنیوی بھی۔ وہ موزوں زرین فضا میں پروان چڑھا اور اُسے اپنے مزاج کا پوری طرح مظاہرہ کرنے کا موقع ملا اور پہلے ہی دن سے اس کی حقیقت کو عمل کے جامہ میں دیکھا گیا۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ اسے اپنی پیغام بری کس کے سپرد کرنی چاہیے۔ اس دین کے لیے جسے آخر زمانہ تک رہنا ہے۔ اللہ کی تقدیر یہ ہوئی کہ روزِ اوّل

ہی سے بغیر کسی رکاوٹ کے پوری طرح نافذ ہو، تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے اس کی مکمل تصویر بغیر کسی آمیزش اور ابہام کے باقی رہے۔

سماج سے کٹ کر یہ دین اپنا صحیح مزاج برقرار ہی نہیں رکھ سکتا، خواہ اس سماج کے افراد ایسے "مسلمان" ہی کیوں نہ ہوں جو اپنے اجتماعی، اقتصادی اور قانونی نظام میں اسلام کو حکم نہ بناتے ہوں۔ جن لوگوں نے اسلامی احکام کو اپنے اجتماعی نظم اور قوانین سے دور رکھا ہو اور صرف عبادات و مراسم کی حد تک اس سے تعلق رکھتے ہوں اُن کا سماج کبھی اسلامی سماج نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ اسلام یہی ہے کہ بندگی صرف خدائے واحد کی ہو اور اُلوہیت کی جملہ صفات صرف اسی کے لیے مخصوص سمجھی جائیں۔ جیسا کہ آئندہ تفصیل سے بیان کیا جائے گا، ان صفات میں اولین صفت حاکمیت ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا
فِىٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ٥

(نساء: ۶۵)

"نہیں، اے محمدؐ! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی صاحب ایمان نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اُس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں اور سر بسر تسلیم کر لیں۔"

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ج

(حشر: ۷)

"جو کچھ تم کو رسول دے اُسے مان لو، اور جس چیز سے بھی وہ روکے رُک جائے۔"

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ (مائدہ:۴۴)

"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔"

اس پالیسی کی تعیین میں جو چیز فیصلہ کن رہی ہے وہ اس دین کا ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہونا ہے۔ اس کے عبادات و معاملات، اس کے قوانین اور اس کی ہدایات، سب مل کر ایک کُل بناتے جو ناقابل تجزیہ ہے۔ یہاں مراسم عبودیت مزاج اور مقاصد کے اعتبار سے معاملات زندگی اور

نظامِ حیات سے جدا نہیں۔ چنانچہ نماز جو اہم ترین عبادات میں سے ہے، جہاں اس کا منشاء یہ ہے کہ فرد و جماعت دونوں ایک صاحبِ قدرت و جبروت اللہ کی طرف متوجہ ہوں، صرف اسی کے آگے سب کی گردنیں جھکیں اور یکسو ہو کر ہر طرح کی کجی اور بے راہ روی سے بچتے ہوئے سب ایک ہی قبلہ کی طرف متوجہ ہوں، وہیں ایک طرح کی مساوات اور ایک جزا و سزا کا اختیار رکھنے والی ہستی کی نظر میں برابری کا احساس دلانا بھی اس کا منشاء ہے۔ سب اس کے بندے ہیں اور سب اس کے آگے برابر ہیں۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا اہم ترین عقیدہ بھی ضمیرِ انسانی کو بندوں کی بندگی کے ہر شائبہ سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی آزادیٔ ضمیر ایک صالح اور پاکیزہ سماج کی تعمیر میں پہلا قدم ہے، ایسا سماج جس میں سب کا درجہ مساوی ہو۔

اس دین کا مطالعہ کرنے والے کو اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اجتماعیت اس کے مذہبی آداب و مراسم اور نظامِ زندگی دونوں میں سرایت کیے ہوئے ہے، یہ ایک طاقتور بنیادی فکر بن کر اس کے پورے نظام میں جاری و ساری ہے۔ اب اگر کسی دور میں لوگ عبادات کے پہلو پر زیادہ زور دینے لگیں اور دین کو اجتماعی زندگی سے یا اجتماعی زندگی کو دین سے کاٹ کر علیحدہ کرنا چاہیں تو یہ اس دور کی آفت ہے نہ کہ اس دین کی کمزوری۔ [1]

اسلام کے بارے میں ہماری یہ رائے اپنی گھڑی ہوئی نہیں اور نہ یہ کوئی نئی تاویل ہے۔ یہ وہی اسلام ہے اور اسی طرح سے پیش کیا جا رہا ہے جس طرح کہ اُسے اس کے اوّلین حامل محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا اور سمجھایا تھا۔ اسلام کے اصل منبع سے قریب رہنے والے مخلصین صحابۂ کرامؓ نے بھی یہی سمجھا تھا۔

---

[1] اسلام میں عبادت شعائرِ مذہبی، قوانین اور جملہ انسانی سرگرمیاں اور اعمال پر حاوی ہے۔ لیکن فقہ کی کتابوں میں، عبادات، کی اصطلاح مذہبی شعائر سے متعلق احکام کے لیے استعمال ہونے لگی اور، معاملات، کی اصطلاح دوسرے قوانین و احکام کے لیے، جب کہ اسلام ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہے۔ ملاحظہ ہو ہماری کتاب "خصائص التصور الاسلامی ومقوماتہ" کا باب "الشمول"۔

قرآن کریم فرماتا ہے :-

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ : ۹-۱۰)

"اے ایمان لانے والو! جمعہ کے دن جب نماز کے لیے پکارا جائے تو کاروبار ترک کر کے اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو - یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے اگر تم واقعی علم رکھتے ہو - جب نماز ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو"

ہر شخص جانتا ہے کہ فرض نماز دن بھر میں کتنا وقت گھیرتی ہے - اس کے بعد جو وقت بچتا ہے وہ سعی و عمل اور رہِ حیات میں جدوجہد کے لیے فارغ ہے - پوری زندگی میں نماز کتنا تھوڑا سا وقت لیتی ہے! رات دن کے بقیہ سارے ہی اوقات سماج اور عملی زندگی کے تقاضے پورا کرنے کے لیے خالی ہیں -

قرآن ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے :

وَّجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا ۙ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝

(النبا : ۱۰-۱۱)

"ہم نے شب کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا موقع قرار دیا"

اس لیے کہ دن میں زیادہ تر وقت معاش میں صرف ہوتا ہے نہ کہ فرض عبادات میں!

اسلام میں عبادات محض مراسم بجالانے کا نام نہیں - عبادت یہ ہے کہ پوری زندگی اللہ کے قانون کی تابع ہو اور اپنی ساری سرگرمیوں کے ساتھ خدا ہی کی طرف متوجہ ہو - چنانچہ ہر اجتماعی خدمت اور ہر بھلا کام عبادت ہے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

الساعی علی الارملة و المسکین کالمجاهد فی سبیل اللّٰه او القائم اللیل، الصائم النهار - (مسلم - بخاری - ترمذی)

"غریبوں اور بیواؤں کی خدمت کرنے والا وہی درجہ رکھتا ہے جو اللہ کی راہ

میں جہاد کرنے والے کا یا رات بھر نماز پڑھنے اور دن بھر روزہ رکھنے والے کا ہے۔"

اسلام کی روح صاحبِ اسلام ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ کے فہم کے مطابق کیا تھی، ذیل کے دو واقعے اس طرف رہنمائی کرتے ہیں:

حضرت انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر میں تھے۔ کچھ لوگ روزہ سے تھے۔ اور کچھ لوگ روزہ سے نہیں تھے۔" ان کا کہنا ہے کہ "اس حال میں ہم نے ایک سخت گرمی والے دن ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ ہم میں سے سب سے زیادہ سایہ اُس کو میسّر تھا جس کے پاس چادر تھی۔ ورنہ بعض لوگ تو ہاتھوں ہی کے ذریعہ دھوپ سے بچاؤ کی کوشش کر رہے تھے۔" پھر وہ کہتے ہیں کہ "اب روزہ دار لوگ تو آرام کرنے لگے، اور جو روزے سے نہیں تھے انہوں نے اٹھ کر خیمے نصب کیے اور سواری کے جانوروں کو پانی پلایا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آج سارا اجر وہ لوگ لے گئے جو روزے سے نہیں تھے۔"[1]

حضرت انسؓ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ تین آدمی ازواجِ مطہراتؓ کے گھروں پر اُن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت گذاری کا حال معلوم کرنے آئے۔ جب انھیں صورت حال بتائی گئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اس کو اپنے اندازہ سے بہت کم پایا۔ وہ بولے: "کہاں ہم کہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ کے تو اگلے اور پچھلے سارے گناہ معاف کیے جا چکے ہیں۔" ایک نے کہا: "میں تو راتیں نماز میں گزاروں گا۔" دوسرا بولا: "میں مسلسل روزے رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہیں کرونگا۔" تیسرے صاحب نے کہا: "میں عورتوں سے الگ تھلگ رہوں گا۔ اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔" اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف تشریف لائے اور فرمایا: "تم ہی لوگ ہو جنہوں نے ایسا ایسا خیال ظاہر کیا ہے۔؟ خدا کی قسم! میں تقویٰ اور اللہ سے ڈرنے کے معاملہ میں تم سے کہیں آگے ہوں، لیکن میں روزے بھی رکھتا ہوں اور بغیر روزے بھی کچھ دن گزارتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ اب جو شخص میری سنت سے علیحدہ کوئی روش اختیار کرے اس کو مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔"[2]

---

[1] یہ حدیث صحاحِ ستّہ سے منقول ہے۔

[2] مسلم۔ بخاری۔ نسائی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لائے ہوئے دین کو خوب اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ اُن کا یہ ارشاد فرمانا کسی طرح بھی نماز روزے کی اہمیت نہیں گھٹاتا بلکہ اس دین کے اصل مزاج کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ وہ دین ہے جو عقیدہ کے تقاضے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ عملی زندگی کے تقاضے بھی پورا کرتا ہے۔ اور عقیدہ کو عملی زندگی کی رگ رگ میں اتار دیتا ہے۔ وہ عقیدہ کو لے کر ضمیر کی خلوت میں گوشہ گیر نہیں ہوجاتا۔

ذیل کے دو واقعے گواہ ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بھی دین کو ایسا ہی سمجھا تھا۔ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ تقشف اور عبادت و ریاضت میں گھلے جانے کا مظاہرہ کررہا ہے۔ آپ نے اُسے ایک درّہ رسید کیا اور فرمایا: "اللہ تیرا برا کرے، ہمارے دین کو مردہ بنا کر نہ پیش کر۔"

اسی طرح ایک بار ایک شخص آپ کے پاس گواہ کی حیثیت میں آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ کسی ایسے شخص کو بلاؤ جو تم کو جانتا ہو۔ چنانچہ وہ ایک شخص کو بلا لایا جس نے آکر اس کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے دریافت کیا: "کیا تم اس کے قریبی پڑوسی ہو اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے اچھی طرح واقف ہو؟" اس نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے کہا: "تو پھر کیا تم سفر میں اس کے ساتھ رہ چکے ہو، کہ سفر میں کسی کی اخلاقی حالت کا بآسانی اندازہ ہوجاتا ہے؟" اس کا جواب بھی نفی میں تھا۔ آپ نے فرمایا: "کیا تم نے اس شخص کے ساتھ درہم و دینار کا معاملہ کیا ہے، کیونکہ اس معاملہ میں انسان کے ورع و تقویٰ کی حقیقت کھل جاتی ہے؟" اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ اب آپ نے فرمایا: "تب میرا خیال ہے کہ تم نے اُسے مسجد میں کھڑے قرآن پڑھتے، کبھی سر جھکاتے اور کبھی اوپر اٹھاتے دیکھا ہے؟" اس نے اقرار کیا۔ آپ نے کہا: "چلے جاؤ، تم اس کو خاک نہیں جانتے" اور اس آدمی کو حکم دیا کہ پھر جائے اور کسی ایسے شخص کو لائے جو اُسے واقعی جانتا ہو۔

اوپر ہم نبی کریمؐ کا تصورِ دین سامنے لا چکے ہیں اور حضرت عمرؓ کا فہم بھی سامنے ہے، یہی اس دین کی حقیقت کا صحیح فہم اور عبادت و سلوک، قلب و ضمیر میں چھپے ہوئے عقیدہ اور نظروں کے سامنے آنے والے ظاہری اعمال کے بارے میں اس کی صحیح رائے ہے۔

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص: ۷۷)

"اللہ نے تجھے جو کچھ عطا کیا ہے اس کے ذریعہ آخرت (کی بھلائی) طلب کر اور دنیا میں سے تیرا جو حصہ ہے اس سے بھی غافل نہ ہو۔"

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا ط۔

(الحج: ۴۰)

"اللہ اگر بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے ہاتھوں مٹاتا نہ رہتا تو صومعے، معابد اور مساجد، جن میں اللہ کا خوب ذکر ہوا کرتا ہے سب ڈھا دیے گئے ہوتے۔"

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ٥ (البقرہ: ۱۹۰)

"اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر زیادتی نہ کرو اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ ج وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ج وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوا وَالصّٰبِرِينَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِينَ الْبَاْسِ ط (البقرہ: ۱۷۷)

"نیکی یہ نہیں کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر کو، ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے، نیک لوگ وہ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و

مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔"

من رائی منکم منکراً فلیغیرہ .... (مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی)۔

"تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے اس کے ازالہ کی کوشش اس پر لازم ہے۔.."

یہ ہے اعتقاد و عمل کے بارے میں اسلام کا اصل نقطۂ نظر ـــــ یہاں دین و دنیا اور عقیدہ و سماج کے مابین اس مسیحیت کی طرح کی کوئی خلیج نہیں حائل ہے جسے مقدس کانفرنسوں نے ایک مخصوص شکل دے دی تھی۔

اسلام میں نہ تو پجاریوں اور پادریوں کا کوئی نظام ہے نہ یہ صرف خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ کا نام ہے۔ زمین کے کسی گوشہ میں بسنے والا، یا سمندر کی لہروں پر سفر کرتا ہوا کوئی مسلمان تنِ تنہا خود، پروہت یا پادری کے واسطہ کے بغیر، اپنے رب سے تعلق جوڑ سکتا ہے اسلامی نظام میں حکمراں اپنا اقتدار نہ تو کسی نظام پاپائیت سے حاصل کرتا ہے، نہ براہ راست خدا سے۔ اس کے اقتدار و اختیار کا منبع "اسلامی جماعت" ہے۔ اسی طرح اس کے احکام و قوانین کا منبع شریعت ہے جس کے فہم و تطبیق میں سب برابر ہیں اور سب یکساں طور پر اس کو اپیل کر سکتے ہیں۔

اسلام میں ان معنیٰ میں مذہبی پیشواؤں کا وجود نہیں جن معنیٰ میں یہ اصطلاح ان مذاہب میں معروف ہے جن کے نزدیک مراسم عبودیت مذہبی پیشواؤں کے بغیر نہیں ادا کی جاسکتی۔ اسلام میں صرف دین کا علم رکھنے والے پائے جاتے ہیں۔ اس دین کے عالم کو بھی عام مسلمانوں پر کوئی مخصوص اقتدار نہیں عطا کیا گیا ہے۔ ان کے حکمرانوں کو بھی صرف اتنا اختیار دیا گیا ہے کہ اُن پر وہ شریعت نافذ کریں جس کے بنانے والے یہ حکمراں نہیں بلکہ جسے اللہ تعالیٰ نے پورے سماج پر فرض کیا ہے۔ جہاں تک آخرت کا سوال ہے ہر ایک کو اسی خدائے واحد کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ٥ (مریم: ۹۵)

"ہر ایک کو قیامت کے دن اللہ کے حضور تنہا ہی حاضر ہونا ہے۔"

عوام پر اثر و اقتدار یا اُن کے مال و دولت کے سلسلہ میں مذہبی طبقات اور ارباب حکومت کے درمیان کسی کشمکش کا سوال نہیں، یہاں کوئی مادّی یا غیر مادّی مفادات ایسے ہیں ہی نہیں

کر ان کے سلسلہ میں ان کو کش مکش کرنی پڑی۔ یہاں سیکولر اقتدار اور مذہبی و روحانی اقتدار کی ایسی تقسیم ہی نہیں جس کے باعث کش مکش کی نوبت آئے جیسا کہ پاپاؤں اور بادشاہوں کے درمیان ہوتا رہا ہے۔

اسلام نہ تو علم کا دشمن ہے نہ علماء کا بلکہ معرفتِ خداوندی کی طرف لے جانے والے ہر علم کو ـــ اور ہر صحیح علم اسی مقصد کی طرف لے جاتا ہے ـــ ایک مقدس فریضہ قرار دے کر دینی کام بنا دیتا ہے۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ۔ (ابن ماجہ)

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔"

مَنْ سَلَكَ سَبِيْلًا يَّطْلُبُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ۔ (مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی)۔

"جس نے طلبِ علم کی خاطر کوئی راستہ طے کیا۔ اللہ اس کے لیے جنت کی راہ آسان کرے گا۔"

تاریخ اسلامی اہلِ فکر و نظر پر اس طرح کے منظم اور نا معقول مظالم اور سخت سزاؤں سے بھی نا آشنا ہے جو یورپ کی تحقیقاتی عدالتوں Inquisitions کا شعار رہا ہے۔

ایسے واقعات کہ کچھ افراد کو ان کے مخصوص فکر کی بنا پر سزا دی گئی ہے اسلامی تاریخ میں معدودے چند ہیں۔ اور وہ بھی اتفاقات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ان واقعات کا کوئی خاص سیاسی پس منظر رہا ہے ـــ یا کسی گروہی تعصب یا نزاع نے ان کو جنم دیا ہے۔ اسلامی زندگی کے عام مزاج سے یہ بات ہمیشہ دور رہی ہے اور ایسے افراد اس کے مرتکب ہوئے ہیں جن کو اسلام کا صحیح فہم بھی حاصل نہیں تھا۔

جس دین نے صرف معجزات و خوارق پر نہ بھروسہ کر لیا ہو اور جو محض غیب کی باتوں پر نہ قائم ہو بلکہ کائنات میں چار سُو بکھری ہوئی آیات کے مشاہدہ اور اُن پر غور و فکر کو اپنی اساس قرار دیتا ہو۔ اس سے اسی مزاج کی توقع کی جا سکتی تھی۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ

وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ
السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ
دَآبَّۃٍ ص وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ہ (البقرہ: ۱۶۴)

"جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اس انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے۔ ہواؤں کی گردش میں، اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابعِ فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں۔"

یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَیُحْیِ الْاَرْضَ
بَعْدَ مَوْتِھَا ط وَکَذٰلِکَ تُخْرَجُوْنَ ہ وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ
تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ہ وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ
مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ہ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ
لِّلْعٰلِمِیْنَ ہ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَابْتِغَآؤُکُمْ مِّنْ
فَضْلِہٖ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ہ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ
خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا ط
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ہ (الروم: ۱۹ تا ۲۴)

"وہ مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے، اور زمین کو مردہ (خشک اور بنجر) ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندگی بخشتا ہے اسی طرح تم بھی (دوبارہ) نکالے

جاؤ گے۔ اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر تم ہر چہار طرف پھیلے ہوئے انسان بن گئے۔ اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تمہارے لیے تمہاری ہی طرح کے جوڑے بنا دیے تاکہ ان کے پاس جاکر سکون حاصل کر سکو۔ نیز اس نے تمہارے درمیان (فطری طور پر) محبت اور رشتہ رکھا۔ ان باتوں میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں۔ آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق اور تمہارے رنگوں اور تمہاری بولیوں کا فرق بھی اسی کی (قدرت کی) نشانی ہے۔ سوچنے سمجھنے والوں کے لیے ان باتوں میں کافی اشارے موجود ہیں۔ تمہارا رات اور دن میں سونا اور اس کے فضل کی تلاش کرنا بھی اس کی ایک نشانی ہے ان باتوں میں سننے والوں کے لیے متعدد علامتیں موجود ہیں۔ اسی کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ تمہیں بجلی دکھاتا ہے تم خوف اور امید (کے ملے جلے جذبات) کے ساتھ دیکھتے ہو۔ وہی آسمان سے پانی اتارتا ہے اور اس سے زمین کو زندہ کرتا ہے بعد اس کے کہ اس پر مردنی چھا چکی تھی۔ ان چیزوں میں سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں۔"

ایک ایسے دین کی پالیسی یہی ہو سکتی تھی جو علم و تقویٰ کے درمیان علت اور معلول کا رشتہ بتاتا ہو اور علم کو معرفتِ خداوندی اور خشیتِ الٰہی کا ذریعہ قرار دیتا ہو۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر: ۲۸)

"اللہ سے کما حقہٗ خشیت اس کے بندوں میں سے اصحابِ علم ہی کرتے ہیں۔"

جو اہلِ علم کو جاہلوں سے برتر گردانتا ہو۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ط (زمر: ۹)

"کہو کیا اہلِ علم اور علم سے بے بہرہ لوگ برابر ہو سکتے ہیں۔؟"

فضل العالم علیٰ العابد کفضل القمر علیٰ سائر الکواکب۔

(ابو داؤد۔ ترمذی۔ ابن حبان۔ بیہقی)۔

"صاحبِ علم کا مرتبہ عبادت گزار سے اتنا ہی بلند ہے جتنا چاند کا دوسرے ستاروں سے۔"

لہٰذا اسلام اور اس علم صحیح کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں جو کائنات اور نفسِ انسانی میں اللہ کی نشانیوں کے مطالعہ کی راہ سے معرفتِ حق کی طرف لے جاتا ہو۔ اسلام کے مزاج یا اس کی عملی تاریخ میں دین اور ایسے علم کے درمیان اُس طرح کی دشمنی نہیں پائی جاتی جیسی کہ نشأۃ ثانیہ اور اس کے بعد کے زمانہ میں چرچ اور اہلِ سائنس کے درمیان پیدا ہوگئی تھی۔

رہی یہ بات کہ دینی طبقات[1] نے اربابِ اقتدار اور اہلِ دولت کا ساتھ دیا اور غریب محنت کش عوام کو خاموش کرنے اور غافل رکھنے کے لیے مذہب کو آلۂ کار بنایا تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلامی تاریخ کے بعض ادوار میں ایسا ہوا ہے۔ لیکن دین کی حقیقی روح ان لوگوں کو یہ موقف اختیار کرنے پر ملامت کرتی ہے۔ مادی مفادات کی خاطر اللہ کی آیات کی اس تجارت پر دین ان کو سخت سزا اور دردناک عذاب کی دھمکی دیتا ہے۔ ان لوگوں کے پہلو بہ پہلو تاریخ ایک بالکل دوسرے کردار کے حامل دین داروں کو بھی سامنے لاتی ہے۔ کسی کی لعنت ملامت ان کو حق بات کے اعلان سے نہ روک سکی۔ انھوں نے حق اللہ اور فقراء و مساکین کے حقوق کی حمایت میں سرمایہ داروں اور اربابِ اقتدار سے ٹکر لی۔ حق داروں میں یہ احساس ابھارا کہ ان کو اپنے حق کے لیے جدوجہد کرنی ہے اور اس کے نتیجہ میں حکومتوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنے۔ بسا اوقات تو ان کو سخت سزائیں بھی جھیلنی پڑیں اور جلاوطنی اختیار کرنی پڑی۔

اسلام کا مخصوص مزاج اور اس کی تاریخ دونوں میں سے کوئی بھی اس دین کو سماج سے علیٰحدہ رکھنے کے لیے کوئی وجہ جواز فراہم نہیں کرتا۔ یہاں ان اسباب میں سے کوئی سبب بھی موجود نہیں جو یورپ میں مسیحیت سے وابستہ ہوگئے اور جن کے نتیجہ میں مسیحیت نے دین کو دنیا سے کنارہ کش

---

[1] ہم دینی طبقات (رجال الدین) اور علماء دین کو دو الگ الگ اصطلاحیں سمجھتے ہیں بعض ادوار میں اربابِ اقتدار کوشش کرتے ہیں کہ اسلام میں ایک مخصوص دینی ادارہ قائم کرکے ایسے حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے اور اربابِ اقتدار کے حق میں فتویٰ دینے نیز ان کے افعال و اقوال اور اُن طریقوں کی تائید کرانے کے لیے استعمال کریں جن کی دین میں کوئی سند نہیں۔ یہ ادارے کلیسا کے Ecclasiastic طبقہ کی مانند ہیں جن کا اسلام میں کوئی مقام نہیں۔

کر لیا۔ دین کو صفائے باطن اور تطہیرِ نفس تک محدود رکھا اور سماجی زندگی کی باگ ڈور خود ساختہ قوانین کے حوالہ کر دی۔ اس طرح کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی طریقہ کار اور شریعتِ اسلامی کے دائرہ میں رہتے ہوئے، اسلام اور اجتماعی عدل کے قیام کی جدوجہد میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے۔

عیسائیت اور اشتراکیت کی کش مکش میں ایسے اسباب ضرور کارفرما تھے۔ مگر اسلام تو خود اجتماعی عدل کے لیے اصول وضوابط تجویز کرتا ہے، مال داروں کی دولت میں فقراء کا حق متعین کرتا ہے اور حکومت واقتصاد کے لیے عدل وانصاف پر مبنی نظام دیتا ہے۔ نہ اس نے عوام کو پنک میں مبتلا کیا۔ اور نہ انھیں یہ تعلیم دی کہ دنیا میں اپنے حقوق سے دستبردار ہو کر صرف عقبیٰ میں ان کی بازیافت کے متوقع رہیں۔ برعکس اس کے اسلام نے اپنے فطری حقوق سے یوں ہی دست بردار ہو جانے والوں کو، خواہ وہ کسی دباؤ کے تحت ہی ایسا کریں، آخرت میں عذابِ شدید کی دھمکی دی اور آپ اپنے اوپر ظلم کرنے والا قرار دیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ ط قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ط قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا ط فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ ط وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۙ

(نساء : ۹۷)

"جو لوگ اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو اُن سے پوچھا کہ تم یہ کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔"

ایسے لوگوں کو وہ اپنے حقوق کے لیے جنگ کرنے پر اکساتا ہے:۔

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَظْلَمَۃٍ فَھُوَ شَھِیْدٌ (نسائی)

"جو کوئی اپنے اوپر کیے جانے والے کسی ظلم سے بچاؤ کرتا ہوا مارا جائے وہ شہید ہے۔"

اب اگر یورپ مذہب کو عملی زندگی سے دُور رکھنے پر مجبور ہوا تو ہم کو اس معاملہ میں اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر اشتراکیت مزدوروں کے تحفظ کے لیے مذہب دشمنی

پر مجبور ہوئی تو ہم اس ضرورت سے بھی بے نیاز ہیں۔

لیکن بعض لوگ، جن میں ایسے حضرات بھی شامل ہیں جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور مسلمانوں جیسے نام رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ:

اس کی کیا ضمانت کہ جس نظام کو اسلام نے ایک خاص دور میں قائم کیا تھا، اس میں نشوونما کی، اور نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہے۔؟ کیا یہ اس قابل ہوسکتا ہے کہ تاریخ کے ایک دوسرے دور میں بھی کامیابی کے ساتھ چل سکے، جب کہ یہ دور اپنے حالات اور اپنی سماجی اقدار کے اعتبار سے اسلام کے ظہور و عروج کے زمانہ سے بہت کچھ مختلف واقع ہوا ہے؟ اگرچہ یہ پوری کتاب اسی قسم کے سوالات کا جواب ہے۔ لیکن یہاں ہم اختصار کے ساتھ چند باتیں پیش کریں گے۔

اسلام اُسی ذات کا مرتب کیا ہوا طریقۂ زندگی ہے جس نے اس کائنات کو اور اس میں جاری قوانین کو بنایا ہے، جو اُس میں ہونے والی تبدیلیوں اور رونما ہونے والے نئے حالات سے بخوبی واقف ہے۔ یہ تاریخی تبدیلیاں اُسے معلوم تھیں، اور یہ بھی معلوم تھا کہ ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں معاشرت و معیشت اور نظریات و افکار کی دنیا میں کیا تبدیلیاں ہوں گی۔ اس نے بنیادی اصول متعین کر دیے ہیں اور ایک اصولی خاکہ مرتب کر دیا ہے۔ رہا ان اصولوں کا عملی انطباق تو یہ تغیراتِ زمانہ اور ضروریات و مصالح کے حوالے ہے۔ یہ کام مقررہ اصولوں اور متعین حدود کے اندر انجام پاتا رہے گا۔ جزئی اور تفصیلی قوانین زندگی کے صرف ان شعبوں کے لیے دیے گئے ہیں جو ان تبدیلیوں سے بنیادی طور پر متاثر نہیں ہوتے۔ ان امور کی حد تک اسلامی قوانین ہر زمانہ اور ہر ماحول میں پوری افادیت اور موزونیت کے ساتھ قابلِ عمل رہتے ہیں۔ اپنی جامعیت اور لچک کے سبب اسلامی قوانین زمانہ کی ترقی کے ساتھ نمو اور تجدد کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس دین کے علماءِ قانون نے قیاس و تفریع اور قوانین کو عملی حالات پر منطبق کرنے کے سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس وقت سماج پر اسلامی قوانین کی حکمرانی تھی اور انہی فقہاء کی کوششوں کی بدولت اسلامی احکام سماج کے نت نئے مسائل کا پوری طرح ساتھ دیتے رہے۔ پھر ایک طویل عرصہ تک یہ کام معطل رہا۔ چنانچہ فقہ اسلامی کا نشوونما اسی مقام پر

رُک گیا۔اب اس صدی کے آغاز میں سارے عالم اسلامی میں زندگی کی نئی لہریں نمودار ہوئی ہیں اوران کے پہلو بہ پہلو اسلامی قانون میں بھی از سر نوجان پیدا ہورہی ہے۔

اس صورتِ حال کا علاج یہ نہیں کہ شریعت سے ماخوذ اسلامی قوانین کی تدوین کے چھوٹے ہوئے سلسلہ کو از سرِ نو شروع کرنے سے قبل ہم فرانسیسی قوانین سے اپنی قانون سازی میں رہنمائی حاصل کرنے لگیں یا اشتراکی نظریات سے اپنا اجتماعی نظام اخذ کرلیں۔جن قوانین کی اساس پر ماضی میں ہماری سماجی زندگی قائم تھی۔اب جدید سوسائٹی کی تشکیل وتعمیر میں ان کی صلاحیت و افادیت سے مایوس ہوئے بغیر مذہب کو محض عبادات تک محدود کردینا بڑی زیادتی ہوگی۔حقیقت یہ ہے کہ کسی ماحول کے لیے وہی نظام موزوں ہوتا ہے جس نے خود اسی ماحول کے اندر فطری طور پر ارتقاء کے مراحل طے کیے ہوں۔کسی اجنبی ماحول کے نظام کو،جس نے اس مخصوص فضا میں ارتقا کے فطری مراحل نہ طے کیے ہوں،لاکر اس پر مسلط کر دینا کبھی سازگار نہیں ہوسکتا۔ہمارا دعوائے اسلام ہم سے جو تقاضا کرتا ہے اس پر یہ باتیں مستزاد ہیں۔اس دعویٰ کی بنیاد یہی تو ہے کہ ہم خدائے واحد ہی کو الٰہ تسلیم کرکے اس کی بندگی اختیار کرتے ہیں۔اللہ ہی کو الٰہ مان کر اُسی کی بندگی اختیار کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ اللہ کی شریعت کو حکمراں بنایا جائے۔ایسا کرنا نہ صرف اس دین کی حقیقت سے ناواقف ہونے بلکہ خود انسانی زندگی اور انسانی سماج کی نفسیات سے جہالت کا ثبوت ہے یہ اندھی تقلید ہے تفریقِ دین و دنیا کے اس رُجحان کی،جو سراسر یورپ کا پروردہ ہے۔یورپ والوں کے دین کا مزاج خود اُن سے تفریق کا مطالبہ کرتا ہے جبکہ اسلام کا مزاج اس سے کوسوں دور ہے۔اُوپر ہم نے تاریخی تجزیہ کرکے واضح کیا ہے کہ ان کے یہاں مذہب وسائنس اور چرچ اور اسٹیٹ کے درمیان کش مکش کیوں ہوئی،اور کس طرح اسلامی تاریخ کا حال اس سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے۔ان کی مخصوص تاریخ تھی جس نے اس رجحان کو جنم دیا،ہمیں اس سے کیا واسطہ۔!

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم فکری،روحانی اور سماجی طور پر انسانیت کے قافلہ سے کٹ جانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ہرگز نہیں،اسلام اس طرح کی کنارہ کشی کا بالکل قائل نہیں اور ہو بھی کس طرح سکتا ہے۔جب وہ خود ایک عالم گیر پیغام کی حیثیت ہی سامنے آتا ہے ہم صرف اس پر زور دینا چاہتے ہیں کہ کسی کی تقلید سے پہلے ہمیں خود اپنے سرمایہ کا جائزہ لے لینا

چاہیے۔ ہمیں پہلے اپنے اصول کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس بات کا صحیح اندازہ لگانا چاہیے کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے اور ہمیشہ قابلِ عمل رہنے کی صلاحیت کس حد تک رکھتا ہے۔ ہماری روایات اور ہماری تاریخ کو اس طرح کی اندھی تقلید سے ذرا بھی مناسبت نہیں ہے۔ اس میں پھنس کر ہم اپنا امتیازی وجود کھو بیٹھیں گے۔ ہمیں مقلد بن کر انسانیت کے قافلہ میں پیچھے پیچھے چلنا ہوگا جبکہ ہمارا دین ہمیں آگے رہنے پر ابھارتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ١١٠)

"دنیا میں تم ہی وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔"

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (بقرہ: ١٤٣)

"اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک 'اُمتِ وسط' بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔"

یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ ہمارے ہی پاس وہ نسخۂ شفا ہے جو اس آفت کی ماری مصیبت زدہ اور خستہ حال دنیا کے درد کا درماں بن سکتا ہے۔ جسے یہ روحانیت سے عاری مادّی تہذیب چوتھائی صدی کے مختصر سے عرصہ میں دو عالم گیر جنگوں میں جھونک چکی ہے۔ جو اب بھی اسی گمراہی میں مست ایک تیسری عالم گیر جنگ کی طرف بڑھ رہی ہے جس سے اس کا سارا تمدن برباد ہو جانے کا خطرہ ہے۔

باب دوم

اسلام میں اجتماعی عدل کا مزاج

اسلام میں اجتماعی عدل کا مزاج

اسلام میں اجتماعی عدل کے مزاج سے ہم صحیح طور پر اسی وقت آشنا ہو سکتے ہیں جب اُلوہیت، کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں اسلامی فکر کو اجمالی طور پر سمجھ لیں۔ کیوں کہ اجتماعی عدل کا اسلامی نظریہ اسی اصول اور بنیادی فکر کی ایک فرع ہے جو اسلام کی تمام تعلیمات کا مرجع و منبع ہے۔

اسلام کے پیشِ نظر پوری انسانی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا کام تھا، اسلیے نہ تو اس کی اصلاحی کوششیں الل ٹپ رہی ہیں اور نہ اس نے ہر مسئلہ کے لیے الگ الگ علاج تجویز کیے ہیں۔ اس کے پاس اُلوہیت، کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں ایک جامع تصور اور مکمل نظریہ ہے۔ اس کی تمام فروع اور جزئیات اس نظریہ سے نکلی ہیں۔ اس کے نظریات و قوانین، اس کی متعین کردہ حدود، اور عبادات و معاملات کے باب میں اس کی ہدایات بھی اس اصل سے گہرا ربط رکھتی ہے۔ اسی جامع اور مکمل فکر کی روشنی میں اس کی عملی پالیسی بھی بنتی ہے۔ یہ طریقہ اسلامی مزاج کے بالکل منافی ہے کہ ہر نئی صورت حال کے لیے ایک نئی اور آزاد پالیسی وضع کرلی جائے۔ جو دوسرے امور میں اختیار کی ہوئی پالیسی سے کوئی ربط نہ رکھتی ہو، یا ہر مسئلہ کے لیے علیحدہ حل تلاش کیے جائیں۔

اس بنیادی فکر کا صحیح فہم ایک محقق کے لیے اسلامی اصول وضوابط کا سمجھنا آسان کردیتا ہے اس کی روشنی میں وہ بآسانی اسلام کے تفصیلی احکام کو اس کے **اصولوں** سے ہم آہنگ دیکھ سکتا ہے اسلامی طرزِ زندگی کا دلچسپی کے ساتھ گہرا مطالعہ بھی اس فہم کے بعد ہی ممکن ہے۔ اسی کے فیض سے محقق اس

نتیجہ تک پہونچ سکے گا کہ اسلام ایک ناقابلِ تقسیم کُل ہے جس کا ہر جز، دوسرے اجزاء سے گہرے طور پر مربوط ہے، اور حیاتِ انسانی کے لیے یہ نظام اسی وقت نفع بخش ہو سکتا ہے جب اسے پورا کا پورا اپنایا جائے۔

اسلام کا مطالعہ کرنے والے کے لیے صحیح ترتیب یہی ہے کہ سیاسیات و اقتصاد، یا افراد و اقوام کے باہمی تعلقات کے ضمن میں اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرنے سے پہلے اُلوہیت، کائنات حیات اور انسان کے بارے میں اسلام کا بنیادی فکر معلوم کر لے۔ اس لیے کہ یہ سب دراصل شاخیں ہیں جو اسی بنیادی فکر سے نکلی ہیں۔ اسے سمجھے بغیر ان کو پوری صحت اور گہرائی کے ساتھ سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

حقیقی اسلامی فکر ابنِ سینا، ابنِ رشد، فارابی یا ان جیسے دوسرے فلاسفہ کے یہاں نہیں ملے گا۔ جن کو دنیا "فلاسفۂ اسلام" کا نام دیتی ہے، ان کا فلسفہ یونانی فلسفہ کا چربہ ہے جو اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کے لیے بالکل اجنبی واقع ہوا ہے۔ اسلام کے پاس اپنا حقیقی اور مکمل فکر موجود ہے جو اس کے فکری مآخذ قرآن و حدیث، رسولِ خدا کی سیرتِ پاک اور آپ کے طرزِ عمل سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے جس بنیادی فکر سے اس کی بقیہ ساری تعلیمات ـــــ بشکل قوانین عبادات اور معاملات ـــــ نکلتی ہیں۔ اس کو پا لینے کے لیے یہ مآخذ ہر بالغ نظر محقق کے لیے کافی ہیں۔

اسلام نے خالق اور مخلوق، انسان، حیات، اور کائنات، انسان اور اس کی اپنی ذات فرد اور جماعت، فرد اور ریاست، بحیثیت مجموعی اقوامِ انسانی اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور مزاج سے بحث کی ہے۔ اس نے اس میں سے ہر ایک کے سلسلہ میں اپنے اصولی موقف اور تفصیلی نظریات کی بنیاد ایک جامع اور ہمہ گیر فکر پر رکھی ہے۔

اس بنیادی فکر پر تفصیلی گفتگو اس کتاب کا موضوع نہیں۔ یہ کام "اسلامی فکر کی خصوصیات اور اس کے اصول" نامی ایک علیحدہ کتاب میں کیا گیا ہے۔ یہاں ہم صرف اصولی اور اہم باتوں کی طرف اشارہ کریں گے تاکہ یہ اشارات اسلام میں اجتماعی عدل پر گفتگو کے لیے تمہید کا کام کر سکیں۔

انسانیت عرصۂ دراز تک کائنات اور خالقِ کائنات، اور کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں کسی جامع تصور تک نہ پہنچ سکی۔

جب بھی اللہ کے یہاں سے کوئی پیغام بر اس کے پاس یہ تصور لے کر آیا، کچھ لوگوں نے اُسے قبول کیا اور اکثر لوگ اس سے روگرداں رہے، پھر ساری کی ساری انسانیت اس سے روگرداں ہوگئی اور بگڑے ہوئے جاہلی تصورات کی طرف چلی گئی۔ پھر اسلام کامل ترین تصور اور جامع ترین شریعت ایک ساتھ لے کر آیا اور اس نے ان دونوں بنیادوں پر زندگی کا نظام قائم کیا جو اس تصور اور اس شریعت کا عملی مظاہرہ تھا۔

جہاں تک خالق اور مخلوق (کائنات، حیات اور انسان) کے مابین تعلق کا سوال ہے، اس کی اصل وہ ارادہ ہے جس سے بغیر کسی فصل اور واسطہ کے ساری مخلوقات پیدا ہوئی ہیں۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ٥

(یٰس: ۸۲)

"اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے" ہوجا "، بس وہ چیز ہوجاتی ہے۔"

خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی واسطہ حائل نہیں۔ نہ قوت کا واسطہ نہ مادہ کا، بلکہ مخلوقات اس کے ارادۂ مطلق کے براہِ راست نتیجہ کے طور پر بلا کسی تاخیر کے وجود میں آتی ہیں۔ اسی کے مطلق اور کامل ارادہ سے مخلوقات کا تحفظ، ان کا انتظام اور ان کی تدبیر وابستہ ہے۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ (الرعد: ۲)

"معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔ آیات کی تفصیل سامنے لاتا ہے۔"

يُمْسِكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ۔

(الحج: ۶۵)

"وہ آسمان کو زمین پر گرنے سے روکے ہوتے ہے۔ الا یہ کہ اللہ کا اذن ہوجائے۔"

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔ (یٰس: ۴۰)

"سورج کے بس میں نہیں کہ چاند کو پالے، نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے۔ ہر ایک اپنے دائرۂ کار میں رواں دواں ہے۔"

تَبَارَكَ الَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(الملک : ۱)

"بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھوں میں سارا اقتدار ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

ایک ارادۂ مطلق سے صادر ہونے والا یہ وجود ایک مکمل وحدت ہے، جس کا ہر جزو اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ دوسرے تمام اجزاء سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہاں ہر جزو میں ایک خاص حکمت پوشیدہ ہے جو ہم آہنگی و تناسب کے اس نظام کامل سے گہرا ربط رکھتی ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝ (الفرقان : ۲)

"اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔"

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ۔ (قمر : ۴۹)

"بے شک ہم نے پیدا کیا ہے ہر چیز کو اندازہ سے۔"

اَلَّذِىْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ (ملک : ۳-۴)

"وہی ہے جس نے تلے اوپر سات آسمان بنائے۔ تم رحمٰن کے خلق میں ذرہ برابر بھی فرق و بے ضابطگی محسوس نہ کرو گے۔ تم نظر ڈال کر دیکھو، کیا تم کسی قسم کا نقص محسوس کرتے ہو۔ پھر تم دوسری بار نظر ڈالو۔ نظر تمہاری طرف ذلیل ہو کر درماندہ لوٹ آئے گی۔"

وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِىْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ (حم السجدہ : ۱۰)

"اللہ نے زمین پر پہاڑ قائم کیے اور اس میں برکت رکھی، اور اس میں روزی کا اہتمام کیا۔"

اَللّٰهُ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِى السَّمَاۗءِ كَيْفَ يَشَاۗءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ (روم : ۴۸)

"اللہ ہی ہے جو ہوائیں چلاتا ہے، پھر وہ ہوائیں بادل اٹھاتی ہیں اور اللہ

اس بادل کو آسمان میں جس طرح چاہتا ہے پھیلاتا ہے۔ وہ ان کو تہہ بتہہ رکھتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ ان کے درمیان سے مینہ نکلتا ہے۔ پھر جب وہ اس سے اپنے بندوں میں سے جنہیں چاہتا ہے نوازتا ہے تو وہ خوش خوش نظر آنے لگتے ہیں۔"

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر موجود شے کی ایک حکمت ہے۔ جو مقصدِ کائنات سے ہم آہنگ ہے اور یہ کہ جو ارادہ کائنات کا موجد ہے اور جو پھر اس کی تنظیم و تدبیر اور دیکھ بھال کرتا ہے وہی ارادہ ہر شے میں اس امر کی رعایت بھی ملحوظ رکھتا ہے کہ وہ وجودِ کلی کے لیے نفعِ کلی کی حامل اور اس سے ہم آہنگ ہو۔

وجود چونکہ ایک ہی مطلق اور کامل ارادہ سے براہِ راست صادر ہونے کے باعث ایک ایسی وحدت ہے جس کے اجزاء باہم مربوط و ہم آہنگ ہیں۔ اس لیے وہ زندگی اور خاص طور پر زندگی کے اعلیٰ ترین مظہر اخلاقی زندگی کے لیے سازگار اور موافق بلکہ مددگار اور معاون واقع ہوا ہے۔

چنانچہ کائنات نہ تو زندگی کی دشمن ہے نہ انسان کی۔ جاہلیّت حاضرہ کی اصطلاح میں "قدرت" انسان کی دشمن نہیں جو اس سے دست بگریباں رہے بلکہ وہ اللہ کی مخلوق اور انسان کی دوست ہے جس کے رجحانات زندگی اور انسان کے رجحانات کے مخالف نہیں۔ زندگی گذارنے والوں کا کام یہ نہیں کہ وہ قدرت سے پنجہ آزمائی کریں۔ کیونکہ انہوں نے اسی کے آغوش میں پرورش پائی ہے اور وہ اور قدرت دونوں اسی کائنات سے تعلق رکھتے ہیں اور ساری کائنات ایک ہی ارادے سے صادر ہوئی ہے۔ انسان ایک مانوس اور موافق فضا میں ایسی موجودات کے درمیان رہتا ہے جو اس کی مونس و غمخوار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب زمین بنائی تو

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا۔ (حم السجدہ: ۱۰)

"اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے۔ اس میں برکت ڈالی اور خوراکوں کا اہتمام کیا۔"

وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ۔ (نحل: ۱۵)

"اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے تاکہ وہ تم کو لے کر جھک نہ پڑے۔"

وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ۝ (الرحمٰن: ۱۰)

"اور زمین کو اس نے مخلوق کے لیے بچھا دیا۔"

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ط (ملک: ۱۵)

"یہ اللہ کی ذات ہے کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے مطیع بنا دیا۔ پس تم اس پر چلو اور اللہ کے عطا کردہ رزق کو کھاؤ۔"

خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ق (بقرہ: ۲۹)

"زمین کی ساری چیزیں تمہارے لیے پیدا کیں۔"

آسمان اپنے حسین تاروں سمیت کائنات کا ایک جز ہے جو بقیہ دوسرے اجزاء سے مل کر ہی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس طرح جو کچھ بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ کائنات کے دوسرے اجزاء کا ہم سفر اور رفیقِ راہ ہے، اُن سے ہم آہنگ ہے، اُن کا ممد و معاون ہے۔

وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ (ملک: ۵)

"اور ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے آراستہ کیا۔"

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا o وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا o وَّخَلَقْنٰکُمْ اَزْوَاجًا o وَّجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا o وَّجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا o وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا o وَّبَنَیْنَا فَوْقَکُمْ سَبْعًا شِدَادًا o وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا o وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا o لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا o وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا o ط (النبا: ۶ تا ۱۶)

"کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں کر دیا اور پہاڑوں کو میخ نہیں بنایا، اور ہم نے تمکو جوڑا جوڑا پیدا کیا، اور ہم نے تمہاری نیند کو ذریعۂ آرام بنایا اور رات کو پردہ پوش کیا اور دن کو روزی کمانے کا وقت بنایا، اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔ اور ہم نے چراغ روشن کیا۔ اور ہم نے برسنے والے بادلوں سے بہت سا پانی نازل کیا تاکہ ہم اس کے ذریعہ سے اناج، سبزیاں اور گنجان باغ اُگائیں۔"

اس طرح اسلامی عقیدہ اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ انسانوں کے پروردگار نے اِن تمام قوتوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کے دوست، مددگار اور معاون بن کر رہیں۔ اس دوستی کو عملاً حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان ان قوتوں کا مشاہدہ کرے، اُن پر غور کرے، اُنھیں سمجھے اور اُن کے ساتھ تعاون کرے۔ اگر کبھی کبھی یہ انسان کو تکلیف پہنچاتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان نے ان پر غور نہیں کیا اور ان اصول و قوانین کو نہیں سمجھا جن کے تحت یہ کام کرتی ہیں۔

ساتھ ہی ایسا نہیں کہ خالق نے انسان اور دوسری ذی روح موجودات کو اس سازگار کائنات کے حوالے کر کے ان کو خود اپنی براہِ راست توجہ اور نگرانی سے محروم ہی رکھا ہو۔ اس کا براہِ راست ارادہ بیک وقت پوری کائنات اور اس کے ہر فرد کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُوْلَا ج وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ م بَعْدِهِ ط (فاطر: ۴۱)

”حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے، اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا انھیں تھامنے والا نہیں ہے۔“

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ط (هود ۶)

”زمین میں کوئی ایسا حیوان نہیں جس کا رزق اللہ نہ فراہم کرتا ہو، اللہ ان تمام جانداروں کی جائے قرار اور ان کی آخری منزل سے باخبر ہے۔“

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ج وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ٥ (قٓ: ۱۶)

”ہم نے انسان کی تخلیق کی ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کا نفس اسے کیا کیا سکھاتا ہے۔ ہم تو اس سے اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں۔“

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن: ۶۰)

”تمہارے رب نے کہا: مجھے پکارو، میں تمہاری پکار سنوں گا۔“

وَلَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ مِّنْ إِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ج (الانعام: ۱۵۱)

"قلت رزق کے اندیشہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، ہم تمہیں اور انھیں دونوں کو رزق فراہم کریں گے"۔

شانِ وحدت کی حامل یہ کائنات ایک ہی ارادہ کا فیض ہے۔ انسان اسی کائنات کا ایک جز ہے جو دوسرے اجزاء سے مربوط اور ہم آہنگ بھی ہے۔ فرداً فرداً نظامِ کائنات سے ہم آہنگ و مربوط ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ افرادِ انسانی باہم بھی ہم آہنگ و مربوط ہو کر رہیں۔ اسی بنا پر اسلام وحدتِ انسانیت کے نظریہ کا قائل ہے کہ اس وحدت کے اجزاء اگر مختلف ہیں تو یہ بھی اتفاق و اتحاد ہی کی خاطر، اور متفرق ہیں تو اسی لیے کہ مجتمع ہو سکیں۔ وہ مختلف راہیں اختیار کر کے بھی بالآخر ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں، کیونکہ وحدتِ کائنات کے ساتھ تعاون و ہم آہنگی سب کی منزلِ مقصود ہے:۔

يَآأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا (الحجرات: ۱۳)

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تم کو مختلف قوموں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کر دیا کہ تم کو ایک دوسرے کے تعارف میں آسانی ہو"۔

انسانی زندگی کا نظم اس وقت تک درست نہ ہو سکے گا جب تک کہ یہ تعاون و ہم آہنگی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اس کی تکمیل اس قدر ضروری ہے کہ اس راہ سے ہٹنے والوں کو واپس لانے کے لیے طاقت کا استعمال بھی مباح ہے:۔

إِنَّمَا جَزَآؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُّقَتَّلُوْا أَوْ يُصَلَّبُوْا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ۔ط (المائدہ: ۳۳)

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں

یا وہ جلا وطن کر دیے جائیں۔"

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ج فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ط (الحجرات: ۹)

"اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اُن کے درمیان صلح کرادو۔ اگر اُن میں سے ایک کی زیادتی ہو تو اس گروہ سے مقاتلہ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پھر جب وہ لوٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو، اور قسط پر قائم رہو۔"

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ

(البقرہ: ۲۵۱)

"اگر اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا۔"

لہٰذا جس چیز کو اصل قرار دیا جائے گا وہ تعاون، ہم آہنگی اور ربطِ باہم ہے جو اس اصل کو چھوڑنے اس کو واپس لانے کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ جو روش کائنات کی کلی مصلحت کا تقاضا ہو، اس کی اتباع بہرحال افراد اور گروہوں کی خواہشات کی پیروی سے زیادہ اہم ہے۔ باہمی تعاون و ہمدردی ہی وہ روش ہے جو مقصدِ کائنات اور اس طور پر خالقِ کائنات کے ارادہ و منشاء سے ہم آہنگ ہے۔

انسان بحیثیتِ نوع بھی ایک وحدت ہے اور بحیثیت فرد بھی۔ اس وحدت کی بظاہر مختلف قوتیں درحقیقت ہم منزل و ہم سفر ہیں۔ اس بارے میں انسان کا حال کائنات ہی جیسا ہے کہ اصل قوت ایک ہی ہے مگر اس کے مظاہر بے شمار۔

زمانہ دراز تک انسانیت، انسان اور کائنات کی قوتوں کے بارے میں کسی جامع نظریہ تک نہ پہنچ سکی۔ روحانی اور مادی قوتوں کے درمیان تقسیم کی گئی۔ کبھی ایک کو ثابت کرنے کے لیے دوسری کا انکار کیا۔ کبھی دونوں میں تضاد اور کش مکش کا تعلق تسلیم کیا۔ اس نے اپنی تعلیمات کی بنیاد اس نظریہ

پر رکھی کہ روح و مادہ میں بنیادی طور پر تضاد ہے۔ ایک کا پلڑا بھاری ہوگا تو دوسرا لازمًا ہلکا ہو جائے گا دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دیے بغیر چارہ نہیں۔ اس نظریہ کی رُو سے تضاد کائنات اور انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس نظریہ کی سب سے نمایاں مثال وہ مسیحیت ہے جسے کلیسا اور متقدمین کا نفوس نے اس کی موجودہ شکل دی ہے۔ اس معاملہ میں وہ کسی حد تک ہندو مذہب اور بدھ مت کے ساتھ ہے ——— اگرچہ خود ان دو مذاہب کا نقطۂ نظر بھی باہم مختلف ہے۔ ان کے نزدیک روح کی نجات جسم کو تکلیفیں پہنچانے، اُسے گھلا ڈالنے، بلکہ فنا کر دینے یا کم از کم اس کی طرف سے بے نیاز ہو جانے اور جسمانی لذتوں سے ہاتھ کھینچ لینے میں مضمر ہے۔

مسخ شدہ مسیحیت اور اس سے ملتے جلتے دوسرے مذاہب کے اس اصول کا اثر انسانی زندگی اور اس کے مختلف مسائل کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر پر بہت گہرا پڑا ہے۔ فرد و جماعت کے طرزِ عمل اور انسان میں پنہاں قوتوں اور صلاحیتوں کے سلسلہ میں اُن کے نظریات اس کی روشنی میں مرتب ہوئے ہیں ان دونوں قوتوں کے درمیان کش مکش جاری رہی۔ اس کھینچ تان میں انسان کی دھجیاں اُڑ گئیں وہ کرب و اضطراب کے عالم میں حیران و سرگرداں رہا۔ لیکن اُسے امن و سکون کی دولت نہ نصیب ہو سکی تا آنکہ اسلام آیا اور ایک مکمل ہر طرح کی کجی، انتشار اور تضاد سے پاک، ٹھوس اور مربوط نظریہ لے کر آیا۔ تمام مختلف قوتوں اور صلاحیتوں کو متحد کر دینا اور سارے رجحانات و میلانات کو ایک سمت میں لگا دینا اس کا مقصد تھا۔ انسان، حیات اور کائنات میں اصلاً جو اتحاد و یکسانیت موجود ہے اسے عملاً برپا کر دکھانا اس کا مشن تھا۔ وہ اس لیے آیا تھا کہ نظامِ کائنات میں زمین و آسمان کو نظامِ دنیا میں دنیا و آخرت کو، نظامِ انسانی میں جسم و روح کو اور نظامِ عمل میں کاروبار اور عبادت کو یک جا کر دکھائے اور یہ سب ایک راہ پر سرگرمِ سفر نظر آنے لگیں ——— وہ راہ جو خدا کی طرف جاتی ہے اور سب کو ایک ہی اقتدار کا تابع بنا دیتی ہے، خدا کے اقتدار کا۔

کائنات ایک اکائی ہے جو مشہور و معلوم، ظاہر اور نظروں سے اوجھل، لامعلوم غائب سے مرکب ہے۔ حیات ایک وحدت ہے جو مادی اور روحانی قوتوں کے سنجوگ کا نتیجہ ہے۔ جہاں یہ قوتیں ایک دوسرے سے الگ ہوئیں انتشار اور خلل پیدا ہوا۔ اسی طرح انسان بھی ایک اکائی ہے جو آسمان کی طرف مائل روحانی ذوق و شوق، اور زمین سے وابستہ جسمانی تقاضوں اور مادی میلانات سے

مرکب ہے۔ فطرتِ انسانی دونوں کے مابین کسی دوری یا کشمکش سے بری ہے کیونکہ نظامِ کائنات میں زمین و آسمان اور معلوم و مجہول کے درمیان کوئی کشمکش یا ٹکراؤ نہیں۔ نہ ہی نظامِ دین میں دنیا و آخرت اور کاروبار عبادت میں کوئی تعارض یا تضاد ہے۔

ان سب کی پشت پر ایک ازلی اور ابدی قوت کارفرما ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی ابتدا، ہے کہ ہم اسے جان سکیں نہ کوئی انتہا کہ وہ احاطۂ بیان میں لائی جا سکے۔ یہی قوت کمالِ ہمہ گیری کے ساتھ کائنات حیات اور انسان پر چھائی ہوئی ہے۔ یہ اللہ کی قوت ہے۔

فردِ فانی اس دائمی قوت سے ربط قائم کر سکتا ہے۔ یہ زندگی میں اس کی رہنمائی کرتی ہے اور فرد مصیبت کے وقت اس سے مدد کا طالب ہوتا ہے اور اس وقت بھی جب انسان اپنی معاش کی خاطر زمین پر کاروبار میں مشغول ہو۔

فرد ہر حال میں آخرت کی بھلائی کے کام کر سکتا ہے۔ وہ روزہ رکھے اور جسم کو ہر طرح کے لذائذ سے محروم کر دے۔ یا روزہ سے نہ ہو اور زندگی کی ہر پاکیزہ نعمت سے لُطف اٹھائے، دونوں حال میں اس کا عمل آخرت کے لیے مفید ہے اگر وہ دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر اسی کی خاطر عمل کرے آخرت کی واحد راہ یہی دنیا کی زندگی ہے جس میں نماز بھی ہے اور کاروبار بھی، کامیابی بھی ہے اور ناکامی بھی اور آخرت کی اس منزل میں جنت و جہنم اور خوشنودی و عتاب دونوں کا اہتمام ہے۔

کائنات کی مختلف قوتوں اور اجزاء یا انسان کی مختلف صلاحیتوں کی وحدت کا راز اسی قوت میں پوشیدہ ہے۔ یہی قوت ہے جو انسان اور اس کی زندگی کے واقعاتی پہلو اور خواب و تخیل کو ایک اکائی بنائے رکھتی ہے۔

کائنات و حیات، حیات اور صاحبِ حیات موجودات، فرد و جماعت اور خود فرد کے مختلف رجحانات و میلانات میں توازن و ہم آہنگی بھی اسی قوت کی مرہونِ منت ہے۔ یہی قوت دنیا اور دین اور زمین اور آسمان کے درمیان ایک خوشگوار ربط اور پائدار رفاقت کی ضامن ہے۔

اس توازن کی خاطر نہ تو جسم کا مفاد مجروح ہوتا ہے اور نہ روح کا۔ ہر ایک کو پوری سرگرمی کا موقع ملتا ہے تاکہ یہ قوت ان سرگرمیوں کو خیر و فلاح اور تعمیر و ترقی کا ذریعہ بنا سکے۔ اس قوت کو بھی یہ منظور نہیں کہ اس ہم آہنگی کی خاطر فرد کو زیادہ پابند کر دے یا جماعت کو کسی حد تک نظر انداز کرے۔ یہ ایک

گروہ کو دوسرے گروہ پر یا ایک نسل کو دوسری نسلوں پر بھی بے جا ترجیح نہیں دیتی بلکہ ہر ایک کے حقوق وفرائض، عدل ومساوات کی روشنی میں واضح طور پر متعین ہیں۔

ایک ہی قانون ہے جو فرد وجماعت، طبقات واقوام اور مختلف نسلوں پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔ ایک ہی مقصد ہے جو ہر جگہ اس کے سامنے رہتا ہے، یعنی یہ کہ بلا کسی تصادم اور کش مکش کے فرد اور جماعت کو پوری پوری سرگرمی دکھانے کا موقع ملے۔ ہر نسل زندگی کی تعمیر وترقی کے لیے جدّوجہد کرے اور اس کو اپنے خالق کی طرف متوجہ رکھے۔

اسلام بلاشبہ دین توحید ہے کیونکہ وہ کائنات کی ساری قوتوں کے درمیان وحدت و یک جہتی کا قائل ہے۔ اس کے یہاں خدا ایک ہے۔ اللہ کے دین کی شکل میں سارے مذاہب کو ایک قرار دیا گیا ہے، اور آغازِ حیات سے اسی دینِ واحد کے پیغام بر ہونے کی حیثیت سے سارے انبیاء بھی ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں[1]

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ○

(الانبیاء: ۹۲)

"بے شک تمہاری یہ امّت ایک ہی جماعت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں۔ لہٰذا تم سب میری ہی عبادت کرو۔"

اسلام عبادت اور کاروبار، عقیدہ اور عمل، روحانیت اور مادیت، معاشی قدروں اور معنوی قدروں، دنیا اور آخرت، اور زمین و آسمان سب کے درمیان وحدت کا قائل ہے۔

اسی عظیم وحدت سے اسلام کے فرائض وقوانین، ہدایات وحدود اور سیاسی اور معاشی امور میں اس کی رائیں اُبھرتی ہیں۔ اس کی روشنی میں وہ حقوق وفرائض متعین کرتا ہے اور نفع ونقصان کو تقسیم عمل میں لاتا ہے۔ الغرض اس کے سارے اجزاء اور تمام تفصیلات اسی اصل اصول میں پنہاں ہیں کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں اسلامی طرزِ فکر کی یہ اساس اگر ہماری سمجھ میں پوری طرح آجائے تو اسلام میں اجتماعی عدل کے بنیادی خطوط خود بخود واضح ہو جاتے ہیں۔

---

[1] مصنّف کی کتاب "التصویر الفنی فی القرآن" کا باب "القصہ" ملاحظہ ہو۔

اجتماعی عدل کے اسلامی تصور کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محدود معنی میں کسی معاشی عدل کا نام نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر اور جامع انسانی عدل ہے۔ زندگی کے تمام مظاہر اور ہر طرح کی سرگرمیاں اس کے دائرہ میں داخل ہیں۔ وہ فکر اور عمل، ضمیر اور وجدان سب پر چھایا ہوا ہے۔ اس کا انحصار معاشی قدروں پر نہیں۔ وہ وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے ساری مادی قدروں تک محدود نہیں۔ وہ مادی، معنوی اور روحانی تمام طرح کی اقدار کے ایک خوشگوار امتزاج کا نام ہے۔

مسخ شدہ مسیحیت انسان کو صرف اس کے روحانی میلانات کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس کے جسمانی تقاضوں ان میلانات کی خاطر کچل دینا چاہتی ہے۔ اشتراکیت صرف انسان کی مادی ضروریات کو اہمیت دیتی ہے۔ وہ انسانیت بلکہ ساری کائنات پر مادی اعتبار سے نظر ڈالتی ہے۔ اسلام ان دونوں کے برعکس انسان کو ایک ایسی وحدت تصور کرتا ہے جس کے روحانی میلانات اور جسمانی تقاضوں میں تفریق نہیں کی جا سکتی۔ نہ اس کی مادی ضروریات اور غیر مادی ضروریات کو الگ الگ کیا جا سکتا ہے۔ کائنات و حیات کا یہ جامع تصور کسی تفریق و تقسیم کا قائل نہیں۔ اسلام اور اشتراکیت و مسیحیت کی راہیں یہیں آکر مختلف ہو جاتی ہیں۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ اسلام تمام تر صرف اللہ کا بنایا ہوا دین ہے جب کہ مسیحیت میں انسانی تحریفات کو دخل ہو گیا اور اشتراکیت تمام تر انسانی وہم و گمان پر مبنی ہے۔

اسلام کی نظر میں زندگی تعاون و ہم آہنگی اور ہمدردی و مواساۃ کا نام ہے۔ مسلمانوں کے درمیان خصوصاً اور عام انسانوں میں عملاً مسیحیت کا نقطۂ نگاہ بھی یہی ہے مگر وہ کوئی واضح اور متعین شریعت نہیں رکھتی اور نہ عالم واقعہ میں اس کا کوئی عملی اظہار اس کے سامنے ہے۔ اشتراکیت اُسے طبقاتی کش مکش کا میدان سمجھتی ہے تاکہ ایک طبقہ کے دوسرے طبقہ پر غلبہ کی شکل میں اشتراکیت کی عظیم تمنا پوری ہو سکے۔ اسی سے واضح ہے کہ مسیحیت عالم مثال میں ایک خواب ہے جس میں انسانیت کو عالم بالا کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسلام انسانیت کے ازلی خواب کی عملی تعبیر ہے جو زمین پر قائم حقیقت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اور اشتراکیت ایک مخصوص دور کے انسانوں کے جذبۂ حسد کا دوسرا نام ہے۔

اسلام اجتماعی عدل کے قیام میں انہی دو بنیادی اصولوں کو سامنے رکھتا ہے۔ متوازن

باہم مربوط اور مکمل وحدت اور افراد اور جماعتوں کے درمیان تعاون و دست گیری کی اسپرٹ اس عدل کے قیام میں اسلام انسانی فطرت کے بنیادی عناصر کا لحاظ رکھتا ہے۔ انسان کی صلاحیتوں کو بھی پوری طرح سامنے رکھتا ہے۔

قرآن کریم انسان کی بابت فرماتا ہے:

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝ (العٰدیٰت : ۸)

"بے شک وہ مال کی محبت میں آگے بڑھا ہوا ہے۔"

مال و دولت کی محبت خود اس کی خاطر، اور ان چیزوں کی خاطر جن کا حصول ان سے وابستہ ہے، انسان کو فطری اور طبعی طور پر بخیل قرار دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ (النساء : ۱۲۸)

"نفس تنگ دلی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔"

یہ خصلت انسان میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ قرآن میں انسان کی اس خصلت کو ایک حسین اور اچھوتی مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے:

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل : ۱۰۰)

"اے محمدؐ ان سے کہو، اگر کہیں میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضہ میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشہ سے ان کو بھی ضرور روک رکھتے۔ واقعی انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے۔"

یہ نہ بھولیے کہ اللہ کی رحمت ہر چیز پر محیط ہے۔ ایک طرف اس کی یہ وسعت بے پایاں اور دوسری طرف انسان کا یہ بخل! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو ناتربیت یافتہ چھوڑ دیا جائے تو اس کا بخل کس حد تک پہنچ جاتا ہے۔

اسلام نظام زندگی کی ترتیب یا قانون سازی اور ہدایات و تلقین میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس فطری حب ذات اور خود غرضی کو نظر انداز نہیں کرتا۔ جس کی جڑیں فطرتِ انسانی میں اتنی گہری ہیں۔ وہ وعظ و نصیحت اور قانونی پابندیوں کے ذریعہ خود غرضی اور بخل کا علاج کرتا ہے۔ وہ

فرد پر اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ساتھ ہی جماعت کی ضروریات و مصالح کا بھی پورا لحاظ رکھتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر فرد و جماعت دونوں کی زندگی کے وہ بلند مقاصد ہیں جو ہر نسل اور ہر زمانہ کے لیے یکساں ہیں۔

جس طرح فرد کی حرص و ہوس کا مفادِ جماعت کو پامال کرنا نامناسب ہی نہیں، کھلی بے انصافی اور صریح ظلم ہے، اسی طرح یہ بھی ظلم ہے کہ جماعت فرد کی قوتِ برداشت کا لحاظ نہ کرے اور اس کی طبیعت پر بے جا بوجھ ڈالے۔ ایسا کرنا صرف ایک فرد پر ظلم نہیں بلکہ پوری جماعت پر ظلم ہے فرد کے رجحانات کو کچلنے اور اس کے میلانات کو دبانے کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ خود جماعت کے لیے اس فرد کی صلاحیتوں اور خدمات سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے مواقع بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ سماجی نظام کو فرد کی صلاحیتوں اور قوتوں میں سے جماعت کا حق حاصل کرنے کے لیے فرد کی آزادی اور اس کے رجحانات کو کچھ حدود کا پابند کرنا چاہیئے، لیکن ساتھ ہی اسے فرد کے حقوق سے بھی غفلت نہیں برتنی چاہیئے۔ انفرادی رجحانات کو اس حد تک پوری آزادی ملنی چاہیئے جس حد تک کہ وہ زندگی کے بلند تر مقاصد سے نہ ٹکراتے اور مفادِ جماعت کو نہ مجروح کرتے ہوں۔ زندگی اسلام کے نزدیک تعاون و توافق کا نام ہے نہ کہ کش مکش اور جنگ و جدل کا۔ زندگی کا راز انفرادی اور اجتماعی قوتوں کی آزادی اور نشوونما میں مضمر ہے نہ کہ ان پر پابندیوں اور جکڑ بندیوں میں۔ ہر وہ چیز مباح ہے جو حرام نہیں قرار دی گئی اور وہ چیز جسے باطل نہیں ٹھہرایا گیا حق ہے۔ انسان کو اللہ کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات اور شریعت کے حدود میں ہر اس عمل اور ہر اس سرگرمی کا اچھا بدلہ ملتا ہے جس میں وہ اللہ کی مرضی کو اپنا نصب العین بنائے اور زندگی کے ان بلند تر مقاصد کے حصول کی کوشش کرے جن کو اللہ نے پسند فرمایا ہے۔

سماج میں عدل و انصاف اور توازن و ہم آہنگی پیدا کرنا اسلام کے لیے نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کے بارے میں اس کا نقطہ جامع بھی ہے اور وسیع بھی۔ وہ مادی اور معاشی قدروں پر آکر رک نہیں جاتا بلکہ آگے بڑھ کر ان تمام قدروں کو اپناتا ہے۔ جن سے انسانیت کی فلاح وابستہ ہے۔ اسلام عدل کے اس محدود تصور سے بلند ہے جو اشتراکیت میں ملتا ہے۔ اشتراکیت کے نزدیک عدل معاوضوں میں ایسی مساوات کا نام ہے کہ معاشی تفاوت اور اونچ نیچ کا خاتمہ

ہو سکے۔ اگرچہ حقائق کی دنیا میں عملی زحمتوں نے اس اصول پر عمل نہ کرنے دیا اور اشتراکیت اپنے سماج میں اسے نافذ کرنے سے یکسر قاصر رہی۔ اسلام کی نظر میں عدل انسانی مساوات کا نام ہے جس میں تمام اقدارِ حیات کی متوازن و ہم آہنگ تحصیل عمل میں آتی ہے۔ ان اقدار میں خالص معاشی قدریں بھی شامل ہیں۔

چونکہ اسلام کے پیشِ نظر اقدار کثیر التعداد اور باہم مربوط ہیں لہٰذا ان کے مجموعے کے ذریعہ عدل کا قیام اس کے لیے زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسے محدود معنیٰ میں معاشی مساوات کو اپنانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ مساوات کا یہ محدود تصور انسانی فطرت سے ٹکراتا ہے۔ افراد کی صلاحیتوں میں پیدائشی طور پر پایا جانے والا تفاوت بھی اس کے خلاف جاتا ہے۔ یہ اصول اعلیٰ صلاحیتوں کو معمولی اور ادنیٰ صلاحیتوں کے برابر قرار دیکر اُن کی ہمت شکنی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل افراد نہ تو ان صلاحیتوں کو خود اپنی بھلائی کے لیے استعمال کر پاتے ہیں نہ قوم کی بھلائی کے لیے۔ قوم اور پوری انسانیت ان خداداد صلاحیتوں کے فیض سے محروم رہ جاتی ہے۔

فطری صلاحیتوں میں عدم مساوات ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا چُھپی ہوئی صلاحیتوں کا انکار بھی اگرچہ حقائق و واقعات کی دنیا میں ناممکن ہے لیکن اُن سے قطع نظر دوسری ظاہر خصوصیات کا معاملہ تو بالکل واضح ہے۔ بعض افراد صحت، قوتِ برداشت اور جسمانی و ذہنی کمال تک پہونچنے کی استعداد پیدائشی طور پر ساتھ لاتے ہیں جب کہ کچھ لوگ مرض و کمزوری اور دوسری خامیوں کے جراثیم لیے ہوئے پیدا ہوتے ہیں۔ تمام صلاحیتوں اور ہر طرح کی استعداد کو برابر کر دینے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ کیونکہ کوئی ایسی مشین نہیں ایجاد ہو سکی ہے۔ جو دوسری مصنوعات کی طرح انسانوں کو بھی ایک ہی سانچہ میں ڈھال کر پیدا کر سکے۔

غیر معمولی اور بلند ذہنی نفسیاتی اور روحانی صلاحیتوں کے وجود سے انکار محض لغویت ہے ہمیں ان کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ انھیں اس بات کا پورا حق ملنا چاہیئے کہ اپنے ثمرات سامنے لا سکیں۔ ان ثمرات میں سے اجتماعی مفاد کی خاطر جن چیزوں کی ضرورت ہو انھیں حاصل کیا جاسکتا ہے مگر ان صلاحیتوں کو روک کر ان کے پھل پھول لانے کے امکانات ختم کر دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ ایسا کرنا ان صلاحیتوں پر بھی ظلم ہوگا اور سماج اور انسانیت پر بھی۔

سماجی عدل اور انسانی مساوات کے خطوط واضح کر دینے کے بعد اسلام نے سعی و جہد کے

ذریعہ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے کھلے مواقع فراہم کیے ہیں۔ اس مسابقت میں اقتصادی اقدار کے علاوہ دوسری قدروں کو بھی اہمیت دی گئی ہے اور عمل کی ترازو میں ان کا وزن بھی پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ (الحجرات: ۱۳)

"اللہ کے نزدیک تم میں سے بزرگ ترین وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔"

يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ

(مجادلہ: ۱۱)

"تم میں سے جو لوگ صاحبِ ایمان ہیں اور جنھیں علم عطا ہوا ہے، اللہ ان کو بلند مراتب سے سرفراز فرمائے گا۔"

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا ۞ (کہف: ۴۶)

"یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجہ کے اعتبار سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔"

اس طرح یہ بات بالکل واضح ہے کہ خالص معاشی اقدار کے علاوہ دوسری قدریں بھی اپنا وجود رکھتی ہیں جن کی اہمیت کو اسلام پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے۔ جب لوگوں کے درمیان آمدنی اور مالی وسائل کے اعتبار سے تفاوت پایا جاتا ہے۔ تو اسلام ان (غیر معاشی) قدروں کو سماج میں عدل و توازن قائم رکھنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہاں اس مالی تفاوت کا ذکر ہے جو مختلف فطری استعداد و صلاحیت جیسے معقول اسباب پر مبنی ہو نہ کہ ان مذموم طریقوں پر جن کو اسلام نے یکسر حرام قرار دیا ہے۔ (تفصیل آگے اقتصادی پالیسی کے بیان میں ملے گی)

ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ اسلام محدود معنی میں معاشی مساوات کا قائل نہیں۔ مال و دولت کے کسب ایسی صلاحیتوں پر مبنی ہے جو سب کو برابر نہیں ملی ہیں۔ عدل کا تقاضا ہے کہ لوگوں میں یک گونہ معاشی تفاوت موجود رہے۔ اور کچھ لوگ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ مال دار

ہوں۔ البتہ انسانی مساوات کو بہر حال برقرار رہنا چاہیے۔ اس کی لازمی شرط یہ ہے کہ سب کو یکساں مواقع حاصل ہوں، کسی شخص کی راہ میں حسب و نسب یا سعی و جہد پر پانی پھیر دینے والی کوئی بھی چیز روڑا نہ بنے۔ ہر طرح کی اقدار کو مناسب وزن حاصل ہو۔ اور ضمیر انسانی کو نری مادی اور معاشی قدروں کی اندھی غلامی سے آزاد کر دیا جائے۔ مادی اور معاشی اقدار کو اُن کے صحیح مقام پر رکھنا بہت ضروری ہے۔ ایسے سماج موجود ہیں جن میں غیر مادی اقدار کا شعور اور ان کی اہمیت کا احساس تو ناپید ہے یا بہت ہلکا ہے۔ ان کے نزدیک مال و دولت ہی بنیادی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ مالی اقدار کو غیر معمولی اہمیت دے کر ایک بہت اونچا مقام دے دینا بالکل غیر فطری اور غیر معقول ہے۔

مال و دولت کو قدرِ اعلیٰ یا قدرِ کل قرار دینا اسلام کے نزدیک ناقابلِ تصور ہے۔ اسے یہ بات ہرگز گوارا نہیں کہ زندگی روٹی کے ایک "ٹکڑے"۔ چند سکوں یا کسی جسمانی خواہش میں گھر کر رہ جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ فقر و فاقہ اور حاجت مندی کا ازالہ بھی ضروری سمجھتا ہے۔ وہ ہر فرد کو بنیادی ضروریات کی تکمیل بلکہ بسا اوقات اس سے زیادہ کی ضمانت دیتا ہے۔ اسلام ایسی عیش کوشی کی راہیں بھی مسدود کر دیتا ہے جس میں شہوات و خواہشات کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے اور ایک دوسرے سے بہت زیادہ فرق و تفاوت رکھنے والے طبقات وجود میں آتے ہیں۔ اسلام دولت کے سلسلہ میں مال داروں پر غریبوں کا ایک حق واجب کر دیتا ہے۔ اس حق کی مقدار ان کی ضروریات اور سوسائٹی کے مفادات و مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے اس مقصد کے پیش نظر متعین کی جاتی ہے کہ سماج میں عدل قائم ہو، ایک حد تک مساوات برپا ہو اور ترقی اور نشو و نما کے لیے سازگار فضا پیدا ہو۔ اس طور پر اسلام زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ مادی اور معنوی، اور دینی اور دُنیوی، تمام پہلوؤں کو پوری پوری رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ تاکہ یہ سب گھُل مل کر ایک کُل کی شکل اختیار کر لیں —— ایک ایسا مرتب اور منضبط اور اتنا موزوں امتزاج رکھنے والا کل جس کے باہم دگر پیوستہ عناصر میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہ رہ جائے۔ اور جس کی وحدت عظیم و وسیع کائنات اور حیات و انسان کی وحدت سے ہم آہنگ ہو جائے۔

بابِ سوم

اِسلام میں اجتماعی عَدل کی بُنیادیں

اِسلام میں اجتماعی عدل کی بنیادیں

اسلام اس اجتماعی عدل کو جس کے مزاج پر گزشتہ ابواب میں کچھ روشنی ڈالی گئی ہے، مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم کرتا ہے۔ اسے ایک اجمالی دعوت یا مبہم سی بات بنا کر چھوڑ دینے کے بجائے وہ اِن مقاصد کے حصول کے لیے متعین ذرائع و وسائل بھی فراہم کرتا ہے۔ اسلام ایک عملی دین ہے۔ کوئی ایسا مذہب نہیں جو محض تصورات کی دنیا میں تعلیم و تلقین تک محدود ہو کر رہ جائے۔

یہ بات اجمالاً سامنے لائی جا چکی ہے کہ اسلام کائنات، حیات اور انسان کی بابت ایک بنیادی نظریہ رکھتا ہے۔ اجتماعی عدل کا تصور اسی بنیادی فکر کا پَرتو ہے۔ یہ نظریہ اسلامی عدل کو ایسا وسیع اور جامع انسانی عدل بنا کر پیش کرتا ہے جو مادی امور یا معاشی مسائل تک محدود نہیں۔ اس کے نزدیک زندگی کی حقیقی قدریں بہ یک وقت مادی بھی ہیں اور معنوی بھی۔ دونوں میں تفریق صحیح نہیں۔ انسانیت ایک جامع وحدت ہے جس کے مختلف عناصر باہم مربوط و ہم آہنگ اور ذمّہ داریوں میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ یہ باہم نفرت اور دشمنی رکھنے والے مختلف گروہوں کا مجموعہ نہیں۔ کبھی کبھی ایسا گمان ہونے لگتا ہے کہ حقیقتِ واقعہ اسلام کے اس بنیادی فکر کے خلاف ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے خود حقیقتِ واقعہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔

اسلام جس چیز کو حقیقتِ واقعہ کا درجہ دیتا ہے وہ کسی ایک فرد، قوم یا نسل کی تاریخ نہیں۔ کیونکہ ایسی تاریخ زمان و مکان کی پابند، ایک محدود سی صورتِ واقعہ کا نام ہے۔ فانی انسانوں کا کوتاہ بیں فہم ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی انسانی زندگی سے اُبھرنے والے عظیم حقائق کو بھول کر انہی تاریخوں کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔ اسلام اس کوتاہ بینی کا قائل نہیں وہ تمام گوشوں پر

نگاہ ڈالتا ہے۔ ہر طرح کے مصالح کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے اور ایسے مقاصد کو اپنا ہدف بناتا ہے جن سے ازل تا ابد ساری انسانیت کو یکساں تعلق ہے۔ چنانچہ ایک بات جو چند مخصوص حالات میں حقیقت کے خلاف نظر آتی ہے وہی جب ساری انسانی تاریخ اور پوری انسانی زندگی کے اس وسیع پس منظر میں رکھ کر دیکھی جاتی ہے، جو افراد و اقوام یا نسلوں کا پابند نہیں، تو سارا تعارض رفع ہو جاتا ہے۔

یہی دُور رس بنیادی اور کلّی فکر جو عدلِ اجتماعی کے اعلیٰ مقاصد کا ضامن ہے اسلام کے تفصیلی احکام و ضوابط کے سمجھنے میں بھی ہماری مدد کرتا ہے۔ جن ضوابط کی علیحدہ علیحدہ توجیہ مشکل نظر آتی ہے وہ اس اصل کی روشنی میں حکمتوں سے پُر نظر آنے لگتے ہیں۔ اِن جزوی احکام پر ایک گروہ کے کسی فرد، ایک قوم کے کسی گروہ، ایک نسل کی کسی مخصوص قوم یا مختلف نسلوں میں سے کسی نسل کے مفاد و مصالح کی روشنی میں غور کیا جائے تو اُن کا صحیح فہم حاصل کرنا مشکل ہوگا۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس بنیادی فکر کی رہنمائی ضروری ہے۔ انفرادی ملکیّت کا نظام، وراثت کے قوانین، زکوٰۃ کا ضابطہ عدالتی نظام اور قوانینِ تجارت، غرض کہ انفرادی یا اجتماعی امور سے متعلق سارے اسلامی قوانین و ضوابط کی حقیقت اسی بنیادی فکر کی روشنی میں سمجھی جا سکتی ہے۔

اس کتاب میں ان تمام موضوعات پر تفصیلی گفتگو نہیں کرنی ہے۔ اسلام کے کلّی فکر کے دائرے میں رہتے ہوئے صرف ان عمومی بنیادوں سے تعرّض کرنا ہے جن پر عدلِ اجتماعی کا اسلامی نظام مبنی ہے۔ ہمارا مطالعہ ہمیں بتائے گا کہ اسلام نے فرد کے اندر جسم و روح اور زندگی میں مادّی اور معنوی قدروں کے درمیان وحدت برقرار رکھی ہے، اور اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ فرد اور جماعت کے مقاصد ایک ہوں، ایک ہی قوم کے مختلف گروہوں کے مفاد و مصالح میں ہم آہنگی رہے اور انسانی برادری کی مختلف قوموں کے درمیان چھوٹے چھوٹے اور محدود مصالح میں اختلاف کے باوجود مقصد کے اعتبار سے اتحاد و یک جہتی برقرار رہے۔

عدلِ اجتماعی کا اسلامی نظام تین بنیادی اصولوں پر مبنی ہے:

۱۔ مطلق اور مکمل آزادیٔ ضمیر۔

۲۔ کامل انسانی مساوات۔

۳۔ ٹھوس اور پائدار اجتماعی تکافل۔

آئندہ صفحات میں انہی بنیادوں کے مزاج و مقصد کی وضاحت کی گئی ہے۔

آزادیٔ ضمیر

اجتماعی عدل کا کوئی تصوّر اس وقت تک پوری طرح شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا نہ اُسے اس وقت تک قیام و بقا نصیب ہو سکتا ہے جب تک کہ اس کے پیچھے اس عدل کی اجتماعی ضرورت کا شدید احساس اور انفرادی استحقاق کا گہرا شعور نہ موجود ہو۔ پھر یہ یقین بھی ضروری ہے کہ اسی طرح ایک اعلیٰ انسانی مقصد تک پہنچنا ممکن ہو سکے گا۔ ساتھ ہی مادی حالات ایسے ہونے چاہئیں کہ فرد اس نظامِ عدل سے وابستہ رہنے، اس کی حفاظت کرنے اور اس کی خاطر تکلیفیں برداشت کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ فرد کو اس ضرورت کا احساس نہ ہو اور وہ اس شعور کو ہمیشہ تازہ رکھنے کا عملاً اہتمام نہ کرے تو محض قانون سازی کے ذریعہ اس طرح کا عدل قائم کرنا مشکل ہے۔ ایسی قانون سازی اگر عمل میں بھی آجائے تو سماج ان قوانین کے برقرار رکھنے اور انھیں پوری طرح نافذ کرنے پر قادر نہ ہو سکے گا۔ ضروری ہے کہ افراد کے داخل میں ایسے عقائد موجود ہوں جو اس اجتماعی عدل کی تائید کریں، اور خارجی حالات بھی ایسے ہوں کہ اس کا قیام عملاً ممکن ہو سکے۔ اس نکتہ کو اسلام اوّل دن سے سمجھتا ہے۔ اور اسے اس نے اپنی قانون سازی اور ہدایت و تلقین دونوں میں ہمیشہ سامنے رکھا ہے۔

کلیسا اور مقدّس کانفرنسوں کی بگاڑی ہوئی عیسائیت اور اسی طرح بدھ مت کے نزدیک دنیوی زندگی کے لذائذ و مرغوبات سے بے نیازی، اللہ کے کرشموں سے پُر آسمانی دنیا کی طرف توجہ، اور ترکِ دنیا، انسان کو آزادی عطا کرنے اور فلاح و سعادت سے بہرہ یاب کرنے کے لیے کافی ہے۔ بات سچی ہے لیکن ایک حد تک، کیونکہ زندگی کے تقاضوں کو ہر حال میں پسِ پشت ڈال دینا ممکن نہیں ہوتا، نہ ہی ضروریاتِ زندگی کو ہمیشہ دبائے رکھنا ممکن ہے۔ انسان ان ضروریات کا دباؤ محسوس کرنے اور اکثر اُن کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور ہے۔ زندگی کے تقاضوں کو دبانا کچلنا ہمیشہ اچھا ہی نہیں ہوتا۔ خالقِ حیات نے انھیں عبث نہیں بنایا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ انسان اس کو معطل رکھ کر ہر طرح کے نشو و ارتقاء سے

محروم کردے ۔ ضروریات سے بے نیازی اور بلندی کا مطلب یہ نہیں کہ خود زندگی کو ناکارہ بنا کر چھوڑ دیا جائے

موزوں اور معقول صورت وہ ہوگی جس میں انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کے نشوونما کا پورا موقع ملے اور ساتھ ہی وہ ضروریات کی توہین آمیز حد تک غلامی سے بھی بچا رہے ۔ اسلام کو ایسی شکل مطلوب تھی اور اس نے جسمانی ضروریات اور روحانی میلانات دونوں کے لیے ایک ایسا ہی نظام تجویز کیا ہے ۔ اس نے آزادئ ضمیر کی خاطر داخل میں شعور و احساس بھی پیدا کیا اور خارجی حالات کو بھی سازگار بنایا اس کے برعکس اشتراکیت کا نظریہ یہ ہے کہ آزادئ ضمیر کی واحد ضامن معاشی آزادی ہے ۔ فرد کو نظری قوانین عدل و مساوات کی جو ضمانتیں عموماً دیتے ہیں اُن سے بھی وہ معاشی دباؤ کے سبب محروم ہی رہ جاتا ہے ۔ یہ بات بھی ایک حد تک سچائی کی حامل ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سماج میں معاشی آزادی کی ضمانت فکر و شعور کی ایسی آزادی کے بغیر نہیں دی جا سکتی جس کی جڑیں قلب و ضمیر میں گہری اُتر چکی ہوں ۔ انسان پر ضروریات ، صلاحیتوں اور رجحانات کا جو دباؤ پڑتا ہے اس کا مقابلہ صرف قانون کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا ایک فرد جو پیدائشی طور پر کمزور ہونے کی وجہ سے پیدائش دولت اور ترقی کی دوڑ میں دوسروں کے ساتھ نہیں چل سکتا کچھ عرصہ تو شیخی بگھار سکتا ہے لیکن بالآخر احساسِ کمتری کا شکار ہو کر پیچھے رہ جائے گا ۔ پھر وہ اس مساوات کا طالب بھی نہ رہ جائے گا جس کی ضمانت بالعموم اسے قانوناً حاصل ہوتی ہے ۔ اسی طرح جو فرد غیر معمولی قوت کا اور اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہوگا وہ ایک دن مساواتِ مطلق کے ضابطے توڑتا ہوا آگے نکل جائے گا ۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو اپنے دل میں قانون کے خلاف غیظ و غضب کی پرورش کرے گا آخر کار وہ یا تو سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا یا اس کی صلاحیتیں مُردہ اور قوتِ کار مفلوج ہو جائے گی اور اس کے نتائج کار بہت گر جائیں گے ۔

اگر مساوات کے پیچھے احساسِ حُریت بھی کارفرما ہو اور اُسے قانون کی تائید بھی حاصل رہے تو اس کا احساس کمزور اور طاقتور دونوں میں یکساں اُجاگر رہتا ہے ۔ کمزور میں مساوات کا یہ تصوّر جذبۂ غلو بن کر نمودار ہوتا ہے اور طاقتور میں انکسار و تواضع بن کر ظاہر ہوتا ہے ۔

مساوات کا یہ تصوّر انسانی ذہن میں جاگزیں ہوتے ہی دوسرے بنیادی تصورات سے مربوط ہو جاتا ہے ۔ اللہ پر ایمان ، امت کی وحدت اور اس کے افراد میں ذمہ داریوں کے اشتراک کا تصور اور آگے بڑھ کر ساری انسانیت کی وحدت اور اس میں کفالت باہمی کا اُصول اس مساوات سے پوری

طرح مربوط نظر آنے لگتا ہے۔ اسلام کو یہی کیفیت مطلوب ہے۔ اسی کی خاطر اس نے پہلے تو داخلی اور خارجی دونوں طرح کے ذرائع استعمال کرتے ہوئے ہر فرد کو بنیادی ضروریات کی تکمیل کی ضمانت دی پھر اُسے کامل آزادیٔ ضمیر بھی عطا کی۔

اسلام اپنے نقطۂ آغاز ہی میں ضمیر انسانی کو غیر اللہ کی عبادت اور اطاعت و فرماں برداری سے آزاد کرتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو انسان پر کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جو اُسے مارتا جِلاتا ہو، کوئی دوسرا نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ آسمان و زمین میں بس وہی ایک ذات ہے جو انسان کو رزق عطا کرتی ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان کوئی واسطہ حائل نہیں رکھتا آسمان و زمین میں بس وہی ایک ذات ہے، اس کے ماسوا سب بندے ہیں جو نہ خود اپنے لیے کچھ کر سکتے ہیں نہ دوسرے کے لیے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَ
لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (الاخلاص : ۱تا۴)

"کہو اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا نہ وہ خود جنا گیا اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے"

جب اللہ ایک ہے تو اس کی عبادت بھی یکساں ہوگی۔ سب کے سب لوگ اسی کی طرف متوجہ ہوں گے۔ کسی دوسرے کی عبادت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پھر کسی انسان کو اس کا بھی حق نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا رب قرار دے۔ کسی کو کسی پر اگر کوئی برتری حاصل ہو سکتی ہے تو صرف نیک عمل اور تقویٰ کی بنا پر۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا
نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ (آل عمران : ۶۴)

"کہو! اے اہلِ کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو تمہارے اور ہمارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے"

اپنی اس تعلیم کو اسلام بڑی اہمیت دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن مختلف امور کے سلسلہ میں اسی اصل کا سہارا لیتا ہے۔ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ لوگ انبیاء کرام کی بزرگی کے سبب ان کی عبادت و پرستش کرنے یا اسی قبیل کے کچھ آداب و مراسم بجالانے کی طرف مائل ہوں۔ لہٰذا اسلام نے انسانی ضمیر کو اس سے آزاد رکھنے کا خصوصی اہتمام کیا۔

اللہ تعالیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت فرماتا ہے:

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ (آل عمران: ۱۴۴)

"محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟"

اور اُن کو مخاطب کرتے ہوئے صاف صاف سناتا ہے۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ۔

(آل عمران: ۱۲۸)

"(اے پیغمبر) فیصلہ کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے، چاہے انھیں معاف کرے چاہے سزا دے۔"

اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر کچھ تنبیہہ کے سے انداز میں کہتا ہے:

وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ إِذًا لَأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۴-۷۵)

"اور بعید نہ تھا کہ ہم تجھے مضبوط نہ رکھتے تو تو اُن کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتا۔ لیکن اگر تو ایسا کرتا تو ہم تجھے دنیا میں بھی دُہرے عذاب کا مزا چکھاتے اور آخرت میں بھی دُہرے عذاب کا۔ پھر تو ہمارے مقابلے میں تو کوئی مددگار نہ پاتا۔"

وہ اُن کو حکم دیتا ہے کہ اپنا حقیقی موقف علانیہ سامنے رکھ دیں۔

قُلْ إِنَّمَا أَدْعُو رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِهِ أَحَدًا ۝ قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ

لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ قُلْ إِنِّي لَنْ يُّجِيرَنِي مِنَ اللّٰهِ أَحَدٌ وَّلَنْ أَجِدَ مِنْ دُونِهٖ مُلْتَحَدًا ۝ (جن: ۲۰ تا ۲۲)

"کہو میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور کسی کو بھی اس کا شریک نہیں ٹھیراتا۔ کہو نہ تمہیں ضرر پہنچانا میرے ہاتھ میں ہے نہ راہ پر لانا۔ کہو، مجھے اللہ سے کوئی نہ بچا سکے گا اور نہ اس کے سوا مجھے کوئی جائے پناہ مل سکے گی۔"

عیسیٰؑ ابن مریم کو خدا بنا لینے والوں کا ذکر کرتا ہے تو انھیں ذلت پسندی اور کفر شعاری کا مجرم گردانتا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۚ (المائدہ: ۱۷)

"یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے۔ اے محمدؐ ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح کو اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اُس کو اُس کے سوا اِس ارادے سے باز رکھے۔"

حضرت مسیحؑ کی بابت ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيٓ إِسْرَائِيلَ ۝ (الزخرف: ۵۹)

"وہ صرف ایک بندے ہیں جن پر ہم نے انعام فرمایا اور جنھیں ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ایک مثل بنایا۔"

قیامت کا ایک منظر سامنے لاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ عیسیٰؑ ابن مریم سے لوگوں کے اس زعم کے سلسلے میں جواب طلب فرمائے گا کہ عیسیٰؑ خدا بن کر آئے تھے، اور پھر ایک نہایت مؤثر زوردار اور دل میں گھر کر جانے والے انداز میں حضرت عیسیٰؑ کو اس تہمت سے بری فرمائے گا جس سے ان کا دامن بالکل پاک تھا:

وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي

وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْ أَنْ
أَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ط إِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ط تَعْلَمُ مَا فِيْ
نَفْسِيْ وَلَا أَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ط إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ
لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِيْ بِهٖ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ج وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ
شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ج فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيْبَ
عَلَيْهِمْ ط وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ
عِبَادُكَ ط وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(المائدہ: ۱۱۶ تا ۱۱۸)

"جب اللہ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تونے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنالو۔؟ تو وہ جواب میں عرض کرے گا "سبحان اللہ" میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا۔ اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا۔ آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے، اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے۔ آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔ میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا۔ یہ کہ اللہ کی بندگی کرو وہ میرا بھی رب ہے۔ اور تمہارا بھی رب ہے۔ میں اُسی وقت تک اُن کا نگران تھا جب تک کہ میں اُن کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بُلا لیا تو آپ اُن کے نگران تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگراں ہیں۔ اب اگر آپ انھیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں۔ اور اگر آپ معاف کردیں تو آپ غالب اور دانا ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے بندوں کے بندوں کو الٰہ بنا لینے کی ایک عملی مثال بھی پیش کی ہے جس میں عقیدہ کے اعتبار سے الٰہ نہیں بنایا گیا تھا بلکہ بندوں سے قانونِ زندگی حاصل کیا گیا تھا ایسا کرنے کے سبب اللہ نے انھیں رب بنانے کا مجرم گردانا اگرچہ نہ اُن کی اُلوہیت کا عقیدہ اختیار کیا گیا تھا نہ اُن کے آگے مراسمِ عبودیت بجالائے گئے تھے۔

اِتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ج وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا ج

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ہ (توبہ: ۳۱)

"انھوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وہ جس کے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔"

اسی طرح قرآن اس عقیدہ کو ذہنوں میں جماتا اور اس طرح کی تشریح و توضیح کرتا رہتا ہے تاکہ انسانی ضمیر کو الوہیت اور تقدس میں کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانے کی غلطی سے محفوظ کرے کہ شرک ضمیر کو کچلتا اور وجدان کو دباتا ہے اور بالآخر اسے اللہ کے بندوں ہی میں سے کسی کا بندہ بنا کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی اگر خدا کا نبی یا رسول ہو تو بھی وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہی رہتا ہے خدا نہیں ہو جاتا۔

جب اس بات کی نفی ہو گئی کہ اللہ کے سامنے کوئی بندہ کسی دوسرے بندہ سے بحیثیت بندہ کے کسی امتیاز کا حامل ہے تو اسی سے اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطوں اور وسیلوں کی بھی آپ سے آپ نفی ہو گئی۔ اب کہانت یا توسل کا کوئی سوال باقی نہیں رہا۔ بلکہ ہر فرد اپنے خالق سے براہِ راست تعلق جوڑے گا۔ اس کی کمزور اور فانی ذات ازل و ابد کی بے پایاں قوت سے تعلق جوڑے گی تاکہ اس سے طاقت و عزت اور جرأت و ہمت حاصل کرے۔ اس کے رحم و کرم اور لطف و عنایت کی چاشنی پائے اور اس کی روحانیت میں بھی اضافہ ہو۔

اسلام کو اس کی بڑی فکر ہے کہ یہ تعلق مضبوط ہو اور فرد کو یہ احساس دلایا جائے کہ وہ رات کی گھڑیوں اور دن کے اوقات میں، ہر وقت، اس عظیم و بے پایاں قوت سے مدد چاہ سکتا ہے:

اَللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ (الشوریٰ: ۱۹)

"اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔"

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ط اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ہ (البقرہ: ۱۸۶)

"اور اے نبی! میرے بندے اگر میرے متعلق تم سے پوچھیں تو انھیں بتادو کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں۔ جب پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سُنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا اُنھیں چاہیئے کہ وہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ یہ بات تم انھیں سُنادو شاید کہ وہ راہ راست پالیں۔"

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ط اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ٥ (یوسف : ۸۷)

"اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔"

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط (الزمر : ۵۳)

"کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنے ساتھ ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ گناہوں کو اکٹھا معاف کر دیتا ہے۔"

اسلام نے پانچ نمازیں فرض قرار دی ہیں، جن میں بندہ روزانہ چند متعین اوقات میں اپنے رب کے حضور کھڑا ہوتا ہے، جس میں مخلوق اپنے خالق سے تعلق جوڑتی ہے۔ وہ اوقات اس کے علاوہ بھی جب خود اس کا جی چاہے کہ وہ اپنے آقا کے حضور کھڑا ہو، اس کی طرف متوجہ ہو، دعا کرے اور اس سے لَو لگائے رہے۔ نماز یا دعا کا مطلب صرف مخصوص الفاظ و حرکات کی ادائیگی نہیں بلکہ اصل یہ ہے کہ بیک وقت دل، دماغ اور جسم سمیت پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہو ___ اسلام کے اس کلی اور بنیادی فکر سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے کہ انسان ساخت و پرداخت میں اور خالق کائنات اپنی الوہیت میں ایک ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ٥ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ٥

(الماعون : ۴-۵)

"تباہی ہے ایسے نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے ہیں۔"

ضمیر انسانی بندوں کی غلامی سے آزاد اور تعلق باللہ کے ہمہ دم بیدار شعور سے معمور ہوتے ہی جان و مال اور عزّ و جاہ کے سلسلہ میں ہر طرح کے خطرات اور اندیشوں سے بلند ہوجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اندیشے اور خطرات بڑے ہی مہلک ہوتے ہیں۔ یہ انسان کی خودداری کو مجروح کر دیتے ہیں اور بسا اوقات تو اسے ذلّت گوارا کرنے، بہت سے حقوق سے دست بردار ہوجانے اور بڑی حد تک اپنے عزّ و شرف سے ہاتھ دھو لینے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ اسلام اس بات کو بڑی اہمیت دیتا ہے کہ لوگوں کی عزّت و آبرو اور اُن کے شرف و جاہ کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔ ان میں صحیح قسم کی خودداری اور عزّتِ نفس پرورش پائے اور وہ عدل وانصاف کے قیام کے نگران و محافظ بن کر رہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس طرح قانون کے علاوہ ان باتوں کے ذریعہ بھی وہ ایک مکمّل اور مطلق اجتماعی عدل کے قیام کی ضمانت دے جس میں کوئی انسان اپنی حد سے تجاوز نہ کرے ـــــ ان اغراض و مقاصد کے پیشِ نظر اسلام کو اس بات کی خصوصی فکر ہے کہ انسان اپنی جان، پیٹ بھرنے کے لیے غذا اور زندگی میں اپنی حیثیت اِن تمام کے سلسلے میں ہر طرح کے خوف و خطر سے آزاد رہے۔ زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کسی مخلوق میں اتنی قدرت نہیں کہ وہ اِس کی مدّتِ عمر میں سے ایک گھڑی یا اس سے کم کے بقدر بھی کمی بیشی کر سکے۔ کوئی مخلوق زندگی میں سے ایک سانس بھی نہیں کم کر سکتا نہ ہی ذرہ برابر نقصان پہنچانے کی سکت رکھتا ہے:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا ۗ (آل عمران: ۱۴۵)

"کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔"

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا ج (التوبہ: ۵۱)

"کہو، ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے اللہ ہی ہمارا مولا ہے۔"

لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ط إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝ (یونس: ۴۹)

"ہر اُمّت کے لیے مہلت کی ایک مدّت ہے۔ جب یہ مدّت پوری ہوجاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی۔"

یہاں بُزدلی اور بزدلوں کی گنجائش نہیں، کیونکہ زندگی اور موت اور نفع و نقصان سب

کچھ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ ط (الانعام ۱۴)

"کہو کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں درآں حالیکہ وہی ارض وسما کا خالق ہے اور وہی (سب کو) روزی دیتا ہے، روزی لیتا نہیں ہے"

اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ط (الرعد: ۲۶)

"اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا رزق دیتا ہے"

وَکَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّۃٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَھَا ق اَللّٰہُ یَرْزُقُھَا وَاِیَّاکُمْ۔ (العنکبوت: ۶۰)

"کتنے ہی جانور ایسے ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی انھیں بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی"

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَمَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰہُ ج (یونس: ۳۱)

"ان لوگوں سے پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظمِ عالم کی تدبیر کررہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے اللہ"

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ ط ھَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰہِ یَرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ط لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ o (فاطر: ۳)

"اے لوگو! اپنے اوپر اللہ کی نعمتیں یاد کرو۔ کیا اُس خدا کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے

جو آسمان و زمین سے تم کو روزی فراہم کرتا رہتا ہے؟ بجز اس کے کوئی الٰہ نہیں۔ پھر تم کہاں بہکے جا رہے ہو؟"

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ

(الانعام: ۱۵۱)

"اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔"

وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ؕ

(التوبہ: ۲۸)

"اگر تمہیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے۔"

قرآن بتاتا ہے کہ فقر و فاقہ کا خوف دراصل شیطانی وسوسہ کا نتیجہ ہے جو اس طور پر ہماری طبیعت کو کمزور بنا کر ہم سے خود اعتمادی، خودداری اور اعتماد علی اللہ کی قیمتی صفات چھین لینا چاہتے ہیں۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (البقرہ: ۲۶۸)

"شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرز عمل کی ترغیب دیتا ہے مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔"

اس حقیقت کے پیش نظر یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی کہ حصول معاش لوگوں کو سر جھکانے پر مجبور کر دے۔ ان کی روزی دراصل صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بندوں میں سے حقیر و ضعیف بندوں میں سے کسی کو اتنی قدرت نہیں حاصل کہ کسی آدمی کو روزی دے یا اس میں کچھ تنگی ڈال سکے اس بات سے اسباب و وسائل کی نفی نہیں ہوتی۔ البتہ یہ خیال دل کو مضبوط بناتا ہے، ضمیر کو قوت بخشتا ہے اور مفلس طالبِ معاش کو پوری قوت و ہمت کے ساتھ ان سے آنکھیں چار کرنے کے قابل بناتا ہے جن کے ہاتھ میں بظاہر اس کے رزق کی کنجی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اب خطرات و اندیشے اس کو اپنی خودداری اور عزتِ نفس کو قائم رکھنے اور اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنے سے نہیں روک سکتے

اور نہ اس بات پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ روزی پر آنچ نہ آنے دینے کی خاطر وہ اپنی واقعی اُجرت یا اپنی عزت و شرافت سے دست بردار ہو جائے۔

قرآن کی ہدایت اور اسلام کے مزاج کو اسی انداز سے سمجھنا چاہئیے کہ یہی وہ عمیق فہم ہے جو قانون سازی اور تلقین و ہدایت کے سلسلہ میں اسلام کے بنیادی اور عمومی فلسفہ سے ہم آہنگ ہے۔

مقام و منزلت کے چھین جانے کا خوف بھی موت اور مصیبت اور فقر و فاقہ کے خوف کا ہم پلہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام چاہتا ہے کہ فرد کو اس خوف سے بھی نجات دلائی جائے کہ اس معاملہ میں بھی کوئی بندہ کسی بندہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (آل عمران : ۲۶)

"کہو خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ فَأَنَّىٰ تُسْحَرُونَ ۝

(المؤمنون : ۸۸-۸۹)

"کہو ساری موجودات کی شہنشاہی کس کے ہاتھ میں ہے اور کون ہے جو پناہ دیتا ہے لیکن جس کے مجرم کو پناہ دینے والا کوئی نہیں۔ اگر تم جانتے ہو (تو اس کا جواب دو) وہ جواب دیں گے کہ اللہ۔ کہو، پھر کس جادو کے پیچھے (حق سے دور) چلے جا رہے ہو۔"

إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ ۝ (آل عمران : ۱۶۰)

"اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمہیں چھوڑ دے

تو اُس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہے ۔"

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ (فاطر : ۱۰)

" جسے عزت کی طلب ہو وہ جان لے کہ عزت ساری کی ساری صرف خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے ۔"

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (المنافقون : ۸)

" عزت اللہ کو سزاوار ہے اور (پھر اس کے ذریعہ) اس کے رسول اور مومنین کے لیے ۔"

پس اس پہلو سے بھی اندیشہ وخطرہ کا کوئی سوال باقی نہیں رہا کہ قدرت وطاقت صرف اللہ واحد کی ذات کو میسر ہے اور عزت ساری صرف اُسی کے حصہ میں آئی ہے ۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝

(الانعام : ۱۸)

" وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور دانا اور باخبر ہے ۔"

تقدس سے مرعوبیت یا جان ومال اور مقام ومنزلت کے بارے میں اندیشوں اور اُن کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی غلامانہ ذہنیت سے تو انسان جلد آزاد ہو جاتا ہے لیکن ان اجتماعی قدروں کی پرستش سے بچنا بڑا مشکل ہے جو مال ودولت ، جاہ وحشمت اور حسب ونسب پر مبنی ہوتی ہیں ۔ خواہ وہ انسان کو نہ فائدہ پہنچا سکتی ہوں نہ نقصان ۔ چنانچہ جب وجدان ان اقدار میں سے کسی سے مرعوب ومتاثر ہو جاتا ہے تو اسی تاثر کی حد تک اس کی آزادی بھی چھن جاتی ہے اور جن لوگوں کو یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں ان کے سامنے وہ حقیقی مساوات کے شعور سے محروم ہو جاتا ہے ۔ یہاں اسلام آگے بڑھتا ہے اور بلا کسی افراط وتفریط کے ان تمام اقدار کو ان کے اس مقام پر رکھتا ہے جو اُنہیں زندگی میں واقعتہً حاصل ہونا چاہیئے وہ حقیقی قدروں کو ان معنوی اور قائم بالذات مطلق اور غیر اضافی معیاروں پر پرکھتا ہے جو وہیں کہیں انسان کے اندر اس کے ذہن کے کسی گوشے میں مستور ہوتے ہیں یا اس کے عمل میں نمایاں اور ظاہر ہوتے ہیں ۔ اُس کے

نتیجہ میں اُن مادّی اقدار کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ ان کا نفسیاتی اثر کمزور ہو جاتا ہے اور یہ چیزیں بھی اسلام کی دی ہوئی اقتصادی اور قانونی ضمانتوں کے پہلو بہ پہلو کامل آزادیٔ ضمیر کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط (الحجرات: ۱۳)

"اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ لوگ ہیں جو سب سے زیادہ متقی ہوں۔"

اور ظاہر ہے کہ صحیح معنی میں معزز وہی ہے جو اللہ کے نزدیک بھی معزز قرار پا سکے۔

وَقَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ہ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ہ وَمَا اَمْوَالُکُمْ وَلَا اَوْلَادُکُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُکُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَھُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ

(سبا: ۳۵ تا ۳۷)

"اور انھوں نے کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال و اولاد رکھتے ہیں، اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔ کہو میرا رب جس کے لیے چاہتا ہے روزی میں فراخی پیدا کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگی۔ لیکن اکثر لوگ ناسمجھ ہیں۔ تمہارے اموال و اولاد تمہیں اللہ سے قریب کرنے والی چیز نہیں۔ البتہ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ بجالائے تو ایسے لوگوں کے لیے ان کے عمل کی بدولت کئی گنا اجر ہوگا اور وہ بالا خانوں میں سکون کے ساتھ استراحت پذیر ہوں گے۔"

اولاد اور مال و دولت کے اعتبار سے کوئی بڑھ چڑھ کر ہے تو ہوا کرے۔ اِن چیزوں کو اتنی قدر و قیمت حاصل نہیں کہ اس کو کوئی امتیاز یا بلندی عطا کر دیں۔ اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا، اسلیے کہ معیار کا کام صرف دو بنیادی حقیقی قدریں کرتی ہیں، ایمان، جو ایک داخلی قدر ہے اور عملِ صالح جو عملی زندگی میں نمایاں اور ظاہر ہے۔

ساتھ ہی ایسا بھی نہیں کہ اسلام مال و اولاد کی واقعی قدر و قیمت میں کوئی کمی کرتا ہو، "اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَۃُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ج" (مال و دولت اور بیٹے دنیا کی زینت ہیں)

محض زینت۔ اس سے آگے بڑھ کر اُن کو ان قدروں میں سے نہیں شمار کیا جا سکتا جو انسان کی بلندی
وپستی کا اصل معیار ہیں:۔ "وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا"
(باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجہ کے لحاظ سے بہتر ہیں اور ان ہی سے اچھی امیدیں وابستہ
کی جا سکتی ہیں۔ (الکہف: ۴۶)

قرآن نے مادی اور معنوی قدروں کی حقیقت دو آدمیوں کی نفسیات کی عکاسی کر کے
اس طرح واضح کر دی ہے کہ اس کے بعد اس بارے میں شبہ کرنے کی گنجائش نہیں باقی رہتی کہ ان قدروں
میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح حاصل ہے۔ اس نے ایک مومن کی نفسیات اور اس کے ذہن میں
مختلف افکار کو جو مقام حاصل ہوتا ہے اس کی پوری پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ
وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ
اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝ وَّكَانَ لَهٗ
ثَمَرٌ ج فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۝
وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ج قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ
اَبَدًا ۝ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً لا وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ
خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ
خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ
رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ
لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ۝ فَعَسٰى رَبِّيْٓ
اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ
صَعِيْدًا زَلَقًا ۝ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ۝
وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ
عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ
فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝ (الکہف: ۳۲ تا ۴۳)

" اے محمدؐ! ان کے سامنے ایک مثال پیش کرو۔ دو شخص تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیے اور اُن کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑھ لگائی اور اُن کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور بارآور ہونے میں انھوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی۔ اُن باغوں کے اندر ہم نے ایک نہر جاری کر دی اور اُسے خوب نفع حاصل ہوا۔ یہ کچھ پاکر ایک دن وہ اپنے ہمسائے سے بات کرتے ہوئے بولا:
" میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں ــــــــ اور تجھ سے زیادہ طاقتور نفر رکھتا ہوں"۔ پھر وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اور اپنے نفس کے حق میں ظالم بن کر کہنے لگا: " میں نہیں سمجھتا کہ یہ دولت کبھی فنا ہو جائے گی اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی۔ تاہم اگر مجھے کبھی اپنے رب کے حضور پلٹایا بھی گیا تو ضرور اس سے بھی زیادہ شاندار جگہ پاؤں گا"۔ اس کے ہمسایہ نے یہ گفتگو کرتے ہوئے اس سے کہا۔" کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا۔ اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کر کھڑا کیا؟ رہا میں تو میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اور جب تو اپنی جنت میں داخل ہو رہا تھا تو اُس وقت تیری زبان سے یہ کیوں نہ نکلا کہ مَاشَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ[1] اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کم تر پا رہا ہے تو بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تیری جنت سے بہتر عطا فرما دے اور تیری جنت پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے۔ یا اس کا پانی زمین میں اُتر جائے۔ اور پھر تو اسے کسی طرح نہ نکال سکے"۔ آخر کار ہوا یہ کہ اُس کا سارا ثمرہ مارا گیا اور وہ اپنے انگوروں کے باغ کو ٹٹیوں پر اُلٹا پڑا دیکھ کر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور کہنے لگا کہ " کاش میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا ــــــــ نہ ہوا اللہ کو

---

[1] یعنی جو کچھ اللہ چاہے گا وہی ہوگا۔ میرا اور کسی کا کچھ زور نہیں۔ ہمارا اگر کچھ بس چل سکتا ہے تو اللہ ہی کی توفیق و تائید سے چل سکتا ہے۔

چھوڑ کر اس کے پاس کوئی جتھا کہ اس کی مدد کرتا، اور نہ کر سکا وہ آپ ہی اس آفت کا مقابلہ۔"

اس طرح مردِ مومن کا اپنے ایمان ہی کو عزت کا مدار سمجھنا اور ان کا ان مادی اقتدار کو حقیر جاننا واضح طور پر سامنے آجاتا ہے جن کو اس کے بحث کرنے والے ساتھی نے اپنی عزت کا مدار سمجھا تھا مثال میں ایک جاذبِ توجہ مقام یہ بھی ہے کہ گو باغ کو اپنی عزت کا مدار بنانے والے ساتھی نے باقاعدہ شرک باللہ کا اظہار نہیں کیا تھا پھر بھی قرآن نے اسے مشرک ہی قرار دیا اور آگے چل کر اُس سے بھی اپنے شرک کا اعتراف کرایا۔ دراصل بات یہ تھی کہ اس نے ایک خالص مادی قدر کو شریک ٹھیرایا اور اُسے ذہن و شعور میں وہ مرتبہ دیا جو صرف اس ذاتِ واحد کے لئے مخصوص ہے! حالانکہ سچا مومن کسی چیز کو بھی اللہ کا شریک نہیں ٹھہراتا۔

قارون کے قصہ میں بھی قرآن نے مال و دولت کے سلسلہ میں دو مختلف طرزِ فکر کے حامل لوگوں کے ذہن کی عکاسی کی ہے۔ ایک تصویر ان لوگوں کی ہے جن کی آنکھوں کو یہ مادی قدریں خیرہ کر دیتی ہیں۔ اور وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر مال داروں کے سامنے خود کو حقیر وضعیف جاننے لگتے ہیں۔ دوسری تصویر ان مومن ذہنوں کی ہے جن کے اندر قوت وعزت اور وقار کا شعور ہمیشہ بیدار رہتا ہے جو کبھی کمزوری نہیں محسوس کرتے۔ نہ احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ص وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ
مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوأُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ ق إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ
لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۝ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ
الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ
اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝
قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي ط أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ قَدْ
أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ
جَمْعًا ط وَلَا يُسْأَلُ عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ ۝ فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ فِي
زِينَتِهِ ط قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ

مَا اُوْتِیَ قَارُوْنُ لا اِنَّہٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ہ وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ
وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ج وَلَا یُلَقّٰھَا
اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ہ فَخَسَفْنَا بِہٖ وَبِدَارِہِ الْاَرْضَ ق فَمَا کَانَ لَہٗ
مِنْ فِئَۃٍ یَّنْصُرُوْنَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ق وَمَا کَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِیْنَ ہ
وَاَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَکَانَہٗ بِالْاَمْسِ یَقُوْلُوْنَ وَیْکَاَنَّ اللّٰہَ
یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَیَقْدِرُ ج لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰہُ عَلَیْنَا
لَخَسَفَ بِنَا ط وَیْکَاَنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْکٰفِرُوْنَ ہ ع (القصص : ۷۶ تا ۸۲)

"قارون موسیٰؑ کی قوم کا ہی ایک فرد تھا۔ مگر وہ ان کے برخلاف راہ پر چل پڑا۔ ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے کہ جن کی کنجیاں اُٹھانا طاقتور آدمیوں کے ایک گروہ پر بھی بار ہوتا۔ جب اس سے قوم نے کہا کہ اترا مت، اللہ کو اترانے والے نہیں بھاتے۔ جو کچھ اللہ نے تجھے دے رکھا ہے اُس کے ذریعہ آخرت کو اپنا مطمحِ نظر بنا اور دنیا میں سے اپنا حصہ نہ بھول جا۔ اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اسی طرح تو بھی لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک اختیار کر۔ زمین میں فساد نہ مچا اللہ فسادی لوگوں کو نہیں پسند کرتا۔ (قارون نے) کہا کہ یہ (مال ودولت) تو مجھے میرے ہنر کے سبب ملا ہے۔ کیا قارون کو اس حقیقت کا احساس نہ ہوا کہ اس سے پہلے اللہ ایسی قوموں کو ہلاکت کے گھاٹ اُتار چکا ہے جو قوتِ بازو اور تعداد دونوں میں اس سے بڑھ چڑھ کر تھیں اور (قیامت کے دن جب حساب کتاب ہوگا تو) ایسے مجرموں سے اُن کے گناہ کے بارے میں پوچھ گچھ بھی نہیں ہوگی۔ اب قارون ہر طرح کے ساز و سامان کے ساتھ قوم کے سامنے آیا۔ حیاتِ دنیا کے طلبگار پکار اُٹھے کہ کاش ہم کو بھی قارون جیسا نصیب ملا ہوتا، یہ تو بڑی اچھی قسمت والا ہے۔ سمجھ بوجھ رکھنے والوں نے کہا بدبختو ایمان لانے اور عملِ صالح کرنے والوں کے لیے اللہ کی عطا کردہ اخروی جزا ہی بہتر ہے۔ البتہ یہ صرف صابرین کے ہاتھ آسکے گی۔ چنانچہ ہم نے قارون کو اس کے گھر سمیت زمین میں دھنسا دیا۔ اللہ سے بچانے

کے لیے نہ کوئی گروہ تھا جو اس کے کام آسکتا نہ وہ کہیں اور سے کسی طرح کی مدد حاصل کر سکا۔ کل جن لوگوں نے اس کی پوزیشن کی تمنا ظاہر کی تھی وہ کہنے لگے: آہ (اب یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ) درحقیقت اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کو مناسب سمجھتا ہے رزق میں کشادگی عطا کرتا ہے اور (جس کے لیے مناسب سمجھتا ہے) تنگی پیدا کرتا ہے۔ اللہ نے اگر ہم پر کرم نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیا ہوتا۔ آہ، حقیقت یہی ہے کہ کفر کی روش اختیار کرنے والے فلاح نہیں پا سکتے۔"

اسلام اپنے اس فکر پر مختلف نتائج ترتیب دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حباب بر آب مال و متاع کو کسی قدر و قیمت کا حامل قرار دینے سے منع کرتا ہے جو بعض لوگوں کے لیے مایۂ ناز اور باعثِ افتخار ہے، کیونکہ وہ آزمائش اور امتحان کے لیے دی جاتی ہے:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ○ (طٰہٰ: ۱۳۱)

"ان لوگوں (اہلِ دنیا) کو ہم نے جو مال و متاع دے رکھا ہے اس کی طرف للچائی نظریں نہ اٹھا۔ یہ دنیاوی زندگی کی آب و تاب ہے جس کے ذریعہ ہم اُن لوگوں کو آزماتے ہیں۔ تیرے رب کے پاس جو رزق ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائدار بھی۔"

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اور اس طرح کی آیتیں غریبوں کو اپنی حالت پر قناعت کرنے اور امراء کو ان کی امارت و ثروت میں مست چھوڑ دینے کی دعوت دیتی ہیں۔ یہ سراسر غلط استنباط ہے۔ اس آیت کی یہ تفسیر اسلام کی رُوح سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ دراصل یہ اُن پیشہ ور دینداروں کی تفسیر ہے جن کی غرض ہی یہ رہی ہے کہ ملوکیت اور استبداد کے دور میں عوام کے شعور و احساس کو مردہ و بے جان کر کے انھیں اجتماعی عدل کے مطالبہ سے باز رکھیں۔ اُن کا جُرم اُن کے سر ہے۔ اسلام اُن کی اس توڑ مروڑ سے بری ہے۔ فی الحقیقت یہ اور اس طرح کی دوسری آیات اس لیے آئی ہیں کہ انسانی قدروں کو اُن کا کھویا ہوا مقام واپس دلائیں اور غریبوں کے ذہن و

شعور کو اس کمزوری اور بے ہمتی سے نکالیں جس میں وہ مال و متاع جیسی خالص مادی قدروں سے مرعوب ہو کر مبتلا ہو جایا کرتے ہیں۔

ہماری اس توجیہہ کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تلقین فرمائی کہ ان قدروں کو کوئی اہمیت نہ دیں اور نہ ہی اُن کو معیار بنا کر لوگوں کا مقام متعین کر دیں:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝ (الکہف: ۲۸)

"اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اُسے پکارتے ہیں، اور اُن سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہش پر چلتا ہے اور جس کا طریقِ کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔"

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

(التوبہ: ۵۵)

"اُن کے مال و دولت اور ان کی کثرتِ اولاد کو دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ، اللہ تو ان چیزوں کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی ہی میں مبتلائے عذاب کرنے والا ہے اور یہ جان بھی دیں گے تو انکارِ حق ہی کی حالت میں دیں گے۔"

اس سلسلہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن اُمّ مکتوم نامی نابینا اور سردار قوم ولید بن مغیرہ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ قابل ذکر ہے ـــــ وہ واقعہ جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر عتاب فرمایا:

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝ اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝

وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ فَاَنْتَ
عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۘ (عبس ۱۰ تا ۱۲)

"اندھے کے آنے پر تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔ تجھے کیا معلوم کہ وہ تزکیہ حاصل کرتا یا اُسے تذکر ہوتا اور یہ یاد دہانی اس کے لیے نفع بخش ثابت ہوتی۔ جو استغنا برتتا ہے تو تو اُس کے پیچھے پڑتا ہے، اور تجھ پر گناہ نہیں کہ وہ نہیں سنورتا، اور جو خود سے دوڑ کر تمہارے پاس آتا ہے اور اس کے اندر خشیت (الٰہی) موجود ہوتی ہے تو اس سے تم بے توجہی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں (یہ رویہ غلط ہے) یہ تذکرہ ہے پس جو چاہے اس سے یاد دہانی حاصل کرے۔"

یہ لمحہ انسانی حرص کا ایک لمحہ تھا جو محمد ــــــ صلی اللہ علیہ وسلم ــــــ پر آپ کی اس فکر میں گذر گیا کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ ولید کو اسلام کی طرف مائل کردے۔ چنانچہ جب ابن ام مکتوم کچھ قرآن سیکھنے آپؐ کے پاس آئے تو آپ ولید سے گفتگو میں مصروف تھے، اب یہ آپؐ کو پکارے جا رہے ہیں اور آپؐ ہیں کہ ولید ہی کے سلسلہ میں مصروف رہے اور ان کی اس بات کو بُرا مانا یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر شکن آگئی۔ اس پر آقا نے اتنا شدید عتاب فرمایا جو جھڑکی کی سرحدیں چھو رہا ہے۔ یہ کیوں؟ تاکہ جن قدروں پر اسلام کی عزت و سربلندی کا مدار ہے وہ اپنی صحیح اہمیت کے ساتھ واضح ہو جائیں اور آزادیٔ ضمیر کے سلسلے میں اس کا موزوں رجحان اور مناسب طریقہ عملاً متحقق ہو سکے۔

انسان تقدس اور بزرگی سے مرعوبیت اور اس کی پرستش کے پھندے سے جلد نکل آتا ہے اور الا ماشاء اللہ بڑی حد تک موت، دوسرے مصائب نقر و فاقہ اور ذلت و خواری کے خوف سے بھی نجات حاصل کر لیتا ہے۔ وہ دوسری سماجی قدروں اور تمام خارجی معیاروں کے دباؤ سے بھی آزاد ہو جاتا ہے۔ لیکن نفس کے لیے خود اپنی غلامی سے نکلنا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرغوبات اور خواہشات کا غلام بنا رہتا ہے، اپنی اغراض و ہوا کے چکر سے نہیں نکل پاتا۔ خارج سے آزادی پانے کے بعد انسان داخل کے بندھنوں میں بندھ جاتا ہے اور ایسی شکل میں وہ شعور و وجدان کی اس مکمل آزادی تک نہیں پہنچ سکتا جس تک اسلام اس کو عظیم الشان اور ہمہ گیر انسانی عدلِ اجتماعی کے قیام کی خاطر پہنچانا

چاہتا ہے۔

آزادیٔ ضمیر اور حریتِ وجدان کے لیے اس پوشیدہ مگر زبردست خطرہ سے اسلام غافل نہیں بلکہ اس کی طرف بڑی گہری توجہ کرتا ہے۔ اور یہ توجہ گواہ ہے کہ اسلام انسان کے داخل کو سنوارنے کا بڑا اہتمام کرتا ہے۔ اس سے ہم اس بات کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ کس طرح اسلام نفس انسانی کے ہر پہلو کی داشت و پرداخت کرتا اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے رکھتا ہے اس سلسلے میں مسیحیت نے جو کچھ سمجھا اور جسے اس نے اپنی آخری منزل قرار دیا وہ سب بھی اسلام کے سامنے ہے:

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ (التوبہ: ۲۴)

"اے نبی! کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ کی جدوجہد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔ اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔"

یہاں اسلام نے ایک ہی آیت میں ہر طرح کے لذائذ و مرغوبات گِنا دیے ہیں۔ اور نفس انسانی کے تمام کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کردی ہے تاکہ ایک پلڑے میں ان سب کو اور دوسرے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت اور اس کی راہ میں جہاد کی تڑپ کو رکھ کر انسان اچھی طرح موازنہ کرکے فیصلہ کرے تاکہ اس کے بعد قربانی و ایثار بھی تکمیل کو پہنچے اور شہوات کے پھندوں سے آزادی بھی مکمل ہو جائے اسلام کو وہی "نفس" مطلوب ہے جو ان تمام بندھنوں سے آزاد ہو چکا ہو اور ان تمام بندھنوں کو

توڑ چکا ہو۔ وہ دعوت دیتا ہے کہ نفس کو اس سانچہ میں ڈھالا جائے تاکہ وہ حقیر ضروریات سے بلند ہو جائے۔ آپ اپنے قابو میں رہے اور عارضی اور حقیر مرغوبات کی بجائے اِن چیزوں کی طرف لپکے جو بلند تر اور وسیع تر ہوں۔ اسی طرح اسلام کہتا ہے کہ :

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۞ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۚ (آل عمران: ۱۴-۱۵)

"لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں۔ مگر یہ سب چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے ؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں اُن کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی، پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔"

یہ تلقین نہ تو غفلت و جمود میں مبتلا رکھنے کی کوشش ہے نہ ہی ترکِ دنیا اور پاکیزہ و حلال چیزوں سے پرہیز کی دعوت، جیسا کہ بعض مفسرین نے اپنے ذوق کی مناسبت سے سمجھا ہے، یا جیسا کہ مخالفین، اسلام کو بدنام کرنے کے لیے اس کے سر تھوپتے ہیں، یہ تو طبیعت اور خواہش کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی دعوت ہے۔ اگر انسان زندگی اور اس کی مسرتوں اور لذتوں کا غلام بننے کی بجائے انہیں قابو میں رکھے رہے تو اُن سے لطف اندوز ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ

الرِّزْقِ ط (اعراف : ۳۲)

"کہیے اللہ نے جو زینت اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اس کو اور کھانے پینے کی اشیاء میں سے پاکیزہ چیزوں کو کس نے حرام ٹھہرایا؟"

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا۔ (قصص : ۷۷)

"دنیا میں اپنا حصہ (حاصل کرنا) نہ بھول جانا"[1]

اس سلسلہ کی ایک کڑی روزہ کی فرضیت بھی ہے تاکہ کچھ عرصہ نفس طبیعت کے شدید تقاضوں اور بنیادی ضرورتوں سے بھی بلند رہے اور نتیجتہً اس کے ارادہ میں مزید قوت اور بلندی پیدا ہو اور اس طرح اپنی ضروریات سے بلند ہونے کے بعد اسی نفس کو لیے ہوئے انسان اپنی ذات سے بھی بلند ہو جائے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے اسلام مختلف طریقے اختیار کرتا ہے اور انہی طریقوں میں سے ایک طریقہ فتنۂ مال و اولاد کی طرف سے چوکنا رہنے کی تلقین بھی ہے۔

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ط (تغابن : ۱۵)

"تمہارے اموال اور تمہاری اولادیں دراصل تمہارے لیے سامانِ آزمائش ہیں"

مال و اولاد کی محبت اور اس سلسلہ میں اپنی فطری کمزوری کے اتباع میں جو خطرات ہیں ان سے اسلام انسان کو آگاہ کرتا اور خود کو محفوظ رکھنے کا جذبہ ابھارتا ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ انسان پر مال و اولاد کے اندر اس کے انہماک و دلچسپی کی راہ سے حملہ ہوتا ہے ایسی صورت میں وہ کچھ بھی قبول کر لیتا ہے جو کسی دوسرے طریقہ سے نہ مانتا۔ ایسے ایسے موقعوں پر گھٹنا ٹیک دیتا ہے جہاں وہ بصورتِ دیگر کبھی نہ سر جھکاتا اور وہ کچھ کر گذرتا ہے جو کسی دوسرے سلسلہ میں اس سے کبھی سرزد ہوتا۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صاحبزادی کے دونوں بیٹوں میں سے ایک

---

[1] مصنف نے آیت کو متعدد جگہ انہی معنی میں پیش کیا ہے جو ہمارے ترجمہ اور موقعِ استعمال سے ظاہر ہیں۔ لیکن محققین اس مفہوم سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ آیت حیاتِ دنیا کے چند روزہ ہونے کی حقیقت یاد دلاتی ہے۔ لیکن اس اختلاف کا اثر مصنف کی اصل بات پر نہیں پڑتا۔ (مترجم)

گود میں لیے نکلے اور آپؐ کی زبان پر یہ جملہ تھا:

اِنَّكُمْ لَتُبَخِّلُونَ وَتُجَبِّنُونَ وَتُجَهِّلُونَ۔ (ترمذی)

"(اولاد کو مخاطب کر کے فرمایا) تم ہی بخیل بناتے ہو اور بزدل بھی اور تم ہی جہالت میں مبتلا کر دیتے ہو"

آدمی ان تمام چیزوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے جو اس کے عزّ و شرف پر کھلے بندوں حملہ آور ہوتی ہوں۔ لیکن یہی انسان کبھی حاجت مند بھی ہوتا ہے ——— کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک لقمہ کا محتاج ہے ——— بس یہاں آکر وہ ذلیل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ ذلّت و خواری کی طرف لے جانے میں ضرورت سب سے آگے آگے ہے۔ خالی پیٹ کو اونچی باتیں نہیں سوجھتیں۔ انسان کبھی دستِ سوال دراز کرنے پر بھی مجبور ہوتا ہے اور یہ چیز اس کی عزتِ نفس کو خاک میں ملا کر رکھ دیتی ہے۔ یہاں اسلام آگے بڑھتا ہے اور معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ وہ اِس مسئلہ کو قوانین بنا کر حل کرتا ہے جو ایک طرف تو فقر و حاجتمندی پیدا کرنے والے اسباب کا سدِّ باب کرتے ہیں اور دوسری طرف اگر یہ خرابی پیدا ہی ہو جائے تو اُس کا ازالہ کرتے ہیں۔ چنانچہ قوم کے ذی استطاعت لوگوں اور ریاست پر فرد کا حق بقدرِ کفایت لازم قرار دیا گیا ہے اور اُسے ایک ایسا فرض قرار دیا گیا ہے جس کے ترک کرنے پر ترک کرنے والے سے دنیا میں جنگ کی جائے گی اور آخرت میں اس کے لئے شدید عذاب ہوگا۔ (تفصیل آگے "اسلام کی اقتصادی پالیسی" میں آتی ہے)۔ پھر اسلام دستِ سوال دراز کرنے سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ایسے ایک گروہ کی تعریف کرتے ہوئے جو اللہ کی راہ کے کاموں میں کچھ ایسا مشغول ہو گئے ہیں کہ چل پھر کر روزی نہیں کماتے، فرماتا ہے کہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے (لَا يَسْئَلُونَ النَّاسَ اِلْحَافًا)۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ایک سائل کو ایک درہم عنایت فرماتے ہیں اور پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ "یہ بات کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی رسّی سنبھالے اور جا کر جلانے کی لکڑیوں کا ایک گٹھا چُن کے اُسے اپنی پیٹھ پر اُٹھا لائے اور فروخت کرے اور اس طرح اللہ اس کی آبرو سلامت رکھے، اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے مانگتا پھرے کہ لوگوں کا جی چاہے تو اُسے کچھ دیں ورنہ نہ دیں (لان یاخذ احدکم حبلہ فیاتی بحزمۃ حطب علیٰ ظہرہٖ فیبیعہا، فیکف اللہ بہا وجہہ خیرٌ من ان یسأل الناس، اعطوہ او منعوہ۔ (بخاری و مسلم)

آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔ (الید العلیا خیر من الید السفلیٰ ــــ بخاری و مسلم)۔ نیز آپؐ نے سوال کے علاوہ اکتساب مال کے دوسرے شرمناک طریقوں سے بھی بچنے کی تاکید کی ہے۔ کیونکہ سوال اسلام کی نظر میں ایک ایسی برائی ہے جسے صرف شدید ضرورت جائز بنا سکتی ہے۔ رہی زکوٰۃ، تو وہ ایک قانونی حق ہے جو بہرحال وصول کیا جائے گا نہ کوئی بخشش اور احسان۔

وَفِیۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ٥ (الذاریات : ۱۹)

"ان کے اموال میں سوال کرنے والے اور محروم لوگوں کے لیے ایک حصہ ہے۔"

یہ ایک واجب الادا حق ہے جسے حکومت وصول کر کے مسلمانوں کی مادی ضروریات کی تکمیل ان کی عزتِ نفس اور خودداری اور ان کے ضمیر و احساس کی پاکیزگی و بلندی کی حفاظت اور ضمانت، غرض کہ ان کے جملہ مصالح و مفاد کے سلسلے میں صرف کرتی ہے۔ ان امور کے لیے اگر زکوٰۃ کا مال کفایت نہ کرے تو ذی استطاعت اور صاحبِ ثروت لوگوں سے اس حد تک مزید ٹیکس وصول کرے گی کہ جس سے کمزور اور غریب حاجتمندوں کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ (تفصیل آگے "اسلام کی اقتصادی پالیسی" میں آئے گی)

غرض یہ کہ اسلام معاملہ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتا ہے اور اس کے ہر گوشہ کی طرف توجہ کر کے شعور و وجدان کو ایسی مکمل آزادی کی ضمانت دیتا ہے جو نہ صرف تصورات اور نظری قدروں پر مبنی ہے نہ اس کا واحد سہارا اقتصادی اور مادی انتظامات ہیں، بلکہ وہ بیک وقت ان دونوں بنیادوں پر قائم ہے۔ وہ زندگی کے عملی حقائق اور نفسِ انسانی کی قوتِ برداشت دونوں کو سامنے رکھتا اور ان کی رعایت کو ملحوظ رکھتا ہے، وہ انسان کے پاکیزہ ترین رجحانات کو اکساتا ہے۔ اس کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں اور قوتوں کو بیدار کرتا ہے اور بالآخر اسے وجدان و شعور کی مکمل اور بے آمیز آزادی تک پہنچا دیتا ہے کیونکہ بلا مکمل آزادی کے وہ کبھی کمزوری و کمتری کے احساس اور غلامانہ ذہنیت سے نجات نہیں حاصل کر سکتا۔ نہ اجتماعی عدل میں سے اپنا حصہ وصول کر سکتا ہے اور نہ اس کے ملنے کے بعد اس کی مشقتوں کو سہہ کر اس کی ذمہ داریوں کو نباہ سکتا ہے۔

اسلام میں اجتماعی عدل کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے یہ آزادی انہی بنیادوں میں سے ایک

اہم بنیاد ہے۔ بلکہ یہی وہ اوّلین بنیاد ہے جس پر دوسری بنیادیں قائم ہیں۔

انسانی مساوات

حقیقی مساوات کے سارے لوازم ایک ایک کرکے اکٹھا ہوگئے۔ انسان کا ضمیر و وجدان پوری طرح آزاد ہوگیا اور غلامانہ ذہنیت کے ہر شائبہ سے بری ہوگیا انسان غربت و ذلت، تکلیف و مصیبت اور موت کے اندیشوں سے یہ سمجھ کر بے نیاز ہوگیا کہ کوئی بات اذنِ خداوندی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ سماجی اور اقتصادی قدروں کے دباؤ سے بھی نکل آیا اور دستِ سوال دراز کرنے کی ذلت سے بھی بچ گیا خود اپنی خواہشات و اہواء سے بھی بلند ہوکر اس یکتا اور منفرد خالق کی طرف متوجہ ہوا جس کی طرف بلا تمیز بندہ و آقا سارے انسان رُخ کرتے ہیں۔ ان باتوں کے پہلو بہ پہلو ہر فرد کو بقدرِ کفایت ضروریاتِ زندگی بھی میسر آگئیں۔ اب حقیقی مساوات کے سارے لوازم مہیا ہوگئے اور مساوات انسان کی رگ دپے میں سرایت کرگئی۔ انسانی ضمیر اب اس کا محتاج نہیں رہا کہ کوئی اس کے لیے مساوات کے لفظی نعرے بھی بلند کرے۔ کیوں کہ ایسا مزاج بن جانے کے بعد اب وہ ان امتیازات کو برداشت کرنے سے انکار کردے گا جو صرف معاشرتی اور معاشی بنیادوں پر قائم ہیں۔ مساوات کے اس تصور کے تحت اب وہ اپنے حقوق کا طالب بن کر اٹھے گا اور جب اُن حقوق کو حاصل کرے گا تو اُن کے تحفظ میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھے گا۔ اسے یہ حقوق عزیز ہوں گے۔ وہ ان کے لیے قربانیاں دے گا، مصیبتیں سہے گا اور ہر اس حملے کا جم کر مقابلہ کرے گا جو اس کے اِن حقوق پر کیا جائے۔

اس مساوات کا تصور ہر ہر دل میں گھر کر چکا ہوگا۔ اس کی پشت پر ہر فرد کو بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کی قانونی ضمانت بھی حاصل ہوگی۔ اس لیے اس کے طالب و حامی صرف کمزور اور غریب لوگ نہ ہوں گے بلکہ وہ اصحابِ ثروت بھی اس کی پشت پناہی کریں گے جن کے دل اسلامی تعلیمات سے منور ہوں — چودہ صدی قبل اسلامی سماج میں عملاً یہی ہوا تھا — جس کی تفصیل آئندہ مناسب موقع پر سامنے آئے گی۔

ان باتوں کے باوجود اسلام نے آزادیٔ ضمیر سے ضمنی طور پر مستنبط ہونے والے مفہومات پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اصولِ مساوات کی لفظاً اور منصوص طور پر صراحت کردی تاکہ بات بالکل متعین

اور صاف ہو کر سامنے آجائے ۔ دنیا میں جب اسلام کی دعوت بلند کی گئی تو انسانیت لفظ مساوات سے نا آشنا تھی۔ کوئی اس بات کا دعوے دار تھا کہ وہ دیوتاؤں کی نسل سے ہے، اور اس دعویٰ کی تائید کرنے والے بھی موجود تھے کوئی اس زعم میں مبتلا تھا کہ اس کی رگوں میں عام لوگوں کی طرح معمولی خون نہیں بلکہ صاف خالص اور شاہانہ خون رواں ہے، اور اس زعم پر بھی سر تسلیم خم کیے جاتے تھے ۔ ایک قوم انسانوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے کسی طبقہ کو خدا کے سر سے تخلیق کیے جانے کے سبب معزز اور کسی دوسرے طبقہ کو خدا کے قدموں سے بنے ہونے کے سبب پست و ذلیل قرار دیتی تھی ۔ عورتوں کے بارے میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ ان کے جسم میں روح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ آقاؤں کے لیے بالکل جائز تھا کہ غلاموں کو دردناک سزائیں دیں یا قتل کر ڈالیں، کیونکہ وہ آقاؤں سے الگ ایک دوسری نوع سے تعلق رکھتے تھے ۔ ایسے حالات میں اسلام آیا اور اس نے مساوات کا درس دیا۔ اس نے بدء و معاد اور موت و زندگی میں حقوق و فرائض کے باب میں، قانون کے سامنے اور اللہ کے حضور، دنیا اور آخرت میں، غرض ہر جگہ ہر حیثیت سے تمام انسانوں کو مساوی قرار دیا۔ بتایا کہ عمل صالح کے سوا فضیلت و امتیاز کا کوئی اور معیار نہیں۔ عزت و شرف اگر ہے تو اُن کے لیے جو زیادہ متقی اور پاکباز ہوں۔

یہ انسانیت کی ایک ایسی جست تھی جس کی تاریخ میں کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی اور اب بھی یہ وہ چوٹی ہے جس کی بلندیوں کو انسان کبھی نہ چھو سکا۔ بلکہ یہ انسانیت کی میلادِ ثانی تھی جس میں ایک بلند تر انسان نے جنم لیا۔ یہ وہ مقام بلند تھا جس سے بعد کے ادوار میں انسانیت نیچے گر گئی اور جس پر وہ اگر کبھی دوبارہ پہنچ سکتی ہے تو اسی الہی طرز زندگی کے زیر سایہ پہنچ سکتی ہے۔

کسی انسان کے اللہ کا بیٹا ہونے کا خیال بالکل لغو ہے۔ اللہ نے کوئی نسل نہیں چلائی :-

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (الاخلاص: ۱تا۴)

"کہو اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا نہ وہ خود جنا گیا، اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔"

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْئًا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ

دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۚ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝ اِنْ
كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَ
عَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝ (مریم: ۸۸ تا ۹۵)

"وہ کہتے ہیں رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنایا ہے، سخت بیہودہ بات ہے جو تم لوگ گھڑ لائے ہو۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں۔ اس بات پر کہ لوگوں نے رحمٰن کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا، رحمٰن کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ زمین و آسمان کے اندر جو بھی ہیں سب اس کے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ سب پر وہ محیط ہے اور اس نے اُن کا شمار کر رکھا ہے۔ سب قیامت کے روز فرداً فرداً اُس کے سامنے حاضر ہوں گے۔"

شاہانہ خون کا دعویٰ بھی باطل ہے۔ شاہانہ خون اور عامی خون کی تقسیم محض ایک افسانہ ہے اور اسی طرح یہ بات کہ کسی کو سر سے پیدا کیا اور کسی کو پیر سے۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ اِلٰى
قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۝ (المرسلات: ۲۰ تا ۲۳)

"کیا ہم نے تم سب کو ایک حقیر پانی سے نہیں بنایا؟ پھر ہم نے اسے ایک جائے قرار میں ایک متعین مدت تک رکھا۔ پھر ہم نے (مزید) تعین کی اور ہم بہت ہی تعین کرنے والے ہیں۔"

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ
الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝ (الطارق: ۵ تا ۷)

"انسان کو چاہیے کہ وہ غور کرے کہ اس کی تخلیق کس چیز سے ہوئی ہے، وہ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے بنایا گیا جو پسلیوں اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان سے نکلتا ہے۔"

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۭ
وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ
وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ (فاطر: ۱۱)

"اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا اور پھر نطفہ (کے ذریعہ تخلیق کو تکمیل تک پہنچایا)، پھر اس نے تم کو جوڑے جوڑے بنایا (تاکہ سلسلۂ نسل آگے چل سکے) اور کوئی مادہ نہ تو اس کے علم کے بغیر حاملہ ہوتی ہے نہ بچہ جنتی ہے۔ کوئی ذی حیات نہ تو ایک خاص عمر پاتا ہے اور نہ اس کی عمر میں کمی ہوتی ہے مگر یہ کہ ساری باتیں ایک رجسٹر میں درج ہیں۔ یہ سب کچھ اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔"

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝

(مومنون: ۱۲-۱۴)

"ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ پس بڑا بابرکت ہے اللہ۔ سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔"

قرآن اس بات کو بار بار دہراتا ہے کہ پوری جنسِ انسانی مٹی سے بنی ہے اور بلا استثناء ہر فرد ایک حقیر پانی سے وجود میں آیا ہے۔ منشاء یہ ہے کہ سارے انسانوں کے ایک ہی اصل سے ہونے، ایک طرح سے پیدا ہونے اور ایک ہی طرح نشو و نما پانے کی حقیقت دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد ارشادات کے ذریعہ یہ بات کھول کھول کر سمجھا دی ہے، فرمایا کہ: "تم سب آدم کی نسل سے ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔" انتم بنو آدم و آدم من تراب۔ (مسلم ابوداؤد)

جب یہ واضح ہو گیا کہ کوئی فرد بالذات کسی دوسرے فرد سے افضل نہیں تو کسی قوم یا نسل کا اپنے حسب و نسب کے اعتبار سے دوسری نسلوں اور قوموں پر فضیلت کا دعویٰ بھی باطل ٹھہرا۔ ــــــ یہ دعویٰ وہی ہے جس کا آج بھی بعض اقوام گلا پھاڑ پھاڑ کر اعلان کر رہی ہیں۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ج

(النساء : ۱)

"لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد عورت (پیدا کر کے) دنیا میں پھیلا دیئے۔"

ایک ہی جان تھی اور اسی جیسا اس کا ایک جوڑا تھا۔ تمام مرد اور عورتیں انہی دونوں سے پیدا ہو کر پھیلی ہیں۔ سب ایک ہی نسل سے ہیں۔ سارے افراد انسانی نسبی طور پر بھائی بھائی اور حسب کے اعتبار سے ایک دوسرے کے برابر ہیں۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ط

(الحجرات : ۱۳)

"اے انسانو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہیں مختلف گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں برتر وہی لوگ ہیں جو زیادہ تقویٰ شعار ہوں۔"

قوموں اور قبیلوں کا یہ اختلاف اس لیے نہیں تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر کریں اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالیں۔ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ باہمی تعارف میں آسانی ہو اور لوگ ایک دوسرے سے ربط و تعلق پیدا کریں۔ اللہ کے نزدیک یہ ساری قومیں اور قبائل برابر ہیں۔ کسی کو کسی سے برتر قرار دیا جا سکتا ہے تو صرف تقویٰ کی بنا پر، اور یہ ایک ایسی صفت ہے جسے حسب و نسب سے کوئی تعلق نہیں۔ نیز یہ کہ تقویٰ کا اولین مرحلہ اللہ واحد کی کامل اطاعت ہے۔ یہ نہ ہو تو نہ تقویٰ ہوگا نہ کوئی بھلائی۔

اب اس حقیقت سے کسے انکار ہوگا کہ اسلام قبیلہ و نسل اور مذہب و مسلک ہر طرح کے تعصبات سے بری ہے اور اس سلسلہ میں اتنے بلند مقام تک پہنچ گیا ہے جہاں پہنچنا مغربی

تہذیب کو آج تک نہیں نصیب ہو سکا۔ اس تہذیب کا پروردہ امریکی ضمیر اس بات کو جائز سمجھتا ہے کہ علی الاعلان ریڈ انڈین نسل کو مٹا دینے کی منظم کوشش کرے اور گوروں اور کالوں کے درمیان مذموم تفریق کو روا رکھے اور کالوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرے۔ یہ تہذیب جنوبی افریقہ کی حکومت کے لیے رنگین نسل والوں کے خلاف علی الاعلان امتیازی قوانین بنانا ناجائز قرار دیتی ہے اور روس، چین، ہندوستان حبشہ اور یوگوسلاویہ وغیرہ کے لیے مسلمانوں کا قتلِ عام مباح کر دیتی ہے۔

امتیاز و برتری جہاں جس شکل میں بھی پایا جا سکتا ہے اسلام اس کا سُراغ لگاتا اور اُسے مٹا دینے کے درپے ہو جاتا ہے۔ بجز اس امتیاز و برتری کے جس کی بنیاد تقویٰ اور عملِ صالح ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال لے لیجیے۔ قرآن بار بار اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ وہ بھی تمام دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں۔ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس بات کو بار بار دُہراتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ آپؐ نبی تھے۔ قوم کے چہیتے تھے اور قوم کے دل میں آپؐ کی عزت وعظمت جاگزیں تھی۔ اندیشہ تھا کہ یہ محبت و تعظیم غیر معمولی فضیلت و برتری دے دینے کی شکل نہ اختیار کر لے۔ اسی اندیشہ کے تحت آپؐ قوم کو نصیحت فرماتے ہیں:

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ عیسی ابن مریم فانما انا عبد اللہ ورسولہ (بخاری)

"میری تعریف میں اس طرح کا غلو نہ کرنا جس کا غلو نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کی تعریف میں کیا تھا، کیونکہ میں صرف اللہ کا بندہ اور پیغامبر ہوں۔"

ایک دفعہ آپؐ کچھ لوگوں کے پاس گئے، وہ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا:

مَن سرہ ان یتمثل لہ الرجال قیاماً فلیتبوأ مقعدہ من النار

(ابوداؤد۔ ترمذی)

"جسے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ لوگ اس کے احترام میں سرو قد کھڑے ہو جایا کریں وہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنا لے۔"

اسی طرح چونکہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کا حد سے زیادہ احترام کرنے لگیں۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں صاف طور پر آگاہ کر دیا کہ وہ اللہ

کے آگے ان کی حمایت کرنے نہیں کھڑے ہو سکیں گے:

یَا مَعْشَرَ قریش لا اغنی عنکم من اللّٰہ شیئًا یا بنی عبد مناف لا اغنی عنکم من اللّٰہ شیئا یا عباس ابن عبد المطلب لا اغنی عنکم من اللّٰہ شیئا و یا صفیۃ عمۃ رسول اللّٰہ لا اغنی عنکِ من اللّٰہ شیئًا۔ (متفق علیہ)

"اے اہلِ قریش! میں خدا کے آگے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اے بنی عبد مناف! میں خدا کے آگے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اے عباس بن عبد المطلب! میں خدا کے آگے تیرے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اے اللہ کے رسول کی پھوپھی صفیہ! میں اللہ کے آگے تیرے کچھ کام نہ آسکوں گا۔"

جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایسا لمحہ گذرا کہ آپ میں اپنے مقصد کی ترویج کی خاطر ایک طرح کی حرص سی ابھر آئی ——— کہ آپ بھی انسان تھے ——— اور آپ بجائے غریب ام مکتوم کے سردار قوم ولید بن مغیرہ کی طرف ہی متوجہ رہے تو اللہ نے ان پر ایسا شدید عتاب فرمایا جو جھڑکی سے جا ملتا ہے ——— کیوں؟ محض اس لیے کہ مساوات مطلق اپنے مکمل اور حقیقی معیار کے ساتھ متحقق ہو سکے۔

اسی طرح بعض صاحب ثروت اور اعلیٰ حسب نسب کے لوگ چونکہ غریب مردوں اور عورتوں سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کرنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

(النور: ۳۲)

"اپنی بیوہ عورتوں اور صالح غلام اور لونڈیوں کا نکاح کر دو۔ اگر یہ لوگ مفلس ہوں تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی بنا دے گا، اللہ صاحب علم اور بڑی وسعتوں کا مالک ہے۔"

جہاں تک دونوں صنفوں کا تعلق ہے، اسلام نے عورت کو بحیثیت ایک صنف کے پوری طرح مردوں کی صنف کے مساوی قرار دیا ہے۔ اس نے صرف ایسی برتری کو روا رکھا ہے۔

جس کی بنا فکری استعداد و استطاعت اور ذمہ داری و مہارت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کا فی نفسہ جنسی اختلاف سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاں بھی فطری استعداد، ذمہ داری اور مہارت یکساں ہو وہاں دونوں کو مساوی مقام دیا گیا ہے۔ فرق صرف وہاں اور اسی حد تک پیدا ہوتا ہے جہاں ان میں سے کوئی چیز کسی حد تک مختلف ہو۔ چنانچہ روحانی اور دینی اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ○ (النساء: ۱۲۴)

"جو نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی"

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ج وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (نحل: ۹۷)

"جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔ اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے"

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ج بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ج (آل عمران: ۱۹۵)

"جواب میں اُن کے رب نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو"

اسی طرح حق ملکیت کی اہلیت اور مالی تصرفات کا مجاز ہونے کے اعتبار سے بھی دونوں برابر ہیں:-

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ (النساء: ۷)

"مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے"

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۚ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ

(النساء ۴: ۳۲)

" جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق اُن کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق اُن کا حصہ ہے۔"

رہا مرد کو میراث میں عورت کا دوگنا حصہ دیا جانا تو اس کی وجہ ذمہ داریوں کا وہ بوجھ اور وہ مشقتیں ہیں جو مرد کو میدانِ حیات میں اٹھانی پڑتی ہیں۔ وہ کسی عورت سے شادی کرتا پھر اس کی اور اس سے پیدا ہونے والے بچوں کی کفالت کا بار برداشت کرتا ہے۔ خاندان کے پورے نظام کا بار بھی اسی پر ہوتا ہے۔ یہی ایک وجہ اسے اس بات کا حق دار قرار دینے کے لیے کافی ہے کہ اس کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہو، خاص کر اس شکل میں کہ عورت کے لیے شادی کرنے یا نہ کرنے یا بیوہ ہو جانے ہر شکل میں خوراک اور دیگر ضروریات کی کفالت کا انتظام کیا ہوا ہے۔ شادی کرنے کی شکل میں تو مرد اس کے نفقہ کا ذمہ دار ہے، اور اگر بیٹھی رہتی ہے یا بیوہ ہو جاتی ہے تو ورثہ میں ملا ہوا مال کام آتا ہے۔ لہٰذا اصل مسئلہ ذمہ داریوں کے فرق کا ہے جو وراثت میں فرق کا باعث بنتا ہے

رہی یہ بات کہ مرد کو عورت پر قوام بنایا گیا ہے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ (النساء ۴: ۳۴)

" مرد عورتوں پر قوام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔"

تو اس برتری کی وجہ وہ استعداد اور مہارت ہے جو کارِ قوامیت کے لیے درکار ہے۔ چنانچہ مرد مادرانہ ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کی وجہ سے سماجی کاموں میں نسبتاً زیادہ عرصہ صرف کرتا ہے اور اس میں اپنی پوری قوتِ فکری لگاتا ہے جب کہ یہ ذمہ داریاں ایک معتد بہ عرصہ کے لیے عورت کی راہ روکے رہتی ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ مادرانہ ذمہ داریاں عورت کے انفعالی اور جذباتی عنصر کو زیادہ اُبھارے رکھتی ہیں جبکہ مردوں میں غور و فکر اور تامل و تدبر کا پہلو زیادہ غالب رہتا ہے۔ اب اگر کسے عورت

پر قوام بنایا گیا ہے تو اسی لیے کہ وہ اس منصب سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری صلاحیتوں کا حامل ہے اور ان شرائط کو پورا کرتا ہے جو اس ذمہ داری کے سونپے جانے کے لیے درکار ہیں۔ پھر یہ کہ مرد ہی خرچ برداشت کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اور مالی پہلو کا قوامیت سے جو گہرا ربط ہے وہ ظاہر ہے۔ اس طور پر یہ ایک فرض کے مقابلے میں ملنے والا ایک حق ہوا جو اپنی اصل کے اعتبار سے میدانِ حیات میں دونوں صنفوں کے مابین حقوق و فرائض کی کامل مساوات پر منتج ہوتا ہے۔

عملی ذمہ داریوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے خالص انسانی اعتبار سے دیکھا جائے تو عورت کو مرد سے کہیں زیادہ اس بات کا حق ہے کہ اس کی نگرانی و خدمت کی جائے۔ یہ حق مرد کے حق قوامیت کا مقابل ہے۔ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہا: اے رسول اللہ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا "تیری ماں"۔ اس نے پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "تیری ماں"۔ سائل نے پھر دریافت کیا، اس کے بعد کس کا نمبر ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: "تیری ماں"۔ اُس نے کہا، پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: "تیرا باپ"۔[1]

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گواہی کے مسئلہ میں بھی ایک صنف کو دوسری پر ترجیح دیدی گئی ہے:

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ (البقرۃ: ۲۸۲)

"اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرالو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے۔ یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہییں جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو"۔

حالانکہ اس کا سبب آیت کے اندر خود ہی موجود ہے۔ یعنی جیسا کہ ہم اوپر بیان بھی کرچکے ہیں، وظائفِ مادریت کے فطرت کے عین تقاضے کے طور پر عورت کے اندر جذباتی اور انفعالی کیفیت اتنی ہی زوردار رہتی ہے جتنی کہ مرد کے اندر فکر و تامل کی عادت۔ اسی لیے اس کا اہتمام

---

[1] بخاری و مسلم۔

کیا گیا کہ اگر ایک عورت پر نسیان طاری ہو جائے یا وہ انفعال کی شکار ہو جائے تو دوسری اس کو یاد دلانے کے لیے موجود رہے۔ پس یہاں بھی اصل مسئلہ زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت کا سامنا کرنے اور اُس سے عہدہ برآ ہونے کا مسئلہ ہے۔

اسلام کے لیے یہ کارنامے کیا کم ہیں کہ اُس نے عورت کو دین کے معاملہ میں برابر کا درجہ دیا۔ کسب مال اور ملکیت میں اُسے مساوات عطا فرمائی۔ پھر اُس نے اس کو اس بات کی ضمانت دی کہ نکاح اس کے اِذن اور اس کی مرضی ہی سے ہو سکے گا، نہ تو اُسے مجبور کیا جا سکے گا نہ نظر انداز۔

لا تنکح الشیب حتی تستأمر ولا تنکح البکر حتی تستأذن واذنھا الصموت (بخاری و مسلم)

"بیوہ کا نکاح بلا اس سے صاف اجازت حاصل کیے نہ کیا جائے اور کنواری کا نکاح بھی اِس کا اذن حاصل کیے بغیر نہ کیا جائے، اس کا اذن خاموشی ہے۔"

اسی طرح اس نے مہر اور نکاح میں یا طلاق کے بعد پیدا ہونے والے دوسرے حقوقِ زوجیت کا تحفظ کیا۔

فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً ط (النساء: ۲۴)

"ان کے مہر بطور فرض کے ادا کرو۔"

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ج (البقرہ: ۲۳۱)

"یا تو بھلے طریقے سے ان کو روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو، محض ستانے کی خاطر انھیں نہ روکے رہنا کہ یہ زیادتی ہو گی۔"

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء:)

"ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔"

واضح رہے کہ اسلام نے عورت کو یہ تمام حقوق اور ضمانتیں خالص انسانی جذبہ کے تحت عطا کی ہیں۔ اس نے ایسا کسی طرح کے مادّی یا معاشی دباؤ کے تحت نہیں کیا ہے۔ اس نے اس ذہنیت کے خلاف اعلانِ جنگ کیا کہ عورت ایک معاشی بوجھ ہے جس کے پیدا ہوتے ہی

اس سے نجات حاصل کر لینا بہتر ہے۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کا یہ رواج جو عرب کے بعض قبائل کی زندگی میں معروف کا درجہ حاصل کر چکا تھا، اس کے خلاف جہاد میں اسلام نے کسی طرح کی نرمی نہیں برتی، اس نے اس رواج کو بھی اُسی انسانی اسپرٹ کے تحت ختم کیا جس کی روشنی میں وہ انسان کو دیکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے پہلے تو بلا کسی استثناء کے قتل نفس سے منع کیا ہے۔

ولا تقتلوا النفس التی حرّم اللّٰہ الا بالحق ہ (الانعام: ۱۵۱)

"اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہو ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔"

پھر خاص طور سے قتلِ اولاد سے روکا۔ یہ واضح رہے کہ صرف لڑکیوں بجائے قتل کا رواج تھا، لڑکوں کا نہیں۔

وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ ط (بنی اسرائیل: ۳۱)

"اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔"

دیکھیے اِس آیت میں اولاد کو روزی دینے کا ذکر مقدم رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہی مسئلہ فاقہ کشی اور مفلسی کے اندیشے پیدا کرنے کا باعث بنتا تھا۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ باپ کا دل اس اعتماد سے بھر جائے کہ اللہ ہی روزی رساں ہے اور بچوں کے رزق کی ذمہ داری اس نے بجائے باپ کے خود اپنے سر لے لی ہے۔ پھر قیامت کا بیان کرتے ہوئے عدل اور رحمت کے جذبات کو یوں اُبھارا گیا ہے:

وَاِذَا الْمَوْءٗدَۃُ سُئِلَتْ ہ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ہ (التکویر: ۸-۹)

"جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے بدلے قتل کی گئی تھی۔؟"

گویا اس بات کو اس ہولناک اور مہیب دن مخصوص طور پر جواب طلبی کے قابل گردانا گیا ہے پس واضح ہو کہ اسلام عورت کو اس کے مادّی و روحانی حقوق عطا کرتے وقت... دراصل اس کے انسان ہونے کی صفت کو سامنے رکھتا ہے اور اسی طرح وہ اپنے "وحدتِ انسان" کے نظریہ کا پورا پورا حق ادا کرتا ہے:

خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّجَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا ج

(الاعراف: ۱۸۹)

"اللہ نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔"

اسلام کا منشاء درحقیقت عورت کے درجہ کو اس مرتبہ تک بلند کر دیتا ہے کہ وہ "نفسِ واحدہ" کا نصف بن کر رہے۔

اسلام کے حق میں یہ باتیں سامنے لانے کے ساتھ یہ بتانا ضروری ہے کہ مادہ پرست مغرب نے عورت کو جو آزادی دی ہے اس کا چشمہ خالص اور پاک انسانی منبع سے نہیں پھوٹتا اور نہ اُس کی پُشت پر وہ بے لوث اور مخلصانہ محرّکات رہے ہیں جو اسلام میں حریت و مساوات عطا کرنے کے باعث بنے۔ ہمیں نہ تو تاریخ کو بھولنا ہے نہ حقائق اور واقعات پر آج جو نظر فریب خول پڑ گئے ہیں اُن سے دھوکا کھانا ہے۔ اچھی طرح یاد رہے کہ مغرب نے عورت کو گھر سے اس لیے نکالا کہ وہ محنت ومزدوری کرکے کسبِ معاش کرے کیونکہ وہاں پر مرد نے عورت کی کفالت اور پرورش سے انکار کر دیا تھا۔ اِلّا یہ کہ وہ عورت سے اس کا معاوضہ اس کی عصمت وعفت کی شکل میں وصول کرلے۔ ایسی صورتِ حال تھی جس کے باعث بے چاری عورت کسبِ معاش کے لیے محنت کرنے پر مجبور ہوتی۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب عورت مجبور ہو کر محنت مزدوری کرنے کے لیے گھر سے باہر نکلی تو مادہ پرست مغرب نے اس کی ضرورت مندی کو غنیمت شمار کیا اور جنسِ محبت کی فراوانی کو تخفیفِ اُجرت کا بہانہ بنا لیا تاکہ مستاجرین کم اُجرت والی عورتوں کو مزدور رکھ کر ان مزدوروں سے مستغنی ہو جائیں جو اَب سر اُٹھانے لگے تھے۔ اور "مناسب معاوضہ" کا مطالبہ کر رہے تھے۔

اب اگر عورت نے وہاں مساوات کا مطالبہ کیا تو اس کا مطلب اُجرتوں میں مساوات کا مطالبہ تھا۔ تاکہ پیٹ بھرنے اور زندگی گزارنے کا بندوبست ہو سکے۔ جب اُسے یہ مساوات نہ مل سکی تو اس نے ووٹ دینے کا حق طلب کیا تاکہ اُسے حق جتانے اور اپنے مطالبات منوانے کے لیے آواز اٹھانے کا موقع مل سکے۔ پھر اس نے پارلیمنٹ میں نمائندگی کا حق چاہا تاکہ وہ اس مساوات کو بجا ثابت کرنے اور اسے تسلیم کرانے کے لیے مثبت طور پر آواز بلند کر سکے۔ کیوں کہ سماج میں جو قوانین نافذ ہوتے تھے انھیں صرف مرد بناتے تھے۔ اسلام کی طرح وہاں قوانین اللہ کے دیے ہوئے نہیں ہیں جو اپنے بندوں میں مردوں اور عورتوں سب کے ساتھ عدل وانصاف برتتا ہے۔

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد چوتھی جمہوریہ تک فرانس میں عورت کو اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر اپنے مال میں تصرف کا حق نہیں حاصل تھا، جیسا کہ اسلام میں حاصل ہے دریں حالیکہ اس نے عورت کو بے حیائی اور فحاشی کا پورا حق دے رکھا ہے، علانیہ اور خفیہ ہر طریقہ سے۔

بس یہی آخری "حق"، وہ واحد "حق" ہے جس سے اسلام نے عورت کو محروم رکھا ہے، اس لیے کہ اس نے مرد کو بھی اس سے محروم رکھا ہے ——— انسان کے شعور و احساس، اس کی عزتِ نفس اور اس کی شرافت کے عین تقاضے کے طور پر۔ اور اس لیے بھی کہ جنسی تعلقات کو اس سطح سے بلند کیا جا سکے کہ وہ محض دو جسموں کا اتصال ہو کر رہ جائیں جس کو نہ خاندان بنانے سے تعلق ہو نہ گھر بسانے سے واسطہ۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ مادہ پرست مغرب بعض کاموں کے سلسلہ میں عورتوں کو مردوں پر ترجیح دیتا ہے۔ خاص کر تجارتی اداروں، سفارت خانوں، قونصل خانوں، خبر رسانی اور صحافت وغیرہ میں تو ہمیں ہرگز اس مکروہ اور گندی ذہنیت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے جو اس ترجیح کی پشت پر کارفرما ہے یہ بجز عنبر و لوبان کی خوشبوؤں اور افیون کی مہک سے بسی ہوئی فضا میں غلامی اور بندگی کی ایک شکل کے سوا اور کچھ نہیں۔

اسے ان سادہ لوحوں کی جنسی حس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے چنانچہ کاروباری ادارہ کا مالک یا وہ ریاست جو کہ عورت کو سفارت خانوں اور قونصل خانوں میں عہدے دیتی ہے، اور اسی طرح وہ مالکِ اخبار جو عورت کو خبریں لانے اور نامہ نگاری کرنے پر مامور کرتا ہے ان میں سے ہر ایک خوب اچھی طرح سمجھتا ہے کہ وہ عورت کو درحقیقت کس غرض کے لیے استعمال کر رہا ہے اور عورت ان میدانوں میں کس طرح بآسانی کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ اور یہ کہ وہ اس کامیابی کی خاطر کیا کچھ قربانی کرتی ہے۔ بفرضِ محال اگر وہ خود سے کچھ نہ "قربان" کرے تو بھی یہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بھوکی شہوتیں اور حریص نگاہیں اس کی بات چیت اور اس کے جسم کے گرد جمع ہو کر رہیں گی۔ یہ لوگ اپنی نفع اندوزی اور معمولی سی کامیابی کی خاطر اس بھوک سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اس لیے کہ اعلیٰ انسانی تصورات اُن سے دور ہیں، بہت دُور۔

اشتراکیت کے پاس مساواتِ مرد و زن کے سلسلہ میں بڑے بلند بانگ دعوے ہیں، حالانکہ اس کی مساوات صرف محنت اور اجرت کی مساوات تک محدود ہے۔ محنت اور اُجرت کی مساوات

کے بعد عورت پوری طرح آزاد ہے اور اسے بھی مرد کی طرح اباحیت شعاری کی کھلی چھٹی حاصل ہے۔ اشتراکیت کی نظر میں اصل مسئلہ پیسے کا ہے، اس کے ماورا کچھ بھی نہیں۔ سارے انسانی محرکات اور تمام انسانی تصوراتِ زندگی مختلف عناصر میں سے کھینچ کر بس اسی ایک عنصر کے اندر سما گئے ہیں۔

تہہ میں اُتریے تو اس کا اصل سبب بھی یہی نظر آئے گا کہ مرد عورت کی کفالت سے بچنا چاہتا ہے لہذا عورت مجبور ہے کہ اپنے گذارے کے لیے مرد ہی کی طرح بلکہ اُسی کے حلقۂ کار میں کام کرے۔ کیونکہ یہ دراصل مادہ پرست مغربی طرزِ فکر کا نقطۂ عروج ہے جو نیکی کے محرکات اور احسان کے دواعی سے خالی اور انسانی زندگی میں روحانی تصورات سے عاری ہے۔

یہ ہیں وہ باتیں جن کو سامنے رکھے بغیر ہماری نظریں اس جھوٹی چمک دمک سے دھوکا کھا سکتی ہیں۔ کیونکہ اسلام نے آج چودہ سو سال پہلے سے عورت کو وہ حقوق دے رکھے ہیں جو مغربی تہذیب اسے آج تک نہیں دے سکی۔ نیز اس نے عورت کو بوقتِ ضرورت محنت مزدوری اور کسبِ معاش کا حق بھی دے رکھا ہے، لیکن ساتھ ہی اسلام نے اس کے لیے خاندان میں نگہداشت اور سرپرستی کا حق بھی بدستور باقی رکھا ہے۔ اس لیے کہ اس کی نظر میں زندگی جان و مال سے زیادہ قیمتی ہے۔ اور اس کے مقاصد محض کھانے پینے سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہیں۔ وہ زندگی پر اُس کے مختلف زاویوں سے نظر ڈالتا ہے۔ اس کے نزدیک مختلف افراد کے لیے جدا جدا کام تو ہیں لیکن سب ایک دوسرے کے سہارے ہی انجام پذیر ہو سکتے ہیں، سب ایک دوسرے سے ہم آہنگ و مربوط ہیں۔ اسی نظر سے وہ عورت اور مرد کے فرائض کو بھی دیکھتا ہے اور سب سے پہلے دونوں پر اپنے اصل کام کی انجام دہی لازم قرار دیتا ہے تاکہ زندگی پھلے پھولے اور ترقی کر سکے۔ وہ دونوں میں سے ہر ایک کو وہ حقوق عطا کرتا ہے جو اس مشترکہ انسانی مقصد تک پہنچانے کے ضامن ہیں۔

پوری نوعِ انسانیت کو ایک خاص طرح کا شرف بخشا گیا ہے جس کو پامال کرنا صحیح نہیں۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝

(بنی اسرائیل: ۷۰)

"ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور اُن کو

پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔"

"ہم نے انھیں معزز ٹھہرایا" پوری نوع کو بحیثیت نوع کے، نہ کہ افراد، قبائل یا نسلوں کو ان کی انفرادی حیثیتوں میں۔ پس عزت و بزرگی علی الاطلاق سب کے لیے مساوی طور پر ہے کہ سب کے سب آدمؑ سے ہیں۔ چونکہ آدمؑ مٹی سے ہیں اور انہی آدمؑ کو معزز ٹھہرایا گیا تھا۔ لہٰذا ان کے بیٹے سب برابر ہیں۔ یہاں بھی اور وہاں (آخرت میں) بھی۔

تمام لوگ عزو شرف کے مالک ہیں اور یہ کسی طرح روا نہیں کہ اس عزو شرف کو ہدفِ تعریض بنایا جائے یا کوئی اس کا مذاق اڑائے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤی اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ وَ مَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (الحجرات: ۱۱)

"اے اہلِ ایمان! یہ بات مناسب نہیں کہ کچھ لوگ دوسروں کا مذاق اڑائیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ اس سے بہتر ہوں۔ اسی طرح کسی عورت کو بھی کسی عورت کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ عورتیں ان (مذاق اڑانے والیوں) سے بہتر ہوں۔ اپنے آپ کو ہدفِ تعریض نہ بناؤ، نہ اُن کو بُرے ناموں سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد بُرا کلمہ بہت ہی بُری بات ہے۔ اب جو لوگ (ایسی حرکتوں سے) تائب نہ ہوں وہ صحیح معنیٰ میں ظالم ہیں۔"

یہ گہری اور حسین تعبیر کہ "اپنے آپ کو ہدفِ تعریض نہ بناؤ"، ایک لطیف اشارہ کی حامل ہے اور وہ یہ کہ انسان کا دوسرے انسان کو ہدفِ تعریض بنانا دراصل خود اپنے کو ہدفِ تعریض بنانا ہے کیونکہ تمام انسان ایک ہی جان سے ہیں۔

ہر ایک صاحبِ عزت و ناموس ہے اور اس کا ناموس واجب الاحترام ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَاِنْ

لَمْ تَجِدُوْا فِيْهَا اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ

(النور: ۲۷-۲۸)

"اے اہلِ ایمان! اپنے ذاتی گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں بلا اجازت لیے اور گھر والوں پر سلام بھیجے نہ داخل ہو۔ اگر تم میں نصیحت حاصل کرنے کی صلاحیت ہو تو (سمجھ لوگے) کہ یہی طریقہ تمہارے لیے بہتری کا ضامن ہے۔ اگر تم کو گھر میں کوئی نظر نہ آئے تو بھی اس وقت تک نہ داخل ہو جب تک اجازت نہ دی جائے۔ اگر تم سے واپس چلے جانے کو کہا جائے تو واپس ہو جاؤ۔ یہ روش تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہوگی۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بخوبی واقف رہتا ہے۔"

وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ (الحجرات: ۱۲)

"ایک دوسرے کی بُرائیوں کا کھوج نہ لگاؤ اور نہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت کرے۔"

اس قرارداد کی قیمت اس میں مضمر ہے کہ یہ ہر فرد میں یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ وہ صاحب عزت و آبرو ہے اور ایک طرح کا ناموس رکھتا ہے جس پر حملہ کرنا دوسروں کے لیے جائز نہیں۔ نہ کسی فرد کی حرمت دوسرے فرد سے کم تر ہے۔ سب اس معاملہ میں برابر ہیں اور سب کے سب ایک دوسرے کی طرف سے امن میں ہیں۔

اسی طرح اسلام زندگی کے ہر پہلو کو لیتا ہے، اجتماعی شعبوں کو بھی اور ضمیر و وجدان کے گوشوں کو بھی، اور ہر جگہ پوری پوری مساوات قائم کرتا ہے۔ ضمیر انسانی کو ہر طرح کی احتیاج، خالی خولی مظاہر اور مصنوعی سماجی اقدار کے دباؤ سے آزاد کر کے مساوات کو اصولی طور پر متحقق کر دینے کے بعد اس امر کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اسلام الفاظ میں اور ظاہری شکلوں کی تعیین کے ساتھ بھی مساوات کا اعلان کرے۔ لیکن اس نے یہ بھی کیا، کیونکہ مساوات اسے بہت عزیز ہے۔ وہ اسے نسل و قبیلہ اور خاندان و مقام کی تنگیوں سے آزاد، مکمل انسانی شکل میں قائم دیکھنا چاہتا ہے کہ مغرب کے مادہ پرست، سائنٹیفک نظاموں کی طرح اس مساوات کا دائرہ

صرف اقتصادی امور تک محدود نہ ہو جائے بلکہ زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہو۔

اجتماعی کفالتِ باہمی

ایسی زندگی کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی جس میں ہر فرد بے قید آزادی کے ساتھ ہاتھ دھو کر نفع اندوزی اور لذت طلبی کے پیچھے پڑ جائے اور جب اس آزادی کے پیچھے مساواتِ مطلق کا تصوّر بھی موجود ہو تو نتائج اور مہلک ہوں گے اور فرد و سماج دونوں تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں گے۔ ہر سماج کی ایک کلّی مصلحت ہوتی ہے جسے انفرادی آزادیوں کی حد سمجھنا چاہیئے۔ خود فرد کی اپنی بھلائی بھی اس میں مضمر ہوتی ہے کہ اپنی آزادی سے فائدہ اٹھانے میں وہ بعض حدود پر آ کر رُک جائے اور اُن سے تجاوز نہ کرے۔ ورنہ لذت طلبی اور اہوا و خواہشات اسے ہلاکت کے گھاٹ اتار دیں گے، یا اُس کی آزادی دوسرے افراد کی آزادی سے ٹکرا جائے گی اور ایسے ایسے جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوں گے جو پھر ختم ہونے کا نام نہ لیں گے۔ ایسی آزادی ایک وبالِ جان بن کر رہ جائے گی۔ زندگی کی ترقی اور بلندی و کمال کی جانب اس کا اقدام عارضی اور حقیر ذاتی مفادات کی حدود پر آ کر رُک جائے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی "آزادی" میں یہی ہوا اور ساتھ ہی آزاد شہوت رانی کے حیوانی نظریات نے بھی جنم لیا۔

اسلام انفرادی آزادی کو اس کی بہترین شکل میں عطا کرتا اور اعلیٰ ترین معنیٰ میں انسانی مساوات برپا کرتا ہے۔ لیکن ان دونوں کو بے قید و بے لگام نہیں چھوڑتا۔ ایک طرف سماج کا مفاد اور اس کا حق ہے، دوسری طرف انسانیت کے مصالح اور اس کے تقاضوں کا پاس و لحاظ ہے اور ساتھ ہی دین کے بلند ترین مفاد کی قدر و قیمت بھی سامنے ہے۔ اس لیے اسلام انفرادی آزادی کے بالمقابل انفرادی ذمہ داری کا اصول پیش کرتا ہے اور اس کے پہلو میں اجتماعی ذمہ داری کو جگہ دیتا ہے جس کا بار فرد اور جماعت دونوں پر ہے۔ اسی ذمہ داری کو ہم "اجتماعی تکافُل" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اسلام نے اجتماعی تکافُل کا اصول پوری تفصیل کے ساتھ سامنے رکھا ہے۔ فرد اور اس کی ذات، فرد اور اس کا قریبی خاندان، فرد اور جماعت، ایک قوم اور دوسری قوموں، ایک نسل اور آگے آنے والی نسلوں سب کے مابین اجتماعی تکافل کا یہ اصول کارفرما ہے۔

ذمہ داریوں کا یہ اشتراک فرد اور اس کی اپنی ذات کے درمیان بھی مطلوب ہے، فرد اس

بات کا مکلف ہے کہ نفس کو اس کی بے لگام خواہشات سے باز رکھے۔ اسے ہر طرح کی گندگیوں سے پاک کرکے اس کا تزکیہ کرے۔ اسے لے کر صلاح و کامرانی اور نجات کی راہ پر پیش قدمی کرے اور اسے ہلاکت کے منہ میں نہ جھونک دے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ (النازعات: ۳۷ تا ۴۱)

"جس نے سرکشی کی روش اختیار کی اور حیاتِ دنیا کو ترجیح دی اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور جو اپنے رب کے حضور حاضری (اور جواب دہی) سے ڈرتا رہا اور اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے باز رکھا اس کا مسکن جنت ہے۔"

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشمس: ۷ تا ۱۰)

"قسم ہے نفس کی اور اس بات کی کہ اسے درست بنایا گیا اور اس میں فجور و تقویٰ کی پہچان پیدا کی گئی۔ جس نے اس (نفس) کو پاک کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے گندگیوں سے آلودہ کیا وہ ناکام رہا۔"

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ج (البقرہ: ۱۹۵)

"اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

ساتھ ہی وہ اس بات کا بھی مکلف ہے کہ نفس کو اس حد تک اس کے مرغوبات ضرور بہم پہنچائے جہاں تک کہ اس کی فطرت پر برے اثرات پڑنے کا اندیشہ نہ ہو اور اس کے لیے اس کے حق کے بموجب کام اور آرام دونوں کے مواقع فراہم کرے نہ یہ کہ کام کا بوجھ ڈال کے اُسے گھلا مارے۔

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص: ۷۷)

"اللہ نے تجھے جو کچھ عطا کیا ہے اُس میں اُخروی زندگی کو اپنا مطمحِ نظر بنا اور دنیا میں سے اپنا حصہ نہ بھول جا۔"

يٰبَنِیٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَ
لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ (الاعراف : ۳۱)

"اے آدم کے بیٹو! اپنی زینتیں ہر نماز کے وقت زیرِ استعمال رکھو۔ کھاؤ، پیو اور حد سے آگے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

یہ انفرادی ذمہ داری اپنی جگہ مکمل ہے۔ ہر انسان کا سابقہ اپنے عمل سے ہے، اچھا، بُرا، نیک و بد جو کچھ بھی وہ کرے گا اُس کا اثر اُسی پر پڑتا ہے۔ دنیا ہو یا آخرت کہیں بھی اس سلسلہ میں کوئی اس کے کام نہ آسکے گا۔

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (المدثر : ۳۸)

"ہر فرد اپنے اعمال میں گرفتار و مقید ہے۔"

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوْسٰی ۝ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی ۝ اَلَّا تَزِرُ
وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۝ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ
سَوْفَ يُرٰی ۝ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی ۝ (النجم : ۳۶ تا ۴۱)

"کیا اُسے خبر نہیں ملی کہ موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں میں کیا مذکور تھا۔ وہ ابراہیم جنہوں نے (بندگی کا) پورا پورا حق ادا کر دیا۔ یہ کہ کوئی فرد کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھا سکے گا اور یہ کہ انسان کے کام آنے والی چیز بس وہی ہے جس کی وہ کوشش (اس دنیا میں) کر گزرے اور یہ کہ اس کی کوششوں کا ثمرہ جلد ہی اس کے سامنے لایا جائے گا اور پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔"

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ (البقرہ : ۲۸۶)

"ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اُسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اُس کا وبال اُسی پر ہے۔"

فَمَنِ اهْتَدٰی فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَا
اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝ (الزمر : ۴۱)

"اب جو راہ یاب ہوتا ہے تو اُس کا اپنا فائدہ ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ گمراہ ہو کر

اپنا ہی بُرا کرتا ہے۔ آپ ان سب کے ٹھیکہ دار نہیں"

وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ط (النساء: ۱۱۱)

"اور جو شخص کوئی برائی کماتے تو اس کی یہ کمائی اسی کے لیے وبال ہوگی"

ان اصولوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے نفس کا آپ ہی نگراں بن جاتا ہے نفس گمراہی کی طرف بڑھے تو یہی اس کو راہ راست پر لاتا ہے اور ساتھ ہی اس کے واجبی حقوق ہمیشہ ادا کرتا رہتا ہے۔ نفس سے لغزش ہو تو اس کا محاسبہ کرتا ہے اور اگر خود غفلت برتے تو اس کا خمیازہ بھی خود ہی بھگتنا ہے۔

اس طرح فرد کو مکمل آزادی ضمیر اور کامل انسانی مساوات عطا کرنے کے ساتھ ہی اسلام ہر فرد میں دو شخصیتیں پیدا کر دیتا ہے جو ہمہ دم ایک دوسرے پر نظر رکھتی ہیں، اور بھلائی بُرائی میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے یا ہاتھ پکڑنے کا فرض بھی ادا کرتی ہیں۔ پس آزادی اور ذمہ داری دونوں برابر ہیں اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔

فرد اور اس کے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کے مابین بھی تکافل کا اصول کار فرما ہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ط إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ه وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ه (بنی اسرائیل: ۲۳:۲۴)

"والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اُف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ اُن سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ اُن کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو: پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔"

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ط (لقمان: ۱۴)

"ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت کی کہ اس کی ماں اس کا بار جانے
کتنی راتوں کو اٹھائے رہی اور پھر دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا گیا (لہذا) وہ
میرا اور اپنے والدین کا شکر گزار ہو۔"

وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۔ (الاحزاب: ٦)

"رحمی رفاقت رکھنے والوں میں سے بعض اللہ کے فرمان میں بعض سے زیادہ قریب
اور مقدم قرار دیے گئے ہیں۔"

وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ
وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (البقرہ: ۲۳۳)

"جو باپ چاہتے ہوں کہ اُن کی اولاد پوری مدتِ رضاعت تک دودھ پیے تو مائیں
اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف
طریقے سے اُنھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔"

خاندان میں کفالتِ باہمی کی اہمیت کے بارے میں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہی اس ادارہ کی شیرازہ بندی کرنے والا اصول ہے۔ خاندان سماج کی عمارت کی بنیادی اینٹ ہے۔ اسکی قدر و قیمت کے اعتراف سے مفر نہیں۔ یہ ادارہ فطرتِ انسانی میں گہری جڑیں رکھنے والے میلانات و رجحانات، رحمت و مودّت کے پاکیزہ جذبات اور ضرورت و مصلحت کے تقاضوں کی تکمیل پر قائم ہے۔ پھر یہی وہ گہوارہ ہے جس میں اخلاق و آداب پرورش پاتے ہیں جو انسانیت کا خاصہ ہیں اور درحقیقت یہی اس سماج کے آداب ہیں جو جانوروں کی سی اباحیتِ مطلقہ اور وحشیانہ انارکی سے بلند ہو چکا ہو۔

کمیونزم نے چاہا تھا کہ نظامِ خاندان کو یکسر ختم کر دے۔ دلیل یہ تھی کہ خاندان انفرادی ملکیت اور ترجیحِ ذات کے جذبات کی پرورش کرتا اور دولت کی اجتماعی ملکیت نیز افراد کے ریاست کی تحویل میں لے لیے جانے کی راہ میں روڑا بنتا ہے۔ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں کمیونزم کو منہ کی کھانی پڑی۔ اس لیے کہ آج کا روسی سماج خاندانی نظام پر ہی مبنی ہے اور اس کے ذہن اور اس کی تاریخ میں خاندان کا ادارہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ مزید برآں ایک حقیقت یہ بھی ہے

کہ خاندان صرف ایک اجتماعی ادارہ نہیں بلکہ ایک نفسیاتی اور حیاتیاتی نظام بھی ہے۔ چنانچہ ایک عورت کو ایک ہی مرد کے لیے خاص کر دینا حیاتیاتی اعتبار سے زیادہ موزوں اور اچھی اولاد پیدا کرنے کی زیادہ کامیاب شکل ہے۔ یہ بات مشاہدہ کی روشنی میں ثابت ہو چکی ہے کہ جو عورت یکے بعد دیگرے کئی مردوں کے تحت رہتی ہے وہ ایک متعین عرصہ بعد بانجھ ہو جاتی ہے، یا پھر اس کے بچے صحت مند نہیں رہتے۔ رہا معاملہ کا نفسیاتی پہلو تو محبت و رحمت کے جذبات کسی دوسرے نظام کی بہ نسبت خاندانی نظام میں زیادہ بہتر طور پر نشوونما پاتے ہیں۔ اس طرح شخصیت کی تعمیر بھی اس ادارہ میں دوسرے نظاموں کی بہ نسبت زیادہ بہتر اور مکمل طور پر ہوتی ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم میں پرورش اطفال کے مراکز میں پرورش پانے والے بچوں پر کیے گئے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ جس بچے کی پرورش یکے بعد دیگرے کئی دائیاں کرتی ہیں اس کی شخصیت اضطراب و انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر محبت اور تعاون کے جذبات کو پورا نشوونما نہیں نصیب ہوتا۔ اسی طرح بلا باپ کا بچہ احساسِ کمتری میں بھی مبتلا رہتا ہے اور ایک ایسا خیالی باپ گھڑ کر اس حقیقت سے فرار کی شکل نکالتا ہے جس کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہوتا۔ وہ بس عالم خیال میں اس سے تعلق جوڑے رہتا ہے اور اس کی خیال آرائیاں اسے طرح طرح کی شکلیں دیتی رہتی ہیں[1]۔

نظامِ خاندانی کو وجود و استحکام بخشنے میں صرف حیاتیاتی اور نفسیاتی عوامل ہی کو دخل نہیں، ضرورت اور مصلحت کے بھی کچھ تقاضے ہیں جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان تعلق پیدا کر کے ایک گھرانے کی تشکیل کرتے اور بچوں کی نگہداشت کا ایک نظام بناتے ہیں۔ اس کے بعد ان رشتوں اور تعلقات کا نمبر آتا ہے جو ایک ہی خاندان کے مختلف افراد کو باہم جوڑتے اور ان سب کو ملا کر ایک وحدت بناتے ہیں جو نسلاً بعد نسل اچھے بُرے میں ایک دوسرے کے ساتھی اور جو کچھ آن پڑے یا ہاتھ لگے اس میں ایک دوسرے کے شریک رہتے چلے آتے ہیں۔

اسلام میں خاندانی کفالتِ باہمی کے مظاہر میں سے ایک اہم مظہر دولت کا وہ توارث

---

[1] از عربی ترجمہ "بلا خاندان کے بچے"، مصنف Anna Freud and Dorothy Burlingham

(مترجمہ بدران درمزی لبسی)

ہے جس کی تفصیل ذیل کی دو آیتیں پیش کرتی ہیں:

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ج فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ج وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ط وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ج فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ج فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ط آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ط فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ ط إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ج فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ط وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ط

(النساء: ۱۱-۱۲)

"تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہو۔ اگر (میت کے وارث) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔ اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔ اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے گا۔ اور اگر میت کے بھائی بہن ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حق دار ہوگی۔ یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے جب کہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کردی جائے اور قرض جو اس پر ہو ادا کر دیا جائے تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کردیے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا

ہے۔اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا۔ اگر وہ بے اولاد ہوں ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جب کہ وصیت جو انہوں نے کی پوری کر دی جائے اور قرض جو انہوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے، اور وہ تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی کی حقدار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں اُن کا حصہ آٹھواں ہو گا بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو وہ پوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔"

يَسْتَفْتُونَكَ ۚ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ۚ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۗ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ (النساء : ۱۷۶)

"لوگ تم سے کلالہ کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی، اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہو گا۔ اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکہ میں سے دو تہائی کی حق دار ہوں گی، اور اگر کئی بھائی بہن ہوں تو عورت کا اِکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہو گا۔ اللہ تمہارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔"

اوپر کی آیات میں جس وصیت کا ذکر آیا ہے اس کی تشریح اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ذریعہ فرما دی ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى

الْمُتَّقِيْنَ ۝ (البقرۃ: ۱۸۰)

"تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے سے وصیت کرے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔"

یہ وصیت ترکہ سے قرض ادا کرنے کے بعد بقیہ کے ایک تہائی سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اور نہ ہی ورثہ پانے والے میں سے کسی کے حق میں کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ "کسی وارث کے حق میں وصیت درست نہیں" (لا وصیۃ لوارث)[ل] دراصل وصیت کی گنجائش ایسے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے رکھی گئی ہے جس میں کہ خاندان کا کوئی ایسا فرد ورثہ سے محروم رہ جائے جس کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا اور بہتر تعلقات قائم رکھنا خاندانی تعلقات کا تقاضا ہو۔ ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ترکہ میں سے دوسرے کارہائے خیر پر کچھ صرف کرنے کا موقع بھی حاصل رہے۔

اسلام کا بنایا ہوا یہ نظام ایک خاندان کے مختلف افراد اور یکے بعد دیگرے آنے والی مختلف پشتوں کے درمیان تکافل کا ایک اہم مظہر ہے۔ علاوہ ازیں یہ ضابطہ دولت کو مسلسل تقسیم کرتا رہتا ہے اور اس کو ایک جگہ اتنا زیادہ نہیں جمع ہونے دیتا کہ یہ اجتماعی سماج کے لیے ایک خطرہ بن جائے۔ (آگے چل کر اقتصادی پالیسی میں ہم اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کریں گے)۔ یہاں ہم صرف اتنا کہنے پر اکتفا کریں گے کہ اسلام کا نظام وراثت خاندان کی فضا میں محنت و معاوضہ اور حقوق و فرائض کے باہمی توازن کا ذریعہ بنتا ہے ہر باپ یہی سمجھ کر محنت کرتا ہے کہ اس کی محنت کا پھل اس کی مختصر سی زندگی تک محدود نہ رہے گا اسکے بعد بھی باقی رہ کر اس کے بیٹوں، پوتوں کو فائدہ پہنچائے گا۔ جن کو بجا طور پر اسی کی زندگی کے آگے کی طرف پھیلاؤ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی پوری کوشش صرف کر کے زیادہ سے زیادہ پیدا کرتا ہے کہ اس میں اس کا بھی بھلا ہے اور پوری انسانیت نیز اس کے ملک کا بھی۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی طرح اُس کی صرف کی ہوئی محنت اور اس کو ملنے والے بدلہ میں یک گونہ برابری بھی پیدا ہوتی ہے کیونکہ اس کے بچے درحقیقت اُسی کا ایک "جزء" ہیں اور اُن کی بقاء میں اُسے اپنی

[ل] مصابیح السنۃ کے مرتب نے یہ حدیث نقل کی ہے اور اُسے حَسَن قرار دیا ہے۔

زندگی کی بقا اور اس کا تسلسل نظر آتا ہے۔

یہ عین تقاضائے انصاف ہے کہ اولاد اپنے ماں باپ کی مساعی سے مستفید ہو، کیونکہ اگر مالی وراثت کا رشتہ کاٹ دیا جائے تو بھی والدین اور اولاد کا تعلق ختم نہیں ہوجاتا۔ ماں باپ اولاد کی ذہنی اور جسمانی ساخت میں وراثت کے ذریعہ بہت سی صفات واستعدادات منتقل کرتے ہیں جو زندگی بھر اُن سے جُدا نہیں ہوتیں اور ان کے آئندہ حالات کو بڑی حد تک متعین کردیتی ہیں۔ یہ حالات اچھے ہوتے ہیں اور خراب بھی۔ یہ بات اولاد کے بس سے باہر ہے کہ موروثہ صفات میں کسی کو قبول کرنے سے انکار کردے یا اُن میں کچھ ردّ و بدل کرسکے۔ ریاست یا سماج کتنا ہی ایڑی چوٹی کا زور لگادے لیکن جس بچے کو اس کے ماں باپ نے ایک بدصورت چہرہ کا وارث بنادیا ہے اُسے ایک حسین وجمیل چہرہ نہیں عطا کرسکتے۔ نہ اس کو مزاج کا اعتدال اور اعصاب کی صحت وسلامتی بخش سکتے ہیں جب کہ اس کے ورثہ میں غیر مستقل مزاجی اور بے ہنگم پن ہی ملا ہو، اسی طرح اگر ماں باپ نے دائم المریض رہنے اور جلد بوڑھے اور ناکارہ ہوجانے کا مواد منتقل کیا ہو تو یہ اس کو لمبی عمر اور فراواں صحت کبھی نہیں دے سکتے۔ جب اس کو یہ سب کچھ بلا کسی ارادہ واختیار کے مجبوراً ہی قبول کرلینا تھا تو اجتماعی عدل کا عین تقاضا ٹھہرا کہ اسے اپنے ماں باپ کی محنتوں کے مادّی ثمرات بھی ملیں تاکہ نفع نقصان کسی حد تک برابر ہوجائے۔

قرآن نے اولاد اور آباء کے درمیان تکافل کو موسیٰ علیہ السلام اور اُس بندۂ خدا کے قصہ میں ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے جس کو بقولہٖ تعالیٰ "ہم نے اپنے جنابِ خاص سے رحمت عطا فرمائی تھی اور ایک مخصوص علم سکھایا تھا" (وَآتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا)

فَانطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا أَتَيَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا
أَن يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَن يَنقَضَّ فَأَقَامَهُ

(کہف: ۷۷)

"پھر وہ آگے چلے، یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے کھانا مانگا۔ مگر انھوں نے ان دونوں کی ضیافت سے انکار کردیا۔ وہاں انھوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی۔ اس شخص نے اُس دیوار کو پھر قائم کردیا۔"

اس پر حضرت موسیٰؑ کو یہ اعتراض تھا کہ جب تک بستی والے ان کو کھانا کھلانے سے انکاری رہیں یہ اُن سے اس کی اُجرت طلب کر سکتے تھے۔ (لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا) اس پر انھوں نے اس دیوار کی مرمت کرنے کی اصل وجہ کا انکشاف اِن الفاظ میں کیا:

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا ج فَأَرَادَ رَبُّكَ أَن يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ج وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ط

(کہف: ۸۲)

"اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے اِن بچوں کے لیے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا اس لیے تمہارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے۔ میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا۔"

اس طور پر دونوں لڑکوں کو باپ کی نیک چلنی سے فائدہ پہنچا اور جو مال و دولت اور نیکی و سعادت وہ اُن کے لیے اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے یہ اس کے وارث ہوئے۔ اس کا مبنی بر حق و انصاف ہونا بالکل واضح ہے۔

اس کے باوجود بھی جب دولت کے کسی خاص دائرہ میں گھِر کر رہ جانے کا اندیشہ ہو تو شریعتِ الٰہی کے مطابق حکمرانی کرنے والا مسلمان حاکم اصلاحِ حال کے لیے مناسب اقدامات کا مجاز ہے۔ اسلام اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص ذرائع سے کام لے کر اصلاحِ حال کریگا جیسا کہ آگے "اقتصادی پالیسی" کے باب میں آتا ہے۔ فرد جماعت اور جماعت و فرد کے درمیان بھی تکافل کا یہ اصول کام کرتا ہے۔ یہ اصول ان دونوں پر کچھ ذمہ داریاں ڈالتا ہے اور دونوں کو کچھ حقوق عطا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام دونوں کے مصالح کو بالآخر ایک دوسرے سے جوڑ کر ایک کر دیتا ہے اور دونوں میں سے جو بھی زندگی کے مادّی یا اصولی اور معنوی کسی بھی پہلو سے متعلق

سورۃ کہف: ۷۷

فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے اس کو سزا دیتا ہے۔

چنانچہ ہر فرد سب سے پہلے اس بات کا مکلف ہے کہ اس کے ذمہ جو کام ہے اُسے کمِن و خوبی انجام دے۔ کیونکہ اس کی محنت کا پھل درحقیقت جماعت کی ملکیت ہے اور بالآخر اس کا اچھا یا بُرا اثر جماعت ہی پر مرتب ہوتا ہے۔

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ ط (التوبہ: ۱۰۵)

"اے نبی! ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو، اللہ اور اس کا رسول اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرزِ عمل کیا رہتا ہے"۔

ہر شخص کو جماعت کے مصالح کی نگرانی اس طرح ملحوظ رکھنی ہے کہ جیسے اُسی کو اُن کا محافظ و نگران بنا دیا گیا ہو۔ کیونکہ زندگی سمندر میں رواں کشتی ہے جس کی سلامتی کے بارے میں اس کا ہر سوار ذمہ دار ہے۔ اور کسی کو انفرادی آزادی کے نام پر اپنی جگہ پر سوراخ کر دینے کا حق نہیں۔

مثل القائم علی حدود اللہ والواقع فیہا کمثل قوم استھموا فی سفینۃ، فاصاب بعضھم اعلاھا وبعضھم اسفلھا فکان الذین فی اسفلھا اذا استقوا مروا علی من فوقھم، فقالوا لوانا خرقنا فی نصیبنا خرقا ولم نؤذ من فوقنا۔ فان ترکوھم وما ارادوا ھلکوا وان اخذوا علی ایدیھم نجوا ونجوا جمیعًا۔

(البخاری والترمذی، واللفظ للبخاری)

"اللہ کی کھینچی ہوئی حدود کا پاس رکھنے والے اور اُن سے تجاوز کرنے والے کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کچھ لوگ تھے جنہوں نے باہم شریک ہو کر ایک کشتی حاصل کی۔ کچھ لوگوں کو اوپر کا حصہ ملا اور کچھ کو نیچے کا۔ جو لوگ نیچے کے حصہ میں رہتے تھے ان کو پانی پینے کے لیے اوپر والوں کے پاس سے ہو کر گذرنا پڑتا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ کیا اچھا ہوتا کہ اگر ہم اپنے ہی حصہ میں (پانی تک پہنچ حاصل کرنے کے لیے) ایک سوراخ کر لیں اور اوپر والوں کو تکلیف دینے سے بچ جائیں۔ اگر لوگ ان (نیچے والوں) کو اُن کا ارادہ پورا کرنے دیں تو خود بھی ہلاک ہوں اور اگر اُن کا ہاتھ پکڑ لیں تو وہ بھی بچ جائیں اور سب کے سب نجات

پاجائیں۔"

افراد کے مفادات و مصالح کے باہم مربوط اور ایک دوسرے پر منحصر ہونے کی یہ بڑی اچھوتی تصویر ہے جو اس انفرادیت پسندانہ طرز فکر کے مقابلہ میں پیش کی گئی ہے۔ جو اصول و نظریات کے ظاہری اور سطحی معنیٰ کا سہارا لیتی اور عملی حقائق کی گہرائی میں اترنے اور واقعات کے عملی نتائج پر غور کرنے سے کتراتی ہے۔ ساتھ ہی یہ تمثیل بڑی باریک بینی کے ساتھ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ فرد اور جماعت دونوں کے اوپر ایسے حالات میں کیا ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔

مصالحِ عامہ کی رعایت ملحوظ رکھنے کی ذمہ داری سے کوئی فرد بھی بری نہیں کہ سماج میں ہر فرد بیک وقت نگران بھی ہے اور زیر نگرانی بھی۔

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ (مسلم۔ بخاری)

"تم میں ہر ایک نگراں ہے اور اُس سے اُس کی نگرانی میں دیے ہوئے لوگوں کی بابت بازپرس بھی ہونی ہے۔"

سماج کے افراد کے درمیان نیکی اور معروف کی حدود میں رہتے ہوئے باہم تعاون سماج کی مصلحت کا عین تقاضا اور ایک لازمی فریضہ ہے۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

(مائدہ: ۲)

"جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں اُن میں سب سے تعاون کرو۔ اور جو گناہ کے کام ہیں اُن میں کسی سے تعاون نہ کرو۔"

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ط (آل عمران: ۱۰۴)

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بُلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔"

امر بالمعروف کے سلسلہ میں ہر شخص سے الگ الگ پرسش ہوگی اور اگر اس نے یہ فریضہ انجام نہ دیا ہوگا تو مجرم قرار پائے گا اور اسے اس جرم کی سزا ملے گی۔"

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا
سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝
وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۝ وَ
لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝ لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ۝ (الحاقۃ: ۳۰تا۳۷)

"اس کو پکڑو اور اس کے گلے میں طوق ڈالو۔ پھر اس کو جہنم میں داخل کرو۔ اور پھر اُسے ستر گز لمبی زنجیر میں جکڑ دو۔ بیشک یہ وہ ہے جو خدائے عظیم وجلیل پر ایمان نہ لایا تھا اور نہ یہ محتاجوں کو کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔ تو اب یہاں کوئی اس کا دوست نہیں اور نہ اس کے لیے یہاں کوئی غذا ہے زخموں کے دھوون کے سوا۔ یہ غذا انھیں لوگوں کے لیے ہے جو گنہگار ہیں"

مسکین کو کھانا کھلانے پر دوسروں کو نہ اُبھارنا بھی کفر اور تکذیب دین کی صریح علامت شمار کی جاتی ہے۔

اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ
الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ (الماعون: ۱تا۳)

"تم نے اس شخص کو دیکھا جو جزا وسزا کا منکر ہے؟ یہی ہے جو یتیموں کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی تلقین نہیں کرتا"

ہر فرد اس بات کا مکلّف ہے کہ جو منکر بھی دیکھے اُسے مٹا دے۔

من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فمن لم يستطع فبلسانه فمن لم يستطع فبقلبه وهو أضعف الايمان۔

(مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی۔)

"تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اُسے چاہیے کہ اُسے بزور بازو مٹا دے، جس سے یہ نہ ہو سکے وہ زبان سے ہی اُس کو دور کرنے کی کوشش کرے، جس سے یہ بھی نہ بن پڑے وہ دل ہی میں اس کے خلاف جذبہ رکھے، اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے"

اس طور پر ہر فرد ہر اُس منکر کے بارے میں جواب دہ قرار پاجاتا ہے جو جماعت میں رونما ہو، خواہ وہ اُس میں خود نہ شریک رہا ہو۔ کیونکہ جماعت ایک اکائی ہے جس کے لیے منکر بڑا اذیت ناک ہے اور جماعت کو خطرات سے محفوظ رکھنا ہر فرد کا فرض ہے۔ اسی طرح جماعت بھی اگر اپنے افراد کی طرف سے منکر کے صدور پر چشم پوشی سے کام لے تو اس سے مواخذہ ہوگا اور اس کی سزا وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ بھگتے گی، کیونکہ یہ اس کی براہِ راست ذمہ داری میں داخل ہے کہ اپنے ہر فرد کی نگران و سرپرست بن کر رہے۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۶)

"اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اُسے برباد کرکے رکھ دیتے ہیں۔"

چاہے اس میں بہت سے افراد خود فسق سے دور رہے ہوں۔ نگران کا اس فسق کے وجود کو ٹھنڈے برداشت کرتے رہنا ہی اُن کو تباہ و برباد کیے جانے کے لائق ٹھہراتا ہے۔

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً ج

(الانفال: ۲۵)

"بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔"

اور اس میں ظلم کی کوئی بات نہیں، اس لیے کہ جس قوم میں فواحش پھیل رہے ہوں اور منکر کا ارتکاب علی الاعلان جاری ہو لیکن وہ اسے مٹانے کی طرف توجہ نہ کرے اُس قوم کا شیرازہ بکھر کر رہتا ہے، وہ کمزور گرتی اور زوال سے دوچار ہوتی ہے۔ جو تباہی اُسے یوں نصیب ہوئی وہ ایک قدرتی اور لازمی نتیجہ ہے اس روش کا جو اس نے اختیار کی۔

منکر سے باز نہ آنے اور اُسے مٹانے کی کوشش نہ کرنے کے سبب ہی بنی اسرائیل کو اپنے انبیاء کی زبان سے لعنت سُننی پڑی، ان کی ہوا اکھڑ گئی اور ان کا عروج زوال سے بدل گیا۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ط ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ط لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○ (المائدہ: ۷۸-۷۹)

"بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرتے تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا جو انھوں نے اختیار کیا۔"

حدیث میں آیا ہے کہ:

لَمَّا وَقَعَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ فِي الْمَعَاصِيْ نَهَتْهُمْ عُلَمَاءُهُمْ فَلَمْ يَنْتَهُوْا فَجَالَسُوْهُمْ فِيْ مَجَالِسِهِمْ وَاٰكَلُوْهُمْ وَشَارَبُوْهُمْ فَضَرَبَ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ وَلَعَنَهُمْ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ۔

"جب بنی اسرائیل میں گناہوں کا بازار گرم ہوا تو ان کے علماء نے انھیں روکا لیکن وہ نہیں رُکے، اُن کے علماء نے مجالس میں ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور اُن کے ساتھ کھانا پینا، سب کچھ جاری رکھا اس پر اللہ نے ان میں سے بعض (یعنی علماء) کے دلوں کو بعض دوسری (یعنی عوام) کے دلوں کے مانند کر دیا اور ان پر عیسیٰ ابن مریم اور داؤد کی زبان سے لعنت بھیجی۔"

آپؐ ٹیک لگائے ہوئے تھے، اب سیدھے بیٹھ گئے۔ اور فرمایا:

لَا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ حَتّٰى تَاطِرُوْهُمْ عَلَى الْحَقِّ اَطْرًا۔

(ابوداؤد، ترمذی)

"نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جب تک ایسے لوگوں کو بزور بازو ٹھیک طریقہ اختیار کرنے پر مجبور نہ کر دو گے (فلاح نہ پاؤ گے)۔"

رہے سچے مسلمان تو یہی لوگ ہیں جن کی بابت قرآن یہ فرماتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ م يَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (التوبہ: ۷۱)

"مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق و دمساز ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔"

ایک بار کچھ لوگوں نے آیت:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ج لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ
اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ط (المائدہ: ۱۰۵)

"اے ایمان لانے والو! اپنی فکر کرو۔ کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہِ راست پر ہو۔"

سے یہ مفہوم نکالا کہ یہ منکر کو مٹانے اور مردود قرار دینے کی طرف سے خاموشی اختیار کر لینے کو جائز قرار دیتی ہے تو اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی کوتاہ فہمی یہ کہہ کر واضح کی:

یا ایھا الناس انکم تقرءون ھذہ الآیۃ وانکم تضعونھا علی غیر موضعھا وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول "ان الناس اذا راوا الظالم فلم یاخذوا علی یدہ اوشک ان یعمھم اللہ تعالیٰ بعقاب" وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول "ما من قوم یعمل فیھم بالمعاصی ثم یقدرون علی ان یغیروا فلم یغیروا الا یوشک ان یعمھم اللہ بعقاب۔"

(ابوداؤد۔ والترمذی)

"لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کی غلط تاویل کرتے ہو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ "لوگوں کا حال جب یہ ہو جائے کہ وہ ظالم کو دیکھیں۔ مگر اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکیں تو پھر اللہ کو ان پر عام عذاب بھیجتے دیر نہیں لگتی" اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ "کوئی قوم ایسی ہو جس میں گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہو اور لوگ اس حالت کے بدلنے پر قادر بھی ہوں لیکن پھر بھی

نہ بدلیں تو اُن پر اللہ کی طرف سے سزائے عام نازل ہوتے دیر نہیں لگتی۔"

دراصل یہی اس آیت کی وہ صحیح تفسیر ہے جو اسلام کے مقاصد سے میل کھاتی ہے۔ آیت میں تو صرف فرد کی ذمہ داری کا بیان ہے اور یہ کہ ایسی منفی گمراہی جس کا مثبت طور پر کوئی اثر مترتب نہ ہو اس شخص کا اپنا معاملہ ہے۔ دوسروں پر صرف اتنی ذمہ داری ہے کہ اسے راہِ راست پر لانے کی اپنی سی کوشش کر دیکھیں۔ لیکن اگر وہ نہیں مانتا تو وہ جانے اور اس کا عمل' اپنے کیے کا پھل اُسے مل ہی جائے گا۔

جماعت اپنے کمزوروں کی حفاظت اور اُن کے مصالح کی دیکھ بھال کے بارے میں جوابدہ ہے۔ چنانچہ اگر ناگزیر ہو تو اُسے ان کی حفاظت کی خاطر جنگ کرنا بھی ضروری ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ .... (النساء: ۷۵)

"آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پاکر دبا لیے گیے ہیں۔ ...."

اسی طرح یہ ذمہ داری بھی اُسی پر ہے کہ جب تک وہ سنِ رُشد کو نہ پہنچیں اُن کے اموال کی حفاظت کرے۔

وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا ۚ وَمَن كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَن كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ○ (النساء: ٦)

"یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم اُن کے اندر اہلیت پاؤ تو اُن کے مال اُن کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ حدِ انصاف سے تجاوز کر کے اِس خوف سے ان کے مال جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سرپرست مال دار ہو وہ پرہیز گاری سے کام لے اور

جو غریب ہو وہ معروف طریقے سے کھائے۔ پھر جب اُن کے مال اُن کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنالو۔ اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔"

حدیث میں ہے کہ:

الساعی علی الارملۃ والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ وکالذی یقوم اللیل ویصوم النھار۔ (مسلم، بخاری، ترمذی، نسائی)

"بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا (اپنے کارنامہ کے اعتبار سے) مجاہد فی سبیل اللہ کے مانند اور اس شخص کی طرح ہے جو دن بھر روزے رکھتا ہو اور رات بھر نمازیں پڑھتا ہو۔"

جماعت اپنے غربا اور فقراء کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ دار ہے۔ وہ زکوٰۃ وصول کرکے اُسے اس کے متعین مصارف میں خرچ کرے گی۔ اگر یہ اس غرض کے لیے کفایت نہ کرے تو ذی استطاعت لوگوں پر اس حد تک ٹیکس لگایا جائے گا جس سے ضرورت مندوں کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ اس ضرورت کی تکمیل کے سوا ٹیکس لگانے میں کوئی دوسری چیز قابلِ لحاظ نہیں کہ اُس کی رعایت اِس کی راہ روک سکے، کیونکہ اگر قوم کا ایک فرد بھی کسی شب بھوکا رہا تو ساری قوم مجرم و گناہگار شمار کی جائے گی تا آنکہ لوگ ایک دوسرے کو بھوکوں کے کھانا کھلانے پر نہ اُبھاریں:

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحَٰضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ وَ
تَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ۝ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ كَلَّا
إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝
وَجِيءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ
الذِّكْرَىٰ ۝ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ۝ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ
عَذَابَهُ أَحَدٌ ۝ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ ۝ يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ
الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي
وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ (الفجر: ۱۷ تا ۳۰)

"ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو محتاجوں

کو کھانا کھلانے پر اُبھارتے ہو، تم مُردے کی میراث سمیٹ کر ساری کی ساری خود کھا جاتے ہو اور مال سے انتہائی محبّت کرتے ہو، ہرگز نہیں، جب زمین کوٹ کوٹ کر پست کردی جائے اور تیرا رب اور فرشتے قطار در قطار آئیں اور اس دن جہنّم کو (میدانِ حشر میں) لایا جائے۔ اس دن انسان اپنی غفلت کو یاد کرے گا اور اب سوچنے سمجھنے کا موقع ہی کہاں رہا۔ وہ کہے گا کاش میں نے اپنی زندگی میں آج کے لیے کچھ بھیجا ہوتا۔ پھر اس دن خدا کی طرح نہ کوئی عذاب دے گا اور نہ اس کی طرح کوئی قید میں ڈالے گا۔ اے وہ روح جو (اپنی دنیاوی زندگی میں) مطمئن ہو گئی تھی اب اپنے رب کی طرف رجوع کر بایں حال کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے خوش تو میرے بندوں میں شامل ہو اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

حدیث میں آتا ہے:

ایما اھل عرصۃ اصبح فیھم امرؤ جائعًا فقد برئت منھم ذمۃ اللہ تبارک وتعالیٰ۔ (مسند امام احمد بن حنبل، نشر کردہ استاذ احمد محمد شاکر، حدیث نمبر ۴۸۸۰)

"جس بستی میں کوئی شخص صبح کو اس حال میں اُٹھے کہ وہ رات بھر بھوکا رہا ہو تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ پر اس بستی کے بقاء و تحفظ کی کوئی ذمّہ داری نہیں رہ جاتی۔"

من کان معہ فضل ظھر فلیعد بہ علی من لا ظھر لہ۔ ومن کان لہ فضل زاد فلیعد بہ من لا زاد لہ (مسلم۔ ابوداؤد)

"جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اُسے اُس کو دیدے جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس زائد زادِراہ ہو وہ اُسے اُس کے حوالہ کردے جس کے پاس زادِراہ نہ ہو۔"

من کان عندہ طعام اثنین فلیذھب بثالث ...... فان اربع فخامس او سادس (متفق علیہ)

"جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے آدمی کو (مہمان بناکر) لے جائے۔ ...... اور اگر چار کا ہو تو پانچویں یا چھٹے کو۔"

امت اسلامیہ جسد واحد کے مانند ہے کہ یہاں سے وہاں تک ایک ہی احساس کام کرتا ہے۔ ایک عضو کو جو تکلیف پہنچتی ہے تمام اعضاء اس کے درد کی ٹیسیں محسوس کرتے ہیں۔ امت اسلامیہ کی یہ تعبیر بڑی ہی دل کش اور مؤثر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔

مثل المؤمنین فی توادھم وتراحمھم وتعاطفھم کمثل الجسد اذا اشتکی منہ عضوٌ تداعی لہ سائر الجسد بالسھر والحمّٰی۔

(متفق علیہ)

"باہم لطف وکرم اور اُنس ومحبت میں مسلمانوں کا حال جسم کا سا ہے کہ جب ایک عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو بدن کا عضو عضو بے خوابی اور بخار کے ذریعہ اس کا شریک غم بن جاتا ہے۔"

اسی طرح آپؐ نے ایک مومن اور دوسرے مومن کے درمیان تعاون و تکافل کی ایک اور لطیف اور معنی خیز تصویر کھینچی ہے:

المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضًا۔ (مسلم۔ بخاری)

"ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت (کی اینٹوں) کے مانند ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو تھامے اور سنبھالے رہتی ہے۔"

تعاون و تکافل کا یہ وہ اعلیٰ ترین معیار ہے جس تک ہمارا تخیل پرواز کر سکتا ہے۔ یہی اصول جس کے تحت اجتماعی جرائم کے لیے سزائیں مقرر کی گئی ہیں اور انھیں سخت رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ جب تک ہر فرد کی جان و مال اور اس کی عزت و آبرو کو محفوظ نہ کر دیا جائے تعاونِ باہمی کا اصول عملاً متحقق نہیں ہو سکتا۔

کل المسلم علی المسلم حرام دمہ وعرضہ ومالہ۔ (مسلم۔ بخاری)

"ایک مسلمان کا سب کچھ دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون، اس کی عزت و آبرو، اس کا مال۔"

اسی لیے اسلام نے قتل اور زخموں کے معاملہ میں برابر کے بدلے کا قانون بنایا اور قتل کے

جرم کو سزا کے معاملہ میں کفر کے برابر قرار دیا:

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا۔

(النساء : ۹۳)

"اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔"

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ط وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا ٥ (بنی اسرائیل : ۳۳)

"قتلِ نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ، اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے۔"

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ط (المائدہ : ۴۵)

"توراۃ میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ ہے۔"

اور قصاص پر اُبھارتے ہوئے اُس نے اس کو جماعت کے لیے حیات بخش قرار دیا:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ٥

(البقرہ : ۱۷۹)

"عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے، اُمید ہے کہ تم اِس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔"

بلاشبہ اس میں زندگی ہے کیونکہ قتل سے روک کر گویا زندگی کو محفوظ کر دیا گیا ہے اور جماعت کے وجود و بقا نیز اس کے شیرازہ کو منتشر ہونے سے بچانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ زنا کی سزا بہت سخت رکھی گئی ہے کیونکہ یہ عزت و آبرو پر حملۂ بے جا اور عصمت و عفت کی بے حرمتی ہے۔ اِس سے

جماعت میں فحاشی کی اشاعت بھی ہوتی ہے جس کے ذریعہ تھوڑے ہی عرصہ میں نظمِ جماعت کا پارہ پارہ ہوجانا یقینی ہے۔ پھر اس سے رشتے گڑبڑ ہوتے ہیں اور یہی بناوٹی ولدیت کے ذریعہ باپوں کے رحم وکرم اور ان کی شفقت کی چوری کا باعث بھی بنتا ہے۔

اسلام نے اس سزا کو سخت رکھا ہے۔ چنانچہ اس نے شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے حتی الموت سنگساری اور غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے کوڑے لگانے کی سزا مقرر کی ہے جو اکثر مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ ۔ (النور: ۲)

"زنا کے مرتکب ہونے والے مرد اور عورت ہر ایک کو سَو سَو کوڑے مارو اور ان دونوں پر اللہ کا قانون نافذ کرنے میں تم نرمی یا رحم سے مطلق کام نہ لینا۔"

جو لوگ بھولی بھالی شادی شدہ مومنات پر افتراء پردازی کرتے ہوئے زنا کی تہمت لگاتے ہیں اور اس طرح بالکل جھوٹ ان کی عزت وآبرو پر حرف رکھتے ہیں، اُن کی سزا اُس نے اسی کوڑے رکھی ہے۔ اس لیے کہ تہمت طرازی کا یہ جُرم نیک نامی اور آبرو پر حملۂ بے جا اور بغض وعناد کی جڑ ہونے کے باعث زنا کا ہم پلّہ ہے۔ پھر اس کے چرچے سے فحاشی اور زیادہ پھیلتی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ (النور: ۴)

"جو لوگ شادی شدہ شریف اور آزاد عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور پھر اس پر چار گواہ نہ پیش کر سکیں اُن کو اسی کوڑوں کی سزا دو، اور آئندہ کبھی اُن کی گواہی نہ قبول کرو۔"

چوری چونکہ دوسرے کی ملکیت پر بے جا زیادتی ہے۔ لہٰذا اسلام نے یہاں بھی سختی برتی اور اس کی سزا قطعِ ید قرار دی اور دوبارہ چوری کرنے پر دوسرا ہاتھ بھی کاٹ لینے کا حکم دیا:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً ۢ بِمَا كَسَبَا

نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۚ (المائدہ: ۳۸)

"اور چور خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ اُن کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا"

آج بعض حضرات جب اس سزا کا ایک شخص کے کچھ مال کی چوری سے مقابلہ کرتے ہیں تو انہیں یہ بہت سخت اور بے رحمانہ نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سزا کے تعین میں اسلام نے جماعت کے امن و تحفظ اور اس کی سلامتی کو سامنے رکھا ہے۔ نیز اس کے پیشِ نظر اس جُرم کی مخصوص نوعیت بھی رہی ہے۔ یہ چوری چھپے کیا جانے والا جُرم ہے اور چُھپا کر کیے جانے والے جرائم اپنی عین فطرت کے اعتبار سے سخت سزائیں چاہتے ہیں۔ تاکہ لوگ اُن سے باز رہیں یا اس سخت سزا کے خوف اور اس کے اندیشے میں طاری ہونے والی بوکھلاہٹ کے نتیجہ میں کوئی نہ کوئی علامت چھوڑ جائیں یا کوئی ایسی حرکت کر جائیں جو اُن کا سُراغ لگانے میں مدد دے سکے۔

واضح رہے کہ اگر چور نے خود اپنی یا اپنی اولاد کی بُھوک کی شدت سے تنگ آ کر مجبوراً چوری کی ہو تو ایسے حالات میں یہ سخت سزا نافذ نہیں کی جائے گی کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ "مجبور پر کوئی تنگی نہیں"

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ (البقرہ: ۱۷۳)

"جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں"

اور شُبہہ پڑ جائے تو حد نہیں جاری کی جائے گی:

ادرؤا الحدود بالشبہات[1]۔

"شبہات کی بناء پر حدود ساقط کرو"

جیسا کہ آگے آتا ہے، حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں اسی اصول پر عمل کیا تھا۔[2]

---

[1] عبداللہ بن عباسؓ راوی ہیں۔ کتاب الکامل لابن عدی۔ اور مسند ابو حنیفہ للحارثی۔

[2] استاذ محمد قطب کی کتاب "الانسان بین المادیۃ والاسلام" کا باب "جرم اور سزا"، ملاحظہ ہو۔

جو لوگ امن عامہ کے لیے مستقل خطرہ بن جائیں اور بدامنی اور فساد مچانے پر اُتر آئیں اُن کی سزا قتل، سُولی یا ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالنا یا جلاوطنی قرار دی گئی ہے:

إِنَّمَا جَزَاؤُا الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ط (المائدہ: ۳۳)

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سُولی پر چڑھائے جائیں یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیے جائیں۔"

اس لیے کہ فساد مچانے اور فتنہ برپا کرنے کی سازش اور اس سلسلے میں گٹھ جوڑ انفرادی جرائم سے کہیں زیادہ گھناؤنا جرم ہے اور اس کے سلسلے میں سخت سزاؤں اور قلع قمع کرنے کی تدابیر کی نسبتاً کہیں زیادہ ضرورت ہے۔

اس طور پر اسلام اجتماعی تکافل کو اس کی تمام ممکن شکلوں کے ساتھ قائم کرتا ہے۔ اس کوشش میں ہر آن یہ اُصول اس کے سامنے رہتا ہے کہ فرد اور جماعت دونوں کے کلی مقاصد ایک ہی ہوں۔ زندگی کے سارے پہلو ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کریں۔ چنانچہ وہ فرد کی اس حد تک مکمل آزادی عطا کرتا ہے جہاں تک وہ نہ خود اس کے لیے مضر ہے اور نہ جماعت کی راہ میں روڑا بنتی ہے۔ وہ جماعت کو بھی اس کے حقوق پورے کے پورے دیتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کو ان حقوق کے مقابلہ میں بہت سی ذمہ داریوں کا مکلف بھی ٹھہراتا ہے تاکہ زندگی اپنی سیدھی ہموار راہ پر بے کھٹکے آگے بڑھی چلے اور بالآخر اِن بلند مقاصد تک جا پہنچے، جن کے طلبگار اور جن کے لیے کوشاں جماعت اور فرد دونوں یکساں طور پر ہیں۔

مکمل آزادیٔ ضمیر، کامل انسانی مساوات اور ٹھوس اور پائدار اجتماعی تکافل، انہی تین بنیادوں پر اجتماعی عدل کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اور انسانی عدل کا نظریہ عمل کا جامہ پہنتا ہے۔

باب چہارم

اسلام میں اجتماعی عدل کے قیام کے ذرائع

اسلام میں اجتماعی عدل کے قیام کے ذرائع

اسلام اپنے کام کا آغاز خارج سے نہیں داخل سے کرتا ہے اور اپنی اصلاحی کوششوں کو سطح تک محدود رکھنے کے بجائے قلب وضمیر کی گہرائیوں کو ان کا اصلی ہدف قرار دیتا ہے، لیکن ساتھ ہی وہ کبھی بھی زندگی کی واقعی صورتِ حال سے غفلت نہیں برتتا۔ وہ نہ تو نفسِ انسانی کی حقیقت اور اس پر طاری ہونے والے مدّوجزر اور قبض و بسط کی مختلف کیفیات کو نظرانداز کرتا ہے نہ اس حقیقت کو کہ ایک طرف بلند پرواز، نیک ارادے اور جذباتِ عالیہ ہیں تو دوسری طرف پاؤں میں ضروریات کی زنجیر بھی ہے۔ انسان کی پرواز کتنی ہی بلند ہو، یہ جانِ ناتواں کمالِ مطلق تک پہنچنے سے قاصر ہی رہتی ہے۔

نفسِ انسانی کی گہرائیوں کی بابت اپنے اتھاہ علم کی رہنمائی میں اسلام قانون بھی بناتا ہے اور ترغیب وتلقین کا فرض بھی انجام دیتا ہے۔ اسی کے مطابق وہ کچھ کاموں کا حکم دیتا اور کچھ چیزوں سے روکتا ہے۔ انسانی نفسیات کے اسی علم کی روشنی میں وہ حدود وضع کرتا اور ان کو نافذ کرتا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ ضمیرِ انسانی کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ قوانین وضوابط کی حدود تک ہی محدود نہ رہے بلکہ اور بھی جتنا بلند ہو سکے اور جتنا اونچا معیار قائم کر سکے کرے۔

اِس دین میں جو فرائض عائد کئے گئے ہیں ان کو نافذ کر دینے سے بھی زندگی کی گاڑی نہ صرف یہ کہ چل پڑتی ہے بلکہ انسانی زندگی میں موزونیت وصالحیت بھی آجاتی ہے، لیکن طبیعت کے علو، قلب ونظر کی وسعت اور نیکی کے کاموں کی مسابقت کی اس اسپرٹ کو اپنایا جائے جس کے لئے اسلام انسانی ضمیر کو اُبھارتا ہے تو مسلمان کی شخصیت کمال کے مدارج بھی طے کر سکتی ہے۔

اس دین میں قلب وضمیر کو مخاطب کرنے والی تلقینات اور ہدایات ہی وہ چیزیں ہیں جو لازم قرار دی

ہونی ذمہ داریوں کو درجۂ کمال تک پہنچاتی ہیں۔ پھر یہی ہدایات قانونی فرائض کی برضا و رغبت انجام دہی کی بھی ضامن ہیں اور یہی انسانی زندگی کو اس کا وہ حقیقی جوہر عطا کرتی ہیں جو پابندیوں اور تقاضائے ضرورت سے مستغنی ہوتا ہے اور اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ قوانین وضوابط کے ذریعہ دھکیل کر اُسے راہ پر لگایا جائے۔

اسلام کے پیش نظر چونکہ کامل اجتماعی عدل کا قیام تھا لہٰذا اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ محض اقتصادی عمل کا محدود نظام بن کر رہ جائے۔ اور یہ بھی مناسب نہ سمجھا کہ قانون کی ذمہ داری ہی اس کے عدل کے قیام کا واحد سہارا ہو۔ چنانچہ اسلام نے اس نظام عدل کو ایک وسیع اور ہمہ گیر انسانی نظام عدل کی شکل دی اور اسے دو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔ فرد کے داخل میں انسانی ضمیر اور سماج کی خارجی دنیا میں قانونی ضابطہ بندی۔ اس نے دونوں کو باہم اچھی طرح مربوط رکھا۔ ان دونوں سے کام لیتے ہوئے ایک طرف تو وہ آدمی کے وجدان میں راسخ تاثرات اور جذبات کو اُبھارتا ہے اور دوسری طرف وہ انسان کی فطری کمزوری سے بھی غافل نہیں رہتا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ انسان خارج میں ایک ایسی قوت کا شدت سے محتاج رہتا ہے جو اُسے غلط روی سے بھی باز رکھ سکے جیسا کہ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ صاحب امر کے ذریعہ اس سے زیادہ اصلاح و درستگی کر دیتا ہے، جتنی قرآن کے ذریعہ کرتا ہے (یزع اللّٰہ بالسلطان اکثر مما یزع بالقرآن)

جو شخص بھی اس دین پر تحقیق کی خاطر انصاف کی نظر ڈالے گا یہ محسوس کرے گا کہ اس نے تہذیب نفس کا بہت زیادہ اہتمام کیا ہے اور ہر پہلو سے اور ہر معاملہ میں نفس کی اصلاح و درستگی پر بہت زیادہ کوششیں صرف کی ہیں۔ چنانچہ اس دین نے اپنے نبیؐ کی جو سب سے اونچی تعریف کی وہ یہ ہے کہ "واقعی آپ بلند ترین اخلاق کے حامل ہیں" (وانک لعلیٰ خلقٍ عظیمٍ ۝ ۔۔۔ القلم: ۴) کیونکہ حسن اخلاق ہی در اصل ٹھوس اور پائدار سماج کی عمارت کا پہلا ستون ہے۔ اسی پر اس فانی اور محدود انسان کا ضمیر میں زمین کے آسمان سے تعلق جوڑنے اور فنا کے خلود سے رشتہ قائم کرنے کا انحصار ہے۔

انسانی ضمیر کی تربیت کر لینے کے بعد اس پر اعتماد کرنے میں اسلام نے بخل سے کام نہیں لیا ہے چنانچہ اس نے اسی کو سارے قوانین کے نفاذ پر نگران و محافظ بنا دیا ہے۔ ان قوانین میں سے اکثر کو نافذ کرنے کا کام نفوس نے بالکل اسی کے حوالہ کر دیا ہے۔ چنانچہ گواہی اکثر حالات میں اقامت حدود کی بنا قرار دی گئی ہے۔ اسی طرح حقوق کے قائم کرنے میں بھی اکثر اسی کو فیصلہ کن مانا گیا ہے۔ گواہی کے معاملے میں معلوم ہے کہ اس کا انحصار فرد کے ضمیر اور اس عقیدہ پر ہے کہ اللہ انسانی ضمیر کا نگراں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ج وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ (النور: ۴)

"جو لوگ شریف عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور پھر اپنے اس دعوے پر چار گواہ نہ لاسکیں تو ان کو اسّی کوڑے مارو اور ہمیشہ کے لئے ان کی گواہی قبول کرنا چھوڑ دو یہ لوگ پکّے فاسق ہیں"

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكَاذِبِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (النور: ۶تا۹)

"جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور ان کے پاس اپنے علاوہ دوسرے گواہ نہ ہوں تو ایسے افراد میں کسی ایک فرد کی شہادت اس طور پر لی جائے گی کہ وہ چار بار اللہ کو گواہ بنا کر یہ بیان دے کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے، اور پانچویں بار یہ کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی پھٹکار پڑے۔ جس عورت پر یہ الزام لگایا گیا ہے اس کے سر سے سزا ٹل جائے گی اگر وہ چار بار اللہ کو گواہ بنا کر یہ بیان دے کہ مرد اپنے دعوی میں جھوٹا ہے، پانچویں بار اسے یہ کہنا ہوگا کہ اگر مرد سچا ہو تو خود مجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو۔"

یہاں تک کہ جن امور میں وہ دستاویز لکھنے کا حکم دیتا ہے وہاں بھی گواہی کو ضروری قرار دیتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ط وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ج وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ط فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ط وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ج

فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى ط (البقرہ : ۲۸۲)

"اے ایمان والو! جب کسی مقرر مدت کے لئے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو، تو اسے لکھ لیا کرو۔ فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو۔ اسے لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ لکھے اور املا وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے (یعنی قرض لینے والا)۔ اور اسے اللہ اپنے رب سے ڈرنا چاہیئے کہ جو معاملہ طے ہوا ہو، اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو یا املا نہ کرا سکتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔ پھر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرالو، اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلادے۔ یہ گواہ ایسے لوگ ہونے چاہئیں جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو۔"

گواہ بننا معاملہ ہوتے وقت بھی فرض ہے:

وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ط (البقرہ : ۲۸۲)

"گواہوں کو جب گواہ بننے کے لئے کہا جائے تو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیئے۔"

اور تقاضا کی نوبت آئے تو اس وقت بھی لازمی ہے:

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ط (البقرہ ۲۸۳)

"اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ۔ جو شہادت چھپاتا ہے اس کا دل گناہ میں آلودہ ہے۔"

اسلام انسانی ضمیر پر اُن حدود کے سلسلے میں بھی اعتماد کرلیتا ہے جن میں سزا کوڑوں اور سنگساری تک جا پہنچتی ہے۔ یہی مالی حقوق کا بھی حال ہے۔ انسان کو عزو شرف بخشنے اور اسے مطلوبہ سطح تک بلند کرنے کے لئے اس پر اعتماد کرنا بھی ضروری تھا۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ جس ضمیر کے سر اسلام نے اتنی بھاری ذمہ داریاں ڈال رکھی ہوں، جسے وہ نفاذ قانون کا نگراں بناتا اور قانونی حدود سے بھی بلند و برتر معیار اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہو، اسے اس نے آزاد چھوڑ رکھا ہو نہیں بلکہ اس نے اللہ کی خشیت کو اس کا نگراں بنا کر کھڑا کیا۔ اور اس کے سامنے اللہ کی ہمہ دم نگرانی کا نقشہ دلکش اچھے

اور موثر انداز میں پیش کیا ہے :

مَا يَكُونُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ہ (المجادلہ : ۷)

"کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جہاں چوتھا اللہ خود نہ ہو، اور نہ ہی یہ ہوتا ہے کہ پانچ آدمی محو سرگوشی ہوں اور چھٹا اللہ خود نہ ہو۔ اسی طرح جب بھی اس سے کم یا زیادہ تعداد میں جمع ہو کر لوگ سرگوشیاں کرتے ہیں تو اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ خواہ وہ کہیں پر بھی ہوں۔ پھر قیامت کے دن اللہ ان سب کو ان کے کرتوت سے آگاہ کرے گا، حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہر ہر بات کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔"

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ج وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ہ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ہ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ہ (ق: ۱۶ تا ۱۸)

"ہم نے ہی تو انسان کو بنایا ہے، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کا نفس اسے کیا سکھاتا پڑھاتا رہتا ہے۔ اور ہم اس سے اس کی شہ رگ کی بہ نسبت بھی زیادہ قریب ہیں۔ جب کہ اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے دو نوٹ کرنے والے اس کی ساری باتیں نوٹ کرتے رہتے ہیں وہ منہ سے کوئی بھی لفظ نہیں نکالتا۔ مگر یہ کہ ایک نگران کار مستعد و تیار اس کے پاس (اس بات کو نوٹ کرنے کے لئے) کھڑا رہتا ہے۔"

فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰى ہ (طٰہٰ : ۷)

"وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات بلکہ اس سے مخفی تر بات بھی جانتا ہے۔"

غرض یہ کہ اسلام نے انسان کو حسنِ عمل پر حسنِ انجام کی بشارت بھی دی، اسے بداعمالیوں کے انجامِ بد سے ڈرایا بھی، اور اس پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ اسے اپنے ہر عمل کا دنیا و آخرت میں حساب دینا ہوگا وہ نہ تو اپنے اعمال کے نتائج سے بچ سکتا ہے اور نہ جزا و سزا سے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط وَاِنْ كَانَ

مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۴۷)

"قیامت کے دن ہم میزان عدل قائم کریں گے۔ اور اس ترازو کی تول میں کسی پر کوئی زیادتی نہ ہوگی، پھر اگر کسی کا کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہوا تو ہم اس کو لا موجود کریں گے، اور ہم حساب لینے کو بالکل کافی ہیں۔"

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال: ۱تا۸)

"جب زمین زلزلے کے مسلسل جھٹکوں سے ہچکولے کھا رہی ہوگی، جب زمین اپنے پیٹ کا سارا بوجھ) سامنے لا ڈالے گی اور انسان دانتوں تلے انگلی دبا کر کہے گا: ارے آج یہ اسے کیا ہوگیا ہے۔؟ جب یہ دن آئے گا تب زمین اپنے آقا کا حکم بجا لاتی ہوئی اپنی ساری خبریں نشر کرنا شروع کرے گی، اور یہی دن ہے جب کہ لوگ (اپنے اعمال وکردار کے اعتبار سے) مختلف گروہوں اور جماعتوں میں بٹے ہوئے میدان حشر کو چلیں گے تاکہ انھیں ان کا کیا کرایا دکھلایا جا سکے تو جو شخص ذرہ برابر بھی بھلائی کرے گا وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ اور جو ذرہ برابر بھی برائی کا مرتکب ہوگا تو وہ برائی بھی اس کی نظروں کے سامنے آکر رہے گی۔

اس طرح کے صاف صاف فرمودات کے ذریعہ اسلام نے ضمیر کی نگرانی کے لئے خشیت و تقویٰ کی چوکی بٹھادی ہے اور اس طور پر اس کو حدودِ دین کے قیام کی ذمہ داری اور قوانینِ شرعی کے نفاذ کی دیکھ بھال کے عظیم منصب سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تیار کیا ہے۔ اجتماعی عدل کے قیام میں اسلام نے ایک طرف تو اسی تربیت یافتہ انسانی ضمیر پر اعتماد کیا ہے اور دوسری طرف قوانین شریعت پر ان ہی بنیادوں پر اس نے ایک ہم آہنگ متوازن انسانی سماج کی تشکیل کی ہے۔ جس کی ہلکی سی جھلک ہم آئندہ کسی باب میں دکھلائیں گے۔ فی الحال ہم قانون سازی اور ہدایت وتلقین کے اس طریقے کے کچھ نمونے سامنے لانے پر اکتفا کریں گے۔ اس غرض کے لئے ہم زکوٰۃ اور صدقہ کا موضوع منتخب کرتے ہیں جو اس کتاب کے موضوع سے گہری مناسبت بھی رکھتا ہے۔

اسلام نے زکوٰۃ کو صاحب استطاعت لوگوں کے مال میں ضرورت مند لوگوں کے حق کے طور پر فرض قرار دیا ہے۔ اس نے اس حق کو شرعاً واجب الوصول قرار دیا ہے جسے اسلامی ریاست بجبر وصول کر سکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس نے اس حق کی ادائیگی پر انسانی شعور و وجدان کو بھی ابھارا اور داخل میں یہ تحریک پیدا کی کہ اصحاب استطاعت خود ہی برضا و رغبت اس کی ادائیگی میں پیش قدمی کریں۔

چنانچہ اس نے واضح کیا کہ زکوٰۃ عمارتِ اسلام کے ستونوں میں سے ایک اہم ستون اور ضروریات ایمان میں سے ایک اہم ضرورت ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِہِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ ۝

(المؤمنون: ۱تا۴)

"ایسے مومنین کی کامیابی یقینی ہے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ غلط اعمال و اقوال سے دور رہتے — اور زکوٰۃ ادا کرتے رہتے ہیں۔

تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَکِتَابٌ مُّبِیْنٌ ۝ ھُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝

(النمل: ۱تا۳)

"یہ قرآن کی آیات ہیں جو ایک واضح کتاب ہے اور ان مومنین کے لئے سراپا ہدایت و بشارت جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں"

اور یہ کہ زکوٰۃ نہ دینا دراصل ان مشرکوں کا رویہ ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے:

وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِکِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کَافِرُوْنَ ۝

(حٰم السجدہ: ۶-۷)

"تباہی ہو مشرکین کی۔ جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور جو آخرت کے بھی منکر ہیں۔

پھر یہ کہ زکوٰۃ دینا رحمت الٰہی کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

(النور: ۵۶)

"نماز قائم کیا کرو، زکوٰۃ دیا کرو اور (سارے ہی معاملات میں) رسولؐ خدا کی اطاعت کیا کرو، توقع ہے کہ اس طرح تم رحم کئے جانے کے لائق قرار پاؤ گے"۔

اللہ کی مدد صرف ان ہی کے حصہ میں آتی ہے جو اس حق کو ادا کرنے اور اپنی سماجی ذمہ داریوں کو بے کم و کاست پورا کرنے اور اس بات کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ فی الحقیقت اس قابل ہیں کہ ان کو زمین میں غلبہ و اقتدار عطا فرمایا جائے:

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ (الحج: ۴۰-۴۱)

"اللہ یقیناً اس کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کو اٹھ کھڑا ہو۔ اللہ بڑی طاقت والا اور زبردست ہے۔ (یہ مستحق نصرتِ الٰہی لوگ وہ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین میں غلبہ و تمکن عطا فرمائیں تو یہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں"۔

زکوٰۃ انسانوں کے لئے ایک دائمی ضابطہ ہے جو انبیاء کی تعلیمات کا لازمی جزو رہا ہے۔ چنانچہ کبھی اس اجتماعی فریضہ کے بغیر نہیں پایا گیا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝ (مریم: ۵۴-۵۵)

"اور اس کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر کرو وہ وعدے کا سچا تھا اور رسولؐ نبی تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا۔ اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ انسان تھا"

حضرت ابراہیمؑ کی بابت ارشاد ہوا ہے:

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۷۲-۷۳)

"اور ہم نے انہیں اسحاق (جیسا فرزند) دیا اور پھر مزید انعام کے طور پر یعقوب (جیسا پوتا)

عطا کیا۔ ان سب کو ہم نے صالح اور نیکو کار بنایا اور ہم نے ان کو ہادی اور رہنما بنایا کہ یہ ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ ہم نے انکو بھلے کام کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی تلقین کی اور یہ سب ہمارے عبادت گزار بندے ہیں۔"

پس بُرا ہو اُن کا جو اس لازمی فریضہ کو نہیں ادا کرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

من اٰتاہ اللّٰہ مالاً فلم یؤدّ زکوٰتہٗ مثل لہ یوم القیامۃ شجاعاً اقرع لہ زبیبتان یطوّقہ یوم القیامۃ ثم یاخذ بلھزمیہ یعنی بشدقیہ ثم یقول: انا مالک، انا کنزک۔ (بخاری ونسائی)

"جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اس نے مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو قیامت کے دن اللہ اس مال کو ایک خوفناک سانپ کی شکل میں ظاہر کرے گا جس کے سر پر بال کھڑے ہوں گے۔ اور جس کی آنکھوں کے اوپر دو سیاہ نقطے[1] ہوں گے۔ یہ سانپ اس کے گلے کا ہار بنایا جائے گا۔ اور سانپ اس کے دونوں جبڑوں کو پکڑ رکھے گا پھر کہے گا کہ میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خزانہ۔"

کتنا ہولناک اور بھیانک ہوگا وہ منظر۔

زکوٰۃ ایک شرعی فریضہ ہے جو ایک متعین شرح کے مطابق مال پر عائد ہوتا ہے۔ اس کے بہلو بہلو صدقہ ہے جس کی کوئی حد یا شرح نہیں مقرر کی گئی ہے، بلکہ اسے فرد کے ضمیر پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ فی الحقیقت وجدان وشعور کی آواز ہے اور اس اخوت اور باہم رحم وکرم کا نتیجہ ہے جس کی تعلیم پر اسلام نے بہت زور دیا ہے۔ فرد کا احساس فرض اور رحم وکرم کی طرف اس کا نفسیاتی میلان دونوں ہی اس کا ذریعہ بنتے ہیں اور اس طرح بیک وقت دو اہم مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ وجدان کی گہری تربیت بھی ہوتی ہے اور خالص انسانی مزاج رکھنے والا ٹھوس اور پائدار اجتماعی تکافل بھی وجود میں آتا ہے۔ اسلام باہم رحم وکرم کی اس صفت کو خالص انسانی بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ اور اسے اخوت دینی کا پابند بھی نہیں بناتا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:-

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ ط (الممتحنہ)

---

[1] سانپ کی یہ قسم بہت زہریلی اور خطرناک ہوتی ہے۔ (مترجم)

"اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان کا برتاؤ رکھنے اور انصاف کا سلوک کرنے سے نہیں روکتا جنھوں نے نہ تو تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا۔"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ارحموا اھل الارض یرحمکم من فی السماء (ابو داؤد، ترمذی)

"زمین میں بسنے والوں پر تم رحم کرو تو جو آسمان پر ہے وہ تم پر رحم کرے گا۔"

اس طرح آپؐ نے باہم رحم و کرم کا ایک ایسا معیار سامنے لا رکھا ہے جو اپنے مزاج کے اعتبار سے خالص انسانی اور دینی عصبیت سے بھی بلند ہے۔

اسلام اسی حد پر رک نہیں جاتا بلکہ ایک قدم ——— ایک عظیم قدم ——— اور اٹھاتا اور تمام ذی روح مخلوقات کو اپنے دامانِ رحمت سے ڈھانپ لیتا ہے۔ اسلام کے سراپا رحم و کرم نبیؐ نے فرمایا:

بینما رجل یمشی بطریقہ اشتد علیہ العطش فوجد بئرا فنزل فیھا فشرب ثم خرج فاذا کلب یلھث یاکل الثری من العطش فقال الرجل لقد بلغ ھٰذا الکلب من العطش مثل الذی کان بلغ منی فنزل البئر فملاء خفہ ماءً ثم امسکہ بفمہ حتیٰ رقی فسقی الکلب فشکر اللہ فغفر لہ۔

"ایک بار ایک آدمی راہ پر چلا جا رہا تھا کہ اُسے سخت پیاس لگی۔ اتنے میں ایک کنواں نظر آیا تو اس میں اتر پڑا۔ پانی پی کر باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک کتا پیاس کے مارے ہانپ رہا ہے اور کیچڑ چاٹ رہا ہے۔ اس نے سوچا کتا بھی پیاس سے اتنا ہی پریشان ہے جتنا خود میں پریشان ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ کنوئیں میں اترا اور اپنا چرمی موزہ پانی سے بھر لیا۔ وہ اپنے منہ سے اسے پکڑے رہا یہاں تک کہ اوپر چڑھ آیا اور آکر کتے کو جی بھر پانی پلایا تو اللہ نے اس کے اس عمل کی بڑی قدر کی اور اُسے بخش دیا۔"

اس پر لوگوں نے پوچھا: "اللہ کے رسولؐ! کیا جانوروں کے ساتھ حسنِ سلوک کا بھی بدلہ ملے گا؟" آپؐ نے فرمایا: "ہاں! ہر ذی حیات کے ساتھ حسنِ سلوک میں اجر ہے۔ فی کل کبد رطبۃ اجر۔"

(بخاری و مسلم)

آپؐ نے یہ بھی بتایا کہ:

دخلت امرأۃ فی النار فی ھرۃ ربطتھا، فلم تطعمھا، ولم تدعھا تاکل من خشاش الارض۔ (بخاری)

"ایک عورت دوزخ میں اس لئے دھونک دی گئی کہ اس نے ایک بلی کو باندھے رکھا، نہ تو خود اسے کچھ کھلایا نہ چھوڑ دیا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا کر پیٹ بھرے۔"

پس اسلام میں رحم وکرم ایمان کی بنیاد اور اس کی پہچان ہے۔ کیونکہ یہ ضمیر کے دین سے متاثر ہونے ضمیر میں دینی روح کے سرایت کر جانے کی دلیل ہے اور ساتھ ہی یہ آدمی میں انسانیت کی اس روح کے وجود کی علامت ہے جو نہ ہو تو اسلام کے نزدیک دین ہی مفقود سمجھا جائے گا۔

اسلام اسی بنیاد پر انسان کو صدقہ اور حسن سلوک کی ترغیب دیتا ہے اور انفاقِ مال کو اس کے لئے محبوب بنا دیتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ طلب اجر کی نیت سے، دنیا میں خوشنودیٔ رب اور اچھے بدلے کی خاطر انفاق کیا جائے۔ اور اسی کے ذریعہ آخرت میں ثواب کا حصول اور اللہ کے عذاب سے نجات چاہی جائے۔

اُن مخلص، سچے، مطیع اور فرمانبردار بندوں کے لئے جو اللہ کی رضا کی خاطر اپنے مال صرف کرتے ہیں، اسلام ایک عظیم خوشخبری لایا ہے۔

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (الحج: ۳۴-۳۵)

"مخبتین (سرفگندہ لوگوں) کو بشارت دے دیجئے۔ ان لوگوں کو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر آتا ہے تو فرطِ خشیت سے ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور جب کوئی مصیبت ان پر آن پڑتی ہے تو اس پر صبر کرتے ہیں، یہ نماز قائم کرنے والے لوگ ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دے رکھا ہے اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔"

وجدان پر کتنا گہرا اثر چھوڑ جانے والی تصویر ہے! قرآن اسی نقش کو ایک بار پھر دوسرے انداز میں تازہ کرتا ہے:

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ

خوفاً وَّطمعاً وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (السجدہ: ۱۵تا۱۷)

"ہماری آیات پر ایمان تو بس وہ لوگ لاتے ہیں کہ جب ان آیات کے ذریعہ ان کو نصیحت ہوجاتی ہے۔ تو وہ سجدہ ریز ہوجاتے ہیں، اور اپنے پروردگار کی حمدوثنا کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور سرکشی وکبر کا رویّہ اختیار نہیں کرتے۔ ان کے پہلو خوابگاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں۔ اور یہ خوف وامید کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اپنے رب کو پکارتے ہیں، اور ہم نے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے، اس میں سے یہ اللہ واسطے خرچ کرتے ہیں۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ خزانۂ غیب میں ایسے لوگوں کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کیا سامان پوشیدہ رکھا گیا ہے ان اعمال کے بدلے جو انہوں نے دنیا میں کئے ہ۔"

اسی طرح ایثار کی ایک اور حسین اور دلکش تصویر ان اہل مدینہ کو سامنے لاکر کھینچی گئی ہے۔ جنھوں نے مہاجرین کو خوش آمدید کہا۔ پوری فراخ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ اُن کو ٹھکانا دیا اور اپنے گھر بار اور مال و دولت میں ان کو حصہ دار بنا لیا۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الحشر: ۹)

(" نیز اس فئے میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہے) جو ان مہاجرین کی آمد سے قبل ہی سے دارالاسلام میں آباد ہیں اور ایمان لاچکے ہیں، اب جو لوگ ہجرت کر کے ان کی طرف آئے ہیں یہ ان کو محبوب رکھتے ہیں اور جو کچھ ان مہاجرین کو دیا جائے اس کے اندر اپنے لئے کوئی طلب نہیں پاتے۔ یہ تو خود اپنے مفاد پر ان کے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ خود انتہائی تنگدستی وفاقہ مستی کے عالم میں کیوں نہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اپنے طبیعت کے حرص وبخل سے محفوظ رکھا گیا اس کی کامیابی یقینی ہے۔"

یہ اعلیٰ ترین انسانیت کی بہترین اور سب سے اچھوتی تصویر ہے۔ کچھ اور بندگان خدا کی ایک تصویر اور بھی ہے جو حسن و دلکشی میں اور تاثیر میں اس سے کم نہیں۔ بعض روایات کے مطابق یہ لوگ حضرت علیؓ آپ کی بیوی فاطمہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے گھر والے ہیں۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

یُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُونَ یَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۝ فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ۝ وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا ۝ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۖ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا ۝ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ۝ وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ۝ قَوَارِيرَا مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ۝ وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ۝ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ۝ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۚ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ۝ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ۝ عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ ۝ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ ۚ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ۝ إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ۝ ۔ (الدہر: تا ۲۲)

یہ وہ لوگ ہوں گے (جو دنیا میں) نذر[1] پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہو گی اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور اُن سے کہتے ہیں کہ ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ ہمیں تو اپنے رب سے اُس دن کے عذاب کا خوف لاحق

---

[1] نذر کے معنیٰ ہیں خدا سے یہ عہد کرنا کہ آدمی اس کی رضا کے لیے فرض سے زائد فلاں نیک کام کرے گا۔

ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ انہیں اس دن کے شر سے بچالے گا اور انہیں تازگی اور سرور بخشے گا اور ان کے صبر[ل] کے بدلے میں انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔ وہاں وہ اونچی مسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ نہ انہیں دھوپ کی گرمی ستائے گی نہ جاڑے کی ٹھر۔ جنت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کررہی ہوگی، اور اس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے۔ (کہ جس طرح چاہیں انہیں توڑلیں) ان کے آگے چاندی[ك] کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش کرائے جارہے ہوں گے، شیشے بھی وہ جو چاندی کی قسم کے ہوں[ت] گے، اور ان کو (منتظمینِ جنت نے) ٹھیک انداز ے کے مطابق بھرا ہوگا ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش[ك] ہوگی، یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔ ان کی خدمت کے لیے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیئے گئے ہیں۔ وہاں جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک بڑی سلطنت کا سروسامان تمہیں نظر آئے گا۔ اُن کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے، ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے[ه] اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔ یہ ہے تمہاری جزا اور تمہاری کارگزاری قابلِ قدر ٹھیری ہے۔

صدقہ اللہ کو دیا جانے والا قرض ہے جس کی ادائیگی کی ضمانت دی گئی ہے:۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝ (الحدید: ۱۱)

ل صبر کا لفظ یہاں اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ ایمان لانے کے بعد وہ مرتے دم تک خدا کے احکام کی پابندی کرتے رہے اور اس کی نافرمانی سے پرہیز کرتے رہے۔

ك سورۂ زخرف آیت ۷۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ اُن کے آگے سونے کے برتن گردش کرائے جارہے ہوں گے اس سے معلوم ہوا کہ کبھی وہاں سونے کے برتن استعمال ہوں گے اور کبھی چاندی کے۔ ت یعنی وہ ہوگی تو چاندی مگر شیشے کی طرح شفاف ہوگی۔

ك اہل عرب چونکہ شراب کے ساتھ سونٹھ ملے ہوئے پانی کی آمیزش کو پسند کرتے تھے اس لیے فرمایا گیا کہ وہاں ان کو وہ شراب پلائی جائے گی جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔

ه سورۂ حج آیت ۲۳، اور سورۂ فاطر آیت ۳۳ میں بیان ہوا ہے کہ انہیں وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق جب وہ چاہیں گے سونے کے کنگن پہنیں گے۔ جب چاہیں گے چاندی کے کنگن پہن لیں گے اور جب چاہیں گے دونوں کو ملاکر استعمال کریں گے۔

"کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے تو پھر اللہ اس کو کئی گنا کر کے لوٹائے اور مزید برآں اسے معقول بدلہ بھی ملے۔"

إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ ○ (الحدید:۱۸)

"صدقہ دینے والے مرد اور عورتیں جنھوں نے اللہ کو قرض حسن دیا اس کو وہ کئی گنا کر کے ادا کرے گا۔ نیز ان کے لئے اس نیکی کا مناسب اجر الگ سے ہوگا۔"

یا پھر یہ ایک نفع بخش تجارت ہے جس کا پورا بدلہ ملے گا:

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَنْ تَبُورَ ○ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ ○ (فاطر: ۲۹-۳۰)

"جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ نیز جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے کھلے چھپے راہِ خیر میں خرچ کرتے ہیں وہ ایک ایسی تجارت کر رہے ہیں جس میں گھاٹے کا کوئی امکان نہیں۔ ان کے اعمال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ ان کو پورا پورا بدلہ دے اور اپنی خصوصی مہربانی سے ان کو اس کے علاوہ مزید انعام سے بھی سرفراز فرمائے۔ درحقیقت وہ خطاؤں کو بخش دینے والا بڑا قدر شناس ہے۔"

یہ صدقہ ہر حال میں کچھ نہ کچھ نفع دے جانے والی تجارت ہے، اس میں حق تلفی یا خسارے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ○

(البقرہ-۲۷۲)

"اور خیرات میں تم جو مال خرچ کرتے ہو وہ تمہارے اپنے لیے ہے۔ آخر تم اسی لئے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ تم جو مال خیرات میں خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا۔ اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔"

آخرت کی جنّت انفاق کرنے والوں کے لئے ایک مناسب وموزوں انعام ہے۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۳-۱۳۴)

"اور دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنّت کی طرف جاتی ہے، جس کی جنّت زمین اور آسمانوں جیسی ہے اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لئے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، اور جو غصّہ کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور کو معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔"

صدقہ سے نفس کی بھی تطہیر ہوتی ہے اور مال کی بھی۔ کچھ خطا کار توبہ واعتراف کی طرف مائل ہوئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ ان کی تطہیر و تزکیہ کی خاطر ان کے مال کا ایک حصّہ ان سے لے کر بھلائی کے کاموں میں صرف کیا جائے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (التوبہ: ۱۰۲ تا ۱۰۴)

"کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے۔ ان کا عمل مخلوط ہے کچھ نیک اور کچھ بد۔ امید ہے کہ اللہ پھر ان پر مہربان ہو جائے، بے شک وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اے نبیؐ! تم ان کے اموال میں صدقہ لیکر انہیں پاک کرو اور نیکی کی راہ میں انہیں بڑھاؤ۔ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو، کیونکہ تمہاری دعا ان کے لئے وجہ تسکین ہوگی، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور سنتا ہے۔ کیا لوگوں کو معلوم نہیں کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو شرف قبولیت

عطا فرماتا ہے، اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔"

انفاق کا جذبہ اللہ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کی تکمیل کرنے، اس کی خشیت میں ڈوبے رہنے اور برے انجام سے ڈرتے رہنے کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہ فہم و تدبّر کی دلیل بھی ہے عقل کو صحیح سوجھ بوجھ سکھاتا ہے۔ اس سے دست کشی کا مطلب اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹا جائے۔ یہ دست کشی ایک طرح کا نقضِ عہد اور زمین میں فساد مچانے کے ہم معنیٰ ہے۔

إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنقُضُونَ الْمِيثَاقَ ۝ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَن صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِم مِّن كُلِّ بَابٍ ۝ سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ وَالَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۙ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۝ (الرعد: ۱۹ تا ۲۵)

"نصیحت دانش مند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں۔ اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن روابط کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے انھیں قائم کرتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اسی بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں اُن کا حساب برا حساب نہ ہو اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں۔ ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ آخرت کا گھر ان ہی لوگوں کے لئے ہے یعنی ایسے باغ جو

ان کی ابدی قیام گاہ ہوں گے، وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو کچھ صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے اور ان سے کہیں گے: "تم پر سلامتی ہے تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہوئے ہو" دیکھو کیا اچھا ہے یہ آخرت کا گھر۔ لیکن وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں، جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ یہ لوگ لعنت کے مستحق ہیں اور ان کے لئے آخرت میں بہت برا ٹھکانا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ سے دست کشی ہلاکت کے ہم معنی ہے:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرۃ: ۱۹۵)

"اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو"

اس روش میں فرد کی ہلاکت مضمر ہے کیونکہ فرد اس کو اختیار کر کے خود کو عذابِ آخرت کا مستحق اور دنیا میں لوگوں کی ملامت کا سزاوار ٹھہراتا ہے اور پھر عدمِ انفاق کی وجہ سے سماج میں ظلم و شقاوت، حسد و کینہ، فتنہ و فساد اور کمزوری و انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں اجتماعی ہلاکت بھی ہے۔ دولت سے غریبوں کو محروم کرنا صریح زیادتی ہے۔

اَلْقِیَا فِیْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِیْدٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ مُعْتَدٍ مُّرِیْبٍ ۝

(ق: ۲۴-۲۵)

"ایسے ناشکرے مخالف کو جہنم میں جھونک دو جو غریبوں کو دولت سے محروم کرنے والا زیادتی کرنے والا اور دین کی حقانیت کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہے"

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِیْنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِیْمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ

(القلم: ۱۰تا۱۲)

"بہت بڑھ بڑھ کر قسمیں کھانے والے بے وقعت و کمینہ طینت انسان کی بات نہ مانو جو غیبت کرنے والا اور چغل خور ہے۔ نیز دولت سے غریبوں کو محروم کرنے والا اور حق تلفی کرنے

والا ہے۔"

یہ زیادتی اللہ کے حق میں بھی زیادتی ہے اور جماعت کے حق میں بھی۔ جماعت کے ایک فرد کی حیثیت سے ایسا شخص خود اپنے اوپر بھی زیادتی کرتا ہے۔ پھر نیکی اور حسنِ سلوک جنت میں ٹھکانا دلاتی ہے اور نیکوکار کو وہ گھاٹی پار کراتی ہے۔ جو جنت اور اس کے درمیان حائل ہے۔ یہ گھاٹی دراصل گردنوں کو چھڑانا، نیز بھوک اور مفلس کے دنوں میں کھانا کھلانا ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝
يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ (البلد: ۱۲تا۱۶)

"جانتے ہو یہ گھاٹی کیا ہے؟ (کسی غلام یا قیدی کی) گردن چھڑانا یا کسی قرابت دار یتیم یا مفلس و فلاش مسکین کو فاقہ کے دنوں میں کھانا کھلا دینا۔"

ان کاموں سے جان چرانا انسان کو جہنم کے حوالہ کرتا اور صفِ کفار میں جا کھڑا کرتا ہے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰىٓ اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ۝ (المدثر: ۴۲تا۴۷)

"تم کو کس بات نے جہنم میں داخل کرا دیا؟ وہ بولے، ہم نمازی نہ تھے۔ اور نہ ہی ہم مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ ہم آیاتِ الٰہی کے ساتھ کھیلنے والوں میں شامل ہو کر اس جرم کے مرتکب بھی ہوتے تھے اور بدلے کے دن کا بھی انکار کرتے تھے تاآنکہ ہمارے سامنے وہ گھڑی آن پہنچی جس کا آنا یقینی تھا۔"

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ (آل عمران: ۱۸۰)

"جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لئے اچھی ہے۔ نہیں یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔"

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ
فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۔ یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی
بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ۔ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ
فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ ○ (التوبہ: ۳۴۔۳۵)

"جو سونے چاندی کے خزانے جمع کرتے ہیں اور انہیں راہِ خدا میں خرچ کرکے نہیں دیتے ان کو دردناک عذاب کا نوٹس دے دیجئے، جس کا مزا وہ اس دن چکھیں گے جب کہ سونے چاندی کے توڑے جہنم کی بھٹی میں تپا کر ان کی پیٹھوں، پہلوؤں اور پیشانیوں کو داغا جائے گا کہ یہ کل تک جو اپنے لئے جمع کرتے رہے، آج اس کا مزا چکھ لو۔"

ایسا نہیں کہ کنز کا اطلاق صرف اسی مال پر ہے جس کی زکوٰۃ نہ نکالی گئی ہو۔ چنانچہ زکوٰۃ کے ذکر سے پہلے یا بعد اکثر صدقہ اور انفاق کا ذکر آتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ زکوٰۃ ایک متعین فریضہ ہے اور صدقہ اور انفاق غیر متعین ہیں۔ کسی نصاب کے بھی پابند نہیں:

عَنْ اَبِی امامۃ رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
یا ابن آدم! انّک ان تبذل الفضل خیرٌ لک وان تمسکہ شرٌّ لک۔

(مسلم، ترمذی)

"حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابن آدم! تیرے لئے ضرورت سے زائد مال کا خرچ کر دینا بہتر ہے اور اسے روکے رکھنا بُرے نتائج کا حامل ہے۔"

عن بلال رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
مَا رزقت فلا تخبأ وما سئلت فلا تمنع، فقلت یا رسول اللہ!
وکیف لی بذالک؟ قال ھو ذاک او النار۔ (رواہ الطبرانی فی الکبیر
وابو الشیخ ابن حبان فی کتاب الثواب۔ والحاکم وقال صحیح الاسناد)

"حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھ اور جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اس میں بخل سے کام نہ لے۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! یہ کیسے ہو سکے گا؟ آپؐ نے فرمایا: یا تو یہ روش اختیار کرنی ہوگی یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔"

یہی نہیں بلکہ ان کے بخل اور منعِ خیر کے بدلے ان کو دنیا میں بھی کبھی سزا مل جاتی ہے۔ قرآن کریم ایک چھوٹے سے قصے کے ذریعہ ایک مثال سامنے لاتا ہے۔ یہ کچھ لوگوں کا قصہ ہے جن کے پاس ایک باغیچہ تھا جس کے پھلوں میں سے یہ فقرا کو بھی کھلایا کرتے تھے۔ پھر ان کے جی میں آئی کہ کنجوسی کریں اور کسی کو کچھ نہ دیں۔ ادھر باغیچہ پر ایک آفت آئی اور اللہ میاں نے اس کے پھلوں کا صفایا کر دیا۔ اب یہ لوگ بہت پچھتائے۔

إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ۝ وَلَا يَسْتَثْنُونَ ۝ فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ ۝ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ۝ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ ۝ أَنِ اغْدُوا عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِن كُنتُمْ صَارِمِينَ ۝ فَانطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ ۝ أَن لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُم مِّسْكِينٌ ۝ وَغَدَوْا عَلَىٰ حَرْدٍ قَادِرِينَ ۝ فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَضَالُّونَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝ قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَلَاوَمُونَ ۝ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا طَاغِينَ ۝ عَسَىٰ رَبُّنَا أَن يُبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا رَاغِبُونَ ۝ كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝

(القلم: ۱۷ تا ۳۳)

"ہم نے ان کو اسی طرح آزمائش میں ڈال رکھا ہے جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا۔ جب کہ انہوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ہی چل کر اس کا پھل توڑ لیں گے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ ان پھلوں میں سے غریبوں اور محتاجوں کے لئے کچھ بھی نہ الگ کریں گے۔[1]

---

[1] ہم نے آیت کا ترجمہ اس لئے کیا ہے کہ فاضل مصنف نے اس سے یہی سمجھا ہے جیسا کہ ان کی (باقی حاشیہ صفحہ ۱۸۲ پر)

لیکن ابھی وہ محو خواب تھے کہ باغ پر تیرے رب کی جانب سے ایک آفت آئی اور باغ ایک فصل کٹے ہوئے کھیت کی مانند رہ گیا۔ ادھر ان لوگوں نے صبح تڑکے ہی ایک دوسرے کو آواز دی کہ پھل توڑنے ہوں تو بس سویرے ہی کھیت پر چلے چلو۔ چنانچہ یہ لوگ سرگوشی کرتے ہوئے چل کھڑے ہوئے کہ "آج کوئی مسکین آنے ہی نہ پائے"۔ یہ ایسا چلے گویا غریبوں کو کچھ نہ دینے پر پوری طرح قادر ہیں۔ جب یہ کھیت پر پہنچے تو راس کا یہ حال دیکھا تو (سر تھام کر بولے): "ارے کیا ہم راستہ بھول گئے؟ نہیں نہیں بلکہ ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی"۔ اب ان میں سے ایک شخص جس کی ذہنیت اچھی تھی آگے بڑھا اور بولا: "میں نے کہا تھا کہ (خراب ذہنیت کا انجام اچھا نہیں تھا) اب سے اللہ کے حضور توبہ کرو، اور اس کی پاکی و بزرگی بیان کرو"۔ وہ بولے: "خدایا! بس ایک تیری ہی ذات خطاؤں سے پاک اور بلند و برتر ہے۔ ہم تو اپنے اوپر سراسر ظلم ہی کرتے رہے"۔ پھر وہ اس غلطی اور غلط طرزِ فکر کا ذمہ دار ایک دوسرے کو ٹھہرا کر ملامت کرنے لگے۔ بالآخر ان سب نے ہی کہا کہ سبھی کا بُرا ہو کہ سب ہی حد سے بڑھ چلے تھے اب تو توبہ استغفار کی ہی روش اختیار کرنی چاہیئے۔ شاید اس طرح اللہ ہمیں اس باغ کے بدلے۔ اس سے اچھا باغ عطا فرما دے۔ ہم سب اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں (جس طرح باغ والوں کے غلط طرزِ عمل کی پاداش میں اُن پر آفت آئی اور ایسی اچانک آئی کہ ان کی ایک چال بھی نہ چلی، اور بجز کفِ افسوس ملنے کے ان کے لئے کوئی اور چارۂ کار نہ رہا) دنیا میں اللہ کا عذاب اسی طرح آیا کرتا ہے اور آخرت کا عذاب تو اور ہولناک ہوگا۔ کیا خوب ہوتا اگر ابھی سے اس بات کو سمجھ لیتے اور صحیح روش اختیار کر لیتے"۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۱ کا) دوسری تصنیف الغنی فی القرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ محققین اس ترجمہ کو صحیح نہیں سمجھتے اور صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ "اور انہوں نے انشاء اللہ بھی نہ کہا"۔ اس ترجمہ کے پیشِ نظر آگے لولا تسبحون کا اشارہ بھی اسی کی طرف سمجھا جائے گا۔ آیت کے فہم میں یہ اختلاف اس موقعہ پر اس سے استدلال کو بھی قابلِ غور بنا دیتا ہے۔ واللہ عندہٗ علم الصواب۔ (مترجم)

اسی لئے قرآن لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وقت کے ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے انفاق کریں:

قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خِلٰلٌ ○ (ابراہیم: ۳۱)

"اے نبیؐ! میرے جو بندے ایمان لائے ہیں اُن سے کہدو کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اسی میں سے کھلے چھپے راہ خیر میں خرچ کریں، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوست نوازی ہو سکے گی۔"

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ○ وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا ط (المنافقون: ۱۰-۱۱)

"جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت اس کے سر پر آ کھڑی ہو تو وہ اس وقت کف افسوس ملتا ہوا بولے:

پروردگار مجھے تھوڑی مدت کے لئے اور مہلت دی ہوتی کہ میں کچھ صدقہ ادا کرتا اور نیکو کار ہو جاتا تو پھر اللہ ایک لمحہ کی مہلت بھی نہیں دیتا۔ اور ہرگز نہیں دیتا۔"

وہ انہیں تنگ دلی سے بچتے رہنے کی تاکید کرتا ہے تاکہ مال و اولاد کی محبت انہیں بخل و حرص میں مبتلا نہ کردے، کیونکہ مال و اولاد ان کی آزمائش کے لئے ہیں:

اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ ط وَاللّٰہُ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ ط وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (التغابن: ۱۴ تا ۱۶)

"تمہارا مال و دولت اور تمہاری اولاد درحقیقت سامانِ آزمائش ہے، اور اگر اس فتنہ میں پھنس نہ جاؤ بلکہ صحیح روش پر قائم رہو تو تمہارے لئے) اللہ کے پاس اجرِ عظیم ہے۔ پس جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور بات سنو اور اطاعت کرو، اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو کہ اس میں تمہارا ہی بھلا ہے۔ اور جو اپنے طبیعت کے حرص و بخل سے بچا رہا وہی حقیقی کامیابی کا منہ دیکھ سکے گا۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر مسلمان کے لیے صدقہ کرنا ضروری قرار دیتے ہیں چاہے مفلس ہی کیوں نہ ہو۔ اس اجمال کی تفصیل آپؐ کا یہ فرمان ہے کہ "ہر مسلمان پر صدقہ کرنا لازمی ہے۔" لوگوں نے کہا: "اللہ کے نبیؐ! جسے کچھ میسر ہی نہ ہو وہ کیا کرے؟" آپؐ نے فرمایا: "اپنے ہاتھوں سے کام کرے اور پھر خود کو بھی فائدہ پہنچائے اور صدقہ بھی کرے۔" لوگوں نے پھر کہا: "اگر اس پر بھی اسے کچھ نہ ملے؟" آپؐ نے جواب دیا: "کسی مصیبت زدہ حاجتمند کی مدد کرے۔" لوگوں نے پوچھا: "اگر اس سے یہ بھی نہ بن پڑے؟" آپؐ نے فرمایا کہ: "ایسی شکل میں اسے چاہیئے کہ خود اپنا طرزِ عمل ٹھیک رکھے اور بُرائی سے بچا رہے کہ یہی اس کے حق میں صدقہ قرار پائے گا۔"[1] اس طور پر انفاق کے معاملے سب برابر قرار پاتے ہیں۔ جس کو جو کچھ بھی میسر ہے اسی کے حساب سے اس کے اوپر ذمہ داری ہے اور جس سے جو کچھ ہو سکتا ہے اتنا ہی اسے کر کے دینا چاہیئے۔

انفاق کی مدات کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ ضرورت کہاں ہے اور کتنی ہے؟ قریبی اعزہ حُسنِ سلوک کے زیادہ مستحق ہیں۔ لیکن دوسرے بھی اس معاملہ میں اُن کے ساتھ ہی شمار کیے جاتے ہیں اور نیکی واحسان پر اُبھارنے کے سلسلے میں اُن کا نام بھی اقرباء کے ساتھ ہی آتا ہے کہ حسنِ سلوک اور نیکی پہلے ایک عام انسانی جذبہ ہے اور نب رشتہ داری کا تقاضا۔ نیکی واحسان کا ذکر ایمان کے ساتھ اکثر آتا ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں یہ ایمان کی علامت ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝

(النساء: ۳۶-۳۷)

"اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔ قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے

---

[1] بخاری ومسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

پیش آؤ، اور پڑوسی رشتہ داروں سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو محبوب نہیں رکھتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ جو کنجوسی کرتے اور دوسروں کو کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اسے چھپاتے ہیں ایسے کافر نعمت لوگوں کے لئے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ٥ (البقرہ: ۲۱۵)

"لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو، اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں اور مسکینوں پر اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اُس سے باخبر ہوگا۔"

اس طرح اس معاملہ میں تمہارا پڑوسی اور ساتھی، والدین اور اقرباء کے ساتھ ہی شمار کیے جاتے ہیں۔ اور پھر یتیم، مساکین اور مسافر بھی اُن ہی کے ساتھ آملتے ہیں، سب برابر ہیں۔ یہاں تک کہ جن لوگوں سے کوئی تکلیف دہ حرکت صادر ہو جائے وہ بھی جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ کے عزیز مسطح سے ہو گیا تھا مسطح نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت عائشہؓ کے بارے میں جھوٹی تہمت پھیلانے میں حصہ لیا تھا۔ اسلام ایسے لوگوں سے درگزر کرنے کی تلقین کرتا ہے اور اس کو حسنِ سلوک سے محروم کرنے سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ جب اپنی عزت و آبرو کو بالکل بر بنائے افتراء و بہتان پامال ہوتے دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ نے شدید غصہ کے عالم میں قسم کھائی کہ مسطح کے ساتھ جو کچھ بھلائی وہ کرتے رہے ہیں اس سے ان کو محروم کر دیں گے تو یہ آیت اُتری:

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ط اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ط (النور: ۲۲)

"تم میں جن لوگوں کو مال اور فراخی نصیب ہے ان کے لئے مناسب نہیں کہ قرابت دارو مسکینوں اور راہ خدا میں ہجرت کرنے والوں کو اعانت نہ کرنے کی قسم کھا بیٹھیں، ان کو چاہیئے کہ عفو درگزر کی پالیسی اختیار کریں۔ کیا تم کو یہ نہیں پسند کہ اللہ تمہاری خطائیں بخش دے۔"

اس طور پر اسلام انسانی شعور کو اس اعتبار سے ایک بلند سطح پر جا پہنچاتا ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسانیت کے عز و شرف کا باعث ہے اور جس پر کہ وہ ماضی، حال اور مستقبل میں فخر کرتی رہے گی. جب تک کہ اللہ کو منظور ہو ۔۔ پھر وہ خود احسان کے تصور میں بھی بلندی پیدا کرتا ہے اور اسے خود اللہ کے ساتھ احسان قرار دیتا ہے۔ حالانکہ اس بزرگ و برتر کی ذات اس سے کہیں بلند ہے نیکی کے اِس تصور کی ایک اچھوتی تصویر کشی ایک حدیثِ قدسی میں یوں کی گئی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يقول يوم القيامة : يا ابن آدم! مرضت فلم تَعُدْنِي! فيَقول ابن اُدم: "يا ربّ! كيف اعودك وانت رب العالمين؟"

فيقول الله: اما علمت ان عبدي فلانًا مرض فلم تعده؟ اما انك لو عُدته لوجدتني عنده۔

يا ابن اُدم! استطعمتك فلم تطعمني۔

فيقول: يا ربّ! كيف اطعمك وانت رب العالمين؟

فيقول الله: اما علمت ان عبدي فلانًا استطعمك فلم تطعمه؟ اما انك لو اطعمته لوجدت ذالك عندي.

يا ابن اُدم! استسقيتك فلم تسقني۔

فيقول: يا رب كيف اسقيك وانت رب العالمين؟

فيقول: استسقاك عبدي فلانٌ فلم تسقه اما انك لو سقيته لوجدت ذالك عندي۔ (مسلم)

"خداوند عزّوجل قیامت کے دن فرمائے گا: "اے ابن آدم! میں بیمار پڑا

تو تو میری عیادت کو نہ آیا۔" ابن آدم جواب دے گا:

"پروردگار! میں تیری عیادت کیسے کرتا جب کہ تو سارے جہانوں کا آقا ہے؟" اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تو تو اس کی عیادت کو نہ گیا۔ اگر تو اس کی عیادت کو گیا ہوتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔"

(اللہ تعالیٰ فرمائے گا) "اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا کھلانے کو کہا تو تو نے مجھے کھانا بھی نہ کھلایا۔"

وہ کہے گا: "پروردگار! میں تجھے کھانا کیسے کھلاتا جب کہ تو خود ہی سارے جہانوں کا مالک ٹھہرا۔"

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانے کو مانگا تو تُو نے اُسے نہیں کھلایا۔ اگر تو نے اُسے کھانا کھلا دیا ہوتا تو اس کھانے کو میرے پاس پالیتا۔"

(پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا) "اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی پلانے کو کہا تو تُو نے مُجھے پانی نہ پلایا۔"

وہ کہے گا: "پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاتا جب کہ تو سارے جہانوں کا رب ہے؟"

(اس پر ارشاد ہوگا) "میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی پلانے کی درخواست کی تھی تو تو نے اُسے پانی نہیں پلایا تھا۔ اگر تو نے اسے پلایا ہوتا تو اس (پانی) کو میرے پاس پالیتا۔"

صدقہ کے لئے اس نے ایسے آداب مقرر کئے ہیں کہ وہ صاحبِ مال کی طرف سے غرور تفوق و برتری کا اظہار نہیں بننے پاتا۔ پھر یہی آداب اُسے غیر پاکیزہ احساسات کے ساتھ کئے جانے والے ریاکارانہ صدقہ کی شکل اختیار کرنے سے بھی بچاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صدقہ کے محرکات پست اور ذلیل ہوں اور جو صدقہ قبول کرے اس پر احسان جتلایا جائے تو

صدقہ دینا ایک ذلیل کام بن جاتا ہے۔ خود اس فرد کی طبیعت اور اس کے اخلاق پر برے اثرات پڑتے ہیں، اور اسی طرح سماج کے دوسرے افراد اور افراد کے باہمی تعلقات پر بھی اس طرح کے صدقہ سے بُرے اثرات پڑتے ہیں۔ انسانی طبیعت کے لئے احسان جتانے سے بڑھ کر گراں گزرنے والی تلخ، رسواکُن اور قبولِ احسان سے روکنے والی دوسری کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح اخلاقی اعتبار سے بھی ریاکارانہ صدقہ سے زیادہ گرا ہوا کوئی فعل نہیں، نہ کوئی دوسری بات ضمیر کے لیئے اس سے زیادہ تباہ کن اور مُضر ہے۔ اسلام دینے والوں اور لینے والوں دونوں کی طبیعت میں عُلو پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی اسے بڑی فکر ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۔ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَا

اِعْصَارٌ فِیْہِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ

تَتَفَکَّرُوْنَ (البقرۃ: ۲۶۱-۲۶۶)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں، اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے، وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے، نہ دُکھ دیتے ہیں، اُن کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اُن کے لیئے کسی رنج و خوف کا موقع نہیں۔ ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذراسی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دُکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بُردباری اس کی صفت ہے۔ اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو دُکھ دے کر اور احسان جتا کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو۔ جو اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی، جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا۔ اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو، اگر زور کی بارش ہو جائے تو دوگنا پھل لائے، اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لئے کافی ہو جائے تم جو کچھ کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا باغ ہو، نہروں سے سیراب، کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا، اور وہ عین اس وقت ایک تیز گرم بگولے کی زد میں آکر جھلس

جائے جب کہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کم سن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں ؟ اسطرح
اللہ اپنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے، شاید کہ تم غور و فکر کرو۔"

اسی لئے صدقہ میں اخفاء سے کام لینا اور پوشیدہ طور پر ناداروں تک پہنچا دینا زیادہ بہتر ہوتا ہے تاکہ ایک طرف تو ان کی عزت و آبرو سلامت رہے۔ دوسری طرف یہ خود بے جا گھمنڈ اور فخر سے بچے رہیں:

إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ (البقرۃ: ۲۷۱)

"اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا ذکر تعریف کے ساتھ کیا ہے جس نے صدقہ دیا تو ایسا چھپا کر دیا کہ بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا۔ (تصدق بصدقة فاخفاها حتى لا تعلم شماله ما تنفق يمينه) نیکی کے معاملہ میں اخفاء سے کام لینے اور اسے نام و نمود اور فخر و غرور سے بچتے ہوئے خالصتۃً للہ کرنے کی یہ کتنی حسین اور کامیاب تصویر ہے۔

اسلام حب ذات اور حُبِّ مال کی بنیادی خصلتوں کا ہمیشہ خیال رکھتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ حرص و بخالت نفسِ انسانی میں بہر حال موجود رہنے والی چیزیں ہیں۔ ان سے مفر نہیں۔

وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ ۚ (النساء: ۱۲۸)

"نفس بخیل واقع ہوا ہے۔"

چنانچہ وہ ترغیب دلا کر اور اُبھار کر، خطرات سے خبردار کر کے اور ڈرا کے اور پھر اعلیٰ نمونوں اور بلند تصورات کی تصویریں سامنے لا کر، غرض ہر طرح سے کوشش کر کے ان چیزوں کا نفسیاتی طور پر علاج کرتا ہے اور بالآخر اپنا مطلب حاصل کر ہی لیتا ہے، چنانچہ وہ اسی کنجوس طبیعت سے یہ مطالبہ بھی کر دیتا ہے کہ وہ چیزیں راہِ خدا میں نکالے جو اس کو محبوب ہوں اور جن کی جدائی اس پر شاق ہو:

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ (آل عمران: ۹۲)

"تم نیکی کا مقام ہرگز نہ پاؤ گے جب تک کہ اپنی محبوب چیزوں کا حصہ خرچ نہ کر دو۔"

چنانچہ نفس انسانی لبیک کہتا ہے اور ڈھونڈ ڈھونڈھ کر عمدہ مال خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اس طرح وہ فیاضی کے درجۂ کمال پر جا پہنچتا ہے اور گہرے شعور کے ساتھ کی جانے والی پاکیزہ داد و دہش میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے جتنا آگے بڑھنا عموماً بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان اپنے نفس سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ بلندی اور طلبِ علو کا جذبہ ضرورت کے احساس پر اور ضمیر کے تقاضے طبیعت کے تقاضوں پر غالب آتے ہیں۔ یہ اپنی جگہ پر خود ایک بلند انسانی مقصد ہے۔ جس کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ توازن پیدا کرنے، ناداری کا مقابلہ کرنے اور محروم و مستطیع کے درمیان تعاون اور کفالتِ باہمی کا اصول زیرِ عمل لانے کے لئے ہمارا اجتماعی ہدف ہے اور اور اسی طرح ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

یہ پالیسی جس کا ایک نمونہ ہم نے قدرے تفصیل کے ساتھ سامنے رکھا ہے، اسلام نے تمام معاملاتِ زندگی میں اختیار کی ہے۔ جس چیز کو قانوناً لازمی قرار دیتا ہے اس پر وجدان کو مطمئن کرنے کا اہتمام بھی رکھا ہے۔ وہ قانونی طور پر اتنا ہی لازم کرتا ہے جتنا معاشرہ کی سلامتی کے لئے ناگزیر ہو۔ اور لوگوں میں جو قوت و تحمّل عام طور پر پائی جاتی ہے وہ اس کا بار آسانی سے اٹھا سکیں پھر وہ وجدان کو مخاطب کرتا ہے تاکہ وہ اس قانونی حد پر مطمئن ہو جائے اور اس سے آگے جس قدر بھی جا سکے، جانے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس کا مقصد انسانی زندگی کو بلند سے بلند تر بنانا اور مسلسل نئی بلندیوں کی طرف سرگرم سفر رکھنا ہے۔ اسلام کم سے کم پابندیوں کی لازمی حد اور بلند تر پسندیدہ حد کے درمیان کافی فاصلہ چھوڑ دیتا ہے تاکہ اسی میں مختلف افراد اور مختلف نسلیں ہر زمانہ میں باہم مسابقت کرتی رہیں۔

اسلام نے اجتماعی عدل کے قیام میں یہی طریق کار اختیار کیا ہے۔ آئندہ دو ابواب میں ہم نے سیاسی پالیسی اور اقتصادی پالیسی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اِس سے یہ بات سامنے آئے گی کہ اسلام ہمیشہ اپنے طریقِ کار کے ان ہی دو بنیادی اصولوں پر اعتماد کرتا ہے۔ قانون سازی اور ترغیب و تلقین ان ہی دو طریقوں سے کام لے کر وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اجتماعی عدل قائم کرتا ہے۔ اسلام کے اوّلین دورِ عروج میں اس طریقہ نے اپنا پورا پورا فائدہ پہنچایا اور گزشتہ چودہ صدیوں میں کتنے ہی ایسے ادوار گزرے ہیں

جن میں اس نے اپنے برکات سے نوازا۔ اب بھی اس کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ حال و مستقبل میں پھر سے وہی فیض رسانی جاری کر دے۔ مگر یہ سب اُسی وقت ہو گا جب اُسے ٹھیک ٹھیک سمجھا جائے، صحیح رُخ پر چلایا جائے۔ اور سب لوگ خود بھی اس کی سیدھی راہ پر چل پڑیں۔

باب پنجم

اسلام میں نظامِ حکومت

اسلام میں نظامِ حکومت

اسلام میں عدل اجتماعی پر گفتگو طرزِ حکومت پر گفتگو کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس عدل کے مزاج کے بارے میں اوپر جو اصول بیان کئے گئے ہیں ان کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اسلام کا تعلق زندگی کے ہر پہلو اور ہر طرح کے اعمال سے ہے۔ یہ نظام روحانی اور مادی دونوں طرح کی قدروں پر حاوی ہے۔ اور دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے نافذ کرتا ہے۔ اِس حقیقت کے پیشِ نظر بھی یہ ضروری ہے کہ اسلامی سیاست کے مزاج پر روشنی ڈالی جائے، کیونکہ طرزِ حکومت اِن اقدار سے گہرا ربط رکھتا ہے۔ مزید برآں قانون کو نافذ کرنے، معاشرہ کی مختلف پہلوؤں سے نگرانی کرنے، اس میں عدل و توازن برقرار رکھنے اور اسلامی اصولوں کے مطابق دولت کی تقسیم عمل میں لانے کا کام بھی بالآخر نظامِ حکومت ہی کے ذمّہ کیا گیا ہے۔

اسلامی نظامِ حکومت پر کافی تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے، اور یہ کام علیحدہ سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں اِس موضوع سے صرف اسی حد تک تعرض کیا جائے گا جس حد تک کہ اجتماعی عدل کے سلسلہ میں ناگزیر ہے۔ حتی الامکان ہم بحث تو ان ہی امور تک محدود رکھیں گے جو اجتماعی عدل سے براہِ راست متعلق ہیں۔ اسلام کے مطالعہ میں اکثر ایک دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے تمام پہلو ایک دوسرے سے مربوط اور بڑی حد تک ایک دوسرے پر منحصر نظر آتے ہیں۔ یہ مختلف پہلو ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوتے کیونکہ یہ دین پورا کا پورا ایک اکائی ہے، عبادات و معاملات، حکومتی پالیسی اور مالی پالیسی، قوانین و ہدایات، عقیدہ و عمل، دنیا و آخرت، سب کے سب ایک مکمل اور جامع نظام کے باہم مربوط و منظم اجزاء ہیں۔ ان میں سے کسی ایک جزء پر الگ سے گفتگو اس وقت تک بہت مشکل ہے جب تک کہ دوسرے اجزاء سے بھی تعرض نہ کیا جائے۔ بہرحال ہم اپنی حد تک طرزِ حکومت پر گفتگو کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلامی نظام پر لکھنے والے بعض اہلِ قلم خواہ وہ اسلام کے اجتماعی نظام پر لکھ رہے ہوں یا حکومت کے نظام اور اس کے ڈھانچہ پر، اسلام اور ان دوسرے نظاموں کے درمیان کچھ مشابہت دکھلانے یا تعلق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے انسانیت دورِ قدیم یا عہدِ جدید میں اسلام سے قبل یا اس کے بعد آشنا رہی ہے۔ ان میں سے بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام اور کسی دوسرے نئے یا پرانے نظام کے درمیان کوئی رشتہ ثابت کر کے وہ اسلام کے حق میں کوئی بڑی قوی سند فراہم کر دیتے ہیں۔

یہ کوشش دراصل داخل میں مغربی نظاموں کے سامنے احساسِ شکست کی غماز ہے۔ ان نظاموں سے مشابہت ثابت ہو جانے کی وجہ سے اسلام کی عزت میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں ہوتا اور نہ ایسا نہ ہو سکنے کی شکل میں اسے کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ اسلام انسانیت کے لیے نظامِ کامل کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ جس کی نظیر آپ کو کسی دوسرے نظام میں، جس سے یہ دنیا اسلام سے پہلے یا اس کے بعد متعارف ہوئی ہو، نہیں مل سکتی۔ اسلام نے کبھی بھی کسی دوسرے نظام کی تقلید کرنے یا اس سے اپنی مشابہت جتلانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس اس نے ایک علیٰحدہ اور اچھوتی راہ اختیار کی ہے اور انسانیت کی تمام مشکلات کے حل کے لیے ایک مکمل علاج پیش کیا۔

انسانی نظاموں کے ادل بدل میں یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے کہ کبھی وہ اسلام سے آملے اور کبھی جدا ہو گئے، لیکن خود اسلام اپنی جگہ پر ایک مکمل اور مستقل نظام ہے جسے اِن دوسرے نظاموں سے کوئی واسطہ نہیں، نہ تو اس وقت جب کہ وہ اس کے ساتھ چلیں اور نہ اس وقت جب وہ اس سے الگ راہ اختیار کر لیں۔ یہ ملنا یا جُدا رہنا دراصل محض عارضی ہوتا ہے اور وہ بھی جُزئی طور پر۔ ظاہر ہے کہ جُزئیات اور عارضی اُمور میں اتفاق یا اختلاف کو کوئی اہمیت نہیں حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں اعتماد صرف بنیادی فکر اور مخصوص فلسفہ پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اسلام اپنا مخصوص فلسفہ اور اپنا علیٰحدہ فکرِ اساسی رکھتا ہے۔ انہیں پر اس کی جزئیات متفرع ہوتی ہیں بہرحال اختلاف ہو یا اتفاق اسلام اپنی مخصوص جداگانہ راہ پر چلتا رہتا ہے۔

اسلامی نظام کا بنیادی اصول دوسرے انسانی نظاموں کے بنیادی اصولوں سے یکسر مختلف ہے۔ اس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے اور وہی شریعت وضع کر سکتا ہے۔ دوسرے سارے نظام اس اصول پر مبنی ہیں کہ حاکمیت انسان کی ہے اور وہ اپنے لئے شریعت وضع کرنے کا مجاز ہے۔ یہ دونوں اُصول ایک دوسرے سے کبھی نہیں مل سکتے۔ اسی وجہ سے اسلامی نظام کسی دوسرے نظام سے میل نہیں کھاتا۔

اور یہ کسی طرح جائز نہیں کہ اُس کو اسلام کے سوا کسی دوسری صفت سے متصف کیا جائے۔

اسلامی محقق کا کام یہ نہیں کہ جب اسلام میں نظامِ حکومت پر گفتگو کرے تو کسی جدید یا قدیم نظام سے مماثلت یا اتفاق کے پہلو تلاش کرے۔ کیونکہ یہ موافقت اور مماثلت نہ صرف یہ کہ سطحی اور جزئی ہوتی ہے اور بنیادی فکر و تصور میں نہیں بلکہ جزئیات میں اتفاقی توارد کا نتیجہ ہوتی ہے، اور اسلام کی قوت میں بھی کوئی اضافہ نہیں کرتی۔ جیسا کہ بعض شکست خوردہ لوگوں کا خیال ہے۔ ان کے لیے صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے دین کی بنیادوں کو پیش کریں اور اس بات پر پختہ یقین کے ساتھ پیش کریں کہ یہ بنیادیں اپنی جگہ پر خود ہی مکمل ہیں خواہ یہ دوسرے تمام نظاموں کے مخالف پڑیں یا موافق۔ رہا اسلامی نظام اور دوسرے نظاموں کے درمیان مشابہت اور موافقت کے نقطے تلاش کرکے اسلام کی تائید کرنے کی کوشش کرنا تو جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں یہ احساسِ شکست ہے جس کو کوئی مسلمان محقق جو اس دین کو واقعی سمجھ چکا ہو اور اس پر گفتگو کا پورا پورا حق ادا کرتے ہوئے اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہو، اپنا شعار نہیں ٹھہرا سکتا۔

دنیا اپنے آغاز میں اور بعد کے مختلف اَدوار میں بہت سے نظاموں سے آشنا رہ چکی ہے۔ اسلامی نظام نہ تو ان ہی کا ایک نظام ہے، نہ ان کا کوئی مرکّب اور مخلوط ہے، اور نہ ہی ان سب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مُرتب کیا گیا ہے۔ وہ ایک مستقل بالذات نظام ہے جو اپنا الگ فکر اور اپنے علیحدہ ذرائع و وسائل رکھتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اُسے اس کی اسی مستقل بالذات حیثیت میں پیش کریں۔ کیونکہ اُس نے دوسروں سے آزاد اور الگ رہ کر ہی نشو و نما پایا ہے اور اُس نے اپنی راہ ہمیشہ دوسروں سے الگ ہی رکھی ہے۔

اسی وجوہ سے میں ڈاکٹر ہیکل[۱] کے عالمِ اسلامی کو "اسلامی سامراج" سے تعبیر کرنے کو اور ان کے اس قول کو کہ "اسلام سامراجی ہے" درست نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ اسلام کی حقیقی رُوح کے فہم سے اِس سے زیادہ دُور اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اسے سامراجی قرار دیا جائے۔ چاہے ہم اسلامی سامراج اور سامراج کے معروف مفہوم کے درمیان فرق واضح کرنے میں کتنا ہی زور کیوں نہ صرف کریں۔ اور اسی طرح دُنیائے اسلام کے مختلف ممالک کے باہمی تعلقات کو "اسلامی سامراج" سے تعبیر کرنا اِن تعلقات کے حقیقی فہم سے بہت دُور ہے۔

---

[۱] ڈاکٹر محمد حسین ہیکل مصر کے ایک مشہور صاحبِ قلم اور سیاسی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ نبی کریمؐ اور خلفائے راشدینؓ کی سیر پر ان کی کتابیں علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ (مترجم)

اس سے زیادہ قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ہیکل' حیاتِ محمدؐ یا الصدیق ابوبکرؓ اور الفاروق عمرؓ میں اسلامی طرزِ حکومت پر گفتگو کرتے وقت اس حقیقی داخلی اختلاف اور تضاد کو تو محسوس کرتے ہیں جو اسلام اور ان دوسرے نظاموں کے مزاج میں ہے جن سے دنیا کو سابقہ پڑتا رہا ہے. لیکن کچھ تو ان غیر اسلامی مظاہرے سے متاثر ہو کر جو آج اسلام سے وابستہ نظر آتے ہیں اور کچھ اسلام اور امپریلزم میں بعض مظاہر کی حد تک بہت مشابہت کی وجہ سے ان دونوں تعبیروں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں. اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے صرف اللہ کی حاکمیت پر مبنی نظام اور انسان کی حاکمیت پر مبنی ایک دوسرے نظام کے درمیان بنیادی فرق کو ملحوظ نہیں رکھا

شاید اس مشابہت کا سب سے نمایاں مظہر عالمِ اسلامی کا مختلف قوموں اور تمدنوں پر مشتمل ممالک سے مل کر بنا ہونا اور ان سب کے حکومتی نظم کا ایک ہی مرکز سے متعلق ہونا ہے. سامراج کی ظاہری شکل بھی یہی ہے. مگر یہ محض ظاہری شکل ہے. اِس مسئلہ میں فیصلہ کن چیز یہ ہے کہ یہ 'مرکز' ان مختلف ممالک کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟ اور یہ کہ ان ممالک کے باہمی تعلق کی اصل نوعیت کیا ہے؟

اسلام کی رُوح اور حکومت کے باب میں اس کی پالیسی کی تحقیق کرنے والا ہر طالب علم قطعی طور پر یہی رائے قائم کرتا ہے کہ معروف سامراجی نظاموں سے یہ بہت دور، بہت ہی دُور واقع ہوا ہے. اسلام دُنیا کے تمام حصّوں میں بسنے والے مسلمانوں کو برابر قرار دیتا ہے. وہ قومی اور وطنی عصبیتوں کو لغو بتاتا ہے. بلکہ جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں' بسا اوقات وہ دینی عصبیت کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا اور اسے یکسر نظر انداز کر دیتا ہے. اسی اسپرٹ کے تحت وہ مختلف ممالک کو نہ تو مستعمرات (Colonies) قرار دیتا ہے نہ انھیں استحصال بے جا کا ہدف بناتا ہے. وہ انھیں اُن چشموں کی حیثیت نہیں دیتا جو بس ایک مرکز کے فائدے کی خاطر ہر چہار طرف سے سب کچھ لا کر اُسی میں اُنڈیل دیتے ہوں. ہر ملک عالمِ اسلامی کے جسم کا ایک عضو ہے' اس کے بسنے والوں کو بھی وہ سارے حقوق حاصل ہیں. اگر کسی ملک کا نظم مدینہ کے اسلامی مرکز کی طرف سے مقرر کردہ ایک والی کے ہاتھ میں تھا تو اُسے یہ عہدہ ایک ایسے صالح مسلمان کی حیثیت میں ملا تھا جو منصب ولایت کا اہل پایا گیا' نہ کہ ایک امپریلیسٹ حاکم کی حیثیت سے. یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ان مفتوحہ ممالک میں سے اکثر کا نظم وہیں کے باشندوں میں سے کسی کے ہاتھ میں تھا اور یہ بھی اس فرد کے منصبِ حکمرانی کے لیئے موزوں ہونے کی حیثیت سے تھا' نہ کہ وہاں کا باشندہ ہونے کی وجہ سے. ان ممالک سے جو محاصل جمع ہوتے تھے وہ پہلے وہیں کی ضروریات پر خرچ کیئے جاتے تھے. اگر اس میں سے کچھ بچ رہتا تو وہ مرکزی بیت المال میں بھیج دیا جاتا تا کہ بوقتِ ضرورت

تمام مسلمانوں پر خرچ کیا جا سکے، نہ اس لیے کہ اُسے مرکزِ اسلامی کا خصوصی حصّہ قرار دے دیا جائے، خواہ دوسرے ممالک اُس کے بُری طرح محتاج ہوں۔ جیسا کہ آج کی سامراجی سلطنتوں میں عملاً ہوتا ہے۔

یہ باتیں عالمِ اسلامی، یا زیادہ موزوں الفاظ میں اُمّتِ اسلامیہ اور امپیریلزم کے درمیان بہت بڑا بُعد پیدا کرتی ہیں۔ اور یہ بات کہ اسلام سامراجی Imperialst ہے، اسلام کی رُوح اور اُس کی تاریخ دونوں پر بڑی زیادتی ہے۔ یہ رائے ایک اجنبی اصطلاح کو زبردستی اسلام کے سر تھوپنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ کہنا زیادہ دُرست ہوگا کہ اسلام اپنے عین مزاج کے اعتبار سے انسانی ہے کیونکہ وحدتِ انسانیت کا نظریہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کے یہاں موجود ہے اور اس اصول کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر وہ ساری انسانیت کو برابر اور بھائی بھائی بنا کر اپنے پرچم تلے جمع کرنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب الفتنۃ الکبریٰ۔ عثمانؓ، میں اسلامی نظامِ حکومت کا دوسرے نظامہائے حکومت سے موازنہ کرتے وقت جو رائے ظاہر کی ہے وہ اس سے زیادہ دقّتِ نظر پر مبنی ہے۔ چنانچہ ان کی رائے میں اسلام اپنے اصل مزاج کے اعتبار سے دوسرے تمام نظاموں سے مختلف ہے ___ درحقیقت نظامِ حکومت کے جزئیات اور خارجی مظاہر نہیں بلکہ اسلام کی رُوح اور اُس کے مزاج کے گہرے مُطالعہ سے جو حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہی ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس بات کو ایک اور ہی نتیجہ اخذ کرنے کی بنیاد بنایا ہے، اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد شیخین کے زمانہ میں اسلام جس صورت میں عملاً قائم ہوا وہ ایک نادرالامر وقوع تھا جس پر انسانیت زیادہ عرصہ تک ثابت قدم نہیں رہ سکی۔ یہ بعینہٖ وہی راگ ہے جسے مستشرقین اور اسلامی ممالک میں ان کے شاگرد الاپتے رہتے ہیں اور جس کی بنا پر وہ یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام اس زمانے میں عملاً قائم نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح میں ان حضرات کے طرزِ تحریر کو بھی مناسب نہیں سمجھتا جو "اسلامی سوشلزم" یا "اسلامی جمہوریت"۔۔۔۔ پر لکھتے ہیں۔ یا اسی طرح اللہ سبحانہٗ کے بنائے ہوئے نظام اور انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں میں جوڑ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِن انسانی نظاموں پر بشریت کی چھاپ ہے، اور نقص و کمال، خطا و صواب ضعف و قوت، اتباعِ خواہش یا حق پرستی کے باب میں انسان جن خصوصیات کا حامل ہے وہ ان نظاموں میں جھلکتی ہیں جب کہ الٰہی نظام ان خامیوں سے پاک ہے۔ یہ ایک مکمل اور جامع نظام ہے جس میں آگے پیچھے کسی طرف سے باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔

اسلام انسانیت کے مختلف مسائل کے ایسے حل پیش کرتا ہے جو اپنی جگہ مستقل اور اپنی شان میں منفرد ہیں۔ ان حلوں کو وہ اپنے بنیادی فکر، اپنی اُصولی بنیادوں اور اپنے منفرد طریقِ کار سے اخذ کرتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہونا ہے کہ جب ہم ان حلوں کی تحقیق کریں تو ان کا رشتہ خواہ مخواہ دوسرے نظریات اور دوسرے مسالک سے نہ جوڑیں کہ وہ ان کی تشریح یا ان پر حاشیہ آرائی کا کام کریں۔ یہ خود ایک مکمل زندگی اور ہم آہنگ اکائی ہے۔ کسی بھی خارجی اور اجنبی عنصر کو اس میں دخل دینے کا نتیجہ بجز فساد کسی اور شکل میں ظاہر نہیں ہوگا۔ جیسے ایک مکمل اور نازک میکانکی نظام ہو کہ اُس میں جہاں کسی بیرونی پُرزے کو فٹ کیا گیا پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور وہ پُرزہ بھی اس میں ایک بھونڈے اور بے ضرورت پیوند کے سوا کچھ نہ معلوم ہوگا۔

یہ چند باتیں یہاں اس لئے قلم سے نکل گئیں کہ بہت سے لوگ جن کا طرزِ فکر اور طرزِ عمل اجنبی طور طریقوں سے بُری طرح متاثر ہو چکا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام میں اِن نظاموں کا جوڑ پیوند لگا کر اسلام کے لئے کچھ تازہ طاقت فراہم کر رہے ہیں۔ یہ خیال سراسر باطل اور اسلام کے حق میں انتہائی مفسدانہ خیال ہے۔ یہ اُس کی روح کو ناکارہ بنا کر چھوڑے گا۔ ساتھ ہی یہ ایک طرح کے احساسِ ہزیمت کے ہم معنی بھی ہے، چاہے صراحت کے ساتھ اس کا اعتراف نہ کیا جائے۔

اسلامی نظام دو بنیادی افکار پر مبنی ہے، جو خود اپنی جگہ پر الوہیت، حیات کائنات اور انسان کے بارے میں اس کے کلی فکر سے ماخوذ ہیں۔ پہلا نظریہ قومیت، مزاج اور نشو و نما کے اعتبار سے انسان کا ایک ہونا ہے اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اب رہتی دنیا تک کے لئے واحد عالمگیر اور دائمی نظام اسلام ہی ہے، جس کے سوا کوئی اور نظام اللہ کسی سے قبول نہ فرمائے گا کیونکہ وہ اسلام کے سوا کوئی دین نہیں قبول کرے گا اور 'دین' اسلامی معنی میں اس نظامِ عمومی کا نام ہے جو زندگی پر حکمراں ہو۔

رہا اسلام کا یہ نظریہ کہ آئندہ رہتی دنیا تک واحد عالمگیر نظامِ زندگی اسلام ہی ہے جس کے سوا کوئی اور نظام اللہ کسی سے قبول نہ فرمائے گا تو اس کی بنیاد دراصل یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کی طرف مبعوث تھے۔ آپ آخری نبی تھے۔ اور آپ کا لایا ہوا دین بہترین دین تھا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ (سبا: ۲۸)

"ہم نے آپ کو تمام انسانوں کی طرف مبعوث کیا ہے۔"

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (انبیاء: ۱۰۷)

"ہم نے آپ کو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

رَسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط (الاحزاب: ۴۰)

"اللہ کے رسول اور انبیاء کے خاتم۔"

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط (المائدۃ: ۳)

"آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔"

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ ۔ (بنی اسرائیل: ۹)

"درحقیقت یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔"

اپنے اسلامی مفہوم کے اعتبار سے "دین" جدید اصطلاح "نظام" کے مرادف ہے۔ البتہ نظام کے مفہوم میں ضمیر میں راسخ عقیدہ، زندگی میں انسان کا رویہ اور اخلاق اور سماج میں قانون... کا بھی اضافہ ضروری ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں بھی اسلام میں 'دین' کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس لئے کوئی بھی نظام اس وقت تک اللہ کے نزدیک قابلِ قبول اور اسلام کے نزدیک درست نہیں قرار پا سکتا جب تک کہ وہ اسلام کے اعتقادی تصور پر نہ مبنی ہو اور صرف اسلامی شریعت کی بنیاد پر قانون سازی اور ضابطہ بندی کا اصول نہ اپناتا ہو۔ ان باتوں سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اس نظام کے چلانے والے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور آقائیت کے آگے سرِتسلیم خم کر چکے ہوں اور خود اپنے لیے قانون سازی اور نظامِ زندگی وضع کرنے کے اختیارات کے دعوے دار نہ ہوں، کیونکہ اسلام میں یہ حق صرف خدا کے لئے مخصوص ہے۔ یہی بات اسلامی نظام کو تمام دوسرے نظاموں سے بنیادی طور پر مختلف اور ممتاز کر دیتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود اسلام دوسروں کو اس کے اپنا لینے پر مجبور نہیں کرتا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ج (البقرۃ: ۲۵۶)

"دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔"

بلکہ ان کو اپنے شعائر دینی پر عمل کی پوری آزادی دیتا ہے۔ اس آزادی کے پاس ولحاظ کی

انتہا یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ اور جہاد صرف مسلمانوں پر فرض کرتا ہے اور اس کے بالمقابل اہلِ ذمّہ سے جزیہ وصول کرتا ہے، کیونکہ وہ بھی اسلامی حکومت کی حفاظت وسرپرستی سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور اس سلسلہ کے اخراجات کا بار بہرحال سب پر پڑنا چاہیئے۔ البتہ وہ ان اخراجات کو اہل ذمّہ سے بطورِ زکوٰۃ وصول نہیں کرتا کہ جس طرح کہ وہ ان پر جہاد نہیں فرض کرتا۔ کیونکہ زکوٰۃ ایک اسلامی فریضہ اور مسلمانوں کی ایک مخصوص عبادت ہے اور یہی نوعیت جہاد کی بھی ہے۔ اسلام نہیں چاہتا کہ اہلِ ذمّہ کو مسلمانوں کی کسی عبادت کے بجالانے پر مجبور کرے۔ چنانچہ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ ان لوگوں سے مال بطورِ مال ہی کے لیا جائے اور زکوٰۃ میں جو تعبُّدی پہلو ملحوظ رکھا گیا تھا اس کو یہاں نہ آنے دیا جائے اسی طرح وہ دار الاسلام کے دفاع میں جہاد کی ذمّہ داری سے بھی انہیں معاف رکھتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی اس کے امن اور خوش حالی سے مستفید ہوتے ہیں۔ غیروں کے بارے میں حقِ عدل کی تیزی یہاں درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔

غیروں کو ان حدود کے اندر آزادی بخشنا دراصل اسلام کے اپنی اسی اسپرٹ سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔ ساتھ ہی اس کو اس حقیقت پر بھی پورا پورا اعتماد ہے کہ جب بھی ان لوگوں کو اس بات کا موقع ملے گا کہ غلط طرزِ فکر یا کسی مادّی طاقت کو درمیان میں نہ لاتے ہوئے سنجیدگی سے اسلام کا مطالعہ کریں تو وہ اپنی فطرت کے عین تقاضے کے طور پر کشاں کشاں اسلام کی طرف کھنچ آئیں گے۔ اُس اسلام کی طرف جس نے ان تمام مقاصد کو کمالِ توازن کے ساتھ جمع کر رکھا ہے جس کی خاطر پچھلے مذاہب کوشاں رہے ہیں۔ جس نے انسانی فطرت میں ودیعت کردہ تمام رجحانات ومیلانات کی یکساں رعایت ملحوظ رکھی ہے جو مطلق مساوات اور مسلسل تعاون وتکافل کی ضمانت دیتا ہے اور جو وحدتِ انسانی کے اصول کو تمدّنی زندگی اور شعور واحساس کی داخلی دنیا دونوں میں نافذ دیکھنا چاہتا ہے۔

اسلامی نظام کے ان دو بنیادی افکار پر مبنی ہونے کا اثر اس کی ساخت اور سمتِ سفر دونوں پر پڑا ہے۔ وہ قانون سازی اور ہدایت وتلقین، طرزِ حکومت اور نظامِ مالی اور دوسرے تمام متعلق نظاموں میں اس بات کا لحاظ رکھتا ہے کہ وہ کسی مخصوص قوم یا نسل کے لیے نہیں بلکہ ساری اقوام اور تمام نسلوں کے لیئے قانون بنا رہا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی تمام ضابطہ بندیوں میں ہمہ گیر اور وسیع انسانی بنیادوں کو سامنے رکھا ہے۔ اس نے عمومی قواعد اور وسیع المعنی مبادی ترتیب دے دیئے ہیں اور ان

کی عملی تطبیق کا کام زمانہ کی تبدیلیوں اور نو بنو ضروریات کے نمودار ہونے پر چھوڑ دیا ہے۔

طرزِ حکومت میں بھی جس کی ایک خاص انداز سے وضاحت ہمارے اس باب کا اصل موضوع ہے، کلی قواعد کی طرف توجہ اور جزئیات سے بے اعتنائی کی یہ صفت پوری طرح موجود ہے۔

اسلام میں نظریۂ حکمرانی کی بنیاد اس بات کی گواہی اور اعلان پر ہے کہ: "اللہ کے سوا کوئی اور الہٰ نہیں"۔ اس شہادت کے ذریعہ جب یہ بات طے ہوگئی کہ اُلوہیت صرف خدا کے لئے مخصوص ہے تو اسی سے یہ بات طے پا گئی کہ انسانی زندگی میں حکمرانی صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ انسانی زندگی میں یہ حکمرانی ایک طرف تو اپنی مشیت اور تقدیر کے ذریعہ معاملاتِ زندگی کی تدبیر فرما کر کرتے ہیں اور دوسری طرف انسانوں کے باہمی تعلقات و روابط، ان کے حقوق اور ذمہ داریوں اور ان کے طور طریقوں کی مخصوص تنظیم کے لیئے ایک ضابطۂ حیات اور شریعت عطا فرما کر کرتے ہیں۔ اسلامی نظام میں اللہ سبحانہ کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی مشیت اور تقدیر میں نہ اس کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات اور شریعت میں اگر ایسا ہو تو یہ شرک و کفر ہوگا۔ اس اصول کی بنا پر انسان بطورِ خود نظامِ حکومت اور دستور و قانون وضع کرنے کا کام نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایسا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی اُلوہیت کا انکار کرکے الوہیت کی مخصوص صفات کے خود اپنے اندر ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے اور یہی صریح کفر ہے۔

اِس قاعدہ کی رُو سے اسلامی نظامِ حکومت بنیادی طور پر انسانوں کے بنائے ہوئے سارے نظاموں سے مختلف ہے۔ خواہ یہ نظامِ صرف حکومت کے لئے وضع کیئے گئے ہوں یا پوری انسانی زندگی کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ نام اور اصطلاح کی حد تک بھی اسلام اور دوسرے انسانی نظاموں کا جوڑ لگانا نامناسب اور غلط ہوگا۔

ذاتِ واحد کی اُلوہیت اور حاکمیت تسلیم کرنے کے بعد اسلام میں نظامِ حکومت حکام کی جانب سے عدل، محکومین کی جانب سے اطاعت اور حاکم و محکوم کے مابین شوریٰ پر مبنی ہے۔ یہی وہ موٹے موٹے بنیادی اصول ہیں جن پر بقیہ سارے اصول و ضوابط متفرع ہوتے ہیں، جن کا مزاج مذکورہ بالا اصل الاصول نے متعین کر دیا ہے۔

ا۔ حکام کی جانب سے عدل

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ (النحل: ۹۰)

"اللہ تم کو عدل کا رویہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔"

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۚ (النساء: ۵۸)

"جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔"

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ (الانعام: ۱۵۲)

"جب بات کہو انصاف کی کہو، خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔"

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔

(المائدہ: ۸)

"کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔"

ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ واقربھم مجلسًا امام عادل و ان ابغض الناس الی اللہ یوم القیامۃ واشد ھم عذابًا امام جائر (الشیخان والترمذی)

"قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ قریب مقام پانیوالا شخص امام عادل ہوگا اور سب سے زیادہ مبغوض اور شدید ترین عذاب کا مستحق شخص امام جابر ہوگا۔"

یہ عدلِ مطلق کی سچی ترازو ہے کہ بغض و محبت اس کی ڈنڈی ٹیڑھی نہیں کر سکتے اور نہ دوستی و دشمنی اس کے قواعد و ضوابط کو بدل سکتے ہیں۔ نہ وہ عدل ہے جو افراد کی باہمی قرابت یا قوموں کے باہمی بغض و عناد کسی سے بھی متاثر نہیں ہوتا۔ اس سے اُمتِ اسلامیہ کے سارے ہی افراد یکساں مستفید ہوتے ہیں۔ نہ تو حسب نسب کا فرق ان میں تفریق و امتیاز کا باعث بنتا ہے نہ مال و جاہ کا۔ اسی طرح دوسری قومیں بھی اس سے مستفید ہوتی ہیں چاہے اُن کے اور مسلمانوں کے درمیان عداوت و دشمنی ہی کیوں نہ ہو۔

یہ عدل کے باب میں وہ بلند چوٹی ہے کہ آج تک نہ کوئی بین الاقوامی قانون اُسے چھو سکا نہ ملکی قانون اُسے پا سکا بلکہ کوئی قانون اس کے قریب بھی نہ پہنچ سکا۔

جن لوگوں کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل ہو انھیں چاہیئے کہ آج قوموں میں طاقتور اور کمزور گروہوں کے درمیان جو سیاست چلتی ہے اس کا مطالعہ کریں اور اسی طرح باہم جنگ و پیکار میں مصروف اقوام کے باہمی تعلقات کا جائزہ لیں یہی نہیں بلکہ ان کو اس "عدل" کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے جو امریکہ میں

سفید اقوام، سُرخ اور سیاہ قوموں کے ساتھ برتتی ہیں اور جیسے جنوبی افریقہ میں سفید نسل کے لوگ رنگین نسلوں کے ساتھ اختیار کرتے ہیں۔ انہیں دیکھنا چاہیئے کہ کمیونسٹ، بُت پرست اور صلیبی اقوام روس، چین، یوگوسلاویہ، ہندوستان اور حبشہ میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہیں[1] اس باب میں اشارہ کافی ہے کیونکہ یہ اسی زمانے کے حالات ہیں جنھیں ہر آدمی جانتا ہے۔

اسلامی عدل کے سلسلہ میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ مجرّد نظریات تک محدود نہ رہا بلکہ عملی زندگی میں بھی اس نے نفوذ کیا اور دفترِ تاریخ اس کی پے در پے مثالوں اور نمونوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلات آگے مناسب موقع پر آئیں گی۔ یہاں ہماری کوشش یہ ہے کہ اسلامی اصول و نظریات کو نصوص کی روشنی میں واضح کر دیں۔

۲۔ محکومین کی طرف سے اطاعت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ

(النساء: ۵۹)

"اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔"

آیت میں اللہ، رسولؐ اور اولی الامر کو ایک ساتھ جمع کرنا اس اطاعت کی حدود اور اس کے مزاج کی تشریح و توضیح کا کام کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ صاحبِ امر کی اطاعت اس کی ذات کی خاطر نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی اطاعت اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی حاکمیت تسلیم کر کے اس کے اقتدار کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی شریعت کا پاسبان بن کر رہتا ہے۔ یہ حق کہ اس کی اطاعت کی جائے اسے خدائے واحد کی حاکمیت کے اعتراف اور اس کی شریعت کے نفاذ سے حاصل ہوتا ہے۔ اب اگر وہ اس اعتراف یا نفاذ سے پہلو تہی کرے تو اس کی اطاعت کا حق ساقط ہو جائے گا۔ اور اس کے احکام کا نفاذ واجب نہیں رہ جائے گا۔ اللہ کا رسولؐ فرماتا ہے:

على المرء المسلم السمع والطاعة فيما أحبّ وأكره الّا ان يؤمر بمعصية،

---

[1] مصنف کی کتاب "دراسات اسلامیہ" کا باب "مسلمان متعصب ہیں" ملاحظہ ہو۔

فاذا اُمر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ (بخاری۔ مسلم)

"ہر مسلمان پر لازم ہے کہ صاحبِ امر کا حکم مانے اور اسے بجالائے خواہ اسے یہ حکم پسند ہو یا نہ پسند ہو۔ الّا یہ کہ اسے معصیت کا حکم دیا جائے۔ جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو اُس پر نہ سُننا فرض ہے نہ حکم بجالانا۔"

اسمعوا واطیعوا، وان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیبۃ، ما اقام فیکم کتاب اللہ تعالیٰ۔ (بخاری)

"حکم سنو اور اس کی تعمیل کرو، خواہ تم پر ایک حبشی کو حاکم بنا دیا جائے جس کا سر کشمش کے دانہ کے مانند (چھوٹا اور سیاہ) ہو جب تک کہ وہ تمہارے درمیان کتاب اللہ کے احکام نافذ کرتا ہے۔"

اس حدیث میں یہ بات بالکل صاف کر دی گئی ہے کہ سمع وطاعت اس وقت تک ہونی چاہیے جب تک کہ کتاب اللہ کو قائم کیا جائے۔ یہاں حکمراں کے احکام کی مطلق اور غیر مشروط اطاعت نہیں، اور نہ ہی ایسا ہے کہ چاہے حکمراں اللہ اور اس کے رسولؐ کی شریعت کو پسِ پشت ڈال دے لیکن اطاعت جاری رہے۔

یہاں دو چیزوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ ایک چیز تو یہ ہے کہ حاکم شریعتِ دینیہ کی تنفیذ کا کام اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اس کا ذمہ دار ہوتا ہے اور یہ ایک بالکل دوسری چیز ہے کہ اسے اپنا اقتدار اپنی کسی دینی خصوصیت کی بنا پر حاصل ہو۔ حاکم کو کوئی ایسی دینی اتھارٹی نہیں حاصل ہے جسے وہ بلاواسطہ آسمان سے حاصل کرتا ہو جیسا کہ پہلے بعض حکمرانوں کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا جس کو "تھیاکریسی" کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں حاکم مسلمانوں کی مطلق آزادی اور کامل اختیار کے نتیجہ میں حاکم بنتا ہے۔ اس سلسلہ میں نہ تو سابق حکمراں کا کیا ہوا یا کرایا ہوا کوئی عہد و پیمان مسلمانوں کو کسی خاص فیصلہ پر مجبور کرتا ہے نہ وہ اس منصب کو وراثت کے طور پر کسی خاندان کے لیے مخصوص رکھنے کے پابند ہیں۔ اُسے اگر یہ منصب ملتا ہے تو اس کے اقتدار کا منبع شریعتِ الٰہی کی تنفیذ کی ذمہ داری ہے۔ بغیر اس کے کہ وہ ذاتی اقتدار کی بنا پر بطورِ خود قانون سازی کا دعوے دار ہو۔ پھر اگر مسلمان اس سے راضی نہ ہوں اور اُسے پسند نہ کریں تو وہ کسی طرح بھی یہ منصب نہیں پا سکتا۔ ان کی رضامندی کے بعد بھی اگر آگے چل کر امام اللہ کی شریعت کو چھوڑ دے تو پھر وہیں سے اس کی اطاعت بھی موقوف ہو جاتی ہے۔

یہیں سے ہمیں اس بات کا بھی پتہ مل جاتا ہے کہ اپنے بعد کے لیے اپنا خلیفہ مقرر کرنے میں نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا حکمت تھی۔ آپ کا ایسا کرنا یہ شبہ پیدا کر سکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مقرر کیے جانے کی وجہ سے اسلام میں خلیفہ ایک طرح کی مذہبی ریاست کا حامل ہے۔

اسلام مسیحی کلیسا کے Ecdasiastic طبقہ کی طرح کی کسی دینی ہیئت کا قائل نہیں اور نہ اسلامی حکومت کسی مخصوص ادارے یا مجلس کے ہاتھوں چلائی جانے والی حکومت کا نام ہے۔ ہر وہ نظامِ حکومت جس میں حکمران اللہ ہی کے واحد حاکم ہونے کا اقرار کرے اور اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ اسلامی شریعت کو نافذ کرے کہ اس کا کام شریعت کے نفاذ کے سوا کچھ نہیں، اسلامی حکومت قرار پائے گا۔ اگر کسی مذہب کے نزدیک "مذہبی حکومت" سے وہ حکومت مراد ہوتی ہو جس کی باگ ڈور ایک متعین گروہ کے ہاتھوں میں ہو تو اسلام کے اندر یہ معنی کسی درجہ میں بھی منتقل نہیں ہوتے۔ اسی طرح یہ رائے بھی صحیح نہیں قرار دی جاسکتی کہ حاکمیت صرف اللہ سبحانہٗ کے لئے مخصوص سمجھ کر اسلامی قانون کے نفاذ کے ماسوا "اسلامی حکومت" کسی اور شرط کی تکمیل پر بھی منحصر ہے۔ درحقیقت ہر وہ حکومت جو اس اصول پر مبنی ہو کہ حاکمیت صرف اللہ کا حق ہے۔ اور اس میں اسلامی شریعت نافذ کی جاتی ہو اسلامی حکومت ہے۔ اسی طرح جو حکومت حاکمیت کو صرف اللہ سبحانہٗ کے لیۓ مخصوص کرنے کے اصول پر نہ مبنی ہو اور جس کے ہاتھوں یہ شریعت نہ نافذ کی جا رہی ہو اسے اسلام اپنی طرف منسوب کرنے کو تیار نہیں خواہ اس کی نگرانی کسی دینی ہیئت کے سپرد ہو یا اسے کسی اسلامی نام سے موسوم کر دیا گیا ہو۔

محکومین کی طرف سے اطاعت حکمراں کے اس اعتراف پر کہ حکمرانی صرف اللہ کا حق ہے اور اسلامی شریعت کی تنفیذ پر منحصر ہے اور اُسی دم تک ہے جب تک کہ یہ صفت برقرار ہے۔ یہ بات حکمرانی میں عدل اور اللہ کی اطاعت کے سوا کسی دوسری شرط سے مشروط نہیں۔

۳۔ حکّام اور محکومین کے مابین مشاورت

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ج (آل عمران: ۱۵۹)

"معاملات میں اُن سے مشورہ کر لیا کیجیے"

أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۸)

"اُن کے معاملات آپس کے مشوروں سے طے ہوتے ہیں"

اِس طور پر شوریٰ اسلام میں طرزِ زندگی کا ایک بنیادی اصول قرار پاتی ہے۔ اس کا دائرۂ اثر حکومت

سے زیادہ وسیع ہے کیونکہ جیسا کہ آیت بتاتی ہے یہ امتِ مسلمہ کی زندگی کا اصول ہے۔ رہا شوریٰ کا طریقہ تو اسلام نے اس کے لئے کوئی لگا بندھا ضابطہ مقرر نہیں کیا ہے۔ اس نے اس اصول کی تطبیق کو احوال وظروف اور ضروریات پر چھوڑ رکھا ہے۔ چنانچہ جن امور میں وحی کے ذریعہ رہنمائی نہ کر دی جاتی ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے مشورہ کرتے تھے اور اُن کے دنیوی معاملات میں جن سے وہ بخوبی واقف ہوتے تھے اُن ہی کی رائے پر عمل فرماتے تھے۔ مثلاً میدانِ جنگ اور متعلق اُمور۔ چنانچہ آپؐ نے غزوۂ بدر میں ان کی رائے مانی اور چشمۂ بدر پر آکر ڈیرے ڈالے۔ حالانکہ اس سے قبل آپؐ اُس سے کچھ دُور پہلے ہی پڑاؤ کر چکے تھے۔ اسی طرح آپؐ نے خندق کھودنے کے معاملہ میں مسلمانوں کی رائے مانی۔ اور بدر کے قیدیوں کے معاملے میں حضرت عمرؓ کی رائے کے مقابلہ میں اُن کی رائے پر عمل کیا تا آنکہ حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید میں وحی نازل ہوئی۔ البتہ جن معاملات میں وحی آکر کوئی راہ متعین کر دیتی تھی تو ظاہر ہے کہ ان میں مشورہ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ وہ فیصلہ فرائضِ دینیہ میں سے ایک فریضہ ہو جاتا تھا جیسا کہ نفسِ معاملہ سے ظاہر ہے۔

خلفائے راشدینؓ بھی مسلمانوں سے مشورہ کی یہی پالیسی اختیار کیئے رہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ کے سلسلہ میں مشورہ کیا اور اُن سے جنگ کرنے کے معاملہ میں اپنی رائے پر عمل کیا۔ پہلے تو عمرؓ آپ سے بحث کرتے رہے لیکن بعد میں جب آپ نے دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنی رائے پر اصرار ہے نیز اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں خود آپ کو بھی شرحِ صدر بخشا تو آپ راضی ہو گئے اور ان ہی کی رائے کی تاکید کرنے لگے۔ اسی طرح آپ نے باوجود حضرت عمرؓ کے اختلاف کے اہلِ مکہ سے شام والوں کے خلاف جنگ کرنے کی بابت رائے لی۔ خود حضرت عمرؓ نے وباز دہ علاقہ میں جانے کی بابت مشورہ طلبی کی اور ایک رائے قائم بھی کر لی، پھر جب آپ کو اس رائے کی تائید میں سنتِ نبویؐ سے ایک نص بھی مل گئی تو آپ نے اس کو بالکل حتمی طور پر اپنا لیا۔ اس دور میں شوریٰ کا یہی حال رہا کہ اس کا کوئی لگا بندھا ضابطہ نہ تھا کیونکہ عملی حالات ہر زمانہ میں اہلِ شوریٰ کی اس طرح تعیین کر دیتے تھے کہ ان کے بارے میں اشتباہ نہ رہ جاتا تھا (کہ وہ کون ہیں) البتہ معاملہ کی عمومی نوعیت کے پیشِ نظر اس بات کی پوری پوری گنجائش ہے کہ شوریٰ کے سلسلہ میں مختلف نظام اختیار کیئے جا سکیں۔ کیونکہ اسلام نے بس عمومی اصول بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے، اس کے طریقوں اور اس کی ہیئت کے سلسلہ میں کوئی تحدید نہیں کی ہے۔

مزید برآں تحریکِ اسلامی کا قدرتی ارتقا ہر زمانہ میں متعین کر دیتا ہے کہ قربانیاں دینے والے

پیش پیش رہنے والے اور صاحب الرائے اہلِ شوریٰ کون لوگ ہیں۔ یہ تعیین ایسی سہولت اور خوش اسلوبی سے انجام پاتی ہے کہ انسانی نظام اس سے ناآشنا ہیں۔[1]

اسلام میں حاکم کے لئے اس کے احکام کی اطاعت، اس کی خیر خواہی اور وفاداری اور شریعت کے قائم کرنے میں اس سے تعاون کے سوا کوئی ایسے حقوق نہیں ہیں جو عام مسلمانوں کو نہ میسر ہوں۔

واضح رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نرے حاکم ہی نہ تھے بلکہ آپؐ ہی قانون دینے والے بھی تھے چنانچہ اسلام کے عطا کردہ حقوق کے دائرہ میں حاکم کو جن حدود کی پابندی کرنی ہے اُن کی آپؐ نے عملی طور پر نشان دہی کر دی ہے۔ پھر آپؐ ہی کے اُسوہ پر خلفائے راشدینؓ بھی چلتے رہے۔ جیسا کہ آئندہ تاریخی مثالوں کے باب میں آرہا ہے۔ آپؐ کا حال یہ تھا کہ خود اپنی ذات سے بھی قصاص لینے تھے۔ الّا آنکہ جس کا حق ہو خود وہی معاف کر دے۔ ایک بار ایک قرض خواہ آیا اور آپؐ سے کچھ سختی کے ساتھ پیش آیا۔ اس پر کچھ مسلمان اس کی طرف لپکے۔ آپؐ نے انہیں اشارہ کیا کہ اُسے چھوڑ دیں کیونکہ حق دار کو کہنے سننے کا پورا پورا حق ہوتا ہے۔ اسی طرح آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

لا یحل لی من غنائمکم الا ھذا الخمس، والخمس مردود علیکم۔

(ابوداؤد۔ نسائی۔)

"تمہارے غنائم میں سے بجز اس پانچویں حصے کے میرے لئے اور کچھ حلال نہیں، اور یہ پانچواں حصہ بھی تمہارے ہی اوپر خرچ کیا جائے گا۔"

آپؐ نے اہلِ خاندان اور قریبی رشتہ داروں کو مخاطب کر کے فرمایا:

یامعشر قریش اشتروا انفسکم لا اغنی عنکم من اللہ شیئًا۔ یابنی عبد مناف لا اغنی عنکم من اللہ شیئًا۔ یاعباس بن عبد المطلب لا اغنی عنکم من اللہِ شیئًا ویا صفیۃ عمۃ رسول اللہ لا اغنی عنکِ من اللہ شیئًا ویا فاطمۃ بنت محمد سلینی ماشئت من مالی لا اُغنی عنکِ مِنَ اللہِ شَیئًا۔ (متفق علیہ)

---

[1] اس اجمال کی تفصیل ہماری کتاب "نحو مجتمع اسلامی" کے باب "شورائی سماج" میں ملے گی۔

"اے اہلِ قریش! اپنے لئے سامان کرو میں اللہ کے حضور تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔
اے بنی عبد مناف! میں اللہ کے حضور تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! میں اللہ کے حضور تمہارے ذرّہ برابر بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے رسول اللہ کی پھوپھی صفیہؓ میں اللہ کے حضور تیرے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے فاطمہؓ بنت محمدؐ! میرے مال میں سے جو چاہے مانگ لے مگر اللہ کے حضور میں تیرے کچھ بھی نہ کام آسکوں گا۔"

علیؓ و فاطمہؓ سے جو ان کو سب سے زیادہ محبوب تھے فرماتے ہیں:

لا أُعْطِيكم وادع اهل الصُّفَّة تلوي بطونهم من الجوع۔

(حدیث نمبر ۵۹٦ مسند امام احمدؒ، مرتبہ و نشر کردہ استاد احمد محمد شاکر)

"یہ نہ ہو گا کہ میں تم کو کچھ دوں اور اہلِ صفہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ بھوک کے مارے ان کے پیٹ لپٹے جا رہے ہوں۔"

ایک دوسرے موقع پر اُن ہی سے فرمایا کہ:

لا اخدمكما وادع اهل صفة تطوى۔ (ایضاً)

"یہ نہ ہو گا کہ تمہاری خدمت کروں اور اہلِ صفہ کو فاقہ کشی کرنے کے لیے چھوڑ دوں۔"

آپؐ ہی کا ارشاد ہے کہ:

ان بنی اسرائیل کان اذ سرق فیهم الشریف ترکوه، واذا سرق فیهم الضعیف قطعوه لو کانت فاطمة لقطعت یدها۔

(رواہ الجماعة)

"بنی اسرائیل کا حال یہ تھا کہ جب ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور اور معمولی آدمی چوری کر بیٹھتا تو اس کا ہاتھ کاٹتے۔ میں تو اگر فاطمہؓ بھی (اس جرم کی مرتکب) ہوتی تو اس کے ہاتھ کاٹ دیتا۔"

پس حاکم کے لیے حدود شرعی یا اموالِ ریاست میں کوئی خصوصی حقوق نہیں اور اس کے گھر والوں کو بھی ان اموال میں اُن حقوق سے زائد کوئی حق حاصل نہیں جو عام مسلمانوں میں سے کسی شخص کو حاصل

ہوتے ہیں۔ حاکم کو عام لوگوں کی رُوح، اُن کے جسم، اُن کی عزّت وآبرو اور ناموس، اور ان کے مال و دولت پر کسی طرح کی زیادتی کا حق حاصل نہیں ہے۔ جب وہ حدودِ شرعی قائم کر چکا اور فرائض کو نافذ کر چکا تو بس یہاں آ کر اس کے اختیارات ختم ہو گئے اور اس سے آگے اسے لوگوں پر کوئی اقتدار حاصل نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دائرہ سے آگے اُن کو اس کے اقتدار کی دسترس سے باہر اور محفوظ رکھا ہے ـــ روح وجسم اور ناموس ومال ہر اعتبار سے۔

اسلام نے اتنے واضح اور مطلق احکام کے ذریعہ روح وجسم اور مال وناموس کے تحفظ کی ضمانت دی ہے کہ ان کے بعد اس حقیقت میں کوئی بھی شائبہ نہیں رہ جاتا کہ اسلام امن وآشتی اور سب کے لئے باعزّت زندگی کے مواقع فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے:

یَاۤ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤی اَھْلِھَا ط (النور: ۲۷)

"کسی گھر میں بغیر اجازت حاصل کیے اور گھر والوں کو سلام کیے نہ داخل ہوا کرو۔"

لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا۔ (البقرہ: ۱۸۹)

"نیکی اس کا نام نہیں کہ گھروں میں عقب سے آؤ۔"

وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا (البقرہ: ۱۸۹)

"گھروں کے اندر ان کے دروازوں کی راہ سے آؤ۔"

وَلَا تَجَسَّسُوْا (الحجرات: ۱۲)

"دوسروں کے عیب نہ ڈھونڈھتے پھرو۔"

حدیث ہے کہ:

کل المسلم علی المسلم حرام دمہ وعرضہ ومالہ (مسلم وبخاری)

"مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لیے حرام ہے۔ اس کا خون، اس کی عزّت وآبرو اور اس کا مال۔"

اور ساتھ ہی اسلام میں جان کے بدلے جان، اور زخموں میں برابر کے بدلے کا اصول رکھا گیا ہے۔

جہاں اسلام اپنی ذات سے متعلق اُمور میں امام کے حدودِ اختیار کو بہت محدود کر دیتا ہے وہیں

نہ جماعت کے مصالح مرسلہ کے سلسلہ میں اس کو انتہائی حد تک وسعت دیتا ہے۔ یہ وہ مصالح ہیں جن کے باب میں کوئی نص نہ آئی ہو۔ حالات کی تبدیلی اور زمانے کے تغیرات کے ساتھ یہ نو بہ نو شکلیں اختیار کرتے رہتے ہیں۔ اس بارے میں بنیادی اُصول یہ ہے کہ امام کو یہ حق حاصل ہے کہ فرمانِ الٰہی:

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۖ (الحج: ۷۸)

"اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی ہے۔"

کے بموجب اور اصلاحِ فرد و جماعت اور ساری انسانیت کی درستیٔ احوال کی خاطر دین اپنے سامنے جو مقاصد رکھتا ہے ان کے حصول کے لیے پیش آمدہ مشکلات کی قدر و وسعت کے مطابق نئے فیصلے کرے اور نئی صورتیں نکالے۔ البتہ یہ سب کچھ اسے اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ یہ حق اسے ملنا ہی اس شرط پر ہے کہ امام کے اندر عدل و انصاف کی جو اسپرٹ ہونی چاہیے وہ اس میں پوری طرح موجود ہو۔

چنانچہ امام کا فرض ہے کہ ہر اس خرابی کا ازالہ کرے جو اُمت کے حق میں کسی طرح کی مضرت کی حامل ہو۔ اور ہر اُس کام کا اہتمام کرے جو کسی حیثیت سے بھی امت کے لیے نفع بخش ہو۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ایسا کرنے میں وہ شریعت کی نصوص میں سے کسی نص کی خلاف ورزی نہ کرے۔

یہ بڑے ہی وسیع اختیارات ہیں جو زندگی کے تمام ہی پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ انہی اختیارات کے اندر اجتماعی عدل کے اپنی تمام شکلوں سمیت متحقق ہونے کی ضمانت بھی مضمر ہے۔ مثال کے طور پر مالی شعبہ میں اُسے یہ حق حاصل ہے کہ فریضۂ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے ٹیکس بھی عائد کرے تاکہ (مختلف طبقات کے درمیان) توازن پیدا ہو اور مساوات رُونما ہو سکے۔ نیز محروم طبقات کے دلوں میں پرورش پانے والے حسد اور کینہ کے جذبات زائل ہوں۔ اُمت سے وہ تمام بُرے اثرات دور ہوں جو عیش پرستانہ ٹھاٹھ باٹھ، یا حد سے زائد تنگی و افلاس، یا اشیاء و اموال کے چند ہاتھوں میں سمٹ آنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مقاصد اسے اس طرح حاصل کرنے چاہئیں کہ نہ تو کسی نص کی خلاف ورزی ہو نہ اسلامی طرزِ زندگی کے بنیادی اصولوں میں سے کوئی اصول مجروح ہو۔ چنانچہ اسے یہ اختیار نہیں کہ عوام سے اُن کا سارا مال چھین کر انھیں مفلس بنا دے۔ یا ان کے رزق کے تمام ذرائع و وسائل اپنے ہاتھوں میں لے لے تاکہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھکی رہیں اور وہ انھیں اپنا غلام بنا کر رکھ سکے، اور انھیں آزادانہ نصیحت،

مخلصانہ احتساب و نگرانی اور بے خوف ہو کر ہر برائی کو، خواہ وہ کسی سے صادر ہو، مٹانے کے فرائض کی ادائیگی کی صلاحیت سے محروم کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ افراد اپنی ان ذمہ داریوں کو اس وقت تک نہیں ادا کر سکتے جب تک انہیں روزی کے ایسے ذرائع میسّر نہ ہوں جو امام اور اس کے مقرر کردہ عہدہ داروں کے قبضۂ قدرت سے آزاد ہوں۔ بات یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں روٹی کے سارے خزانے ہوں گے اس کے آگے بندوں کی گردنیں جھکی رہیں گی۔

اُمّت مسلمہ کی تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ اسلامی طرزِ زندگی کے بنیادی اصولوں کو مجروح کیے بغیر عام مصالح کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ ہر زمانہ میں ایسا کرنا ممکن ہے، کیونکہ اسلام کوئی جامد نظام نہیں ہے اور اس کے اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کرنے کا عمل کسی زمانہ یا کسی ماحول میں رُک نہیں جاتا۔ اسلام جن چیزوں کو بہر حال قائم رکھنا چاہتا ہے وہ بنیادی اصول ہیں جو اُس کی ربّانی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہیں۔ مسلم سوسائٹی ان اصولوں کو جاہلی معاشروں میں کمزور پڑ جانے یا مٹ جانے سے بچاتی ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اسلام ان معاشروں کی قیادت کے اس منصب سے محروم ہو جاتا ہے۔ جس کے لیے وہ آیا ہے۔

واضح رہے کہ یہ تصریحات اسلام کی حکومتی پالیسی کے صرف "رسمی" (یعنی قانونی اور ضابطہ کے تحت آنے والے) پہلو سے متعلق نہیں۔ اس کے پیچھے تطوّع (یعنی افراد کے اختیار و پسند پر چھوڑی ہوئی ذمہ داریوں) کا پہلو بھی مستقل طور پر موجود ہے جسے تلقین و ترغیب کی قوت قانونی طور پر عاید کی جانے والی ذمہ داریوں سے بہت آگے لے جاتی ہے۔

پس اسلام میں نظامِ حکومت قانونی بنیاد کے ساتھ ہی ضمیر کی بنیاد پر بھی قائم ہے۔ اس بنیاد پر کہ اللہ تعالیٰ ہر لمحہ حاکم و محکوم دونوں کے قریب ہے اور دونوں کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:-

ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃً فلم یحطھا بنصیحۃ الا لم یجد رائحۃ الجنۃ (بخاری و مسلم)

"جس بندے کو بھی اللہ کچھ لوگوں کا نگراں (سرپرست) بنائے اور وہ انہیں اپنی خیرخواہیوں سے ڈھانپ نہ لے وہ جنّت کی خوشبو سے بھی آشنا نہ ہو سکے گا۔"

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥

(البقرہ: ۱۸۸)

"ایک دوسرے کا مال غلط طریقہ پر نہ ہڑپ کر لیا کرو، اور نہ ہی ایسا کرنے کے لیے جھوٹے مقدمے لے کر حکام تک پہنچا کرو تاکہ جانتے بوجھتے لوگوں کا مال ظلماً حاصل کر سکو۔"

یہاں راعی اور رعایا دونوں سے ہمہ دم "اللہ" کو حاضر و ناظر جان کر اس کا پاس و لحاظ رکھنے کا مطالبہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عدل کے قیام کی آخری ضمانت صرف اللہ کی خشیت ہے۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ اسلام انسانی ضمیر کی تطہیر و تزکیہ کے بعد تعزیرات اور مالیات سے متعلق بڑے بڑے امور کی کل ذمہ داریاں اس کے سپرد کر دیتا ہے۔ اب اگر خود اس ضمیر میں ہی خوفِ خدا موجود نہ ہو تو پھر (عدل اجتماعی کی) ضمانت دینے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ قانون کی زد سے بچنے اور عوام، حکام اور ججوں کو دھوکہ دینے کی گنجائش نکل ہی آیا کرتی ہے۔

اوپر کی گفتگو سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اسلام کا اجتماعی نظام صرف اس ضمیر کے سہارے قائم ہوتا ہے، بلکہ اس سے جو نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ اسلام میں صرف قانون سازی پر بھروسہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے علاوہ ایک ضمانت اور مہیا کی گئی ہے۔ یہ بات اپنے نظام کو عملاً قائم کر دکھانے کے سلسلہ میں اسلام کو ان دوسرے نظاموں پر فوقیت عطا کرتی ہے جن کا واحد سہارا قانون سازی ہے۔ جو ضمیر کی ملامت اور شعور کی بیداری سے تہی دامن ہیں۔

آئندہ صفحات میں ہم یہ دیکھیں گے کہ اسی ضمیر نے جس کی تربیت و تطہیر کا اہتمام اسلام نے کیا ہے، بڑے شاندار کارنامے انجام دئے ہیں۔ اور ایسے ایسے کام کئے جو اب اتنا زمانہ گذر جانے پر مسلمانوں کی زندگی میں معجزہ اور خرقِ عادت معلوم ہوتے ہیں۔

باب ششم

اسلام کی اقتصادی پالیسی

اسلام کی اقتصادی پالیسی

آج کل اجتماعی عدل پر اظہارِ خیال کرتے وقت سب سے زیادہ اہمیت اقتصادی پالیسی کو دی جاتی ہے اور اسی وجہ سے غالباً اکثر پڑھنے والوں نے ایسا محسوس کیا ہوگا کہ کتاب میں اس موضوع کو بہت مؤخر کر دیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے کیونکہ اسلام میں جس چیز کو ہم اجتماعی عدل کہتے ہیں وہ اقتصادی پالیسی سے کہیں زیادہ وسیع اور بلندتر چیز ہے۔ جیسا کہ ہم گذشتہ ابواب میں واضح بھی کر چکے ہیں۔ اسی لیے ہم نے ضروری سمجھا کہ مخصوص طور پر اسلام کی اقتصادی پالیسی کے بیان سے پہلے اس بنیادی اہمیت کے حامل مکمل فکر کو سامنے لائیں جو اس نظامِ عدل کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ پھر ہم نے اس کے مزاج اس کے ارکان اور اُن طریقوں کی تشریح کی جو اجتماعی عدل کے وسیع باب میں اسلام نے اختیار کر رکھے ہیں۔ اقتصاد کو مقدم رکھنا مادی نظاموں کا خاصہ ہے جو معاشی قدروں کے ماسوئی زندگی کی دوسری قدروں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔

اسلام اقتصاد کے باب میں جو پالیسی اختیار کرتا ہے وہ اس کے جامع فکر اور بنیادی نظریہ کے عین مطابق ہے۔ اسلام اقتصادی پالیسی کے ضمن میں بھی پہلے اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ اللہِ واحد کی بندگی کا اصول قائم ہو۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ دولت کا استعمال اللہ کے قانون کے تابع ہو جائے یہ قانون فرد اور جماعت دونوں کے مصالح کی پوری رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے اس سلسلہ میں موزوں مناسب درمیانی راہ اختیار کرتا ہے جس میں نہ تو فرد کی کوئی حق تلفی ہوتی ہے نہ جماعت کے مفاد کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ وہ نہ تو فطرت کی راہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے نہ زندگی کے حقیقی اصول وضوابط یا

اس کے اعلیٰ مقاصد کی راہ میں روڑے اٹکاتا ہے۔

اس پالیسی کو کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچانے کے لیے اسلام اپنے وہی دو بنیادی طریقے اختیار کرتا ہے۔ یعنی قانونی ضابطہ بندی اور ہدایت و تلقین۔ قانون کے ذریعہ وہ ایسے عملی مقاصد حاصل کرتا ہے جو اپنی جگہ ایک صالح، ترقی پذیر سماج کی تعمیر کے لیے کافی ہیں، اور ہدایات و تلقین کے ذریعہ وہ حاجات کی غلامی سے بلند ہونے، زندگی کے بلند تر تصور کی طرف متوجہ ہونے اور بحیثیت مجموعی زندگی کو "آئیڈیل" کی حد تک بلند کر دینے جیسے اعلیٰ مقاصد کی طرف اقدام کرتا ہے۔ یہ مقاصد کچھ ایسے واقع ہوئے ہیں کہ تمام لوگوں کا ہر طرح کے حالات میں ان تک پہنچ سکنا ممکن نہیں۔ البتہ وہ ترقی اور کمال کی راہیں ہمیشہ کھلی رکھتا ہے۔

مالی پالیسی پر تفصیل سے گفتگو کرنے سے قبل ہم ایک ایسی مثال سامنے لائیں گے جس سے خود مال کی اصل حقیقت واضح ہوتی ہے۔ اسلام نے زکوٰۃ کو مال میں سے ایک واجب الوصول حق قرار دیا ہے جسے وہ لوگوں پر قانوناً لازمی قرار دیتا ہے۔ اس کی عدم ادائیگی کی شکل میں اس نے امام کو حدود قائم کرنے اور اُن لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے جو اس سے انکار کریں۔ مزید برآں اُس نے امام کو یہ حق بھی دیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ اس قدر ٹیکس وصول کرے جس سے ہر طرح کے ضرر کا ازالہ ہو سکے، تنگی دور کی جا سکے اور بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے مفادات و مصالح محفوظ کیے جا سکیں۔ یہ بھی ضرورت پڑنے پر زکوٰۃ ہی کی طرح ایک حق ہو جاتا ہے، جس کی بابت فیصلہ کا انحصار اسلامی نظام کے عام اصولوں امت کے مصالح اور امام کی انصاف پسندی اور دیانت داری پر ہے۔

معاملہ کا قانونی پہلو تو اسی حد تک تھا، لیکن ہدایت و تلقین کے ذریعہ لوگوں میں اسپرٹ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اپنے سارے ہی مال سے دست بردار ہو جائیں اور اسے کُل کا کُل اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوماً نحو اُحد وأنا معہٗ فقال: "یا اباذر!" فقلت لبیک یا رسول اللہ۔ فقال: الاکثرون هم الاقلون یوم القیامۃ الا من قال کذا وکذا۔ عن یمینہ و

شماکلہ وقد امہ وخلفہ ۔ وقیل ماھم ۔ ثم قال: "یا اباذر!"
فقلت : نعم یارسول اللہ! بابی انت وامی ۔ قال: مایسرنی
ان لی مثل احد، انفقہ فی سبیل اللہ امرت واترک منہ قراطین
قلت : اوقنطارین یارسول اللہ؟ قال: "بل قیراطین" ثم قال:
"یا اباذر! انت ترید الاکثر وانا ارید الاقل"

(بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)

"ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُحد کی طرف تشریف لے چلے۔ میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ آپؐ نے فرمایا: "ابوذرؓ!" میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ لبیک"۔ آپؐ نے فرمایا: "آج جو لوگ زیادہ رکھتے ہیں کل قیامت کے دن وہی مفلس ہوں گے۔ بجز ان کے جو ایسا کریں۔ آپؐ نے اپنے ہاتھ دائیں بائیں اور سامنے پیچھے چلاتے ہوئے کہا اور ایسے لوگ کم ہی ہوں گے۔" پھر آپؐ نے فرمایا "ابوذرؓ!" میں نے عرض کیا "ہاں اللہ کے رسولؐ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان (ارشاد ہو)۔ آپؐ نے فرمایا "مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ میرے پاس اُحد جتنی دولت ہو اور میں اُسے راہِ خدا میں خرچ بھی کرتا رہوں لیکن مروں تو اُس میں دو قیراط (بلا خرچ کیے ہی) چھوڑ جاؤں۔" میں نے عرض کیا" رسولِ خدا آپؐ کی مراد کیا دو قنطار سے ہے؟" آپؐ نے فرمایا "نہیں نہیں دو قیراط" پھر آپ بولے: "ابوذرؓ! تم زیادہ کی طرف جاتے ہو اور میں کم کی طرف۔"

وہ تھی قانون سازی اور یہ ہے ہدایت و تلقین! اور یہ دونوں مل کر ہی انتصادی پالیسی کی تشکیل کرتی ہیں۔ اسلام کی تمام پالیسیوں کا یہی حال ہے۔

آئیے اب ہم تفصیلات میں داخل ہوں۔

انفرادی مِلکیّت

انفرادی ملکیت کا حق

اسلام دولت کی انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے ـــــ حصولِ مِلکیّت کی

اُن مخصوص شکلوں کے ساتھ جن کو قانون جائز قرار دیتا ہو۔ اِن شکلوں کا بیان آگے آتا ہے اور ایسی انفرادی ملکیت کو اس نے اپنے نظام کی بنیاد قرار دیا ہے۔ پھر وہ اس حق کو تسلیم کرنے پر مترتب ہونے والے لازمی نتائج کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ مثلاً حق دار کے حق کی حفاظت اور اسے چوری ڈاکہ، لوٹ مار اور اُچکے پن وغیرہ کی تمام شکلوں سے محفوظ رکھنا۔ ساتھ ہی وہ اس بات کو بھی غلط قرار دیتا ہے کہ بغیر کسی اجتماعی ضرورت کے اور بغیر پورا معاوضہ دیے ہوئے کسی کی ملکیت چھین لی جائے۔ اس تحفظ کی عملی طور پر ضمانت "وہ دست اندازی کی ان تمام شکلوں پر سخت سزائیں مقرر کر کے" دیتا ہے۔ ساتھ ہی وہ اصلاحی ہدایات و تلقینات اپنی جگہ پر ہیں جن کے ذریعہ وہ نفس کو ان چیزوں کی طرف لپکنے سے روکتا ہے جو اس کے اپنے پاس نہیں بلکہ دوسروں کی ملک ہیں۔ اسلام نے اپنے ذاتی ملکیت کے دوسرے لوازم بھی تسلیم کیے ہیں۔ یعنی اپنے مال میں تجارت، اجارہ، رہن، ہبہ اور وصیت کے ذریعہ تصرف کی ان تمام شکلوں کا پورا پورا حق جو حلال ہوں اور ایسے تصرفات کے لیے اسلام نے جو حدود مقرر کی ہیں اُن کے اندر ہوں۔

اسلام میں اس صریح اور واضح حق کے تسلیم کیے جانے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ بات بھی شبہ سے بالا ہے کہ یہ حق اسلامی طرز زندگی کا ایک بنیادی اصول اور اسلام کے اقتصادی نظام کی اساس ہے یہ ایسا بنیادی اصول ہے جس کی خلاف ورزی صرف ضرورت کی صورت میں ضرورت کی حد تک ہی کی جا سکتی ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ

(النساء ۴ : ۳۲)

"مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ خود کمائیں"

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ۖ

(النساء ۴ : ۲)

"یتیموں کا مال اُن کے حوالہ کر دو اور بُری چیز کو اچھی چیز سے بدل نہ لو"

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ

كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ج فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا

وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ج (الکہف: ۸۲)

"رہی دیوار تو وہ اسی شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا۔ ان کا باپ ایک صالح آدمی تھا۔ پس تیرے رب کی یہ مشیت ہوئی کہ وہ دونوں لڑکے پختہ عمر کو پہنچیں اور اپنا خزانہ برآمد کر لیں۔ یہ تیرے رب کی طرف سے کرم فرمائی تھی۔"

حدیث میں آیا ہے کہ:

مَن قُتِلَ دون ماله فهو شهيد (بخاری و مسلم)

"جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔"

چوری کی سخت سزا، اس حق کے احترام اور اس پر دست درازی کی ممانعت کی کھلی دلیل ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا

نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ط (المائدہ: ۳۸)

"چوری کرنے والے مرد یا عورت کا حکم یہ ہے کہ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں اس جرم کے بدلے جس کے وہ مرتکب ہوئے، اللہ کی طرف سے سزا کے طور پر۔"

غصب کرنا حرام اور اس جرم کا مرتکب ملعون ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

من ظلم من الارض شيئا طوقه من سبع ارضين۔ (بخاری و مسلم یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

"جو کسی دوسرے کی زمین کا تھوڑا سا حصہ بھی غصب کرے گا سات زمینوں کا طوق اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔"

من اقتطع مال امرئ مسلم بغير حق لقى الله عز وجل وهو عليه غضبان۔ (استاذ احمد محمد شاکر کی مرتب کردہ مسند امام احمدؒ، حدیث نمبر ۳۹۴۶)

"جو شخص کسی مسلمان کا مال بلا استحقاق دبا بیٹھے وہ اللہ کے حضور اس حال میں جائے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر بہت غضبناک ہوں گے۔"

فرد کو جس طرح ملکیت رکھنے کا حق حاصل ہے اُسی طرح ورثہ پانے اور وارث بنانے کا حق بھی حاصل ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ۔ (النساء: ۷)

"مردوں کا حصہ ہے اس ترکہ میں سے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں اور اسی طرح عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے اس ترکہ میں سے جو ماں باپ یا قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں۔"

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ج (النساء: ۱۱)

"اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے، اولاد نرینہ کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہوگا۔"

يَسْتَفْتُونَكَ ط قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ط إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ج (النساء: ۱۷۶)

"لوگ آپ سے فتویٰ پوچھتے، کہہ دیجیے کہ اللہ تم کو کلالہ کا حکم بتاتا ہے، اگر کوئی آدمی اس حال میں مرے کہ اس کے لڑکا نہ ہو اور اس کی بہن زندہ ہو تو اس کو اس کے ترکہ کا نصف مل جائے گا۔"

انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کرنا اور اس کا تحفظ محنت اور بدلہ کے درمیان عدل قائم کرنے کا کام کرتا ہے۔ اس طور پر فطرت سے ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور نفسِ انسانی میں راسخ میلانات کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں — وہ میلانات جن کی اسلام نظامِ اجتماعی کی تشکیل میں پوری پوری رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ایسا کرنا جماعتی مصالح سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے کیونکہ یہ فرد کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ زندگی کی ترویج و ترقی کے لیے جو کچھ بھی اس کے بس میں ہو کر گزرے۔

مزید برآں یہ افراد میں وہ آزادی اور عزتِ نفس پیدا کرتا ہے اور اُن کی شخصیت کو اس انداز پر نشوونما دیتا ہے کہ وہ اس دین کے علم بردار بن کر رہنے، منکر کی روک تھام کرنے اور حکمران کا احتساب کرتے ہوئے اس کو نصیحت کرنے کے قابل ہو سکیں — بغیر اس کے کہ انھیں اس بات کا اندیشہ لاحق

رہے کہ ان کی روزی نہ چھن جائے، جیساکہ روزی کے حاکم کے ہاتھوں میں رہنے سے لازم آتا ہے۔

چنانچہ فرد کی فطرت میں "خیر" کی طلب ودیعت کی گئی ہے۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝ (العادیات: ۸)

"وہ خیر کی طلب میں بہت حریص واقع ہوا ہے۔"

اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ جو کچھ اس کی مِلک ہو اس پر قبضہ کرنے اور انھیں اپنی ملک میں باقی رکھنے پر حریص ہو۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ (بنی اسرائیل: ۱۰۰)

"کہہ دیجئے کہ تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو بھی ختم ہوجانے کے ڈر سے ہاتھ روک لیتے۔"

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ (النساء: ۱۲۸)

"دل تنگی کی طرف مائل ہوجایا کرتے ہیں۔"

اپنی اولاد سے محبت اور اپنی محنت کے ثمرات ان کو ورثہ میں منتقل کرجانے کی خواہش بھی بالکل فطری ہے۔ آدمی جو مال اُن کے لیے بچا رکھتا ہے وہ محنت ہی ہے جسے مال کی صورت میں جمع کرکے رکھا گیا ہے اور اپنی زندگی میں اپنے آرام وآسائش کا ذریعہ بنانے کے بجائے اپنی اولاد کو ترجیح دیتے ہوئے ان کے لیے رکھ چھوڑا گیا ہے۔

ان فطری میلانات کا ساتھ دینے اور اُن کے تقاضے پورے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ تاکہ انسان محنت اور پیدائشِ دولت کی مہم میں اپنی ہی ضروریات کی خاطر اور اپنے ہی ذوق وشوق کے تحت پورے جوش وخروش کے ساتھ آگے بڑھے اور اس میں اپنی پوری طاقت صرف کردے، حالانکہ وہ کسی طرح بھی خود کو محنت کرنے پر مجبور نہ پاتا ہو، نہ بے دلی، ناپسندیدگی اور مایوسی کے جذبات اُس کے پاس پھٹکیں۔ اس کی اس کدوکاوش کا حاصل بالآخر جماعت کے حصہ میں آئے گا۔ مزید برآں اسلام ایسے قواعد وضوابط بھی ترتیب دیتا ہے جو اس کا فائدہ جماعت کو بہم پہنچانے کے علاوہ ان متوقع نقصانات کا بھی سدِباب کرتے ہیں جو فرد کی آزادیٔ ضمیر اور اس کو عطا کردہ حق

ملکیت کے نتیجہ میں سامنے آسکتے ہیں۔

یہ بات عدل کے اولین تقاضوں میں سے ہے کہ جہاں تک مفادِ جماعت کے لیے مفید ہو اجتماعی نظام کو فرد کے میلانات و رجحانات سے ہم آہنگ اور اس کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیے۔ فرد جماعت کی راہ میں جو قوتیں صرف کرتا ہے، جس طرح اپنا پسینہ بہاتا ہے اور اس کے لیے جو جسمانی اور ذہنی کدوکاوش کرتا رہتا ہے اس کے پیش نظر ایسا کرنا بالکل ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عدل ہی اسلام کا اصل الاصول ہے۔ عدل اجتماعی کا قیام و بقا اس طور پر ممکن نہیں کہ اس سلسلے کی قربانیوں کا سارا بار فرد ہی پر آن پڑے۔ اگر ہم درمیانی راہ چل کر اجتماعی عدل کو اس کی تمام صورتوں میں قائم کرنا چاہتے ہیں تو لازماً ایسا ہونا چاہیئے کہ اس کا بار فرد اور جماعت دونوں پر یکساں طور پر پڑے۔

کوئی بھی قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ معقول طبیعی محرکات و عوامل کو کچلنا فرد یا جماعت کے حق میں کچھ اچھا ثابت ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ فطرتِ انسانی سے ایک بلا وجہ کی بدگمانی ہے جو قیامِ عدل کی واحد ممکن شکل بس اسی کو قرار دیتی ہے کہ ان فطری میلانات کو دبا دیا جائے اور ان کی راہ روک کر کھڑے ہو جایا جائے۔ وہ خیالی نظریات جو حقیقتِ واقعہ سے کوئی بحث نہیں کرتے صرف وہی یہ فرض کر سکتے ہیں کہ خارج، قانون اور سماجی نظم کا دباؤ ڈال کر ایک آدھ پشت یا چند پشتوں میں ان محرکات کو یکسر ختم کیا جا سکتا ہے۔ اسلام فطرت سے اس درجہ بدگمانی نہیں کرتا اور نہ ہی وہ حقائق سے آنکھیں بند کر کے خیالی بنیادوں پر اپنی عمارت اٹھانے کا خیال ذہن میں لاتا ہے۔

اب ہم یہ آواز بلند کر سکتے ہیں کہ خود انسانیت کے احترام کا تقاضا ہے کہ ہم اسے ذرا اور گہری نظر سے دیکھیں جو اس کے مزاج کی گہرائیوں کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکے، اس کی فطرت کی اصل کو پا سکے اور یہ معلوم کر سکے کہ اس کی جڑیں کتنی گہری جا چکی ہیں۔ اسی طرح یہ ممکن ہے کہ ہم انسانیت کی رہنمائی اور اس کی تعمیرِ نو کے اہم کام میں زیادہ دانشمندی، سوجھ بوجھ اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانے کا مظاہرہ کر سکیں۔ لکھوکھا برس پر پھیلی ہوئی انسانی زندگی جو دلائل پیش کرتی ہے وہ اتنے ہلکے اور بے وزن تو قرار نہیں دیے جا سکتے کہ ہم حیات انسانی کی فطرت، اس کی اصل روش اور اُس کے

میلانات درجانات کی بابت خود سے کچھ نظریات گھڑ لیں اور پھر زبردستی انھیں کو مسلط بھی کر دیا۔

حقِ وراثت و توریث کی بابت ہم تفصیلی گفتگو اجتماعی تکافل کے باب میں کر چکے ہیں۔ اب یہاں ہم نے جس اسپرٹ پر روشنی ڈالی ہے یہ حق اس کے عین مطابق اور ساتھ ہی عدلِ اجتماعی سے اسکی بلند ترین سطح پر، اور مفادِ جماعت سے اس کے وسیع ترین معنی میں ہم آہنگ ہے۔ یہ تصورِ نوعِ انسانی کی ایک پشت اور دوسری پشتوں کے درمیان کوئی مصنوعی دیوار نہیں کھڑی کرتا اور پھر جیسا کہ آگے آتا ہے یہی حق تقسیمِ دولت کے وسائل میں سے بھی ایک اہم وسیلہ ہے۔

انفرادی ملکیت کا مزاج

لیکن ایسا نہیں کہ اسلام نے سرمایہ دارانہ نظام کی طرح ذاتی ملکیت کے حق کو حدود و قیود عاید کیے بغیر یونہی چھوڑ دیا ہو۔ وہ اس حق کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو کچھ دوسرے اصول و ضوابط بھی دیتا ہے جو اس حق کو اسی درجہ میں جماعت کے مصالح حاصل کرنے کا ذریعہ بنا دیتے ہیں جس درجہ میں کہ اس سے مالک فرد کے مصالح پورے ہوتے ہیں۔ وہ اس حق کو قانوناً تسلیم کرنے کے ساتھ ہی مال کی افزائش، خرچ اور لین دین سے متعلق تصرفات کے لیے متعین ضابطے بھی عطا کرتا ہے۔ ان تمام باتوں کے پیچھے جو چیز کام کر رہی ہے وہ اجتماعی مصالح کا لحاظ اور خود فرد کی مفاد کی رعایت ہے۔ ان فطری اغراض و مقاصد کی حدود میں رہتے ہوئے جن پر اسلام زندگی کی عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

حقِ ملکیت کے سلسلہ میں اسلام کا پہلا اصول یہ ہے کہ اپنے مال و املاک کے سلسلہ میں فرد کی حیثیت جماعت کے نمائندہ اور نائب کی سی ہے، اس پر اس کا قبضہ ملکیت سے کہیں زیادہ ایک ذمہ داری ہے۔ اپنی عمومی حیثیت میں مال و دولت جماعت کا حق ہے جب کہ خود جماعت بھی اس معاملہ میں اُس خدا کی نیابت پر مامور ہے جس کے سوا کوئی ذات کسی چیز کی حقیقی مالک نہیں۔ انفرادی ملکیت اس وقت وجود میں آتی ہے جب ایک فرد اپنی ذاتی محنت سے ان اشیاء میں سے کسی چیز کو اپنے قبضہ میں لے آتا ہے جس پر اللہ نے بنی نوع انسان کو اپنا نائب بناتے ہوئے ایک عام حقِ ملکیت عطا فرمایا ہے۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے:

اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ۔ (الحدید: ۷)

"اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس (مال) میں تم کو نائب مقرر کیا گیا ہے اُس میں سے خرچ کرو۔"

آیت کسی تاویل کی محتاج نہیں اور واضح طور پر ہمارے بیان کی تائید کر رہی ہے۔ یعنی انسان کے ہاتھ میں جو مال ہے وہ اصلاً اللہ کا ہے اور انسان کی حیثیت نائب کی ہے نہ کہ اصل مالک کی۔ ایک دوسری آیت میں جو مکاتب غلاموں کی بابت ہے حکم دیا گیا ہے کہ:

وَاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ ط (النور: ۳۳)

"اللہ نے جو مال تم کو دیا ہے اُس میں سے اُن کو دو۔"

گویا یہ مال جو انھیں دیتے ہیں وہ اپنی ملک سے نہیں بلکہ اللہ کے مال میں سے دیتے ہیں اور ان کی حیثیت صرف ایک درمیانی واسطہ کی ہے۔

دولت کی ذاتی ملکیت کی حقیقت کے بیان میں اس سے زیادہ واضح اور صریح چیز یں بھی ہیں جو بتاتی ہیں کہ اس کا مطلب تصرّف و انتفاع کے حق سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ واقعی صورتحال بھی یہی ہے، کیونکہ بلا تصرّف اور انتفاع کے حق کے تو ملکیتِ ذاتی متحقق ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ اس حق کے بقا کی شرط تصرّف کی صلاحیت کو قرار دیا گیا ہے۔ اور جب کوئی تصرف میں نادانی اور نالائقی کا مظاہرہ کرے تو سرپرست یا سماج کو حقِ تصرّف واپس چھین لینے کا حق ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَھَآءَ اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْھُمْ فِیْھَا وَاکْسُوْھُمْ (النساء: ۵)

"اپنے وہ اموال جن کو اللہ نے تمہارے گذارے کا ذریعہ بنایا ہے کم عقلوں کے حوالے نہ کردو۔ (البتہ) اس میں سے اُن کو کھلاؤ اور پہناؤ۔"

تصرف کا حق رُشد اور اس ذمہ داری کی بحسن و خوبی انجام دہی پر منحصر قرار دیا گیا ہے۔ جب مالک اس ذمہ داری کو پورا کر کے نہ دے تو ملکیت کے طبعی نتائج یعنی تصرّف کے جملہ حقوق بھی موقوف ہو جاتے ہیں۔ اس اصول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جس کا کوئی وارث نہ ہو

اس کا وارث امام ہوتا ہے۔ کیونکہ مال دراصل جماعت کا تھا جسے ایک فرد کی نگرانی میں دیا گیا تھا۔ اب جب اس کے پیچھے اس کا کوئی نہ رہا تو مال جہاں کا تھا وہاں لوٹ آیا۔

اس اصل پر زور دینے سے ہماری مراد یہ نہیں کہ ہم دولت کی "اجتماعی ملکیت" کا اصول ثابت کریں۔ ذاتی ملکیت کا حق اسلامی نظام میں ایک بنیادی حق ہے جسے واضح طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ بلکہ اس پر زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی ملکیت کے بارے میں صحیح تصور قائم کرنے میں اصل سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس سے مال و دولت کے بارے میں اسلام کا وہ بنیادی فکر سامنے آتا ہے جس کا تابع ملکیت کا حق بھی ہے۔ اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ملکیت کا اسلامی نظریہ انفرادی ملکیت کے سرمایہ دارانہ نظریہ سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے۔ بالفاظِ دیگر فرد کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ اس مال میں جو دراصل جماعت کا ہے صرف ایک ذمہ دار کارپرداز کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاکہ یہ احساس اسے اپنے تصرفات پر جماعت کی عاید کردہ پابندیوں کو بخوشی تسلیم کر لینے اور اس کی سونپی ہوئی ذمہ داریوں کو جی سے قبول کر کے آگے بڑھنے پر آمادہ کرے۔ اسی طرح جماعت کو اس بات کا شعور ہونا چاہیے کہ وہی اس مال کی حقیقی مالک ہے۔ تاکہ وہ فرد پر ذمہ داریاں ڈالنے یا حد بندیاں عاید کرنے میں زیادہ جری اور بے باک ہو جائے۔ البتہ ایسا کرنے میں جماعت اسلامی نظام کے ان بنیادی اُصولوں کو مجروح نہ ہونے دے گی۔ جن کی طرف ہم اُوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ بالآخر ایسے ضابطے وضع کیے جا سکیں گے جن کے تحت اس مال و دولت سے اس طرح فائدہ اٹھایا جا سکے جس سے مکمل اجتماعی عدل قائم ہو۔

مال سے انتفاع کے سلسلہ میں اسلام کا دوسرا اُصول یہ ہے کہ مال کا لوگوں کے ایک خاص گروہ میں محدود ہو کر رہ جانا اور انہی کے درمیان اس طرح گردش کرتے رہنا کہ دوسرے لوگ اسے نہ پا سکیں سخت ناپسندیدہ اور سراسر نامطلوب ہے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ ط (الحشر: ۷)

"تاکہ مال تمہارے مالدار لوگوں ہی کے درمیان چکر لگاتا نہ رہ جائے"

مطلب یہ ہے کہ مال دار لوگوں سے ان کے مال کا ایک حصہ لے کر اسے غریبوں کی ملکیت میں دے دیا جائے۔ اس نص سے جو تاریخ وابستہ ہے اس کا جاننا اسلام کے اس بنیادی اصول کو صحیح طور پر سمجھنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ مہاجرین مکّہ سے ہجرت کرکے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ چلے آئے تھے۔ غریب مہاجرین کے پاس تو مال تھا ہی نہیں کہ اُسے ساتھ لانے کا سوال پیدا ہوتا۔ خود اغنیاء بھی اپنا مال پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اب بالکل محتاج ہوکر رہ گئے تھے۔ اس موقع پر انصار نے بڑی سخاوت کا مظاہرہ کیا اور ثابت کر دیا کہ نفس میں جو فطری بخل پوشیدہ ہے وہ اس سے بلند ہو چکے ہیں۔ ان کے پاس جو کچھ بھی تھا اس میں انھوں نے ان کو بھائی کی طرح شریک کر لیا، یہاں تک کہ اپنی خاص الخاص چیزوں کو بھی مستثنیٰ نہ رکھا۔ اور یہ سب کچھ بالکل خوشی خوشی اور پوری آمادگی کے ساتھ کیا:

يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ

(الحشر: ۹)

جو لوگ ان کی طرف ہجرت کرکے آتے ہیں ان کو یہ عزیز رکھتے ہیں، ان کو جو کچھ دیا جائے اس کی یہ خود اپنے لیے خواہش نہیں کرتے، یہ اپنے اوپر انھیں ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ خود تنگ دستی کے شکار ہوں۔"

تقیدہ نفس کو کس طرح سنوارتا ہے، اس کے وہ جیتے جاگتے نمونے بن گئے تھے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ضروریات کے دباؤ سے بے نیازی اور اعلیٰ جذبات اور بلند تصورات کی طرف میلان کی ایک مثال بن کر سامنے آئے تھے۔

لیکن اس کے باوجود بھی مدینہ کے امراء اور غریب مہاجرین کے درمیان کا خلا کافی وسیع رہا۔ انصار کی فراخ دلی اور سخاوت کا حال پوری طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھا، اس لیے آپ نے اُن سے مزید مطالبہ کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی اور نہ انھیں یہ حکم دیا کہ اپنے مال کا کچھ حصہ مہاجرین کے حوالہ کر دیں کیونکہ وہ خود ہی اپنی ساری املاک میں ان کو بالکل بھائی بنا کر شریک کر رہے تھے۔ یہی حالات تھے کہ بنی نضیر کا واقعہ پیش آیا۔ جنگ نہیں ہوئی بلکہ ایک صلح کے ذریعہ آپ کا قبضہ مان لیا گیا۔ برخلاف عام جنگوں کے ان میں ۴/۵ لڑنے والوں کا حصّہ قرار پاتا اور صرف ۱/۵ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف منتقل کیا جاتا۔ اس بار ساری غنیمت اللہ اور اس کے رسولؐ کی قرار پائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے مسلمانوں کے درمیان تقسیم دولت کے باب میں یک گونہ توازن پیدا کرنے کا ایک مناسب موقع جانا

چنانچہ آپؐ نے بنی نضیر کی فَےْ کو مہاجرین کے لیے خاص کر دیا۔ بجز دو غریب انصاریوں کے جن کو حصہ دینے کے لیے بعینہٖ وہی وجوہ موجود تھے جو اس فَےْ کو مہاجرین کے لیے خاص کرنے کے باعث بنے تھے۔ اسی واقعہ کے سلسلہ میں قرآن کریم فرماتا ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ ط وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَ مَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ج وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ہ لِلْفُقَرَآءِ الْمُھٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَ اَمْوَالِھِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا وَّیَنْصُرُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ط اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ہ (الحشر: ۷-۸)

"ان آبادیوں کے جن اموال کو اللہ نے اپنے رسول کو (بغیر جنگ) عطا کیا ہے وہ اللہ، اس کے رسولؐ اور رسولؐ کے قرابت داروں نیز یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لیے مخصوص ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت تمہارے صاحب ثروت لوگوں ہی کے درمیان چکر کھاتی رہ جائے جو (حکم یا حق) تمہیں رسول دے اسے تسلیم کر لو اور جن باتوں سے بھی روکے ان سے باز آجاؤ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔ (اور مذکورہ بالا اموال و املاک) ان مہاجرین کے لیے (وقف) ہیں جو اپنے گھر بار اور مال و املاک سے (بے دخل کر کے) نکال دیے گئے ہیں، جو اللہ کے فضل اور اس کی رضا مندی کے طالب ہیں (اور اسی کی خاطر انہیں ان حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے) جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے (دشمن میں اس کے) مددگار ہیں، در حقیقت یہی لوگ سچے اور راست باز ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تصرف اور اس کی اس توجیہہ سے جو قرآن نے بیان کی ہے، جو اُصول سامنے آتا ہے وہ بالکل واضح ہے اور کسی مزید توضیح کا محتاج نہیں۔ یہ بات واضح طور پر اسلام کا ایک بنیادی اصول متعین کرتی ہے اور وہ ہے اس بات کا ناپسندیدہ ہونا کہ دولت جماعت کے چند ہاتھوں میں گھر کر رہ جائے، اور اس بات کا ضروری ہونا کہ جہاں ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے وہاں

حالات کی اصلاح کی جائے تاکہ ایک گونہ توازن پیدا ہو سکے۔

اصل بات یہ ہے کہ ایک طرف دولت کی افراط اور دوسری طرف اس کا فقدان، یہ کیفیت کچھ دلوں میں حسد و کینہ کے جذبات پیدا کرنے کے علاوہ دوسرے گوناگوں مفسدات کو بھی جنم دیتی ہے۔ جہاں بھی زائد از ضرورت دولت پائی جائے اس کی حیثیت وہی ہے جو بدن میں فالتو قوتِ حیات کی ہے کہ اُسے کسی نہ کسی سمت میں لگانا ضروری ہے۔ اب یہ کوئی ضروری نہیں کہ لوگ ہمیشہ اُسے محفوظ سمت میں اور سُتھرائی کے ساتھ ہی لگائیں۔ یہ بات توقع کے عین مطابق بلکہ لابدی ہے کہ وہ نفس کو بگاڑ دینے والی اور مہلک عیش کوشی یا اتباعِ شہوات کی شکل اختیار کرلے جسے جماعت کے محتاج طبقوں میں خوب کھل کھیلنے کے لیے ایک وسیع میدان مل جائے۔ یہ طبقہ اصحابِ دولت کی خواہشات کی تسکین اور اُن کے کبر و غرور کی پیاس بجھانے کی خاطر آبرو فروشی، عصمت و عفت کی تجارت، خوشامد اور جھوٹ کے ذریعہ اپنی شخصیت اور خودی کو فنا کرکے اس طبقہ سے تعلق جوڑتا ہے کہ مجبوری میں کوئی کیا کچھ نہیں کرتا۔ دولت کی بہتات رکھنے والے کو اس بات کے سوا اور کسی چیز کی پروا نہیں ہوتی کہ وہ اپنی فالتو دولت اور فالتو قوتِ حیات کے لیے کوئی مصرف نکالے۔ بدکاری یا اس قبیل کی ساری چیزیں مثلاً جوا، شراب، بردہ فروشی اور غلاموں کی تجارت اور شرف عزت اور مردانگی کا کھو بیٹھنا یہ سب نتیجہ ہے محض ایک طرف دولت کی بہتات اور دوسری طرف اس کے کال کا۔ سماج میں ہر طرح کا عدمِ توازن بس صرف اسی تفاوت کا نتیجہ ہے۔

دلوں میں جو کینہ پیدا ہوتا ہے اور ان مفلسوں کے دل جنھیں خرچ کرنے کے لیے چند پیسے بھی میسّر نہیں ہوتے، بے انتہا دولت رکھنے والے سے جس طرح بھر جاتے ہیں وہ اِن چیزوں کے علاوہ ہے۔ یہ لوگ اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں کہ یا تو حسد میں جلتے رہیں، یا اُن کی طبیعتیں اِدھر اُدھر لپکیں اور اس طرح ذلیل و خوار ہوں۔ ان کی قیمت خود ان ہی کی نظر میں گھٹ جاتی ہے اور طاقت و ثروت کے مظاہر کے سامنے وہ اپنی واقعی عزت کو بھی حقیر جاننے لگتے ہیں۔ غرض کہ وہ بالآخر انسان کے بجائے محض گوشت و پوست کے پُتلے رہ جاتے ہیں۔ جن کو صرف اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ مال و دولت اور جاہ و منزلت کے مالکوں کو خوش رکھیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں یہی کچھ ہوا!

اگرچہ اسلام نے معنوی اور تصوراتی اقدار پر زیادہ توجہ کی ہے لیکن وہ معاشی قدروں کے اثر کو نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ لوگوں کو ان کی ادنیٰ ضروریات سے جتنا بھی بلند دیکھنا ہو لیکن اُن پر

انسان کی قوت برداشت سے زیادہ بوجھ کبھی نہیں ڈالتا۔ اسی لیے اُسے یہ گوارا نہ ہوا کہ دولت صرف اغنیاء کے اندر چکّر کرتی رہے اور اس نے اپنی مالی پالیسی کے سلسلے میں اس کو ایک مستقل اصول کی حیثیت دے رکھی ہے۔ اس نے اس مال کے ایک حصّہ کو غریبوں کو دینا لازم قرار دیا تاکہ ان کو روزی کا ایک ایسا ذریعہ حاصل رہے جو اُن کے اپنے قبضہ میں ہو اور وہ عزتِ نفس کے ساتھ آزاد زندگی گزار سکیں تاکہ وہ بُرائیوں کو مٹانے کی وہ ذمہ داری ادا کرسکیں جو اس دین نے اُن پر عاید کی ہے، خواہ یہ بُرائیاں حکمرانوں میں پائی جاتی ہیں یا محکومین میں۔

بعض مشترک قسم کے مال ایسے ہوتے ہیں جن کا اپنے قبضہ میں لانا افراد کے لیے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے تین کا نام لیا ہے: پانی، گھاس اور آگ۔

الناس شرکاء فی ثلاث: فی الماء والکلاء والنار۔ (مصابیح السنۃ کے مصنف نے اس حدیث کو "حسن" قرار دیا ہے)۔

"تین چیزوں میں سب کے سب شریک ہیں: پانی، گھاس اور آگ۔"

ایسا ان چیزوں کی اس خصوصیت کی بناء پر ہے کہ اس وقت کے عرب میں یہ چیزیں جماعت کی زندگی کے لیے ضروریات میں شمار کی جاتی تھیں۔ اسی لیے اُن سے انتفاع کا حق پوری جماعت کو یکساں طور پر دیا گیا۔ جماعت کی زندگی کے لیے لازمی اشیاء میں ماحول اور زمانہ کے لحاظ سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور قیاس میں جو اسلامی اصولِ تشریع میں سے ایک اہم اصول ہے اتنی وسعت موجود ہے کہ ان دوسری چیزوں پر بھی اس کا انطباق کیا جا سکے جو اس حکم کے تحت داخل ہوں۔ شرط یہ ہے کہ اسلامی نظام کے بنیادی اصول مجروح نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تمام افراد کو ذاتی ملکیت سے محروم کرکے حکومت کا تنخواہ دار بنا دیا جائے، کیونکہ ایسی صورت میں حکومت ان کو غلام بنانے اور دبا کر رکھنے پر اس سے کہیں زیادہ قادر ہو جاتی ہے جتنی قدرت کہ سرمایہ دار افراد کو حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ حکومت کے ہاتھ میں اقتدار اور مال دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔

مال کا ایک حصّہ ایسا بھی ہے جو جماعت کے بعض ضرورت مندوں کا حق ہے۔ یہی وہ حصّہ ہے جو زکوٰۃ کی صورت میں قانوناً فرض ہے۔

فِیٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (معارج: ۲۴-۲۵)

"ان کے اموال میں محروم اور (احتیاج کی بنا پر) سوال کرنے والے کا بھی حق ہے۔"

مال، زکوٰۃ دینے والوں کی ملکیت سے نکل کر زکوٰۃ کے مستحق افراد کی ملکیت میں داخل ہو جاتا ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ .... الخ

یہ ایک قانونی حق ہے جسے جماعت وصول کرتی ہے اور ایک بار پھر اسے متعین افراد تک پہنچا دیتی ہے۔ گویا جماعت کا کام انفرادی ملکیت کو ایک طرف سے دوسری طرف اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر دینا ہے۔

پس اسلام میں انفرادی ملکیت کا مزاج مختصراً یہ ہے کہ:

- دولت کی اصل مالک جماعت ہے، اپنی عمومی حیثیت میں۔
- ذاتی ملکیت ایک مشروط اور پابند ذمہ داری ہے۔
- دولت کی بعض شکلیں عام اور مشترک ملکیت شمار ہوتی ہیں۔ کسی فردِ واحد کو ان پر قبضہ کا حق نہیں۔ ان سے سب لوگ شرکت کے اصول پر فائدہ اٹھائیں گے۔

دولت کا ایک حصہ جماعت کا حق ہے جو اس کی طرف لوٹ جائے گا تاکہ وہ اس کو متعین گروہوں تک پہنچا دے جو اس کے محتاج ہیں، تاکہ اس کا اور اس کے ساتھ ہی جماعت کا حال درست اور بہتر ہو سکے۔

ذاتی ملکیت کے ذرائع

قبضہ اور ملکیت کی حقیقت کے باب میں اس نظریہ پر اسلام اس کے منطقی نتائج بھی مرتب کرتا ہے، وہ قبضہ کے شرائط متعین کرتا ہے، تصرف پر پابندیاں عاید کرتا ہے اور انتفاع کے لیے حدیں مقرر کرتا ہے۔ اس طور پر ملکیت ہمیشہ اسی دائرہ میں رہتی ہے جو جماعتی مصلحت اور اس سے کبھی نہ الگ ہونے والی، اسی میں شامل، فرد کی مصلحت اس کے لیے متعین کرتی ہے۔

سب سے پہلے وہ بتاتا ہے کہ ملکیت یعنی شئے مملوک سے انتفاع کا حق، شارع کے اذن کے بغیر نہیں متحقق ہوتا، کیوں کہ شارع ہی جماعت کے جملہ معاملات کا نگران ہے یہ کیونکہ درحقیقت

یہ شارع ہی ہے جس نے اسے سبب شرعی پر منحصر قرار دے کر انسان کو ملکیت کا حق عطا کیا۔ چنانچہ ملکیت کی مختلف تعریفوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "ملکیت، کسی شئی کی ذات یا اس سے فائدہ سے متعلق ایک شرعی حکم ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ جس فرد کی طرف اس حکم کی اضافت کی جائے اُسے اُس شے سے انتفاع کا اور اُسے دے کر اُس کی قیمت وصول کرنے کا حق دار سمجھا جائے۔"

فقہائے اسلام کی متفقہ رائے ہے کہ ملکیت اُسی وقت متحقق ہوتی ہے جب خود شارع اُسے عطا کرے یا تسلیم کرے۔ اس لیے کہ سارے حقوق جن میں حقِ ملکیت شامل ہے بلا شارع کے عطا کیے یا اس کے اسباب کو تسلیم کیے نہیں ثابت ہوتے۔ یہ حق اشیاء کی طبیعت سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ شارع کے اذن سے اور اس بات سے وجود میں آتا ہے کہ اس نے شرعی طور پر سبب کو مسبّب کے وجود میں لانے کا ذریعہ تسلیم کیا ہے[له]۔"

حقِ ملکیت کے بارے اسلامی نظریہ کی وضاحت میں یہ بات کافی اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کی رُو سے ملکیت جماعت کے نائب کی حیثیت میں شارع کی طرف سے دیا ہوا کسی خاص چیز پر قبضہ کا وہ حق ہے جو وہ کسی فرد کو دیتا ہے، اگر یہ تملیک نہ ہوتی تو اس فرد کا قبضہ کبھی درست نہ ہوتا — کیونکہ اصل یہ ہے کہ مال اللہ کا ہے اور بنی نوع انسان اس میں خلیفہ کے طور پر متصرّف ہیں۔ شارع ہی اس کا مجاز ہے کہ کسی چیز کے اپنی ذات کے لیے مخصوص کرنے کی اجازت دے، خواہ یہ اجازت کسی اصولِ عام کے تحت ہو یا کسی خاص اجازت نامہ کے ذریعہ۔

اسلام میں ملکیت کا حق پانے کا واحد ذریعہ عمل ہے۔ "عمل" اپنی تمام قسموں اور تمام شکلوں میں اس طور پر محنت اور اُس کی جزا کے درمیان مساوات قائم رکھی گئی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دولت کے حاصل کرنے اور اس کا مالک قرار پانے کی جن شکلوں کو اسلام درست تسلیم کرتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ **شکار:**۔ یہ انسانی زندگی کا قدیم ترین ذریعہ معاش رہا ہے۔ اب بھی متمدن اور

له "الملکیۃ ونظریۃ العقد فی الشریعۃ الاسلامیۃ"، مصنفہ استاذ ابوزہرہ، پروفیسر اسلامی قانون، لاء کالج، قاہرہ یونیورسٹی۔

ترقی یافتہ ممالک میں یہ مختلف اقسام کے مال حاصل کرنے کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ مچھلی، موتی، مرجان، اسفنج اور اس قبیل کی دوسری چیزوں کا شکار آج بھی قوموں اور افراد کی آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ فراہم کرتا ہے۔ یہی حال تجارت کے لیے یا تفریحی طور پر چڑیوں اور جانوروں کے شکار کا بھی ہے۔

۲۔ جن افتادہ زمینوں کا کوئی مالک نہ ہو اُن کو کسی طریقہ سے کار آمد بنا لینا

اس سلسلہ میں یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ زمین پر قبضہ کرنے کے بعد تین سال کے اندر اندر وہ شخص اس کو کار آمد بنا لے ورنہ اس کا حقِ ملکیت زائل ہو جائے گا۔ کیونکہ اصل غرض یہ ہے کہ افتادہ زمینیں کار آمد بنائی جائیں تاکہ اس سے فائدہ اٹھانے سے جو مصالح وابستہ ہیں وہ متحقق ہو سکیں۔ تین سال کی مدت اس بات کو جانچنے کے لیے کافی ہے کہ قبضہ کرنے والا کار آمد بنانے پر قادر ہے یا نہیں۔ اتنے عرصہ میں اگر اس قدرت کا ثبوت دینے والے کوئی بھی مظاہر سامنے نہیں آئے تو افتادہ زمین دوبارہ جماعت کی طرف لوٹ آئیگی اور کوئی فرد اس کا مالک نہ سمجھا جائے گا۔

عادی الارض للہ ولرسولہ ثم لکم من بعد فمن احیا ارضا میتا فھی لہ ولیس لمحتجز حق بعد ثلاث سنین۔ (قاضی ابویوسف نے کتاب الخراج میں اس حدیث کو لیث عن طاؤس کے واسطہ سے روایت کیا ہے)

" افتادہ زمینیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی ملک ہیں۔ اس کے بعد وہ تمہاری ہیں۔ چنانچہ جو شخص بھی کسی افتادہ زمین کو کار آمد بنا لے وہ اس کی ہو جائے گی۔ البتہ کسی باڑھ ڈالنے والے کا تین سال بعد کوئی حق نہ تسلیم کیا جائے گا "

اس معاملہ میں اسلامی قانون آج کے اس خود ساختہ قانون سے بہتر ہے جو فرانسیسی قانون کو سامنے رکھ کر وضع کیا گیا ہے۔ اس قانون میں صرف پندرہ سال تک قبضہ کو اس بات کے لیے کافی تسلیم کیا گیا ہے کہ زمین قابض کی ملکیت قرار پا جائے خواہ وہ اُسے کار آمد بنائے یا اس عرصہ میں اور اس کے بعد بھی اُسے یونہی ناکارہ چھوڑے رہے۔ یہاں حقِ ملکیت دینے میں جو حکمت کام کر رہی ہے وہ محض ایک منفی حکمت ہے اور صرف " صورتِ واقعہ " کو قانوناً تسلیم کرنے کا نظریہ فیصلہ کُن بن رہا ہے۔ یہاں اسلامی نظریہ اور خود ساختہ قانون کے نظریہ کے مابین زمین آسمان کا فرق ہے۔

۳۔ زمین کے اندر جو کانیں (رکاز) ہیں اُن کو نکالنا

کان سے جو کچھ نکلتا ہے اس کا ۴/۵ حصہ نکالنے والے کی ملک قرار پاجاتا ہے اور ۱/۵ از کوٰۃ کیونکہ یہ دفینہ اصلاً مباح تھا جسے فرد محنت مشقت کرکے حاصل کرتا ہے۔

یہاں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے۔ درحقیقت جس وقت یہ حکم صادر کیا گیا تھا اس وقت تک 'رکاز' سے جو کچھ حاصل کیا جاتا تھا وہ صرف قلیل الاستعمال معدنیات تھے۔ مثلاً سونا اور چاندی۔ اور یہ چیزیں پٹرول اور کوئلہ کی طرح کی نہیں جن کی ضرورت مند ساری جماعت ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پٹرول، کوئلہ، لوہا اور اس قبیل کی دوسری چیزوں کو پانی، گھاس اور آگ جیسی مشترک قرار دی گئی ضروری چیزوں پر قیاس کیا جائے گا یا ان رکاز پر جو اسلام کے ابتدائی دور میں معروف تھے۔

اس مسئلہ میں ہم مالکیہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں جس کے مطابق یہ اقسامِ دولت ملکیّتِ عامہ قرار پاتی ہیں اور ان کی ملکیت اس زمین کے مالک کی طرف نہیں منتقل ہوتی جس سے کان برآمد ہو۔ کیونکہ زمین کا مالک ہونا اس کے اندر پائی جانے والی چیزوں کی ملکیت کو مستلزم نہیں جب کہ زمین کی ملکیت یا اُس کی طلب عام طور پر ان کانوں کے لیے نہیں ہوتی۔

۴۔ خام مواد سے مصنوعات کی تیاری

تاکہ اس سے زندگی کی کوئی ضرورت پوری ہو اور ایسا فائدہ حاصل ہو سکے جو اس کے خام مواد ہونے کی صورت میں نہیں حاصل کیا جا سکتا تھا یا اس میں ایسی خصوصیات کا اضافہ جس سے وہ پہلے سے زیادہ مفید ہو جائے۔ اس عمل میں مختلف انواع کی محنت کی اہمیت ظاہر ہے۔

۵۔ تجارت

اس کے مختلف مراحل ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سارے مراحل ایک ہی آدمی طے کرلے اور یہ بھی کہ متعدد افراد مل کر ان مراحل کو طے کریں۔ بالآخر جو مقصد حاصل ہونا ہے وہ خام مال یا مصنوعات کا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہونا ہے، جس کے نتیجے میں اس خام مال یا تیار شدہ سامان سے زیادہ فائدہ اٹھانا ممکن ہو جاتا ہے۔

۶۔ اُجرت کے عوض کسی دوسرے کے لیے محنت کرنا۔

اسلام اس طرح کی محنت کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کی اُجرت کو بلا کسی تاخیر اور بلا کسی تخفیف کے پوری پوری ادا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ خود قرآن عمل پر اکساتا ہے اور اُسے نگاہوں کا مرکز اور

غور و فکر کا مقام قرار دیتا ہے۔

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ ط (التوبۃ:۱۰۵)

"کہہ دیجئے کہ عمل کر کے دکھاؤ، اللہ، اُس کا رسولؐ اور مومنین تمہارے عمل کا جائزہ لیں گے۔"

اس آیت میں کام کو حسن و سلیقہ اور خوش اسلوبی سے انجام دینے پر اُبھارا گیا ہے۔ پھر اس میں محنت کی تعظیم پائی جاتی ہے اور اسے مطالعہ کرنے، غور و فکر اور اس کے نتائج کے انتظار میں رہنے کے قابل قرار دیا گیا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر عمل اور اس کی خاطر زمین میں چلنے پھرنے پر ابھارا گیا ہے۔

فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ ط (الملک: ۱۵)

"اس کے اوپر چلو اور اس کی روزی میں سے کھاؤ۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محنت کا رتبہ بلند ہونے کے بارے میں متعدد احادیث منقول ہیں:

ان اللہ یحب العبد المؤمن المحترف (اس حدیث کو قرطبی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے)

"اللہ اس بندۂ مومن کو عزیز رکھتا ہے جو کسی پیشے کے ذریعہ اپنی روزی کماتا ہو۔"

ما اکل احدکم طعاماً قط خیراً من عمل یدہ۔ (بخاری)

"اپنے ہاتھوں کی کمائی کھانے سے بہتر تم نے کبھی کوئی کھانا نہ کھایا ہوگا۔"

محنت کی قدر و منزلت اور اس کی بزرگی و احترام کے اس نظریہ کی بنیاد پر اسلام مزدور کے حق اُجرت کو ایک مقدس حق قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور جو کوئی محنت کشوں کا یہ حق دبا بیٹھنے کی کوشش کرے اُسے وہ یہ جتلا کر ڈراتا ہے کہ ایسا کرنے والا دراصل اللہ سے لڑائی مول لیتا ہے اور اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قال اللہ عزوجل: ثلاثۃ انا خصمھم یوم القیامۃ، رجل اعطی بی ثم غدر، ورجل باع حرًا فاکل ثمنہ ورجل استاجر اجیرًا فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہ (بخاری)

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تین طرح کے

لوگ ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اُن سے نپٹنے والا خود میں ہوں گا۔ ایک تو وہ شخص جس نے میری قسم کھا کر کسی کو زبان دی اور پھر اپنے وعدے سے مُکر گیا۔ دوسرا وہ جس نے کسی آزاد شخص کو بیچ کر اس کی قیمت وصول کی، اور تیسرا وہ جس نے کسی مزدور کو اُجرت پر بُلایا اور اس سے پورا کام لینے کے بعد بھی اُسے اس کی مزدوری نہ دی۔"

ان تینوں گناہوں کو ایک ساتھ رکھنے اور اُن کی سزا یکساں رکھنے میں ایک خاص معنٰی پنہاں ہے پہلا گناہ صریح خیانت اور اللہ کی دی ہوئی ضمانت کی بے حرمتی ہے۔ دوسرا انسانیت کی توہین کے ہم معنٰی ہیں ایک آزاد شخص اور اسے فروخت کرکے اس کی قیمت کھانا! تیسرا گناہ مزدور کے پسینہ کے پھل کا خود ہڑپ کر جانا ہے۔ یہ آزاد شخص کی قیمت کھانے کی طرح انسانیت کے ساتھ ایک غداری ہے۔ اور اللہ کی قسم کھانے کے بعد بدعہدی کی طرح اللہ کی دی ہوئی ضمانت کی بے حرمتی بھی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی خباثت اور اپنے اندر نمایاں طور پر موجود غداری کی بنا پر اللہ کی طرف سے جواب طلبی اور اعلانِ جنگ کا مستحق ہے۔ پُر زور ہدایت ہے کہ یہ اُجر وقت کے وقت ادا کیا جائے۔ صرف پوری پوری ادائیگی کافی نہیں بلکہ بلا تاخیر ادائیگی ضروری ہے۔ اللہ کا رسولؐ فرماتا ہے:

اعطوا الاجیر حقہ قبل ان یجف عرقہ۔ (مصابیح السنۃ، فی الصحاح)

"مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے پہلے ادا کردو۔"

اس ہدایت میں اسلام نے مزدور کی صرف مادی ضروریات ہی کو ملحوظ نہیں رکھا ہے بلکہ اس کی نفسیاتی ضرورت کا بھی پورا پورا خیال رکھا ہے۔ نفسیاتی طور پر اس کی تسکین کا سامان یوں کیا گیا ہے کہ اُسے یہ احساس دلایا جائے کہ اس کے مسئلہ کو اہمیت دی جارہی ہے اور اسے پوری توجہ اور اعتناء کے قابل سمجھا جارہا ہے۔ اُجرت کی ادائیگی میں جلدی اسی خوبی کی حامل ہے۔ اس طرح اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی محنت قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی اور یہ کہ سماج میں اس کا ایک مقام تسلیم کیا گیا ہے۔ جہاں تک لازمی ضروریات کا سوال ہے مزدور عموماً اپنی مزدوری کا فوری طور پر محتاج ہوتا ہے تاکہ اس سے وہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات کی تکمیل کرسکے۔ اسی وجہ سے اُجرت میں تاخیر اس کے لیے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اسے اپنی محنت کے پھل کی جس وقت سب سے زیادہ ضرورت رہتی ہے یہ تاخیر اسی وقت اس سے محروم کردیتی ہے۔ اس طرح نہ کام میں لگن باقی رہتی ہے نہ اس سلسلہ میں نشاط باقی

رہتا ہے۔ اسلام کو اس کی بڑی فکر ہے کہ جو کوئی بھی کچھ کام کر سکتا ہو کرے، جتنا زیادہ سے زیادہ کر سکتا ہو کرے اور نفسیاتی طور پر اطمینان و رضامندی اور مادّی طور پر معقول معاوضہ سے لطف اندوز ہوتا رہے۔

مزدور کے حق کا اتنا خیال رکھنے کے بدلے اسلام اس سے یہ چاہتا ہے کہ وہ کام کو خوب اچھی طرح اور حسن و خوبی سے انجام دے۔ کیونکہ اسلام میں حق ہر کسی نہ کسی فرض کے بدلہ میں ملتا ہے۔ یہ محنت اور اس کے ثمرہ میں برابری کے اصول کا بھی ایک فطری تقاضا ہے اور اخلاقی پہلو سے بھی ضروری ہے۔ واضح رہے کہ اسلام اخلاق کو زندگی کی بنیاد بنانا چاہتا ہے۔ دھوکہ دہی اور کام میں ٹال مٹول انکاری، احساس ذمہ داری کے فقدان اور ضمیر کے مردہ ہو جانے کا ثبوت ہے، ان دونوں خصلتوں میں برابر مبتلا رہنا اور ان پر اصرار احساسِ ذمّہ داری کو بالکل ختم کر دینے اور ضمیر کو کھوکھلا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ جماعت کے جملہ صالح اس طرح جس عظیم فساد اور افراتفری کا شکار ہوتے ہیں اور الگ ہیں۔

یہاں ہم یہ بحث نہیں اٹھائیں گے کہ مزدور کی اُجرت کتنی ہونی چاہیے اور اس کی تعیین کس اصول پر مبنی ہوگی۔ آیا اس عرصۂ وقت کا لحاظ بنیادی اہمیت رکھتا ہے جو اشیاء کی پیداوار میں صرف ہو، یا مارکس کی اصطلاح میں "ضروری اجتماعی محنت" کا۔ یہ تفصیلات سے متعلق مباحث ہیں جن کا صحیح محل اسلامی معاشیات پر کی جانے والی علیحدہ تصانیف ہیں:

۷۔ جنگ

جنگ سے سلب کی ملکیت پیدا ہوتی ہے جس کے تحت وہ ساری چیزیں آتی ہیں جو کسی مشرک مقتول کے پاس اس وقت ہوں جب کوئی مسلمان اُسے قتل کرے:

من قتل قتيلاً له عليه بيّنةٌ فسلبه له۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)۔

"جو کسی مشرک کو قتل کرے تو اس کی سلب اس کی ملکیت قرار پائے گی بشرطیکہ وہ اس امر کی باقاعدہ گواہی پیش کرے"۔

دوسری چیز جس کی ملکیت جنگ کے ذریعہ وجود میں آتی ہے وہ مالِ غنیمت ہے جس کا ۴/۵ حصہ جنگ کرنے والوں کا حق ہے اور ۱/۵ حصہ اللہ اور اس کے رسول ؐ کا۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ
وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔ (الانفال: ۴۱)

"جان لو کہ جو چیزیں تم کو غنیمت کے طور پر حاصل ہوں اُن کا ۱/۵ اللہ کا، اس کے رسولؐ

رسولؐ کے قرابت داروں، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کا حصہ ہے۔"

۸۔ سلطان کا اُن زمینوں میں سے کسی کو کچھ عطیہ کے طور پر دے دینا جن کا کوئی مالک نہ ہو

اور جو لاوارث زمینیں مشرکین کی طرف سے جن کا سرپرست امام قرار پاتا ہے، بیت المال میں آئی ہوں، یا اسی طرح ان ناکارہ زمینوں میں سے جن کا کوئی مالک نہ ہو۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو زمینیں عطا فرمائی تھیں۔ آپؐ کے بعد خلفاءؓ بھی عطیہ کے طور پر زمینیں دیتے رہے ہیں۔ یہ عطایا اسلام کی کسی خدمت یا کسی نمایاں کارنامہ کے صلہ میں دیے جاتے تھے لیکن بہت محدود پیمانہ پر۔ اور صرف انہی زمینوں میں سے جو یا تو ناکارہ ہوں یا اُن کا کوئی مالک نہ ہو۔ جب بنی امیہ کا زمانہ آیا تو انھوں نے لوگوں کو لوٹنا اور زمین کے عطایا اپنے اعزہ و اقرباء میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ اس لیے کہ جیسا کہ آگے تفصیل سے آئے گا یہ لوگ خلفائے راشدین میں سے نہ تھے بلکہ ان کا شمار ظالم حکمرانوں میں ہوتا ہے۔

۹۔ بقائے حیات کی خاطر مال کا محتاج ہونا

چنانچہ اسلام نے زکوٰۃ کے مال کا متعین مدات میں صرف کیا جانا ضروری قرار دیا ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا وَ
الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ
وَابْنِ السَّبِیْلِ ط (التوبۃ: ۶۰)

"صدقات کے مستحق صرف فقراء، مساکین اور صدقات (کی تحصیل و تقسیم) پر مقرر کردہ کارندے ہیں، اور وہ لوگ جن کی تالیف قلب مقصود ہو، اور گردنیں چھڑانے میں، مقروض کی مدد کرنے میں، اللہ کی راہ میں مسافروں پر (بھی صدقات میں سے صرف کیا جائے گا)۔"

ان میں سے کسی ایک میں شامل ہونا، کسی شخص کو مالِ زکوٰۃ میں سے ایک حصہ کی ملکیت کا حقدار بنا دیتا ہے۔ ان لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کے سلسلہ میں بجز ضرورت مندی کے اور کوئی وجہ نہیں کام کر رہی ہے۔ گویا ضرورت کو اضطراری شکل میں محنت کا بدل قرار دے دیا جاتا ہے جسے اسلام نے ایک بلند درجہ عطا کیا ہے اور ملکیت حاصل کرنے کا پہلا اور آخری ذریعہ قرار دیا ہے:

۱۰۔ محنت کی مختلف نئی صورتیں جو جسمانی یا ذہنی سعی و جہد کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کو اسلام ابتدا رِ ملکیت کے سلسلہ میں جائز تسلیم کرتا ہے۔ ان کے علاوہ جو بھی طریقے ہیں اسلام ان کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ چوری، ڈاکہ اور لوٹ مار یا مجرد قبضہ ملکیت کا باعث نہیں بن سکتے۔ یہی حال جوئے کا بھی ہے کہ اسے حرام قرار دے دیا گیا ہے۔

اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (مائدہ: ۹۰)

"شراب، جُوا، پانسے اور (غیر خدا کے) استھان شیطانی حرکتیں اور ناپاک امور ہیں، اُن سے بچو تاکہ تم فلاح یافتہ ہوسکو۔"

جو مال حرام طریقے سے کمایا جائے وہ حرام ہی سمجھا جاتا ہے۔ درحقیقت جوئے بازی کوئی "کام" نہیں بلکہ محض زبردستی اور فریب ہے۔ اس پر مستزاد وہ بغض و عناد ہے جو یہ جُوا کھیلنے والوں کے درمیان پیدا کرتا ہے اور جو اسلام کے اہم ترین اصول یعنی بھائی چارہ اور تعاون کی اس اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے جسے اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ (مائدہ: ۹۱)

"شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے۔"

ان تمام اسباب کی حکمت واضح طور پر ان کا "محنت" پر مبنی ہونا ہے، محنت بہر حال جزا کی مستحق ہے کہ اسی پر زندگی کی فلاح و بقا منحصر ہے۔ زمین کو آباد اور کار آمد بنانا، سوسائٹی کو فائدہ پہنچانا،

نفس کی صفائی، ضمیر کی تطہیر، سب اسی پر منحصر ہیں۔ تزکیۂ روحانی، جسم کو تقویت پہنچانے اور سستی، کاہلی اور گمنامی کے عوامل سے انسان کو بچائے رکھنے وغیرہ امور جس حسن و خوبی کے ساتھ محنت، کے ذریعہ انجام پاتے ہیں کسی دوسرے ذریعہ سے ممکن نہیں۔

جب تک حصولِ ملکیت کا واحد ذریعہ "عمل" کی مختلف صورتیں ہوں، انفرادی ملکیت کا ان حدود کے اندر تسلیم کیا جانا جن کی وضاحت ہم نے اوپر کی ہے کسی کے لیے ضرر رساں نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ فرد کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ اپنی انتہائی کوششیں بھی کر گزرے۔ اسی طرح اُسے اس بات کا موقع ملتا ہے کہ مقررہ حدود میں رہتے ہوئے اور دوسروں کو نقصان نہ پہنچاتے ہوئے اپنے قبضہ میں لانے اور ملکیت میں رکھنے کے رجحانات کو پورا کر سکے۔ اگر وہ ان حدود سے تجاوز کرتا ہے تو منصفانہ طریقہ یہ ہے کہ اسے حدود کے اندر لوٹ آنے پر مجبور کیا جائے نہ یہ کہ اس کو ہر طرح کی سرگرمیوں سے روک کر پست ہمت گمنام اور کم تر استعداد رکھنے والوں کے برابر کر دیا جائے۔ یہ طریقہ مناسب نہ ہوگا کہ غلط استعمال کو روکنے کے بہانے فرد کو سرے سے حقِ ملکیت ہی سے محروم کر دیا جائے۔ کیوں کہ غلط استعمال کا علاج ممکن ہے اور ضرورت کے مطابق مداخلت کر کے اُسے روکا جا سکتا ہے۔

ملکیت کے اسی نظریہ کا نتیجہ ہے کہ اسلام انتقالِ ملکیت کے طریقوں میں بھی مداخلت کرتا ہے اور فرد کو اس سلسلہ میں بالکل آزاد نہیں چھوڑتا، خرید و فروخت اور دوسرے معاہدوں، وراثت اور وصیت کے ضابطوں سے بھی یہ حقیقت ظاہر ہے۔ صرف ہبہ اور ہدیہ کو ہر قید سے آزاد رکھا گیا ہے اور صاحبِ مال کو اس بات کا پورا اختیار دیا گیا ہے کہ اپنی زندگی میں اپنا مال جس کو چاہے ہبہ کر دے یا ہدیۃً دیدے۔ اس گنجائش کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں طبیعت خود ہی ایک روک ثابت ہوتی ہے اور صاحبِ مال اپنے مال کا ایک حصہ ہی ہدیہ یا ہبہ کے طور پر دیتا ہے۔ اس سے وراثت کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا۔ یہی حال وصیت کا بھی ہے۔ اب اگر وہ اسراف پر اُترآتا ہے تو اُسے بے جا تصرف کرنے والا قرار دیا جائے گا اور اس پر قانونی پابندی عاید کی جا سکے گی۔ یعنی اسے اپنی ملکیت میں تصرف کے حق سے محروم کیا جا سکے گا۔

مالک کے قبضہ کا اٹھنا اور مال کا اس کے بعد ورثا، یا جن لوگوں کے حق میں وصیت کی گئی ہو ان کی طرف منتقل ہونا ایک مقرر ضابطہ کے تحت عمل میں آتا ہے جس کی حکمتیں علیحدہ ہیں۔ چنانچہ کسی

وارث کے لیے وصیت نہیں کی جا سکتی" اور نہ ایک تہائی سے زیادہ میں وصیت کا کوئی دخل ہوگا کہ یہی آخری حد ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں وصیت کی اجازت بعض خاص طرح کے حالات کے پیش نظر دی گئی ہے۔ بسا اوقات بعض ایسے قریبی رشتہ دار وراثت سے محروم رہ جاتے ہیں جن کے رشتہ اور تعلق کا تقاضا ہوتا ہے کہ اُن کو بھی کچھ ملے لیکن رشتہ داری میں اُن کا مقام کچھ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے ورثاء اُن تک وراثت پہنچنے میں مانع ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے اس پہلو کے اعتبار سے وصیت حسن سلوک اور صدقہ کی ایک قسم ہے۔

وراثت کے ذریعہ مال اس ضابطے کے مُطابق منتقل ہوتا ہے جس کا بیان میراث کی آیتوں میں آیا ہے (یہ آیات اجتماعی تکافل کی بحث میں گذر چکی ہیں)۔ حصّوں کے بارے میں جس عام قاعدہ کی پابندی کی ہے وہ یہ ہے کہ مرد کے لیے دو عورتوں جتنا حصّہ ہے اس اصول کی حکمت ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں۔ پدری رشتے کی رو سے وارث ہونے والا ماں کے رشتہ سے وراثت کا مستحق قرار پانے والے پر ترجیح پاتا ہے گو بعض حالات میں مؤخر الذکر کو زیادہ حصّہ بھی مل جاتا ہے۔ (دونوں میں اس تفریق کی) وجہ حقوق کو ذمّہ داریوں کی مناسبت سے تقسیم کرنے کا اصول ہے۔ کیونکہ پدری رشتہ سے وارث ہونے والے پر مُورث کے سلسلے میں زیادہ ذمّہ داریاں عاید تھیں۔ اس طرح خاندان میں بیٹے کو دادا اور دادی کا حصہ علیحدہ کرنے کے بعد سب کا سب مل جائے گا۔ کیونکہ اگر ضرورت تقاضا کرتی تو باپ کی زندگی میں اس کی کفالت ان کے ہی ذمّہ ہوتی ہے۔ حقیقی بھائی سوتیلے بھائی کو وراثت سے محروم کر دے گا۔ کیونکہ اگر اُس کا حقیقی بھائی کسبِ معاش سے عاجز رہ جاتا تو اُس کی کفالت کا شرعاً بھی ذمہ دار ہوتا۔ اس طرح اس ضابطہ میں ایک منصفانہ تقسیم کے ذریعہ فوائد اور ذمّہ داریوں، حقوق اور فرائض کے درمیان ایک مناسب توازن برقرار رکھا گیا ہے۔

قانونِ وراثت کی حکمتوں اور اس کے دوررس اثرات پر ہم اجتماعی تکافل کی بحث میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ وہیں ہم نے اس تکافل یا رشتہ داروں اور پیہم مختلف پشتوں کے درمیان ربط و تعلّق کو مضبوط کرنے والے دوسرے اصولوں سے اس قانون کی ہم آہنگی بھی واضح کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح یہ ضابطے فرد اور جماعت دونوں کے مفادات و ضروریات نیز فطرت اور طبعی میلانات کی یکساں رعایت ملحوظ رکھتے ہیں۔

اب یہاں ہم نظامِ وراثت کی ان حکمتوں پر غور کریں گے جو خصوصیت کے ساتھ اجتماعی پہلو سے متعلق ہیں۔

اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام دولت کے ارتکاز اور اس کے ایک طبقے کے اندر محدود ہو کر رہ جانے کو پسند نہیں کرتا اور اسلام کا نظامِ وراثت پشت در پشت جمع ہونے والی دولت کی تقسیم کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ چنانچہ اس کے ذریعہ ایک ملکیت محض مالک کی وفات سے اس کی متعدد اولاد اور اعزہ کو منتقل ہو جاتی اور اس طرح چھوٹے چھوٹے یا متوسط حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اس ضابطے کے باوجود ملکیت جیوں کی توں رہ جائے ان شاذ و نادر پیش آنے والے حالات کے لیے کوئی اصول بنانا ممکن نہیں (مثلاً یہ کہ مالک صرف ایک بیٹا چھوڑ کر وفات پائے جو اس کے سارے ترکہ کا وارث قرار پا جائے گا کیونکہ متوفیٰ کے باپ ماں یا بیوی اور لڑکی میں سے کوئی زندہ نہیں رہا) زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ دولت متعدد چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

جب ہم اس ضابطہ کا دوسرے ضابطوں مثلاً انگریزوں کے ضابطہ سے مقابلہ کرتے ہیں جو ترکہ کا تمام تر مستحق بڑے لڑکے کو گردانتا ہے تو ہم پر اسلام کی یہ حکمت کہ وہ جمع شدہ دولت کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اسلامی ضابطہ میں ورثاء کے مابین جو عدل ملحوظ رکھا گیا ہے وہ اس پر مستزاد ہے۔ اس کا عدل صرف بڑے لڑکے کے لیے مخصوص نہیں۔

ملکیت کو نمو بخشنے کے طریقے

ملکیتِ دولت کی بابت اسلام جس نظریہ کا قائل ہے اس کے تحت اس نے مال کے ذریعہ مزید مال حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے کے طریقوں میں بھی مداخلت کی ہے۔ وہ مالک کو اس بات کی کھلی چھٹی نہیں دیتا کہ وہ اس سلسلے میں من مانی کرتے رہیں۔ کیونکہ فرد کی ذاتی مصلحت کے پہلو بہ پہلو اس جماعت کی مصلحت بھی قابلِ لحاظ ہے جس سے فرد معاملات کرتا ہے۔

چنانچہ ہر فرد کو مال کے ذریعہ نفع کمانے کی پوری آزادی ہے۔ لیکن قانونِ الٰہی کے مقرر کردہ حدود کے اندر۔ اسے پوری آزادی ہے کہ زمین میں کاشت کرے۔ خام مال کے ذریعہ مصنوعات تیار کرے تجارت کرے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اس کی اجازت کہ وہ دھوکہ دہی پر اُتر آئے، یا عام ضرورت کی اشیاء کو قیمت چڑھنے کے انتظار میں ذخیرہ کیے رہے، یا اپنی دولت کو سود پر دے، یا مزدوروں کی اُجرت کے سلسلہ میں ظلم و زیادتی سے کام لے کر خود اپنے نفع میں اضافہ کرے۔ یہ سب کچھ اس پر حرام کر دیا گیا ہے۔ اسلام افزائش دولت کے لیے صرف پاکیزہ اور صاف ستھرے ذرائع ہی کو روا رکھتا ہے، اور پاکیزہ ذرائع کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سرمایہ کو اس حد تک بڑھنے کا موقع نہیں دیتے کہ طبقاتی فرق میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ آج ہم سرمایہ میں جو بے تحاشہ اضافہ دیکھتے ہیں اس کی وجہ دراصل دھوکہ فریب، سود، مزدور کی حق تلفی، احتکار، عوام کی ضروریات سے بے جا فائدہ اٹھانا، اُچکا پن، چوری، غصب وغیرہ وہ جرائم ہیں جو آج کے معروف طریق ہائے استحصال Exploitation میں مضمر ہیں۔ اسلام ان کی اجازت کبھی نہیں دیتا۔ آئیے اب ہم افزائش دولت کے سلسلہ میں احکام اور ان کی حکمتوں کا مطالعہ کریں:

۱۔ اسلام کاروبار میں بددیانتی کو حرام قرار دیتا ہے

من غشّ فلیس منی (اصحاب السنن)

"جس نے (کاروبار) میں دھوکہ دیا وہ میرا پیرو نہیں"

البیعان بالخیار ما لم یتفرقا فان صدقا و بیّنا بورک لهما فی بیعهما و ان کتما و کذبا محقت برکة بیعهما (بخاری و مسلم)

"خریدار اور فروخت کنندہ جب تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جائیں وہ معاملہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں پورا اختیار رکھتے ہیں۔ اگر انہوں نے راست بازی اور درست بیانی سے کام لیا تو ان کے معاملہ میں برکت ہوگی اور اگر غلط بیانی اور (عیوب کے) اخفاء کا طریقہ اختیار کیا تو اُن کے معاملۂ بیع کی برکت ختم کر دی جائے گی"

گویا آپ کو خرید و فروخت کی پوری آزادی ہے البتہ شرط یہ ہے کہ نہ تو مال میں کسی طرح کا دھوکہ ہو نہ دام میں۔ اگر کسی چیز میں کوئی عیب ہو تو اس کا بتا دینا لازم ہے ورنہ آپ دھوکہ باز قرار پائیں گے اور جو نفع کمایا ہوگا وہ بھی آپ کے لیے حرام ہوگا۔ اس حرام نفع کو صدقہ کر دینا بھی آپ کو مواخذہ سے نہیں بچائے گا۔ کیونکہ وہی صدقہ آپ کے حساب میں لکھا جائے گا جو حلال کمائی میں سے کیا جائے گا۔

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، عن رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم انہ قال: لا یکسب عبدٌ مالا حراما فیتصدق منہ فیقبل منہ ولا ینفق منہ فیبارک لہ فیہ۔ ولا یترکہ خلف ظھرہ۔ الا کان زادہ الی النار۔ ان اللہ لا یمحو السیئ بالسیئ ولکن یمحو السیئ بالحسن، ان الخبیث لا یمحو الخبیث

(ذکرہ صاحب مصابیح السنۃ فی الصحاح)

"عبداللہ بن مسعود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص حرام مال کمائے اور اس میں سے صدقہ خیرات کرے تو وہ (عنداللہ) قبول کر لیا جائے یا وہ اس میں سے خرچ کرے تو اس میں برکت ہو سکے۔ وہ ایسے مال کو اگر اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے تو یہ اس کے لیے راہ جہنم کا توشہ ثابت ہوتا ہے۔ اللہ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا۔ بلکہ برائی کو اچھائی کے ذریعہ مٹاتا ہے۔ درحقیقت ناپاک چیز ناپاک چیز کو دور نہیں کر سکتی

آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

انا لا یربو لحمٌ نبت من سحتٍ الا کانت النار اولی بہ

(ترمذی۔ نسائی)

"مال حرام پر پلا ہوا گوشت (جسم) پروان نہیں چڑھتا بلکہ اس کا اصل ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔"

اس باب میں اسلام کی پالیسی اپنے بنیادی اصولوں کے عین مطابق ہے۔ وہ ہر طرح کی ضرر رسانی کا سدِ باب کرنے اور لوگوں کے درمیان باہمی تعاون کی اسپرٹ پیدا کرنے کے بنیادی مقاصد کو یہاں بھی اپنے سامنے رکھتا ہے۔ چنانچہ دیکھا جائے تو دھوکہ دہی ایک طرف تو نفس کی کثافت ہے، ساتھ ہی یہ دوسرے کی ضرر رسانی کے بھی ہم معنی ہے۔ بالآخر اس طرح ایک ایسی فضا بن جاتی ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر اعتماد کرنا ہی چھوڑ دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اعتمادِ باہم کے بغیر کسی گروہ میں تعاون کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پھر دھوکہ دہی کا مال یہی تو ہے کہ بلا کسی معقول اور جائز کوشش کے کچھ مال ہاتھ لگ جائے جب کہ اسلام کا عام اصول یہ ہے کہ کوئی ثمرہ بلا محنت نہیں، اور اسی طرح کوئی محنت نہیں جو رائگاں جائے

اور اپنے ثمرہ سے محروم رہے۔

۲۔ اشیائے ضرورت کی ذخیرہ اندوزی کو اسلام دولت کمانے اور اس میں اضافہ چاہنے کا جائز طریقہ نہیں تسلیم کرتا۔

من احتکر فھو خاطئ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

"جس نے احتکار کیا وہ غلط کار ہے۔"

وجہ یہ ہے کہ احتکار صنعت و تجارت کی آزادی کا خون ہے۔ کیونکہ اجارہ دار Monopolist کو یہ گوارہ نہیں ہوتا کہ دوسرا بھی بازار میں اسی جیسا مال لائے یا اُسی جیسی مصنوعات تیار کرے۔ وہ تو بازار پر اپنا پورا کنٹرول چاہتا ہے تاکہ لوگوں سے من مانی قیمتیں وصول کر سکے اور نتیجتہً لوگوں کو ہر طرح کی شدت اور تنگی کا شکار کر کے اُن کا جینا دوبھر کر دے۔ وہ دوسروں کے لیے اس بات کے مواقع ختم کر دیتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح کی روزی کما سکیں یا اس تگ ودَو میں اس سے زیادہ سرگرمی دکھا سکیں۔ چنانچہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ احتکار کرنے والا دولت کے ذخیروں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور زائد سامان کو تلف کر دیتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح ایک خاص نرخ کو لوگوں پر مسلط کر سکے۔ یہ طرزِ عمل صریح طور پر سامانِ معیشت کے ان سماجی خزانوں کی بربادی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے فائدے کے لیے زمین میں پیدا کیا ہے۔

کسبِ مال کے اس ذریعہ کا سدِ باب کرنے کو اسلام نے اتنی اہمیت دی کہ احتکار کو دائرۂ دین سے خارج کرنے والا جرم قرار دے دیا:

من احتکر طعاماً اربعین یوماً فقد برئ من اللہ وبرئ اللہ منہ

(مسند امام احمد)

"جس نے چالیس دن تک سامانِ غذا کو ذخیرہ کیے رکھا اس کو اللہ سے کوئی واسطہ نہیں نہ اللہ کو اس کی کوئی پرواہ۔"

ایسے شخص کو مسلمان تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا جو جماعت کی دشمنی میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ اپنی ذاتی نفع اندوزی اور اس طرح اپنے خزانہ میں اضافہ کی خاطر اجتماعی مصالح کو دانستہ مجروح کرتے ہوئے سماج میں مصنوعی طور پر خوف اور احتیاج پیدا کر دیتا ہے۔

۴۔ سُودی کاروبار بھی افزائشِ دولت کا ایک حرام ذریعہ ہے جسے اسلام واضح طور پر قابلِ نفریں قرار دیتا ہے۔ وہ اس کی خباثت واضح کرتے ہوئے اسے اپنانے والوں کو بدترین انجام کی خبر سُناتا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً وَّاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (اٰل عمران: ۱۳۰)

"اے اہلِ ایمان دوگنا چوگنا کرکے سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ ... فلاح یاب ہوسکو۔"

یہاں مقصود صرف دوگنے، چوگنے سے روک کر سود کی معمولی شرحوں کو سندِ جواز عطا کرنا نہیں، یہ صرف احوالِ واقعی کا بیان ہے، اور جو کچھ (اس وقت عرب میں) عملاً ہو رہا تھا اس کی تفصیل ہے۔ جیساکہ دوسری آیات سے واضح ہوتا ہے نفسِ سود کی ممانعت مقصود ہے:

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا م وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَہٗ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ فَانْتَھٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرہ: ۲۷۵)

"سود خوار کا حال اس شخص کا سا ہے جس کو شیطان (جنوں) نے اپنے اثر سے خبط الحواس بنا لیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ بیع کا معاملہ بھی سودی معاملہ کی طرح ہے۔ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال اور سودی معاملات کو حرام قرار دے دیا ہے۔ اب جس کو اس کے رب کی نصیحت (اس باب میں) پہنچے اور وہ آئندہ سودی معاملات سے باز آجائے تو جو کچھ (سودی معاملہ) پہلے ہوچکا وہ اس کا ہے۔ اور اس باب میں اس کا معاملہ اللہ کے سپرد۔ اور جو اب بھی یہ حرکت کرے گا تو ایسے لوگ جہنمی ہیں اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔"

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ

مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝

(البقرہ : ۲۷۸-۲۷۹)

"اے اہلِ ایمان! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سودی مطالبات باقی رہ گئے ہیں اُنکو اگر تم درحقیقت مومن ہو، چھوڑ دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو تمہیں اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کی وارننگ دی جاتی ہے۔ اگر تم توبہ کرو (اور سودی معاملات سے باز آجاؤ) تو تمہارے راس المال Principal تمہارے ہیں (وہ تم کو ملیں گے) نہ تو تم زیادتی کرو نہ تمہارے ساتھ زیادتی کی جائے گی۔"

سود کی مذمت اور اس کے اجتناب کی تلقین میں اسلام یہاں تک آگے جاتا ہے کہ اس معاملہ میں جو کوئی کسی طرح بھی شریک ہو، چاہے اس کا دستاویز لکھنے والا ہو یا اس پر گواہی دینے والا، ان سب پر وہ لعنت بھیجتا ہے:

عن جابرؓ: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوٰا و موکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء (مسلم)

"حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ...... صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے کھلانے والے اور اس کی دستاویز لکھنے والے، اس پر گواہی دینے والوں سب پر لعنت بھیجی ہے اور فرمایا یہ سب برابر ہیں۔"

ان تمام امور میں اسلام اُن بنیادی اُصولوں کے مطابق پالیسی اختیار کرتا ہے جو مال و دولت اخلاق اور مصالحِ عامّہ کے سلسلہ میں اس کے سامنے ہیں۔ اس کے نزدیک دولت صاحبِ دولت کے ہاتھ میں ایک امانت ہے اور وہ اس پر پوری جماعت کے مفاد کا نگران مقرر کیا گیا ہے۔ اسے لوگوں کو نقصان پہنچانے اور ذاتی نفع کی خاطر اس ذمّہ داری کو پسِ پُشت ڈال دینے کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اُنکی ضرورت مندی کی گھڑی کا منتظر رہے۔ اُن کی کمزور پوزیشن سے بے جا فائدہ اٹھائے اور جو کچھ اُنہیں دیتا ہے اُس سے بڑھ چڑھ کر معاوضہ وصول کرے۔ ضرورت ہر قسم کی ہوتی ہے۔ کبھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے جس پر زندگی کی گاڑی کے آگے

کھسکنے کا انحصار ہے تو کبھی علاج کے لیے دوا کی، یا حصولِ علم یا کسی اور ضروری کام کے لیے اخراجات کی۔ اس طرح یا تو یہ سارے کام یونہی پڑے رہ جائیں گے یا دولت مند لوگ ضرورت مندوں پر اپنا حکم چلائیں گے۔ اس کو تھوڑا دے کر اس سے بہت سا واپس لیں گے اور اس طرح اس کی محنت کا حق دبا بیٹھیں گے۔ وہ بے چارہ محنت مشقت برداشت کیے جائے اور نتیجہ صرف یہ نکلے کہ یا تو ساری کی ساری کمائی سود ادا کرنے میں سود خواروں کی نذر ہو جائے یا سال بسال قرض میں اضافہ ہوتا جائے۔

یہ زائد از ضرورت دولت جس سے صاحبِ مال فائدہ اٹھاتا ہے ______

دریں حالیکہ وہ کرتا کچھ نہیں بس راس المال Principal اس کا ہوتا ہے ______

یہ دراصل خون اور پسینہ ہوتا ہے جس کو یہ کمال حیوانیت سے چاٹتا رہتا ہے اور بیٹھے ہی بیٹھے طبعاً طور پر چوستا رہتا ہے۔

اسلام جو محنت کی عظمت و تقدس جتلاتا ہے اور اُسے ملکیت اور نفع کی اساس قرار دیتا ہے اس بات کو روا نہیں رکھتا کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہنے والا فرد مال کا حق دار ٹھہرے یا دولت، دولت کو جنم دے۔ دولت کو صرف محنت جنم دے سکتی ہے۔ بصورتِ دیگر وہ مال حرام قرار پاتا ہے۔

اسلام فرد کی اخلاقی پاکیزگی اور جماعت میں باہم میل و محبت دونوں کو پوری اہمیت کے ساتھ سامنے رکھتا ہے۔ درحقیقت نہ تو کوئی صاحبِ خیر اور شریف انسان سود خواری میں ملوث ہو سکتا ہے نہ یہ ممکن ہے کہ کسی جماعت میں سود خواری کی لعنت عام ہو جائے اور پھر بھی اس کے افراد میں باہم انس و محبت باقی رہ جائے۔ جو شخص مجھے ایک دینار صرف اس لیے دیتا ہے کہ اُسے دو دینار کر کے مجھ سے واپس وصول کر سکے وہ درحقیقت میرا دشمن ہے۔ میں کبھی اپنا دل اس کی طرف سے صاف نہیں رکھ سکتا اور نہ اس کی محبت میرے دل میں جگہ پا سکتی ہے۔ تعاون اسلامی سماج کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے اور سود اس اصول کا دشمن واقع ہوا ہے۔ وہ اس بنیاد کو ڈھا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اسے سخت ناپسند کرتا ہے۔

حُرمتِ سود میں ایک اور حکمت مضمر ہے جو ہم پر آج دورِ جدید میں منکشف ہو رہی ہے اور

غالباً کل تک سامنے نہ آئی تھی۔ وہ یہ کہ سود ایک ایسا عامل ہے جو سرمایہ میں بے حد حساب اضافہ کرتا جاتا ہے۔ یہ اضافہ نہ تو کسی سعی و جہد کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کسی طرح کی محنت کا ثمرہ۔ سود کی یہ صفت ایسی ہے جو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہنے والے ایک کو اس کا موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ افزائش دولت کے سلسلہ میں تمام تر اسی ایک ذریعہ پر انحصار کر بیٹھیں۔ نتیجۃً اس طبقہ میں سستی و کاہلی، مسرفانہ عیاشی اور بدکرداری پھیل جاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ ان محنت کشوں کے بل پر جو دولت کے محتاج ہوتے ہیں اور تنگی کے عالم میں مجبور ہو کر سودی قرض لیتے ہیں۔ اس طرح دو خطرناک اجتماعی امراض ابھرتے ہیں۔ سرمایہ میں بے حد حساب اضافہ اور انسانیت کی بلند و پست دو طبقات میں روز افزوں تفریق جو کسی حد پر ٹھہرنے کا نام نہیں لیتی۔ مزید برآں ایک نئے خطرے کے طور پر ایک کاہل اور بے عمل طبقہ کا وجود جو بجز عیش و عشرت کچھ اور کرنے کا نام نہیں لیتا اور دنیا کی ساری نعمتیں بس بیٹھے بیٹھے حاصل کرتا رہتا ہے۔ گویا اس کی دولت مزید دولت کے شکار کے لیے ایک جال ہے، ایسا جال جس میں شکار کو مغالطہ دینے کے لیے دانے کی بھی ضرورت نہیں۔ ضرورت مندوں کے غول اس میں خود بخود پھنستے رہتے ہیں۔ ان کی ضروریات ان کو دھکیل کر آگے بڑھاتی ہیں اور اپنے پیروں پر چل کر وہ اس میں آ پڑتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سود کھانا اسلامی تصورِ زندگی کے اس بنیادی اصول سے ٹکراتا ہے کہ مال اللہ کا ہے جس میں اس نے انسانوں کو نائب بنایا ہے ـــــــ ان شرطوں کے تحت جن کو نائب بنانے والا یعنی اللہ سبحانہٗ خود مقرر فرماتا ہے۔ نہ یہ کہ آدمی جو چاہے کرے۔

"سودی نظام کی بنیاد یہ تصور ہے کہ انسانی زندگی اور اللہ سبحانہٗ کے ارادہ کے درمیان کوئی تعلق نہیں انسان اصلاً اس زمین کا مالک ہے، اللہ سے کیے ہوئے کسی عہد کا پابند نہیں۔ نہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اللہ کے احکام کی پیروی کرے۔ فرد پوری طرح آزاد ہے کہ جس طرح چاہے دولت کمائے، اس میں اضافہ چاہے اور اس سے لطف اندوز ہو۔ ان امور میں نہ وہ اللہ سے کیے ہوئے کسی عہد کا یا اس کی عاید کی ہوئی کسی شرط کا پابند ہے نہ اس کے لیے دوسرے افراد کے مصالح کا اعتبار و لحاظ ضروری ہے۔ اگر وہ اپنے ذاتی خزانہ میں کوئی اضافہ کر سکتا ہے تو اسے اس کی پروا نہ ہونی چاہیے کہ اس کے نتیجہ میں لاکھوں افراد کو تکلیف ہوگی۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین بھی کبھی کبھی جزئی طور پر فرد کی اس آزادی میں مداخلت کرتے ہیں۔ مثلاً شرح سود کی تحدید کرکے یا دھوکہ فریب، غصب، چوری، ملاوٹ، ایذارسانی ...... وغیرہ کی بعض صورتوں کو

ممنوع قرار دے کر۔ لیکن اس مداخلت کے حدود انسانوں کے اپنے اختیار اور ان کی خواہشات سے متعین ہوتے ہیں نہ کہ اللہ تعالیٰ کی سند رکھنے والے کسی مقررہ اصول کے تحت۔

مزید برآں اس کی تہ میں یہ غلط اور فساد انگیز تصور کام کر رہا ہے کہ انسانی وجود کا آخری مقصود کسی نہ کسی طریقہ سے مال حاصل کر کے خواہشاتِ نفس کے مطابق اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرد مال حاصل کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور اس راہ میں ہر اصول اور دوسروں کی ہر مصلحت کو پامال کرتا چلا جاتا ہے۔ بالآخر اس سے ایک ایسا نظام جنم لیتا ہے جو انسانیت کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے اور انفرادی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی ہر سطح پر انسانی زندگی کو چند سود خواروں کے فائدہ کی خاطر ناخوش و نامراد بنا کر رکھ دیتا ہے۔ یہ نظام حیاتِ انسانی کو اخلاقی، نفسیاتی اور اعصابی اعتبار پست کر کے دولت کی گردش اور انسانی معیشت کی موزوں ترقی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ بالآخر اس کا انجام دورِ حاضر کے انجام کی طرح، یہ ہوتا ہے کہ پوری انسانیت پر حقیقی اقتدار اور عملی اختیار چند بدترین اور پست ترین گروہوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہو جاتا ہے۔ خلقِ خدا کے یہ بدترین افراد انسانیت کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتے، اس کے بارے میں کوئی بھی ذمہ داری نہیں محسوس کرتے۔ یہ نہ کسی عہد کا پاس رکھتے نہ کسی انسانی قدر کا لحاظ کرتے ہیں۔

یہ وہ افراد ہیں جو افراد کو بھی قرض دیتے ہیں اور حکومتوں اور قوموں کو بھی۔ اپنے ملک میں بھی اور ملک کے باہر بھی۔ ساری انسانیت کی محنت کا اصل حاصل اور انسانوں کی خون پسینہ ایک کی ہوئی محنت کے نتائج چہار طرف سے کھنچ کر اُن کے قدموں میں آتے ہیں ——— اس سود کی شکل میں جس کے پیدا کرنے میں انھوں نے ذرا بھی محنت نہیں کی ہوتی ہے۔ انھیں صرف مال و دولت نہیں ملتی بلکہ نفوذ و رسوخ بھی حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ یہ لوگ کسی اصول یا اخلاق کے حامل نہیں ہوتے، نہ کوئی اخلاقی یا دینی تصور رکھتے ہیں بلکہ دین و اخلاق اور اُصول و مقاصد کی باتوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، لہٰذا قدرتی طور پر اپنے اس زبردست اثر و نفوذ کو ایسے حالات پیدا کرنے، ایسے افکار کو فروغ دینے اور ایسے طریقے رائج کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جن کے طفیل ان کے لیے مزید نفع کمانا اور استحصال کرنا ممکن ہو سکے۔ اپنی حرص پوری کرنے اور اُن کمینہ مقاصد کو حاصل کرنے کی راہ میں یہ کہیں بھی نہیں رُکتے۔ سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ انسانوں کے اخلاق خراب ہوں اور وہ لذت کوشی اور شہوت پرستی کے دلدل میں جا گریں کہ اس کی

خاطر بہت سے لوگ اپنا آخری پیسہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور یہ پیسہ اُن کی جیبوں میں آجاتا ہے جنہوں نے اس کی خاطر یہ سارا جال پھیلا رکھا ہے۔ ساتھ ہی یہ لوگ دنیا کے معاشی امور و معاملات کو اپنے محدود مصالح کے مطابق جس طرح چاہتے ہیں چلاتے ہیں۔ خواہ اس کے نتیجہ میں کساد بازاری کے دورے اور معاشی تلاطم نمودار ہوتے رہیں جن سے معاشیات کی دنیا خوب واقف ہے۔ اُن کے اثر و رسوخ کے نتیجہ میں صنعتی اور معاشی پیداوار تمام انسانوں کے مصالح کے مطابق انجام پانے کے بجائے اُن مال دار سود خواروں کے مصالح کے مطابق انجام پاتی ہے جن کے ہاتھوں میں دنیا بھر کی دولت کی باگ دوڑ آجاتی ہے۔

دورِ جدید میں ایک ایسی ٹریجڈی واقع ہوئی ہے جو اس بُری شکل میں دورِ جاہلیت میں بھی نہیں پیش آئی تھی۔ وہ یہ کہ یہ سود خوار جو پُرانے زمانہ میں بعض افراد اور مالی اداروں کی شکل میں پائے جاتے تھے اور آج جدید بینکوں کے ڈائرکٹر وغیرہ ہوتے ہیں، دنیا کے غریب عوام کو اس مغالطہ میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ سُودی نظام ہی قدرتی اور معقول نظام ہے۔ ایسا کرنا اس زبردست اثر و رسوخ کی بنا پر ممکن ہوا جو ان سُود خواروں کو بین الاقوامی اداروں اور حکومتوں میں اور اُن کے باہر بھی حاصل ہے۔ ساری دنیا کے رسل و رسائل اور تعلیم و تربیت کے نظام پر انہی لوگوں کا قبضہ ہے۔ اخبارات رسائل، کتابوں اور اُن کی تعلیم دینے والوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں، ریڈیو اسٹیشنوں اور سینما گھروں، سب پر یہی چھائے ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ سود خوار دنیا کے جن غریب عوام کا خون چُوستے اور ہڈیاں چباتے ہیں اُنہی کے ذہنوں میں انھوں نے یہ خیال راسخ کر دیا ہے کہ معاشی ترقی کی واحد صحیح بنیاد سود ہے۔ اس کے سوا کسی اور بنیاد پر معاشی ترقی ممکن ہی نہیں اور مغرب کی ساری تمدنی ترقی اسی سودی نظام کی برکت سے عمل میں آئی ہے۔ انہوں نے جمہور عالم کو باور کرایا ہے کہ جو لوگ سود کو ختم کرنا چاہتے ہیں وہ خیالی دنیا میں رہتے ہیں۔ اُنہیں عملی حالات سے کوئی واقفیت نہیں اور اُن کی رائے کی بنیاد صرف اخلاقی نظریات اور ایسے آئیڈیل کی طلب ہے جو واقعات کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ان لوگوں کی رائے کو اگر معاشی نظام میں دخل اندازی کا موقع دیا گیا تو یہ پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ آج جو لوگ سودی نظام پر تنقید کرتے ہیں اُن کا مذاق وہ لوگ بھی اُڑاتے ہیں جو خود اسی نظام کے مارے ہوئے اور اسی کے ستم رسیدہ ہیں! ان بیچاروں کا حال بھی وہی ہے جو پوری عالمی معیشت کا ہے جسے

دنیا کے سود خواروں کی ٹولیاں ایک خلافِ فطرت، غیر موزوں اور غلط راہ پر چلنے پر مجبور کیے ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں وہ مکمل طور پر کساد بازاری کے دوروں میں مبتلا رہتی ہے۔ اب اس معیشت کے لیے یہ ممکن نہیں کہ پوری انسانیت کے لیے سود مند ہو، بلکہ وہ بھیڑیوں کے ایک جھنڈ کا شکار بن کر رہ گئی ہے۔

سودی نظام خالص معاشی زاویۂ نگاہ سے بھی ایک ناقص اور مضر نظام ہے۔ اس کی مضرت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ اس کے مفاسد پر خود مغرب کے بعض علمائے معاشیات کو تنبہ ہو چکا ہے۔ جو خود اس کے زیر سایہ پروان چڑھے ہیں اور جن کی تعلیم و تربیت اُسی زہریلی فضا میں ہوئی ہے، جو دولتمندوں کی ٹولی تہذیب و ثقافت اور افکار و اخلاق ہر شعبہ میں پیدا کر چکی ہے۔ اس نظام پر خالص معاشی زاویہ نگاہ سے تنقید کرنے والوں میں پیش پیش جرمنی کے عالم معاشیات ڈاکٹر شاخت ہیں جو جرمنی کے رائش بینک کے گورنر بھی رہ چکے ہیں۔ دمشق میں ۱۹۵۳ء میں اپنے ایک لکچر میں انھوں نے کہا تھا کہ وہ الجبرا کے ایک (لامتناہی) سلسلۂ حساب کے ذریعہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ دنیا کی ساری دولت معدودے چند سود خواروں کے ہاتھوں میں کھنچ آنے والی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سود پر قرض دینے والا ہمیشہ فائدہ حاصل کرتا ہے جب کہ قرض لینے والے کو کبھی نقصان ہوتا ہے اور کبھی فائدہ۔ ظاہر ہے کہ ساری دولت بالآخر اس کے ہاتھوں میں آجائے گی جس کو ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے۔ الجبرا کے ذریعہ یہی بات ثابت کی گئی ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ عملاً ایسا ہی ہو رہا ہے کیونکہ آج دنیا کی بیشتر دولت کے اصل مالک چند ہزار افراد ہیں، باقی سارے اصحاب ملکیت اور کارخانہ دار جو بینکوں سے قرض لے کر کاروبار کرتے ہیں، اور اُن کے مزدور وغیرہ سب انہی مال داروں کے تنخواہ دار ملازمین کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی محنت کے ثمرات ان چند ہزار افراد کو ملتے ہیں۔

سود کی مضرت اسی پر موقوف نہیں۔ معاشی نظام کے سود پر قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور صنعت میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان تعلق کی نوعیت دائمی طور پر باہمی کش مکش اور ہار جیت کی بازی ہو جاتی ہے۔ سود خوار زیادہ سے زیادہ سود حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی خاطر وہ سرمایہ کو روکے رہتا ہے تا آنکہ تجارت اور صنعت کی جانب سے اس کی طلب میں شدت پیدا ہو اور سود کی شرح بڑھ جائے۔ وہ اس شرح کو اسی طرح بڑھاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ تاجروں اور صناعوں کو یہ نظر آتا ہے کہ اتنی اونچی شرح سود پر سرمایہ حاصل کر کے سرمایہ کاری کرنے سے انھیں کوئی نفع نہیں حاصل

ہو سکتا۔ کیونکہ سرمایہ کی پیداآوری اتنی زیادہ نہیں ہوگی کہ وہ سُود ادا کرنے کے بعد اپنے لیے کچھ نفع بھی حاصل کرسکیں۔ جب یہ کیفیت رونما ہوجاتی ہے تو پیداواری سرگرمیاں جن میں کروڑوں افراد مشغول ہوتے ہیں سُست پڑ جاتی ہیں اور اُن میں لگا ہوا سرمایہ گھٹنے لگتا ہے، کارخانے اپنی پیداوار کم کردیتے ہیں مزدور بے روزگار ہوجاتے ہیں۔ اور قوتِ خرید گھٹ جاتی ہے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچتی ہے اور سود خوار یہ دیکھتے ہیں کہ سرمایہ کی طلب گھٹ گئی یا ختم ہوگئی تو وہ مجبوراً سود کی شرح کم کرتے ہیں۔ پھر تاجر اور صنّاع از سرِ نو سرمایہ کے طلب گار ہوتے ہیں اور زندگی کی گاڑی پھر سے خوش حالی کی طرف رواں ہوتی ہے اسی طرح دنیا میں کساد بازاری اور خوش حالی کے دورے یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں اور انسانیت ان بے زبان بیلوں کی طرح اس کولھو میں جُتی رہتی ہے۔

سارے صارفین سود خواروں کو براہ راست ایک محصول ادا کرتے ہیں۔ کیوں کہ ارباب صنعت وتجارت جو سرمایہ استعمال کرتے ہیں اُن کا سُود صارفین ہی سے وصول کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اشیائے صرف کی قیمتوں میں اس سود کا اضافہ کردیتے ہیں، اور اس طرح سود کا بار ساری خلقِ خدا پر تقسیم ہوجاتا ہے تاکہ بالآخر سود کی پوری رقم سود خواروں کو ادا کی جاسکے۔ حکومتیں مالی اداروں سے ترقیاتی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے اور دوسری سماجی خدمات انجام دینے کے لیے جو قرضے لیتی ہیں اُن کے سود بھی اُن حکومتوں کے شہری اُدا کرتے ہیں۔ حکومتیں مجبور ہیں کہ مختلف محاصل میں اضافہ کرکے ان قرضوں کو مع سود ادا کرنے کا اہتمام کریں۔ اس طرح ہر فرد سود خواروں کو یہ "جزیہ" ادا کرنے میں شریک ہے۔ معاملہ یہیں پر نہیں ختم ہوجاتا بلکہ ان قرضوں کا انجام سامراجیت ہے۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر سامراجی جنگیں بھی لڑی جاتی ہیں۔[1]"

اسلام کے نزدیک قرض سب یکساں ہیں، خواہ اُسے ضروریات میں خرچ کرنے کے لیے لیا جائے یا پیداواری کاموں پر لگانے کے لیے۔ کیوں کہ اگر قرض کے مصارف کیلئے لیاگیا ہے اور اس سے غرض یہ ہے کہ قرض لینے والا اپنی ضروریات میں خرچ کرے تو اس کو اصل کے علاوہ کچھ اور دینے پر مجبور کرنا کسی طرح قرینِ انصاف نہیں۔ یہی بہت ہے کہ وہ گنجائش ہونے پر اصل کو واپس کردے۔ اگر قرض پیداواری

---

[1] فی ظلال القرآن، جلد ۳۔ صفحات ۷۲ تا ۷۶۔

کاموں میں لگانے کے لیے گیا ہے تو اس پر جو کچھ نفع ہوتا ہے وہ ثمرہ دراصل اس محنت کا ہے جو وہ خود کرتا ہے نہ کہ اس مال کا جو اس نے قرض لیا۔ کیوں کہ سرمایہ بلا محنت نفع آور نہیں ہوتا اور اسلام میں اصل اہمیت محنت ہی کو حاصل ہے۔ سرمایہ کے ذریعہ نفع کمانے کی صورت صرف مضاربت ہے جس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال رہتا ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر سود کو کسی حال میں جائز نہیں قرار دیا گیا ہے۔ اپنی ضروریات کے لیے قرض چاہنے والے کو قرض دینا بہر حال لازمی قرار دیا گیا ہے۔

اب اگر قرض لینے والے نے قرض لیا اور پھر تنگی ہی میں مبتلا رہا تو اُسے "فراخی تک مہلت" دی جائے گی (فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ)۔ میری رائے میں یہ صیغہ حکم کے لیے ہے کیونکہ یہ شرط اور جواب شرط کی شکل میں وارد ہوا ہے۔

وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ط (البقرہ: ۲۸۰)

"اگر (مقروض) تنگ حالی میں مبتلا ہو تو اُسے فراخی تک مہلت ملنی چاہیئے"۔

اس صیغہ کے استعمال سے حکم دینا مقصود ہے نہ کہ صرف ترغیب اور اظہار پسندیدگی۔ اس حکم کے پہلو بہ پہلو اسلام نرمی برتنے اور سہولت سے پیش آنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

رحم اللہ رجلاً سمحاً اذا باع واذا اشتری واذا اقتضی۔

(بخاری، ترمذی)

"اس شخص پر خدا اپنے رحم و کرم کی بارش کرے جو خرید و فروخت میں خوش دلی اور سلیقہ مندی برتتا ہے اور قرض کا تقاضا کرنے میں نرمی سے پیش آتا ہے"۔

قرض کے تقاضے میں نرمی اور شرافت مقروض کی عزت و آبرو کو محفوظ رکھنے کا باعث بنتی ہے اور اس کے دل میں قرض دینے والے کی محبت کے لیے جگہ بناتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے اندر یہ جذبہ ابھارتی ہے کہ حتی الامکان ادا کرنے کی پوری کوشش کرے۔ آپؐ نے فرمایا:

من سرہ ان ینجیہ اللہ من کرب یوم القیامۃ فلینفس عن معسر او یضع عنہ۔ (مسلم)

"جو قیامت کے روز کرب و اضطراب سے بچنا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ تنگ حال

مقروض کی مشکلات رفع کرے یا اس سے جو مطالبہ ہو اس میں کچھ کمی کر دے۔"

اور یہ کہ:

من انظر معسراً او وضع له اظله الله یوم القیامة تحت ظل العرش یوم لا ظل الا ظله۔ (ترمذی)

"جس نے تنگ حال مقروض کو مہلت دی یا اس کے لیے کچھ کمی (اصل قرض میں سے) کر دی اسے اللہ قیامت کے دن عرش پاک کے سایہ تلے لیگا جب کہ اس دن بجز اس کے سایہ کے کوئی سایہ میسر نہ ہوگا۔"

اس کے بالمقابل اسلام قرض دار کا فرض قرار دیتا ہے کہ وہ قرض کو ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کرے تاکہ اس طرح اپنی ذمہ داری سے بھی عہدہ برآ ہو جائے اور قرض دینے والے کے احسان کا بدلہ واپسی کے معاملہ میں وعدہ کا سچا ثابت ہو کر ادا کر دے۔ نیز اس کے اس طرزِ عمل کا ایک مزید فائدہ یہ بھی ہوگا کہ معاملات میں لوگوں کا باہمی اعتماد بڑھ جائے گا۔

من اخذ اموال الناس یرید اداءها ادی الله عنه و من اخذها یرید اتلافها اتلفه الله۔ (بخاری)

"جو ادا کرنے کی نیت سے لوگوں کا مال (قرض) لیتا ہو اللہ اس کی طرف سے ادائیگی کا بندوبست فرمائے گا۔ اور جو اڑانے پڑانے کی نیت سے لیتا ہے اللہ اس کو بربادی کے حوالہ کر دے گا۔"

چنانچہ جو ادا کرنے کی نیت سے قرض لے گا وہ ضرور کوشش کرے گا کہ کچھ کمائے اور روزی حاصل کرے۔ اور عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ دھن کا پکا عزت و شرف کمانے میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے، اور جو اڑانے پڑانے کے خیال سے لے گا وہ دوسروں کے مال پر عیش کرنے ہی میں ٹھاٹ جمائے گا اور سعی و جہد چھوڑ کر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے گا۔ نتیجہ میں کاہلی اور سستی اُسے آ دبوچے گی۔ اس کی ہمت جواب دے دے گی اور بالآخر وہ ناکامی اور تباہی سے دوچار ہوگا۔ اللہ کا رسول فرماتا ہے۔

مطل الغنی ظلمٌ (رواة الخمسة)

"مال رکھنے والے کا واپسی قرض میں خواہ مخواہ تاخیر کرنا صریح ظلم ہے۔"

ایک شخص نے دریافت کیا کہ " اللہ کے رسولؐ! آپؐ کا کیا خیال ہے اگر میں راہِ خدا میں قتل کیا جاؤں تو اللہ میری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا ؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: " ہاں، بشرطیکہ تو خالصتہً للہ لڑ رہا ہو، صبر و ثبات کا مظاہرہ کرے اور الٹے قدم بھاگتے ہوئے نہیں بلکہ آگے کو اقدام کرتے ہوئے مارا جائے " پھر آپؐ نے اس شخص سے فرمایا کہ ذرا اپنا سوال دُہرانا! اُس نے سوال کو دُہرایا۔ آپؐ نے فرمایا: " ٹھیک ہے۔ لیکن قرض نہیں بخشا جائے گا۔ جبریلؑ مجھے یہ بات بتا گئے ہیں۔"

گویا صاحبِ قدرت مقروض کے سر سے قرض کا بار اس طرح بھی نہیں ہٹ سکتا کہ وہ جہاد کرے، راہِ خدا میں مخلصانہ طور پر صبر و ثبات کے ساتھ لڑے اور پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہوا نہیں جرأت مندانہ اقدام کی حالت میں مارا جائے۔ کیونکہ قرض کا تعلق دوسروں کے حقوق سے ہے جو اس کے ذمہ ہیں۔ صرف اللہ کا حق نہیں۔ یہ اس شکل میں جب کہ وہ ادائے قرض پر قادر ہو۔ رہا معذور اور عاجز آدمی، تو وہ زکوٰۃ میں سے ایک حصہ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ ..... وَالْغٰرِمِیْنَ۔ اس کو ادائے قرض کی خاطر صدقہ کے طور پر کچھ دینا بھی مناسب ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص نے (کاروباری نقطۂ نظر سے) پھلوں کا ایک باغ خریدا۔ آفاتِ سماوی کے نتیجہ میں باغ تباہ ہوگیا۔ بے چارہ بہت مقروض ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس شخص پر صدقہ کرنے کی تلقین کی۔ چنانچہ لوگوں نے صدقہ کیا۔ لیکن اتنا مال نہ جمع ہو سکا کہ پورا قرض ادا کیا جا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہوں سے فرمایا کہ: جو مل جائے اُسے لے لو اب اور زیادہ تمہیں نہیں مل سکتا۔ (ترمذی)

جب پے در پے فتوحات کے نتیجہ میں کافی مال جمع ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلا قدم اٹھایا۔ اب آپؐ نے یہ دستور بنا لیا کہ مقروض افراد کے مرنے کے بعد ان کے ذمہ کے قرضے بیت المال سے ادا کر دیا کرتے:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یؤتی بالرجل المتوفی علیہ الدین فیسأل: ھل ترک لدینہ قضاء؟ فان حدث انہ ترک وفاء صلی علیہ، والا قال للمسلمین

ؔ مسلم، ترمذی، نسائی۔

صلّوا علی صاحبکم۔ فلمّا فتح اللّٰہ علیہ الفتوح قام فقال: انا اولی بالمؤمنین من انفسھم فمن مات علیہ دین ولم یترک وفاء فعلینا قضاءہ، ومن ترک مالاً فلورثتہ۔

(بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)

"حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: مقروض افراد کی میت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائی جاتی تو آپؐ دریافت کرتے: کیا اس نے اپنے قرض کی ادائیگی کے بقدر مال چھوڑا ہے۔ اگر جواب ملتا کہ اس نے اس قدر مال چھوڑا ہے کہ قرض ادا کیا جاسکے تب تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھاتے ورنہ مسلمانوں سے کہہ دیتے کہ اپنے ساتھی کی نمازِ جنازہ ادا کریں۔ جب اللہ نے آپ کو متعدد فتوحات عطا کیں تو آپؐ نے اعلان فرما دیا کہ: میں مسلمانوں کا ان کی نسبت بھی زیادہ قریبی اور سرپرست ہوں، پس جو اس حال میں انتقال کر گیا کہ اس پر قرض ہے اور اس کی ادائیگی کے لیے اس نے کافی مال نہیں چھوڑا تو اس قرض کی ادائیگی ہمارے ذمہ ہے اور جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے ورثاء کا حق ہے۔"

ان نظائر سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح اسلام کو اس کی بڑی فکر ہے کہ بے کس و مجبور کی مدد کی جائے اور اُسے ادائے قرض میں سہولت بہم پہنچائی۔ اسی طرح وہ اس بات کا بھی اہتمام کرتا ہے کہ ہر حق دار کو اس کا حق ملے۔ اسلام اس معاملہ کے ہر پہلو کا لحاظ رکھتا ہے۔ جملہ مصالح کا تحفظ عمل میں لاتا ہے اور حقوق و فرائض کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔

صَرف کی راہیں

اُوپر ہم نے ان حدود پر گفتگو کی ہے جو اسلام نے باہمی لین دین کے ذریعہ افزائشِ دولت کے سلسلہ میں عاید کی ہیں۔ جہاں اسلام نے کسبِ مال کے لیے یہ حدود متعین کی ہیں وہیں وہ مال کے صرف کو بھی یونہی بلا کسی ضابطے کے نہیں چھوڑ دیتا۔ چنانچہ صاحبِ دولت کو کھلی چھٹی نہیں دی گئی کہ جس حد تک چاہے مال کو نہ صرف کرے اور روکے رکھے یا جہاں جس طرح چاہے اُسے خرچ کرتا رہے۔ گو اس طرح کا تصرف ایک شخصی مسئلہ ہے لیکن اسلام میں فرد کی یہ حیثیت نہیں تسلیم کی گئی ہے کہ وہ اپنے شخصی معاملات میں من مانی کرنے کا اختیار

رکھتا ہے۔ بلا شبہ اُسے ایک گونہ آزادی حاصل ہے لیکن چند متعین حدود کے اندر رہتے ہوئے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاید ہی کوئی انفرادی فعل ہو جس کا تعلق دوسروں سے کچھ بھی نہ ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ تعلق بالکل واضح اور قریبی نہ ہو۔

اسلام کو نہ تو اسراف کی حد تک بڑھا ہوا خرچ کرنا پسند ہے نہ کنجوسی کی حد تک ہاتھ روکنے کو وہ صحیح سمجھتا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ہی طریقے بالآخر اس فرد اور پوری جماعت کے حق میں نقصان کا باعث بنتے ہیں:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ○ (اسراء: ۲۹)

"اپنے ہاتھ کو گلے میں باندھ کر سکیڑ نہ لو، نہ اسے پوری طرح پھیلا کر (بعد میں تو ہدف ملامت بن کر تنگ دستی کے عالم میں بیٹھ رہنے پر مجبور ہو جائے۔"

يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ خُذُوا۟ زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا۟ وَاشْرَبُوا۟ وَلَا تُسْرِفُوٓا۟ ج إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ○ (الاعراف: ۳۱)

"اے بنی آدم! ہر مسجد میں تم اپنے کو زیب و زینت دینے والے اسباب کو ساتھ رکھو اور کھاؤ پیو لیکن اسراف میں نہ مبتلا ہو، درحقیقت اللہ تعالیٰ مسرفین کو پسند نہیں کرتا۔"

صرف سے دست کشی کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ نفس جائز حد تک بھی آرام و راحت نہ اٹھا سکے دریں حالیکہ اسلام ضروری قرار دیتا ہے کہ فرد شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی ذات کو بھی آرام پہنچائے اور مختلف لذائذ سے لطف اندوزی کا موقع دے۔ اسے یہ بات چنداں گوارا نہیں کہ لوگ ان چیزوں سے بھی محروم رکھے جائیں۔ جو حرام نہیں قرار دی گئی ہیں۔ کیونکہ زندگی کو معقول اور خوش گوار ہونا چاہیے۔ ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں حسن و جمال پیدا ہو سکے اور اسے بلا اسراف اور لہو و لعب میں مبتلا ہوئے شاداں و فرحاں اور شاداب و شگفتہ رکھا جا سکے۔ اسلام نے ترکِ لذائذ سے زہد و تقشف اور پاکیزہ و طیب نعمتوں سے خود کو محروم کر لینے کا حکم کبھی نہیں دیا۔

چنانچہ مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ اسلام انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ مناسب حد تک زیب و زینت اختیار کرے، اس آیت کے بعد ہی قرآن استفہام انکاری کے انداز میں کہتا ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

(الاعراف: ۳۲-۳۳)

"اُن سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو خالصتہً انہی کے لیے ہوں گی۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔ اُن سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام ـــــ خواہ کھلے ہوں یا چھپے ـــــ اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی کو شریک کرو۔ جس کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے۔"

اسلام چاہتا ہے کہ تمام لوگ، بڑے چھوٹے اور امیر و غریب، سب زندگی کو خوش گوار بنانے والی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں خطاب کا رُخ "بنی آدم" کی طرف ہے۔ اب اگر وہ کبھی صبر اور تسلیم و رضا کی تلقین کرتا ہے۔ تو اس کے معنی زہد اور ترکِ دنیا کے نہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب شدائد و مصائب آن پڑیں تو اُن کے دور ہونے یا دور کیے جانے تک آدمی بجائے گھرانے کے اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ رہے۔ ایسے مواقع کے علاوہ فرد ہمیشہ اس بات کا مکلف ہے کہ حلال چیزوں سے متمتع ہوتا رہے۔ اور جماعت پر اس بات کی ذمہ داری عاید کی گئی ہے کہ اپنے سارے افراد کے لیے یہ چیزیں مہیا کرنے کی کوشش کرے۔ اور انہیں اُن چیزوں سے محروم نہ رکھے جن سے مستفید ہوتے رہنے کی دعوت ان کو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔

اسی لیے اسلام نے فقراء کو ـــــ یعنی اُن لوگوں کو جو نصابِ زکوٰۃ سے کم مال رکھتے ہیں۔

ـــــــ زکوٰۃ میں سے ایک حصہ کا مستحق قرار دیا ہے جس کا منشا صرف یہی نہیں کہ اُن کو کفاف (ناگزیر ضرورت کے بقدر) میسّر آجائے۔ کیونکہ اتنا توان کے پاس ہوتا ہی ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ اُن کو رزق میں مزید فراخی نصیب ہو۔ یہ اس لیے کہ اسلام صرف بقدر کفاف کا طالب نہیں بلکہ وہ زندگی سے متمتع ہونے پر اُبھارتا ہے۔ ظاہر ہے کہ متمتع ہونے کا سوال کفاف کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے اور اس سے زائد ملنے پر ہی ممکن ہے۔

جب اسلام فقیر کو زکوٰۃ میں سے حصّہ دیتا ہے تاکہ اس مزید مال سے وہ اپنے نفس کی آسائش کا کچھ سامان کرے اور ناگزیر ضروریات کے ماسوا بھی سامانِ حیات سے لُطف اندوز ہو سکے، تو صاحب مال کو بدرجۂ اولیٰ خرچ کرنا چاہیئے۔ اسے ایک معقول حد تک سامانِ حیات فراہم کرنا چاہیئے اور اپنے نفس کو پاکیزہ اشیاء سے محروم نہ کرنا چاہیئے ـــــــ اور ظاہر ہے کہ پاکیزہ اشیاء بکثرت اور بے شمار ہیں ـــــــ تاکہ زندگی میں نکھار پیدا ہو۔ وہ حسن و جمال سے آراستہ ہو اور (اس خوش گوار فضا میں) انسان کی طبیعت ضروریات سے ماوراء بلندیٔ فکر اور لطافتِ احساس کی فضا میں سانس لے سکے، اور اس کارخانۂ تخلیق اور عالم موجودات پر غور و فکر نیز (اس صناعی کے) کمال اور جمال کی بلندیوں کا شعور پیدا کرنے والے تدبّر میں محو ہو سکے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اذا اٰتاك الله نعمة فليرَ اثر نعمة الله عليك وكرامته۔

(ابوداؤد۔ نسائی)

"جب اللہ تجھے نعمت سے نوازے تو ضروری ہے کہ اس انعام الٰہی کا اثر تیرے (ظاہر کے) اوپر دیکھا جا سکے۔"

گویا آپؐ کے نزدیک باوجود قدرت کے خستہ حال اور مسکین صورت بنا رہنا اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناقدری، بلکہ ان کے انکاری کے ہم معنیٰ ہے جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے۔

یہ ساری گفتگو ایک زاویۂ نگاہ سے تھی۔ مال کے گردش میں آنے اور صَرف کیے جانے سے روکنے کو اسلام ایک اور زاویہ سے بھی دیکھتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس کا اس طرح روکے رہنا اس کے حقیقی عمل کو معطل کر دینا ہے۔ جماعت کا مفاد متقاضی ہے کہ اس کی دولت ہمیشہ گردش کرتی رہے تاکہ زندگی ہر طرح پھلے پھولے پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو، محنت کاروں کے لیے وسائل کار فراہم ہوں اور انسانیت عامہ کو تعمیری سرگرمیوں کے پورے پورے مواقع میسّر آئیں، مال کا روکے رکھنا اس پورے نظام کو معطل کر دینا

ہے۔ لہٰذا وہ اسلام کے نزدیک حرام ہے۔ اس سے مالدار افراد کے مخصوص مفادات اور سماج کے عام مصالح دونوں کا خون ہوتا ہے۔

اسراف دوسری انتہا کا نام ہے، اور وہ بھی فرد اور جماعت دونوں کے لیے مہلک ہے۔ یہاں یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ اللہ کی راہ میں مال صرف کرنا، خواہ سارے کا سارا مال اس مصرف میں کام آجائے، اسراف نہیں کہلاتا۔ اُوپر وہ حدیث گذر چکی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمنا ظاہر کی ہے کہ اگر آپؐ کے پاس پہاڑ برابر سونا ہوتا تو بھی اُسے کل کا کل اللہ کی راہ میں خرچ کردیتے اور ذرّہ برابر بھی بچا کر نہ رکھتے۔ اسراف کا اطلاق اُس فضول خرچی پر ہوتا ہے جو اپنے نفس کی خاطر کی جائے اور اسلام کو اسی سے بحث ہے۔

ان معنٰی میں اسراف اسی عیش پرستی کا نام ہے جسے اسلام سخت ناپسند کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ بات بہت بُری ہے کہ مال امیروں ہی کے درمیان گردش کرتا رہے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ کثرتِ مال لوگوں کو عیش و عشرت میں مبتلا کردے۔ اسلام عیش پرستی کو فرد و جماعت دونوں کے لیے شر و فساد کا منبع قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک یہ ایک ایسا منکر ہے جسے مٹا دینا جماعت کا فرض ہے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اسی کے سبب خود کو ہلاکت کے منہ میں جا ڈالے گی۔

ایسی بہت سی آیات اور متواتر حدیثیں ہیں جو دو ٹوک الفاظ میں عیش کوشی کو ناپسندیدہ اور حرام قرار دیتی ہیں۔ یہ واضح طور پر بتاتی ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک یہ انتہائی گھناؤنے قسم کا فعل حرام ہے۔ وہی اسلام جو لوگوں کو زندگی کی پاکیزہ نعمتوں سے لُطف اندوز ہونے کی دعوت دیتا اور اس بات کو ناپسندیدہ قرار دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو انہیں حلال قرار دیا مگر لوگ انھیں اپنے اوپر حرام کرلیں، وہ اسلام جو زندگی کو صرف باقی رکھنے اور خستہ حال بنا کر رکھنے کی بجائے اسے حسین، خوشگوار اور دل پسند بنا کر گزارنے پر اُبھارتا ہے، وہی اسلام اسرافِ بے جا اور عیش پرستی کو اتنی ہی شدت کے ساتھ ناپسندیدہ اور نامرغوب قرار دیتا ہے۔

چنانچہ قرآن بتاتا ہے کہ عیش پرست کم ہمت، کمزور اور بُزدل ہوتے ہیں:

وَإِذَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ ءَامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَجَٰهِدُوا۟ مَعَ رَسُولِهِ ٱسْتَـْٔذَنَكَ أُو۟لُوا۟ ٱلطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا۟ ذَرْنَا نَكُن مَّعَ ٱلْقَٰعِدِينَ ۝

(التوبہ: ۸۶)

"اور جب کوئی سورۃ اِس مضمون کی نازل ہوئی کہ اللہ کو مانو اور اس کے رسولؐ کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو تم نے دیکھا کہ جو لوگ اُن میں سے صاحبِ مقدرت تھے وہی تم سے درخواست کرنے لگے کہ انھیں جہاد کی شرکت سے معاف رکھا جائے اور انھوں نے کہا کہ ہمیں چھوڑ دیجئے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں۔

اسلام ان صاحبِ قدرت لوگوں کو مجاہدین کی صفوں سے پیچھے ہٹ جانے اور بیٹھ رہنے پر کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا پورا اندازہ اس وقت ہوگا جب ہم اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ اسلام جہاد کو کتنی اہمیت دیتا ہے، اس کی کتنی ترغیب دلاتا ہے اور جو لوگ خود سے اس کی طرف بڑھیں ان کو کتنا بلند مرتبہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

من مات ولم یغزولم یحدث نفسہ بغزوٍ مات علی شعبۃٍ من النفاق۔ (مسلم۔ ابوداؤد۔ نسائی)

"وہ شخص یک گونہ نفاق کی حالت میں مرا جس نے موت تک اللہ کی راہ میں جنگ نہ کی، اور نہ اس کے دل میں اس کا کوئی ارادہ پیدا ہوا۔"

یہ چنداں تعجب کی بات نہیں کیونکہ عیش پرست کاہل اور سہولت پسند ہوتا ہے۔ نہ اس میں مردانگی باقی رہتی ہے نہ قوتِ ارادی۔ اس نے محنت و مشقت کی عادت نہیں ڈالی، لہٰذا اس کا جذبہ دروں سرد پڑ جاتا ہے اور اس کی تمنّیں پست ہو جاتی ہیں۔ جو چیز اس کو عزیز ہے وہ شہوانی لذائذ ہیں۔ جہاد کے سلسلہ کی مشقتیں اُسے کچھ عرصہ کے لیے ان حیوانی لذتوں سے محروم کر دیتی ہیں۔ اور ایسا آدمی بجز ان بے حیا اور فحش و ناکارہ اقدار کے زندگی میں کسی اور چیز کی قدر و قیمت سے آشنا ہی نہیں ہوتا۔

قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ تاریخِ انسانی میں مُترفین کا عمل کیا رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ اس ہدایت کی راہ میں روڑا ثابت ہوتے ہیں جو ان کے اور اُن کے زیردستوں کے لیے آئی ہے۔ جس سماج میں کچھ لوگ عیش پرست ہوں وہاں زیردستوں کا ایک گروہ بھی ضروری ہے تاکہ وہ ان کی خوشامدیں کر کے ان کے کبرِ نفس کو تسکین دے۔ محنت کر کے اُن کی خواہشات پوری کرے اور اُن کی چاکری کرتا ہوا کیڑے مکوڑوں کی طرح فنا ہو جائے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا

اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ (سبا ء : ۳۴)

"ہم نے جب کبھی کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا تو اس کے خوش حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم تو اس چیز کا انکار کرتے ہیں جسے لے کر تم بھیجے گئے ہو۔"

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَاءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ○ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ○ (المومنون : ۳۳-۳۴)

"اور اس کی قوم کے اُن سرداروں نے جنھوں نے کفر کیا تھا اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا تھا اور جنھیں ہم نے دنیا کی زندگی میں خوش حال بنایا تھا، یہ کہا: یہ تو تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے اور کچھ نہیں، جو تم کھاتے ہو وہی یہ بھی کھاتا ہے اور جو تم پیتے ہو وہی یہ بھی پیتا ہے۔ اگر تم نے اپنے جیسے ایک آدمی کی اطاعت کی تب تو تم واقعی بڑے ہی گھاٹے میں رہو گے۔"

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ○ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ○

(الاحزاب : ۶۷-۶۸)

"اور انہوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور اپنی قوم کے بڑے لوگوں کی پیروی کی اور انھوں نے ہمیں راہ راست سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے پروردگار! ان (سرداروں اور بڑے) لوگوں کو دوگنا عذاب اور ان پر بہت بڑی لعنت کر۔"

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ عیش پرستوں کو جس چیز کی سب سے زیادہ فکر ہوتی ہے وہ اُن کی نرالی سہل پسندانہ اور مریضانہ زندگی ہے۔ یہ اپنی خواہشات اور مرغوبات سے چمٹے رہتے ہیں۔ ان کو اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے خدمت گذاروں اور نمک خواروں کا ایک گروہ چاہیے۔ دین و ایمان ان کو ان مرغوبات کے ایک بڑے حصّہ سے محروم کر دیتا ہے اور دنیا کی نعمتوں سے لُطف اندوز ہونے کے لیے چند راہیں متعین کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جائز حدود ان کے لیے بہت کم اور غیر تشفی بخش ثابت ہوتی ہیں۔ جس پر اُن کی مریضانہ ذہنیت اور بے لگام خواہشات قانع نہیں ہوتیں۔ پھر اسی پر بس نہیں۔ اسلام تمام انسانوں کی قدر و قیمت بالا کرتا ہے

اور ان عیش پرستوں کے لیے مفلس و کمزور طبقات پر اس طرح کی حکومت جتانے کا موقع نہیں باقی رہتا۔ جس کے سبب وہ اُن کے آلۂ کار اور غلام بنے رہتے ہیں۔ اسلام ان اوہام و خرافات اور بے بنیاد قصوں کو بھی ختم کر دیتا ہے جن کے ذریعہ یہ لوگ اپنے گرد ایک ہالہ بنا لیتے ہیں اور جاہل و گمراہ اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والے سماج میں انھیں استحصال کے لیے ایک مؤثر حربے کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے، یہ لوگ ہر ہدایت اور ہر روشنی کے دشمن ہوتے ہیں۔ عیش پرستی ضمیر انسانی پر جو اثر ڈالتی ہے اور لذت پرستی کی زندگی انسان کے جذباتِ عالیہ کو جس جمود و خمود کا شکار بنا دیتی ہے وہ ان خرابیوں کے علاوہ ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَقُولُ ءَ أَنْتُمْ أَضْلَلْتُمْ عِبَادِي هٰؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ ۝ قَالُوا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلٰكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ج وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا ۝ (الفرقان: ۱۷-۱۸)

"اور وہی دن ہو گا جب کہ (تمہارا رب) ان لوگوں کو بھی گھیر لائے گا اور ان کے اُن معبودوں کو بھی بلائے گا جنہیں آج یہ اللہ کو چھوڑ کر پوج رہے ہیں۔ پھر وہ اُن سے پُوچھے گا کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ یا یہ خود راہِ راست سے بھٹک گئے تھے؟ وہ عرض کریں گے پاک ہے آپ کی ذات، ہماری یہ مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو اپنا مولیٰ بنائیں، مگر آپ نے ان کے باپ دادا کو خوب سامانِ زندگی دیا حتّٰی کہ یہ سبق بھول گئے اور شامت زدہ ہو کر رہے۔"

یعنی عیش و عشرت کے سامان جو عرصۂ دراز تک میسر رہیں اور آباء و اجداد سے ورثہ میں ملے ہوں انسان کو خدا سے غافل کر دیتے اور ناکارہ بنا کر چھوڑتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ لوگ "بُور" ہو گئے، قرآن نے گویا اُن کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اس میں بڑے گہرے معانی پوشیدہ ہیں۔ "بُور" اُن قحط زدہ زمینوں کو کہتے ہیں جو کچھ پیدا کر کے نہیں دیتی ہیں۔ اُن لوگوں کے دل، اُن کی طبیعتیں اور ان کی پوری زندگی اسی طرح سخت اور بنجر ہو جاتی ہے۔ اب اس میں زندگی کی کوئی بھی حرکت نہیں محسوس کی جا سکتی۔

اللہ کا رسول مُترفین کے گھروں کو شیطان کے ٹھکانے قرار دیتا ہے کہ انہی سے فساد پھوٹتا ہے اور وہیں پر سر اٹھاتا ہے:

تكون ابل للشياطين وبيوت للشياطين فاما ابل الشيطان

فقد رأیتها، یخرج احدکم بنجیبات معہ قد اسمنها فلا یعلو بعیراً منها، و یمر باخیہ قد انقطع فلا یحملہ واما بیوت الشیطان فلا اراها الا ہذہ الاقفاص التی تستر الناس بالدیباج۔ (ابوداؤد)

"شیطان کے اونٹ بھی ہوتے ہیں اور گھر بھی۔ شیطان کے اونٹوں کو میں نے خود دیکھا ہے تم میں سے کوئی اپنے ساتھ بہترین قسم کے اونٹ لیے نکلتا ہے جسے اُس نے کھلا پلا کر خوب فربہ کیا ہوتا ہے۔ وہ نہ تو کسی اونٹ پر خود سوار ہوتا ہے نہ اپنے اس بے سہارا بھائی کو اُس پر سوار کراتا ہے جو اُسے راستہ میں ملتا ہے۔ ایسے شیطان کے گھر تو میرے نزدیک وہ پنجرے ہیں جو لوگوں کو دیباج سے ڈھانک دیتے ہیں"[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اونٹوں کو جن پر ان کے مالکوں کو سواری کی چنداں ضرورت نہ تھی جب کہ کتنے ہی اکیلے مسافر سواری سے محروم تھے، شیطان کے اونٹ قرار دیا۔ اور آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شاندار موٹریں چھوٹے چھوٹے کاموں کے سلسلہ میں ادھر اُدھر دوڑا کرتی ہیں۔ جب کہ ہزاروں افراد کو ٹرام کے ٹکٹ کے لیے چند پیسے بھی میسّر نہیں ہوتے اور سینکڑوں افراد تو ایسے ہیں جن کو چلنے کے لیے دو پاؤں بھی نہیں میسّر۔ کیوں کہ ان کی ٹانگیں حادثوں کی نذر ہو چکیں۔ رہے وہ گھر جنھیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان "پنجروں" سے تعبیر کیا تھا جو (اپنے اندر رہنے والے) لوگوں کو دیباج (کے پردوں) سے ڈھانک دیتے ہیں۔ تو وہ آج بھی نظر آتے ہیں آج ان گھروں میں عیش و عشرت کے ایسے ایسے سامان پائے جاتے ہیں جو اُس زمانے کے انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔

عیش و عشرت کا باعثِ ہلاکت ہونا ایک تاریخی حقیقت ہے، کیونکہ متاعِ دنیا کی فراوانی اور اُن میں انہماک سے انسان میں اترابٹ پیدا ہوتی ہے۔

---

[1] یہ حدیث ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب الجنائب میں آئی ہے۔ لیکن حدیث کے الفاظ اُس سے کچھ مختلف ہیں جو مصنف نے لکھے ہیں۔ ابوداؤد کی شرح عون المعبود میں قفص سے ہودج مراد لیا گیا ہے۔ اقفاص وہ ہودج ہیں جن پر ریشمی پردے ڈالے جاتے تھے۔ جیسا کہ مصنف کی عبارت سے واضح ہے۔ وہ اس کی شرح کچھ اور ہی کرتے ہیں۔ (مترجم)

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ج فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ط (قصص : ۵۸)

"اور ہم نے کتنی ہی بستیاں ایسی غارت کر دیں جو اپنی معاشی حالت پر اترانے لگی تھیں تو یہ ہیں اُن کے گھر بار جو اُن کے بعد بہت ہی کم آباد ہو سکے۔"

عیش پرستی آخرت میں عذابِ شدید سے دوچار کراتی ہے۔ کیونکہ اس کے سبب آدمی طرح طرح کے گناہوں سے آلودہ ہوتا ہے۔

وَأَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَآ أَصْحٰبُ الشِّمَالِ o فِي سَمُومٍ وَحَمِيمٍ o وَظِلٍّ مِنْ يَحْمُومٍ o لَا بَارِدٍ وَلَا كَرِيمٍ o إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِينَ o وَكَانُوا يُصِرُّونَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيمِ o وَكَانُوا يَقُولُونَ أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا ءَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ o أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ o

(الواقعہ : ۴۱ تا ۴۸)

اور بائیں جانب والے، کیسے بائیں جانب والے؟ بادِ سموم اور کھولتے پانی میں۔ دھوئیں کے سایہ میں۔ جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ اچھا۔ یہ لوگ اس سے پہلے (دنیا میں) خوش حال لوگ تھے۔ یہ لوگ گناہِ عظیم (یعنی شرک و کفر) پر مُصر تھے۔ اور کہا کرتے تھے: کیا جب ہم مر کر مٹی اور ہڈی بن چکے ہوں گے تو ہمیں پھر اُٹھایا جائے گا؟ اور ہمارے اگلے باپ دادوں کو بھی!"

لیکن یہ دنیوی تباہی اور اُخروی عذاب صرف عیش پرست فرد پر نہیں آتا بلکہ اس پوری جماعت کو گھیر لیتا ہے جو مترفین کے وجود کو برضا و رغبت گوارا کرتی رہتی ہے

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا[1] مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيرًا o (بنی اسرائیل : ۱۶)

---

[1] یہاں اَمَرْنَا کے معنی اکثرنا (تعداد بڑھا دینا) کے ہیں (مصنف)۔ جیسا کہ ہمارے ترجمہ سے ظاہر ہے ہمارے لیے مصنف کی رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے (مترجم)

"جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں۔ تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اُسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔"

جماعت میں عیش پرستوں کا وجود، جماعت کا اُسے بخوشی گوارا کر لینا اور اپنی خاموشی کے ذریعہ گویا اس کی اجازت دینا، عیش و عشرت کے اسباب کا ازالہ کرنے کی طرف توجہ نہ کرنا اور عیش پرستوں کو فساد پھیلانے کے لیے آزاد چھوڑ دینا یہ اپنی عین فطرت کے اعتبار سے ایسے اسباب و عوامل ہیں جو بالآخر لازماً تباہی اور بربادی کے گڑھے میں گرا دیتے ہیں۔ اس آیت میں ارادہ کے یہی معنی ہیں یعنی مقدمات کے متحقق ہو جانے پر ان کے نتائج مرتب کرنا اور اسباب فراہم ہو جانے پر اُن کے مسببات کو بروئے کار لا دینا، جیسا کہ حیات و کائنات میں ازل سے اللہ تعالیٰ کا طریقہ رہا ہے۔

اپنے اندر نمودار ہونے والے اس منکر کے بارے میں جماعت ہی کو جوابدہ قرار دیا گیا ہے کسی جماعت میں عیش پرستی کا وجود لازماً اس کے اندر منکر کے فروغ کا ذریعہ بنتا ہے۔ اوپر ہم نے یہ بتایا ہے کہ فاضل قوت اپنا کوئی نہ کوئی مصرف تلاش کر لیتی ہے۔ ان مترفین کے پاس فاضل مال، فالتو جسمانی طاقت اور خالی وقت ہوتا ہے۔ جس میں نہ انہیں کوئی کام ہوتا ہے نہ کسی کام کی فکر۔ یہ سب مختلف طرح کی قوتیں ہیں۔ صاحب ثروت نوجوان مرد اور عورتیں جن کو جوانی، دولت کی فراوانی اور وقت کی ارزانی سبھی کچھ میسر ہے، فسق و فجور نہ کریں گے تو کیا کریں گے؟ ان کو وقت، مال اور جسم کی ان فاضل قوتوں کے کچھ مصرف تلاش کرنے پڑتے ہیں اور اکثر یہ مصارف بہت پست قسم کے ہوتے ہیں جو زمانہ اور ماحول کے اعتبار سے مختلف روپ دھارتے رہتے ہیں لیکن پستی و ذلت اور ظاہری و معنوی خباثت ایک قدر مشترک کے طور پر اُن میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

دوسری طرف نفع اندوزوں، استحصال کرنے والوں اور حاجت مندوں کا گروہ ہوتا ہے۔ جس میں بردہ فروش، مسخرے اور ان عیش پرستوں کے حاشیہ نشین اور خدمت گزار شامل ہوتے ہیں جو اپنے قول و عمل سے بے حیائی، فحاشی، عیش پرستی اور سہل پسندی کی اشاعت میں ہمہ دم مشغول رہتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کی ان تمام اعلیٰ قدروں کی توہین کرتے رہتے ہیں جو مترفین کے اس گروہ کے مفاد و مذاق سے ٹکراتی ہیں۔

رفتہ رفتہ یہ مرض زندگی کے تمام شعبوں میں پھیل جاتا ہے اور یہ خرابیاں بالآخر ایک ایسی فضا بنا دیتی ہیں کہ فحاشی اور بے حیائی پوری قوم میں عام ہو جاتی ہے۔ ایک بے قیدا باحیت ہر کس و ناکس کا شعار قرار پاتی ہے۔ لوگوں کے نہ صرف جسم بلکہ دماغ بھی کسل و اضمحلال کا شکار ہو کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اور روحانی اور معنوی اقدار کا چراغ ٹمٹمانے لگتا ہے۔ جب سماج اِن پستیوں میں جا گرتا ہے تو اللہ کی سنت کے مطابق وہ تخریب و ہلاکت کا مستحق قرار پا جاتا ہے اور اللہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیتا ہے۔

یہ ہے اسلام کی نظر میں جرمِ عیش پرستی کی تاریخ اور اس کا انجام۔ یہ خرابی پہلے چند انفرادی کرداروں میں نمودار ہوتی ہے۔ پھر جب جماعت اسے خاموشی سے گوارا کر لیتی ہے تو یہ فساد اپنے نتائج سامنے لاتا ہے اور یہ جماعت کے جسم کو اپنے نامبارک اثرات سے رِستے ہوئے ناسوروں میں بدل دیتا ہے۔ مقدمات پر نتائج کے مرتب ہونے اور فراہمی اسباب پر مسببات کے ظہور میں آنے کے قاعدہ کے تحت یہ فساد جماعت کو بالآخر ہلاکت کے غار میں ڈھکیل دیتا ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۝ (الاحزاب: ۶۲)

"تم اللہ کے طریقہ کو بدلتا نہ پاؤ گے"

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عیش پرستی اور مفلسی کے حدود کیا ہیں اور اُن کے مابین اعتدال و توسط کی راہ کیا ہے؟

جب ہم اسلام کے اوّلین دورِ عروج کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ خستہ حالی اور مفلسی کا دور دورہ ہے اور فقر و فاقہ عام ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ریشمی لباس پہننے سے منع فرمایا:

مَن لبس الحرير فی الدنیا لم یلبسه فی الاخرة (بخاری)

"جس نے دنیا میں ریشم (کا کپڑا) پہنا اُسے آخرت میں ریشمی لباس نہ نصیب ہوگا۔"

اور علی کرم اللہ وجہہٗ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو قسی[1] اور زرد رنگ کا

---

[1] ایک سوتی کپڑا جس پر ابریشم سے بنے ہوئے نقش و نگار ہوتے تھے۔ یہ کپڑا عرب میں مصر سے درآمد کیا جاتا تھا۔

کپڑا پہننے اور سونے کی انگوٹھی سے روک دیا تھا۔ یہ ممانعت صرف مردوں کے لیے تھی۔ عورتوں کے لیے ریشمی لباس اور سونے کے زیور مباح قرار دیے گئے۔ اگرچہ رسول اللہ نے یہ نہیں پسند کیا کہ آپؐ کی صاحبزادی فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سونے کے زیور پہنیں۔ لیکن یہ ایک خصوصی حکم تھا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر والوں کے لیے دیا تھا، عام لوگوں کے لیے ایسا کرنا ضروری نہیں قرار دیا تھا۔

ہمارے نزدیک یہ کہنا حرام کو حلال کر دینے کے مترادف نہ ہوگا کہ اگر قوم کے احوال و ظروف کا تقاضا نہ ہو تو اسلام بذاتِ خود خستہ حالی اختیار کرنے کی دعوت نہیں دیتا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رنگین اور شوخ کپڑے اور ریشمی یا نقش و نگار سے آراستہ لباس پہننے سے مرد کی امتیازی شان گھٹتی اور اُس کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ ایسے لباس سے ان میں عیش کوشی اور سہل پسندی راہ پاتی ہے۔ خاص طور پر زمانۂ جہاد میں اور یا ایسی شکل میں جب کہ جماعت کے اقتصادی حالات ایسے بناؤ سنوار کی اجازت نہ دیتے ہوں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی نہیں گوارا کہ یہ خستہ حالی بھونڈے پن اور بدسلیقگی تک جا پہنچے کہ آدمی اپنے لباس سے لاپروا ہی برتنے لگے اور اُسے دیکھ کر وحشت ہو۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ آپؐ نے ایک شخص کو دیکھا کہ پریشان حال ہے اور اس کے بال پراگندہ ہیں، آپؐ نے فرمایا:

"کیا اسے اپنے سر کے (بال) درست کرنے کے لیے کوئی چیز نہ مل سکی؟"

ایک بار آپؐ نے ایک شخص کو میلے کچیلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا:

"کیا اسے اپنے کپڑے دھونے کے لیے کچھ بھی نہ مل سکا؟"

ابوالاحوص الجشمی نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال میں دیکھا کہ پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ:

"کیا تمہارے پاس کچھ مال ہے؟"

میں نے جواب دیا "ہاں"

آپ نے فرمایا "کس قسم کا مال ۔؟"

میں نے عرض کیا کہ :" اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کے مال دے رکھے ہیں، اونٹ ہیں اور بکریاں ہیں۔"

آپ نے فرمایا:

اذا اٰتاک اللہ مالاً فلیُرَ اثر نعمتہ وکرامتہ علیک ۔ (ابو داؤد۔ نسائی)

"جب تجھے اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو ضروری ہے کہ تیرے (ظاہر کے) اوپر اس کی نعمت اور کرم فرمائی کا اثر بھی محسوس کیا جائے۔"

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ طیب، یحب الطیب، نظیف یحب النظافۃ کریم یحب الکرم جواد یحب الجود، نظفوا افنیتکم ولا تشبھوا بالیھود۔

(ترمذی، بسند حسن)

" اللہ پاک ہے اور پاکیزگی کو پسند فرماتا ہے۔ صاف ستھرا ہے اور صفائی ستھرائی اُسے پسند بھی ہے۔ خود کریم ہے اور رحم وکرم کو محبوب رکھتا ہے۔ سخی ہے اور اسے سخاوت پسند ہے۔ لوگو! تم بھی اپنے جسموں کو صاف ستھرا رکھا کرو اور یہود کی طرح (گندے) نہ ہو جاؤ۔"

اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو زیب وزینت اختیار کرنے اور حلال و پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہرا لینے کا جو حکم دیا ہے اس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ سماج کی عام معاشی سطح ہی عیش کوشی اور بدحالی کی حدیں متعین کر سکتی ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بڑے بڑے ملکوں کا فاتح بنایا، دولت عامّہ میں اضافہ ہوا اور معاشی سطح بلند ہوئی تو ان کے لباس بھی بدل گئے اور وہ ان نعمتوں سے بھی لُطف اندوز ہونے لگے جن سے وہ پہلے نہیں لُطف اندوز ہوتے تھے۔ کسی نے بھی اُن کو ایسا کرنے پر ملامت نہیں کی الّا یہ کہ یہ کبھی حدِ معقول سے تجاوز کر گئے ہوں (اور تب ان پر تنقید کی گئی ہو) نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

کُل ما شئت والبس ما شئت ما اخطئتک اثنتان سرفٌ او مخیلۃ

(بخاری)

"جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو، بشرطیکہ اسراف اور اتراہٹ ان دونوں چیزوں سے بچے رہو۔"

لیکن ساتھ ہی ہم اس حقیقت پر زور دینا چاہتے ہیں کہ اسلام کو زندگی کی جو روش پسند ہے اور جسے وہ عام طور پر رائج دیکھنا چاہتا ہے وہ سادگی کی روش ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں کا امتیازی نشان یہ قرار دیتا ہے کہ ان کا نفس مادی سازو سامان سے بے نیاز ہو اور وہ اس سازو سامان کے غلام بن کر نہ رہ جائیں۔

تعس عبد الدرھم، تعس عبد الدینار، تعس عبد القطیفۃ۔
تعس وانتکس، واذا شیک فلا انتقش ...... (بخاری)

"درہم کا پرستار ہلاک ہو، دینار کا بندہ ہلاک ہو، مخملی شال کا غلام ہلاک ہو، ہلاک ہو اور منہ کے بل گرے۔ پھر جب اُسے کانٹا چُبھے تو وہ بھی نہ نکالا جائے"

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ مادی سازو سامان سے بے نیازی کے ساتھ اس کو برتنے میں میانہ روی اختیار کی جائے۔ قلبِ مسلم کا ذوق واساس راہِ اعتدال کو خوب جانتا ہے۔

فریضۂ زکوٰۃ

اب ہمارا موضوعِ بحث زکوٰۃ ہے جو ارکانِ اسلام میں سے ایک ایسا رکن ہے جو واضح طور پر اجتماعی واقع ہوا ہے۔ اسلام کے اقتصادی نظام پر گفتگو میں زکوٰۃ کی بحث مرکزی مقام کی حامل ہے۔

زکوٰۃ مال میں عاید ہونے والا ایک حق ہے۔ ایک اعتبار سے تو یہ عبادت ہے اور اپنے دوسرے پہلو کے اعتبار سے ایک اجتماعی فریضہ۔ عبادات اور اجتماعی مسائل کے باب میں اسلام کے مخصوص طرزِ فکر کو سامنے رکھتے ہوئے ہم زکوٰۃ کو ایک تعبدی اجتماعی فریضہ قرار دیں گے۔ اسی لیے اسے زکوٰۃ کا نام دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں طہارت اور نمو کے۔ یہ عبارت ہے ضمیر کی اس پاکیزگی سے جو حقِ واجب کی ادائیگی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یہ قلب کی اس صفائی کا نام ہے جو حبِ ذات اور حرص و بخل کے طبیعی خصائص سے بلند و بے نیاز ہو جانے پر میسر آتی ہے۔ مال ہر ایک کو عزیز ہوتا ہے اور اپنی ملکیت ہر ایک کو محبوب ہوتی ہے۔ نفس اسے دوسروں کی خاطر صرف کرے تو اُسے پاکیزگی اور برتری حاصل ہوتی ہے۔ اسی میں اس کی بھلا مضمر ہے۔ زکوٰۃ مال کی وہ پاکیزگی ہے جو

اُسے حق مال ادا کرنے اور اس طرح حلال قرار پا جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کا یہی تعبدی پہلو ہے جس کے سبب اسلام کے لطیف احساس نے یہ گوارا نہ کیا کہ اہلِ ذمہ اور اہلِ کتاب سے اس کی ادائیگی کا مطالبہ کرے۔ چنانچہ اس نے اس کے عوض ان پر جزیہ عاید کیا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ ریاست کے عام اخراجات میں شریک ہو سکیں۔ مگر جبراً اسلامی عبادت کے پابند نہ قرار دیے جائیں الّا یہ کہ وہ خود اِسے اختیار کریں۔

زکوٰۃ سماج کا ایک حق ہے جو فرد پر واجب ہوتا ہے تاکہ ضرورت مند طبقوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اور بسا اوقات ناگزیر ضروریات کے ماسوا بھی انھیں کچھ سامانِ زندگی فراہم کیا جا سکے اس طرح اسلام کسی حد تک اپنے اس اصول کو عملی جامہ پہناتا ہے جو آیۂ کریمہؔ کی لَا یَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ'' میں بیان ہوا ہے۔ اسلام کو انسانوں کا فقر و احتیاج میں مبتلا رہنا ناگوار ہے اس نے یہ اصول طے کر دیا ہے کہ فرد اگر استطاعت رکھتا ہو تو اپنی قوّتِ بازو کے بل پر اپنی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کرے اور اگر وہ کسی وجہ سے ایسا نہ کر سکتا ہو تو اُسے سماج کے مال میں سے کفاف دیا جائے۔

اسلام کو انسان کا فقر و احتیاج میں مبتلا رہنا کیوں نہیں گوارا؟ اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ انسان کو اس کی مادّی ضروریات سے فارغ کر کے اُن بلند تر مقامات و منازل کی طرف توجہ کرنے کا موقع فراہم کرے جو مقامِ انسانیت اور اس خصوصی شرف و امتیاز کے شایانِ شان ہیں جو اللہ نے بنی آدم کو عطا فرمایا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۷۰)

''ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور اُن کو خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی''۔

اللہ نے انسانوں کو یہ بزرگی عقل و جذبات اور جسمانی ضروریات سے بلند تر مقاصد کی طرف روحانی میلانات دے کر عملاً عطا فرما دی ہے۔ اب اگر انسانوں کو ضروری سامانِ زندگی اس قدر

بھی میسّر نہ ہو کہ انھیں اِن رُوحانی میلانات اور فکری بلند پروازیوں کے لیے کچھ وقت مل سکے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی یہ بزرگی ان سے چھین لی گئ اور وہ جانوروں کے مقام پر واپس چلے گئے بلکہ اس سے بھی نیچے۔ کیوں کہ جانوروں کو تو عموماً کھانے پینے کو مل جاتا ہے۔ بہت سے جانور مست ہو کر کلیلیں کرتے پھرتے ہیں اور کتنی ہی چڑیاں پیٹ بھر لینے کے بعد زندگی کی رعنائیوں پر خوشیاں مناتی اور چہچہاتی پھرتی ہیں۔

ایسا شخص جسے اپنے کھانے پینے کی فکر اتنا مشغول رکھے کہ بلند مقام انسان کے شایانِ شان افکار و تصورات کی طرف توجہ کرنا تو کجا، اتنی فرصت اور اس قدر فارغ ذہن بھی میسّر نہ ہو جتنا چرند و پرند کو حاصل ہے۔ نہ تو انسان کہلانے کا مستحق ہے نہ اللہ کے نزدیک شرف و امتیاز کا حامل یہ صورتِ حال کہ آدمی اپنا سارا وقت صرف کر دینے اور ہر ممکن کوشش کر لینے کے باوجود بقدرِ کفایت روزی نہ حاصل کر سکے، اس کے حق میں تہم قاتل ہے۔ یہ اُسے اس مقام سے بہت نیچے گرا دیتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے پسند فرمایا ہے۔ یہ صورتِ حال اس سماج کے حق میں بھی مہلک ہے جس کے افراد اس میں مبتلا ہوں۔ یہ ایک گرا ہوا سماج ہے جو اللہ کی طرف ہونے والی عزت و بزرگی کا مستحق نہیں، کیوں کہ اس نے ارادۂ الٰہی کی خلاف ورزی کی ہے۔

انسان اللہ کی زمین میں اس کا نائب ہے۔ اللہ نے اسے منصبِ نیابت اس لیے عطا فرمایا ہے کہ وہ اس زمین پر حیات کو نشو و نما بخشے، اسے ترقی دے، اسے شاداب و شگفتہ بنا کر رکھے اور پھر اس شادابی اور حُسن سے لُطف اندوز ہو کر ان ساری نعمتوں پر اللہ کا شکر بجالائے کہ سب اُسی کی عطا کردہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر انسان کی پوری زندگی روٹی کی نذر ہو جائے چاہے یہ روٹی اس کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہو تو وہ ان بلند مقاصد کو کبھی نہ حاصل کر سکے گا۔ پھر وہ زندگی کتنی گری ہوئی زندگی ہے جس میں انسان عمر بھر کوشش کے باوجود اپنی ضروریات بھی نہ پوری کر سکے۔

اسلام کو یہ بات بہت ناپسند ہے کہ امّت کے مختلف افراد کے درمیان اتنا تفاوت پا یا جائے کہ کچھ لوگ تو عیش و عشرت کی زندگی گزاریں اور دوسرے لوگ خستہ حال اور پریشان رہیں۔ اور یہ خستہ حالی، مفلسی، فاقہ کشی اور کپڑوں بغیر ننگے رہنے کی حد تک جا پہنچے۔ ایسی قوم مسلمان نہیں کہی جا سکتی۔ اللہ کا رسولؐ فرماتا ہے:

ایما اھل عرصة اصبح فیھم امرؤ جائعا فقد برئت منھم ذمة اللہ۔ (مسند امام احمدؒ۔ حدیث نمبر ۴۸۸۰ بحوالہ جدید ایڈیشن مرتبہ احمد محمد شاکر)

"جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے اللہ کی حفاظت و نگرانی کا وعدہ ختم"

نیز آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ:

لا یؤمن احدکم حتیٰ یحب لاخیہ ما یحب لنفسہٖ۔ (متفق علیہ)

"تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک معتبر نہیں۔ جب تک وہ جو کچھ اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی اپنے بھائی کے لیے بھی نہ پسند کرے"

اسلام امت کے مختلف افراد کے درمیان اتنے زیادہ تفاوت کو کیوں نہیں پسند کرتا؟ اس کا جواب حسد و کینہ کے ان خطرناک جذبات میں مضمر ہے جو سماج کی بنیادیں ہلا دیتے ہیں۔ اس کا جواب اس بے جا امتیاز، حق تلفی اور سنگ دلی میں مضمر ہے جو قلب و ضمیر کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ اتنا تفاوت ہونے کا مطلب ضرورت مندوں کو چوری اور غصب کرنے یا عزتِ نفس اور خودداری سے ہاتھ دھو کر انتہائی ذلت و خواری میں مبتلا ہو جانے پر مجبور کرنا ہے۔ یہ انسانوں کو پستی کی طرف لے جانے والے عوامل ہیں جن سے اسلام سماج کو بچائے رکھنا چاہتا ہے۔

اسلام نہیں چاہتا کہ دولت قوم کے مال دار افراد کے درمیان گردش کرتی رہے اور عوام کی اکثریت کو خرچ کرنے کے لیے مال نہ میسر ہو کیوں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کی زندگی ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے اور روزگار اور آمدنی کی سطح گر جاتی ہے۔ اکثر لوگوں کے ہاتھوں میں مال ہوگا تو وہ اسے ضروریاتِ زندگی کی خریداری میں صَرف کریں گے، اشیاء کی طلب بڑھے گی، پیداوار میں اضافہ ہوگا اور قابلِ کار افراد کے لیے مکمل روزگار حاصل ہو سکے گا۔ اس طرح محنت، پیدائشِ دولت اور صَرفِ دولت کا عمل اپنے قدرتی انداز پر جاری رہ کر مفید نتائج سامنے لا سکے گا۔

زکوٰۃ کا مقصد یہی ہے۔ شارع نے اسے ایک مالی فریضہ قرار دیا ہے جو اپنے مستحقین کا ایک قانونی حق ہے، نہ کہ زکوٰۃ نکالنے والوں کا ایک احسان، اس کا نصاب اس طرح مقرر کیا گیا ہے کہ سارے مال دار لوگ اس کی ادائیگی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ حد جس سے کم مال پر زکوٰۃ نہیں عاید ہوتی

بیس مثقال سونا ہے۔ جو ہمارے سکّہ میں تیس پاؤنڈ کے برابر ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ مالک مقروض نہ ہو یہ رقم ضروریات کے علاوہ اس کے پاس فاضل بچ رہی ہو اور اس پر پورا ایک سال گذر چکا ہو۔ ظاہر ہے کہ جو آدمی خود ہی زکوٰۃ کا مستحق ہو اس سے زکوٰۃ ادا کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ زرعی پیداوار پھلوں کی زکوٰۃ موسم موسم وصول کی جاتی ہے اور فصل تیار ہونے پر واجب ہوتی ہے۔ سامانِ تجارت کی زکوٰۃ سونے یا چاندی میں اس کی جو قیمت آتی ہے اس کے حساب سے لی جاتی ہے۔ مویشیوں کی زکوٰۃ کی شرحیں بھی مقرر ہیں اور ان میں وہی تناسب ملحوظ رکھا گیا ہے جو نقد سرمایہ کی زکوٰۃ میں پایا جاتا ہے۔ (یعنی چالیسواں حصہ)۔ رکاز میں پانچواں حصہ واجب ہے۔ البتہ رکاز کی مختلف قسموں کے احکام کے بارے میں اختلاف ہے کہ ان کے مالک زمین کے مالک ہوں گے یا قوم ہوگی۔

قرآن کریم کی صراحت کے بموجب مالِ زکوٰۃ کے مستحق یہ ہیں۔

فُقراء

یہ وہ لوگ ہیں جو نصاب سے کم مال رکھتے ہیں۔ یا اگر صاحب نصاب ہیں تو اتنے مقروض ہیں کہ قرضہ وضع کرنے کے بعد صاحبِ نصاب نہیں رہ جاتے۔ ظاہر ہے کہ اُن کے پاس کچھ نہ کچھ مال تو ضرور ہوتا ہے لیکن یہ مال ناکافی ہوتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر فرد کو بقدرِ کفایت مال ملے اور جہاں تک ممکن ہو اُنھیں سامانِ دنیا سے مستفید ہونے کی خاطر قدرِ کفایت سے زیادہ بھی حاصل ہو۔

مسَاکین

وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ قدرتی طور پر یہ لوگ فقراء سے زیادہ مستحق ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ آیت میں فقراء کے ذکر کو ان پر مقدم رکھنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فقراء کے پاس جو تھوڑا مال ہوتا ہے وہ کافی نہیں اور ان کا حال بھی گویا مساکین جیسا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اسلام بقدرِ ضرورت کفالت کی فراہمی پر قانع نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ فراہم کرنا چاہتا ہے۔

عاملینِ زکوٰۃ

یعنی وہ لوگ جو اس کی تحصیل عمل میں لاتے ہیں۔ ان کو اُن کے . . . . کام کے معاوضہ کے طور پر کچھ دیا جاتا ہے خواہ یہ خود صاحب مال ہوں۔ گویا (ان کا حصہ) ایک طرح کی تنخواہ ہے اور اس کا تعلق نظامِ محنت و اُجرت سے ہے نہ کہ ضروریات کی تکمیل سے۔

مؤلفة القلوب

یعنی وہ لوگ جو ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہوں اُن کو مال دے کر اُن کی ہمت افزائی کرنا اور اُن جیسے دوسرے لوگوں کو اسلام کی طرف لانا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں مرتدین کے خلاف فوج کشی کے بعد سے اس مصرف پر خرچ کرنا بند کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ پھر اسلام کو اتنا غلبہ واستحکام حاصل ہوگیا کہ اُسے مال کے ذریعہ تالیفِ قلوب کی کوئی حاجت نہیں باقی رہ گئی۔ اس کے باوجود کہ قرآن کی ایک آیت واضح طور پر ایسے لوگوں کو زکوٰۃ کا مستحق قرار دیتی ہے، حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں تصرّف کرنے میں کوئی حرج نہ محسوس کیا۔

گردنیں چھڑانے میں

یعنی ان مکاتب غلاموں کی مالی امداد جو اپنے آقاؤں سے ایک متعین رقم کے عوض آزادی حاصل کر لینے کا معاہدہ کر لیں تاکہ وہ اپنا مقصد حاصل کر سکیں۔

قرض دار

جن کے اُوپر ان کی پونجی سے کہیں زیادہ قرض ہو۔ البتہ شرط یہ ہے کہ قرض کسی گناہ کے کام میں نہ لیا گیا ہو۔ مثلاً عیش پرستی وغیرہ۔ ان کو زکوٰۃ سے حصّہ دینا ایک طرف تو قرض سے نجات کا ذریعہ بنے گا دوسری طرف اُن کو صاف سُتھری باعزت زندگی بسر کرنے کا موقع ملے گا۔

فی سبیل اللہ

یہ ایک عام مَد ہے جس کی عملی شکلیں حالات ہی متعین کر سکتے ہیں۔ مجاہدین کی تیاری، بیماروں کا علاج، جو لوگ خود سے تعلیم نہ حاصل کر سکتے ہوں ان کی تعلیم کا بندوبست، غرض یہ کہ وہ سارے کام جو مصالح مسلمین کی خاطر مفید اور ضروری ہوں اس مَد کے تحت آجاتے ہیں۔ اس کے اندر اتنی وسعت ہے کہ مختلف حالات میں سارے ہی اجتماعی کام اس کے تحت آجاتے ہیں۔

مُسافر

جو غریب الوطنی کے باعث اپنے مال سے فائدہ نہ اٹھا سکتا ہو اور اس وقت اس کا ہاتھ خالی ہو۔ اس تعریف کے تحت آج کل کے مہاجرین بھی آجاتے ہیں جو جنگ، غارت گری اور ظلم و جور کے باعث بے گھر ہو جاتے ہیں، جو کچھ مال و دولت اُن کے پاس تھا وہ وہیں چھوٹ جاتا ہے اور اب

اُن کے لیے اس سے استفادہ ممکن نہیں رہ جاتا

واضح رہے کہ اسلام ان مستحقین کو زکوٰۃ میں سے حصہ پانے کا حق اسی وقت دیتا ہے جب کہ یہ کسب مال کی کوشش میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ اور اس کے باوجود ان کا کام نہ چلے۔ اس پالیسی کی وجہ یہ ہے کہ اسلام عزتِ نفس اور خودداری کو سب سے اہم چیز سمجھتا ہے۔ اس لیے وہ اُس کا اہتمام کرتا ہے کہ ہر فرد کو روزی کا ایک ایسا ذریعہ حاصل رہے جو اُس کے اپنے اختیار میں ہو اور جس کے سلسلے میں وہ کسی کا، یہاں تک کہ سماج کا بھی، ماتحت و دست نگر بننے پر نہ مجبور ہو۔ اسی لیے وہ لوگوں کو ترغیب دلاتا ہے کہ محنت کریں اور اس طرح مدد لینے سے مستغنی رہیں۔ اسی لیے اس نے جماعت کی اولین ذمہ داری قرار دی ہے کہ ہر فرد کے لیے روزگار فراہم کرے۔ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگنے آیا۔ آپؐ نے اُسے ایک درہم عنایت فرمایا کہ اس سے ایک رسّی خرید لے۔ جنگل سے لکڑیاں چنے اور انھیں باندھ کر لے آئے اور اس طرح اپنی قوتِ بازو کی کمائی پر گذر بسر کرے۔ آپؐ نے فرمایا:

لان یاخذ احدکم حبلہ فیحتطب علی ظہرہ فیبیعہ خیرٌ لہٗ
من ان یسأل الناس اعطوہ او منعوہ۔ (بخاری ومسلم)

"یہ بات کہ تم میں سے کوئی رسّی لے، لکڑیاں چُن کر اپنی پیٹھ پر لادلائے اور اُسے فروخت کرکے (گزربسر کرے) اس سے کہیں بہتر ہے کہ لوگوں سے مانگتا پھرے کہ ان کا جی چاہے اُسے دیں جی چاہے نہ دیں"

زکوٰۃ کی رقم سے دی جانے والی امداد آخری اجتماعی بچاؤ ہے۔ یہ درحقیقت ایسے افراد کے لیے سماجی تحفظ ہے جو باوجود کوشش کے کچھ نہ کما سکیں یا ضرورت سے کم یا بقدرِ ضرورت ہی حاصل کرسکیں۔ زکوٰۃ کے ذریعہ یہ مقصد بھی حاصل کیا جاتا ہے کہ دولت تمام افرادِ معاشرہ کے درمیان گردش کرتی رہے تاکہ پیداوار، محنت اور صَرف کے درمیان سرمایہ کی گردش موزوں طریقہ پر انجام پاتی رہے۔ یہاں اسلام بیک وقت معاملے کے دونوں پہلوؤں کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ ایک طرف تو یہ خواہش کہ ہر فرد اپنی طاقت بھر کام کرے اور سماجی امداد کا سہارا لے کر بے کار وقت گذاری نہ کرے، اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ کہ ضرورت مند کو بقدرِ ضرورت مدد دے کر ضروریاتِ حیات کا بار اس کے سر سے ہلکا کردیا جائے اور اسے ایک صاف ستھری اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرنے کے

مواقع فراہم کردیے جائیں۔ ساتھ ہی وہ اس کے ذریعہ سرمایہ کے موزوں طریقہ پر گردش کرتے رہنے کا اہتمام بھی کرتا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

زکوٰۃ تعاون اور کفالتِ باہمی پر مبنی اُس معاشرہ کی بنیاد ہے جسے اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی سودی نظام کے سہارے کی ضرورت نہیں۔

آج زکوٰۃ کے بارے میں ہمارا تصور مسخ ہوگیا ہے۔ وہ بدبخت نسلیں زکوٰۃ کی حقیقت کے صحیح ادراک سے محروم ہیں۔ جنھوں نے اسلامی نظام کو واقعات کی دنیا میں قائم نہیں دیکھا ہے اور براہِ راست مشاہدہ سے یہ بات نہیں سمجھ سکی ہیں کہ یہ نظام ایمانی تصور، ایمانی تربیت اور ایمان پر مبنی اخلاق پر قائم ہوتا ہے اور نفسِ انسانی کو ایک مخصوص سانچہ میں ڈھال دیتا ہے۔ پھر اس نظام کے ہر شعبہ میں صحیح افکار و تصورات، پاکیزہ اخلاق و عادات اور اعلیٰ طور طریقے جاری ہوتے ہیں۔ جاہلی نظام کے بالمقابل جس کی بنیاد سود پر ہے اسلام اپنے نظام میں زکوٰۃ کو بنیاد کی حیثیت دیتا ہے۔ اس نظام میں انفرادی سعی و جہد اور سود سے پاک باہمی تعاون کے ذریعہ زندگی نمو پاتی ہے اور معیشت کی ترقی عمل میں آتی ہے۔

جن بدقسمت نسلوں کو انسانیت کے اس اعلیٰ تصور کا عملی تجربہ نہیں اُن کو زکوٰۃ کی اس صحیح شکل کا شعور نہ حاصل ہو سکا۔ یہ نسلیں سود پر مادی نظام کے زیرِ سایہ پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں۔ انھیں حرص و آز، بخل و کم ظرفی، درندوں جیسی باہمی مسابقت اور اس خود غرضانہ انفرادیت ہی کا تجربہ ہوا، جو عوام کے ضمیروں پر بھی حکمراں ہے، جس کے تحت ضرورتمندوں کو بھی سود کے ذلیل ذریعہ کے سوا کسی اور صورت سے مال نہیں مل سکتا۔ جن انسانوں کے پاس جمع شدہ مال نہ ہو وہ اس نظام میں بے سہارا زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے۔ سہارے کی صورت صرف یہ نکلی کہ اپنے مال کا ایک حصہ ادا کر کے انشورنس کے سودی کاروبار میں شرکت کریں۔ تجارت اور صنعت کو بھی اُس وقت تک کاروباری سرمایہ نہیں مل سکتا۔ جب تک وہ اسے سود پر نہ حاصل کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان بدنصیب نسلوں کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ اس نظام کے سوا کوئی دوسرا نظام ممکن ہی نہیں، اور زندگی کی گاڑی صرف سود کے پہیوں پر چل سکتی ہے!

زکوٰۃ کے بارے میں لوگوں کا تصور اتنا بگڑ گیا ہے کہ وہ اسے معمولی درجہ کی انفرادی خیرات سمجھنے لگے ہیں جس کی بنیاد پر دورِ حاضر میں کوئی اجتماعی نظام نہیں قائم ہو سکتا۔ مگر غور کرنے کی بات

ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعہ حاصل ہونے والی مجموعی رقم کی مقدار کتنی ہوگی جب کہ اس کی شرح قومی سرمایہ اور اس کے منافع کی کل مقدار کی ڈھائی فی صد ہے[1]۔ مزید برآں اسے ادا کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جنہیں اسلام نے ایک خاص سانچے میں ڈھال کر اپنے قوانین اور تلقین و ترغیب کے ذریعہ تربیت دی ہوگی۔ جو ایک ایسے اجتماعی نظام کے زیر سایہ پروان چڑھیں گے جس کی بلندی کا تصور بھی ان ذہنوں کے لیے دشوار ہے، جنھوں نے اس کے زیر سایہ زندگی نہ گذاری ہو۔ پھر اسے ایک مسلم ریاست ایک لازمی حق کے طور پر وصول کرے گی نہ کہ خیرات کے طور پر۔ اس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کی جماعت کے ہر اس فرد کی کفالت کرے گی جس کے ذاتی وسائل اس کے لیے کافی نہ ہوں۔ اس طرح ہر فرد کو یہ اطمینان حاصل ہوگا کہ اس کی اولاد کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل بہر حال یقینی ہے۔ ساتھ ہی ریاست ادائے قرض سے عاجز مقروض افراد کی جانب سے اُن کے قرضے زکوٰۃ کی مدد سے ادا کرے گی خواہ یہ قرض کاروباری اغراض کے لیے ہوں یا غیر کاروباری اغراض کے لیے۔

اصل اہمیت اس نظام کے ڈھانچہ کو نہیں حاصل ہے بلکہ اہم چیز اُس کی رُوح ہے۔ اسلام اپنی تلقین و ترغیب، اپنے قوانین اور اپنے اجتماعی ضوابط کے ذریعہ جو معاشرہ برپا کرتا ہے وہ اس نظام کے ڈھانچہ اور اس کے طریقۂ نفاذ سے مزاجی مناسبت رکھتا ہے۔ وہ قوانین اور ترغیبات سے مل کر تکمیل پاتا ہے۔ اس میں کفالتِ باہمی داخل سے بھی جنم لیتی ہے اور ضوابط کے ذریعہ بھی عمل میں آتی ہے۔ دونوں طریقے ایک دوسرے کی کمی پوری کرتے اور ہم آہنگ ہیں۔ ان لوگوں کے لیے اس حقیقت کا فہم اکثر دشوار ہوتا ہے جو دوسرے مادّی نظاموں کے زیر سایہ پروان چڑھے ہیں لیکن ہم مسلمان اس حقیقت کو خوب جانتے ہیں اور اپنے ذوقِ ایمانی سے اس کا پتہ پاچکے ہیں۔ اگر وہ لوگ اپنی نحوست اور بدبختی سے اس ذوق سے محروم ہیں —— بدبخت ہے وہ انسانیت جس کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے —— تو ایسا ہوا کرے، اور انھیں اس خیر سے محروم رہنے دو جس کی خوش خبری اللہ نے ان لوگوں کو دی ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ۔

---

[1] زراعت اور معدنی دولت کی زکوٰۃ کی شرح پانچ، دس اور بیس فی صد تک جا پہنچتی ہے۔

"جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال بجالاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔"

یہ لوگ اجر و ثواب کے علاوہ اس زندگی میں سکون و اطمینان سے بھی محروم رہیں گے، اور اس محرومی کی تمام تر ذمہ داری ان کی اپنی جہالت، جاہلیت، گمراہی اور حق دشمنی پر ہے۔

زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے محاصل

زکوٰۃ وہ واحد حق نہیں جو مال میں عاید ہوتا ہو

ایسا نظر آتا ہے کہ جو لوگ آج کل زکوٰۃ کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہیں وہ اس بات پر قریب قریب متفق ہو گئے ہیں کہ اسلام سرمایہ پر ٹیکس جو عاید کرتا ہے اس کی آخری حد ہمیشہ کے لیے زکوٰۃ ہے۔ پیشہ ور علماء کے اس سازشی اجماع کا پردہ چاک کرنا بہت ضروری ہے۔ جس کا سہارا وہ لوگ بھی لیتے ہیں جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس ترقی کے زمانہ میں اسلامی نظام پر عمل نہیں ممکن ہے۔

درحقیقت زکوٰۃ مال و دولت پر عاید کیے جانے والے ٹیکس کی ادنیٰ ترین شرح ہے اور یہ اُن حالات کے لیے ہے جب کہ جماعت کو محاصلِ زکوٰۃ کے بعد مزید فنڈ کی ضرورت نہ پڑے۔ ایسے حالات میں جب کہ زکوٰۃ کی آمدنی کافی نہ ہو اسلام کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اُس نے شریعت اسلامی کو نافذ کرنے والے صاحبِ امر کو سرمایہ پر ٹیکس لگانے کے وسیع اختیارات دیے ہیں وہ سرمایہ میں سے اس قدر طلب کر لینے کا مجاز ہے جس قدر کہ اصلاحِ حال کے لیے ضروری ہو۔ چنانچہ ایک حدیث میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ:

ان فی المال حقاً سوی الزکوٰۃ (ترمذی)

"مال میں زکوٰۃ کے علاوہ حق بھی ہے۔"

اسلامی قانون سازی میں مصالح مرسلہ اور سدِ ذرائع کے اصول اپنے اندر اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ اُن کے تحت ہر طرح کے سماجی مصالح کا حصول اور ہر طرح کی مضرتوں کا ازالہ ممکن ہے۔

ان اصولوں کی وسعت سامنے لانے کے لیے ہم استاذ محمد ابوزہرہ پروفیسر قانونِ اسلامی

لاء کالج، قاہرہ یونیورسٹی، کتاب "الامام مالک" کے بعض اقتباسات پیش کریں گے۔

مصالح مرسلہ

"وہ مصالح جن کے (شرعاً) معتبر ہونے پر (کتاب وسنّت کی) کوئی نص نہ دلالت کرتی ہو مرسلہ کہلاتے ہیں۔ یہ بات فقہاء کے نزدیک مختلف فیہ ہے کہ ان مصالح کا اعتبار و لحاظ فقہ اسلامی کے بنیادی اصولوں میں سے ہے کہ نہیں۔ قرافی کا دعویٰ ہے کہ بلا استثناء تمام فقہاء نے جزئیات فقہ میں ان مصالح کو ملحوظ رکھا ہے اور اُن کو دلیل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اگرچہ ان میں سے اکثر نے انھیں ایک بنیادی اصول تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ قرافی لکھتے ہیں:

> "دوسرے مکاتب فکر کے لوگ مصلحت مرسلہ کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو مسائل کی تفریع میں اُن کو اکثر مطلق مصلحت کا اعتبار کرتے ہوئے پائیں گے۔ وہ ہر اس موقع پر جب کہ دو (ہم جنس) اُمور میں مختلف احکام تجویز کرتے یا دو (مختلف) اُمور کو ایک ہی حکم کے تحت قرار دیتے ہیں۔ خود کو اصولی دلائل دینے کا مکلف نہیں سمجھتے بلکہ محض ادنیٰ مناسبت پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔ ہم اسی کو مصلحت مرسلہ (پر اعتبار کرنا) کہتے ہیں"۔

قرافی کا یہ دعویٰ صحیح ہو یا غلط، یہ بات طے شدہ ہے کہ جن مصالح کے اعتبار کو کسی نصِ شرعی کی سند نہ حاصل ہو اُن کو معتبر قرار دینے کے سلسلے میں علماء مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ اگر ان کے اعتبار میں (عملاً) اختلاف نہ موجود ہو تو بھی، جیسا کہ قرافی کا بھی خیال ہے۔ اس بارے میں ضرور اختلاف ہے کہ ان کا اعتبار کس حد تک کیا جائے۔

علماء کے درمیان اس سلسلہ میں چار مختلف رائیں ملتی ہیں:

پہلی قسم شوافع اور ان کے ہم مسلک لوگوں کی ہے، جن مصالح کے اعتبار کے لیے کوئی شرعی دلیل نہ موجود ہو انہیں یہ معتبر نہیں قرار دیتے۔ کیونکہ یہ حضرات صرف منصوص اور قیاس علی المنصوص کے قائل ہیں۔ قیاس کے لیے ان کے یہاں یہ شرط

ہے کہ اصل اور فرع کے درمیان یعنی جو حکم مستنبط کیا جارہا ہے اس کے اور منصوص حکم کے درمیان کوئی باقاعدہ اصولی رشتہ پایا جاتا ہو۔ قرآنی کا ساتھ دینا چاہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شوافع کے یہاں باقاعدہ قیاس کے بغیر کسی مصلحت مرسلہ کے اعتبار کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

دوسری رائے احناف اور ان دوسرے حضرات کی ہے جو قیاس کے ساتھ استحسان کے بھی قائل ہیں۔ استحسان کی یہ لوگ جو تعریف بھی کرتے ہوں اس میں مطلق مصلحت پر اعتماد کرنا آپ سے آپ شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے استنباط میں مصالح کا اعتبار شوافع سے کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن خالص استحسان کی مثالیں اُن کے یہاں بھی بہت زیادہ نہیں کیونکہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ میں اُن کا سہارا تمام تر صرف مصالح پر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان مصالح کو اُن کے یہاں بنیادی اصول کے طور پر نہیں شمار کیا جاتا۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو مصالح کے اعتبار میں غلو سے کام لیتے ہیں، یہاں تک کہ انسانی معاملات میں مصالح کو نص پر مقدم قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مصلحت نص کی تخصیص کر سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک مصلحت اجماع کی بھی تخصیص کر سکتی ہے۔ اگر کسی نص کی روشنی میں کسی مسئلہ پر علماء کا اجماع ہو گیا ہو اور پھر یہ حکم بعض پہلوؤں کے اعتبار سے مصلحت کے منافی نظر آئے تو مصلحت کے لحاظ کو مقدم رکھا جائے گا اور ایسا کرنے کو تخصیص سمجھا جائے گا۔ طوفی نے یہی رائے ظاہر کی ہے۔

چوتھی قسم معتدل رائے رکھنے والوں کی ہے اور انہی کا مسلک اقرب الی الصواب نظر آتا ہے۔ ان کی رائے میں مصالح مرسلہ کا اعتبار ان امور میں کیا جاتے گا جن میں نصِ قطعی نہ وارد ہوتی ہو۔ مالکیہ میں سے اکثر یہی رائے رکھتے ہیں۔ یہ مسلک کہ مصالح مرسلہ کا اعتبار ایک مستقل اصول قانون ہے امام مالکؒ کا خود اختراع کردہ نہیں بلکہ اس باب میں وہ (سلفِ صالح کے) متبع تھے (جیسا کہ ذیل کے نظائر سے واضح ہوتا ہے)

۱۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی وفات کے بعد کچھ ایسے اقدامات بھی کیے جو آپؐ کے عہد میں نہ کیے گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا نہ ہوا تھا۔ مگر جب انھیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ حفاظِ قرآن کی موت کے بعد قرآن کو بھول نہ جایا جائے تو مصلحت متقاضی ہوئی کہ وہ جمعِ قرآن کا اہتمام کریں۔ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ مرتدین کے خلاف جنگوں میں حفاظ قرآن یکے بعد دیگرے شہید ہوتے جا رہے ہیں تو آپ کو قرآن کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہوا اور آپ نے حضرت ابو بکرؓ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ قرآن کو کتابی شکل میں جمع کر دیا جائے۔ سارے صحابہؓ نے آپ کی تجویز سے پورا پورا اتفاق کیا۔

۲۔ صحابۂ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شراب خوار کو اسی کوڑوں کی سزا دینے پر اتفاق کر لیا۔ یہ فیصلہ بھی مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے کیا گیا تھا۔ کیونکہ انھوں نے دیکھا کہ شراب خواری فضول بکواس پر اُبھارتی اور بالآخر افترا پردازی اور پاکیزہ شریف عورتوں پر تہمت طرازی پر منتج ہوتی ہے۔

۳۔ خلفاء راشدینؓ نے متفقہ طور پر صنّاعوں پر ضمان عاید کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ جو اشیاء ان کاریگروں کو کام کے لیے دی جاتی تھیں وہ اصولاً امانت کی حیثیت رکھتی تھیں اور امانت میں نقصان واقع ہو جانے یا اس کے ضائع جانے کی شکل میں امانت دار سے تاوان نہیں وصول کیا جا سکتا، لیکن عملاً صورتِ حال یہ تھی کہ لوگوں میں صنّاعوں کی بڑی طلب تھی۔ اگر ان صنّاعوں کو لوگوں کے سامان ضائع جانے یا اُن میں نقص واقع ہو جانے پر قابلِ تاوان نہ قرار دیا جاتا تو یہ لاپروائی برتتے اور عوام کا نقصان ہوتا۔ ایسی شکل میں مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ اُن پر ضمان عاید کی جائے۔ اسی بنا پر حضرت علیؓ نے اُن لوگوں کو ان سامانوں کا ذمہ دار اور دین دار قرار دینے کی بابت یہ فرمایا ہے کہ:

"اس کے بغیر لوگوں کے مفادات کا تحفظ نہیں ہو سکتا۔"

۴۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا دستور یہ تھا کہ جن والیوں پر خیانت کا شبہ ہوتا ان کے مال میں سے نصف حصہ بحقِ سرکار ضبط کر لیتے۔ وجہ یہ تھی کہ جو اموال یہ لوگ اپنے منصبِ ولایت کے اثر سے فائدہ اٹھا کر کماتے تھے وہ اُن کے اصل ذاتی مال کے ساتھ مل چکا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ کا یہ فیصلہ بھی مصلحتِ مرسلہ کے تحت آتا ہے۔ آپ نے یہ محسوس کیا کہ والیوں کی اصلاح اور ان کو منصبِ ولایت کے رُعب داب سے بے جا فائدہ اُٹھا کر نیز دوسرے ناجائز طریقوں سے مال و دولت کمانے سے روکنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔

۵۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں روایت کی جاتی ہے کہ آپ نے ملاوٹ کرنے کی سزا کے طور پر ایک بار پانی مِلا ہوا دودھ زمین پر بہا دیا تھا۔ یہ اقدام بھی مصلحتِ عامہ کے تحفظ کے لیے تھا تاکہ تاجر عوام کو دھوکہ دینے سے باز آجائیں۔

۶۔ آپ کے بارے میں منقول ہے کہ اگر کسی آدمی کے قتل میں ایک پورا گروہ شریک ہو تو آپ پورے گروہ کے قتل کا فیصلہ کرتے تھے کیونکہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا اور اس باب میں کوئی نص نہیں موجود تھی۔ مصلحت کا ثبوت یہ ہے کہ مقتول بے گناہ ہے اور اسے عمداً قتل کیا گیا ہے۔ ایسی شکل میں اس کے خون کا بدلہ نہ لینا اصولِ قصاص کی جڑ کاٹ دینے کے ہم معنیٰ ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قتل کرنے میں لوگ ایک دوسرے سے مدد لینے لگیں گے۔ کیونکہ انھیں بخوبی معلوم ہوگا کہ مل جل کر یہ کام کیا جائے تو اُن سے قصاص نہیں لیا جا سکے گا۔ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس شکل میں جو قاتل نہیں اسے قتل کی سزا دے کر دین میں ایک بدعت کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا گروہ میں سے کسی ایک فرد کو بھی، اس کی انفرادی حیثیت میں، قاتل نہیں قرار دیا جا سکا۔ جواب یہ ہے کہ قتل کا اصل مُجرم وہ پورا گروہ بحیثیت گروہ ہے۔ اُسے بھی اسی طرح قتل کیا جائے گا جیسے کہ کسی منفرد قاتل کو۔ اس گروہ کی طرف قتل کا جُرم اسی طرح منسوب ہوا ہے جس طرح کہ وہ کسی فردِ واحد کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ گویا کہ اس شکل میں یہ پورا گروہ سزائے قتل کے سلسلہ میں فردِ واحد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا کرنے کا محرک

مصلحت ہے۔ کیوں کہ خوں ریزی کا سدِ باب اور انسانی سماج کا تحفظ اسی طرح ممکن ہے۔

مسائلِ عامہ میں مصلحت کے لحاظ کی ایک مثال یہ ہے کہ جب بیت المال خالی ہو، یا فوج کے اخراجات بڑھ جائیں اور بیت المال میں بقدرِ ضرورت فنڈ نہ موجود ہو تو امام کو چاہیے کہ مال داروں پر بقدرِ ضرورت ٹیکس عاید کر دے۔ جب تک بیت المال میں دوسری مدات سے کچھ آمدنی نہ ہو جائے یا اس میں ضرریات کے بقدر مال نہ آجائے۔ یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ امام کو چاہیئے کہ یہ ٹیکس فصل کٹنے اور پھلوں کے توڑے جانے کے وقت وصول کرے تاکہ اصحابِ ثروت سے مالیہ طلب کرنا ان میں بد دلی پیدا کرنے کا باعث نہ بن جائے۔ اس میں مصلحت کا پہلو یہ ہے کہ امام عادل اگر ایسا نہیں کرتا تو اس کی دھاک اکھڑ جائے گی، ہر طرف فتنے سر اٹھانے لگیں گے اور ان لوگوں کے غلبہ کا خطرہ قوی تر ہو جائے گا جو ایسے مواقع سے فائدہ اٹھا کر اوپر آنا چاہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امام کو ٹیکس لگانے کے بجائے بیت المال کی طرف سے قرض لے لینا چاہیئے۔ شاطبی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ناگہانی امور پیش آجانے پر قرض لینا اسی شکل میں مناسب ہوگا جب کہ بیت المال کو مستقبل قریب میں کچھ آمدنی ہونے کی توقع ہو۔ ایسی شکل میں جب کوئی آمدنی متوقع نہ ہو اور آمدنی کے جو ذرائع میسر ہوں ان کی آمدنی بھی گر گئی ہو اور ضرریات کے لیے ناکافی ہو ٹیکس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ذرائع

ذریعہ کے معنیٰ ہیں وسیلہ کے۔ سدِ ذرائع کا مطلب یہ ہے کہ (ناپسندیدہ چیزوں کے) اسباب کا ازالہ کر دیا جائے۔ جو چیز کسی حرام کا سبب یا ذریعہ ہو وہ خود بھی حرام قرار پاتی ہے، اور جو چیز کسی واجب کا وسیلہ ہو وہ خود بھی واجب ہے۔ زنا حرام ہے لہٰذا کسی اجنبی عورت کی طرف قصداً دیکھنا بھی حرام ہے۔ کیونکہ یہ چیز زنا کی طرف لے جاتی ہے۔ جمعہ کی نماز فرض ہے۔ لہٰذا اس کے لیے جانا اور اس روانگی کی خاطر کاروبار

روک دینا بھی فرض ہے۔ حج فرض ہے۔ لہٰذا بیت الحرام کی طرف سفر اور حج کے جملہ مراسم کو بجالانا بھی فرض ہے۔

سدِ ذرائع میں اصل اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ کوئی کام بالآخر کس انجام تک پہنچاتا ہے۔ اگر اس کا رُخ اُن مصالح کی جانب ہو جو باہمی معاملات سے متعلق اور ہر طرح مطلوب و مقصود ہوں تو خود یہ کام بھی اُن مقاصد کی اہمیت اور ضرورت کی مناسبت سے کم یا زیادہ مطلوب قرار پائیں گے۔ البتہ یہ کام (جو ذریعہ بن رہے ہیں) اپنی مطلوبیت میں اِن مقاصد کے ہم پلّہ نہیں۔ اگر یہ کام ایسے ہیں کہ ان کے انجام نامطلوب مفاسد ہوں تو یہ خود بھی اُنھیں مفاسد کی حُرمت کی مناسبت سے حرام قرار پائیں گے، اگرچہ اس شدت کے ساتھ نہیں جس شدّت کے ساتھ کہ خود یہ مفاسد حرام ہوں۔

اس سلسلہ میں اصل اہمیت کام کرنے والے کی نیّت اور ارادے کو نہیں بلکہ اس کے کام کے اثرات و نتائج کو حاصل ہے۔ آخرت میں جزا و سزا کا مدار بلاشبہ کام کرنے والے کی نیّت اور ارادے پر ہے۔ لیکن کسی کام کو بھلا یا بُرا قرار دینے، یا اُسے مطلوب یا ممنوع قرار دینے کا مدار تمام تر اس کے عملی نتیجہ پر ہے۔ دنیا کا نظام بندگانِ خدا کے مصالح کے تحفظ، عدل و انصاف اور توازن پر مبنی ہے اور ان امور کا تقاضا ہے کہ حسنِ نیّت اور ارادۂ ثواب پر نہیں بلکہ کاموں کے عملی اثرات و نتائج پر نظر ڈالی جائے۔ جو شخص خالصتہً لوجہ اللہ بتوں کو گالیاں دے وہ اپنے تئیں مخلص ہو سکتا ہے، لیکن اگر اس کے اثر سے مشرکین غضب ناک ہو کر اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینے لگیں تو اس شخص کو خود اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع کر دیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ (الانعام: ۱۰۸)

" یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں "

" جو چیز ممانعت کا باعث بنی وہ اس فعل کا عملی نتیجہ ہے۔ اس نیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا جو اپنی جگہ خالصتہً مذہبی ہے اور جس کا مقصود حصولِ ثواب تھا۔ اس سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جو چیز گناہ و فساد پر منتج ہوتی ہو اس کی ممانعت میں صرف خلوص نیت کا لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے عملی نتیجہ کو بھی اہمیت دی جاتی ہے اور اسی بُرے نتیجہ کے سبب اُسے ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اس کے مخلصانہ محرک کا خوب علم ہوتا ہے۔

ایک آدمی کسی مُباح کام کو کسی بُرے مقصد کا ذریعہ بناتا ہے ایسا آدمی خدا کے حضور گناہ گار قرار پائے گا لیکن کسی دوسرے کو اس پر اعتراض کا حق نہیں اور اس کے اس طرح کے تصرف کو شرعاً باطل نہیں قرار دیا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص اپنے مال کا نرخ بہت ارزاں کر دیتا ہے تاکہ اپنے کسی حریف تاجر کو نقصان پہنچا سکے، یہ بلاشبہ ایک کام ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ ایک گناہ یعنی دوسرے کو نقصان پہنچانے کا ذریعہ بھی بن رہا ہے۔ اور وہ بھی قصداً۔ لیکن اس کے باوجود اس کے اس فعل کو علی الاطلاق باطل نہیں قرار دیا جا سکتا اور نہ یہ ایسا کھلا ہوا ممنوع فعل ہے جسے عدالت کے ذریعہ رد کیا جا سکتا ہو۔ نیت کے اعتبار سے یہ کام شر کا ذریعہ ہے اور ظاہری طور پر یہ خاص اور عام دونوں طرح کے فائدوں کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ جہاں تک اُس تاجر کا سوال ہے اسے اپنی تجارت کے چمک اُٹھنے اور گاہکوں کی تعداد میں اضافہ سے یقیناً فائدہ ہوگا۔ عام لوگوں کو بھی ارزانی سے فائدہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے سبب عام نرخ بھی گر جائے۔

جیسا کہ اوپر کے بیان سے واضح ہو گیا ہوگا، سدِ ذرائع کا اُصول صرف انفرادی نیتوں اور مقاصد کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظر عام لوگوں کے مفاد اور اُن سے ضرر و فساد کے ازالہ پر بھی ہوتی ہے۔ یہ اصول ارادہ کے ساتھ عملی نتیجہ کا اور بسا اوقات صرف عملی نتیجہ کا لحاظ کرتا ہے۔

سدِ ذرائع کا اصولِ قانون سازی ہونا قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ قرآن میں

اللہ تعالیٰ کا یہ قول موجود ہے کہ:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط (الانعام: ۱۰۸)

"یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔"

روایت ہے کہ مشرکین نے مطالبہ کیا تھا کہ مسلمان ان کے خداؤں کو بُرا کہنے سے باز آجائیں ورنہ وہ اُن کے خداؤں کو بُرا کہنے لگیں گے۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا

(البقرہ: ۱۰۴)

"اے ایمان والو رَاعِنَا نہ کہا کرو بلکہ اُنظُرْنَا کہو، اور توجہ سے بات کو سنو۔"

مسلمانوں کا ارادہ نیک تھا لیکن یہود نے اس لفظ (رَاعِنَا) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

سنت میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے متعدد فتاویٰ اس کی نظیریں ہیں مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے قتل سے اسی لیے احتراز کیا کہ کفار کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہ کو مقروض سے ہدیہ قبول کرنے سے منع فرمایا ہے اِلّا یہ کہ وہ اِسے قرض میں سے وضع کر دے۔ وجہ یہ ہے کہ ہدیہ دینے سے مقروض کی غرض یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اُسے ادائے قرض میں تاخیر کا بہانہ بنائے۔ یہ کُھلا ہوا سُود ہوگا کیونکہ قرض خواہ کا اصل تو اُسے پورا پورا واپس ملے گا اور جو کچھ تحفے کے طور پر اسے دیا جائے وہ مزید ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانۂ جنگ میں (چوری کی سزا کے طور پر) ہاتھ کاٹنے سے

منع کر دیا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ یہ سزا، سزا یافتہ کے دشمن سے جا ملنے کا باعث بن جائے۔ اسی مصلحت کی بنا پر جنگ میں حدود نہیں نافذ کی جاتیں کہ مبادا سزا کی دہشت مجرم کو گمراہی میں نہ مبتلا کر دے، جس کا دروازہ حالتِ جنگ میں بالکل سامنے ہوتا ہے۔

مہاجرین و انصار میں سے سابقین اوّلین کا طریقہ یہ تھا کہ جس عورت کو اُس کے شوہر نے مرضِ موت میں طلاقِ بائن دی ہو اُسے اس مرد کے ورثہ کا بربنائے زوجیت مستحق قرار دیتے تھے۔ کیونکہ مرد پر یہ شُبہ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے عورت کو اس لیے طلاق دی کہ وہ ورثہ سے محروم ہو جائے۔ محروم کرنے کا ارادہ ثابت تو نہیں کیا جا سکتا۔ مگر طلاق عملاً اس کا ذریعہ بنتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احتکار سے منع فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے:

من احتکر فھو خاطئ (مسلم، ابو داؤد، ترمذی)

"جس نے احتکار کیا اس نے غلط کام کیا"

احتکار ضروریاتِ زندگی کا ذخیرہ کر کے لوگوں پر تنگی کرنے کا ذریعہ ہے اسی لیے جس چیز کی ذخیرہ اندوزی عوام کے لیے تنگی کا باعث نہ ہو اس کا احتکار ممنوع نہیں مثلاً سامانِ زینت و آرائش جنھیں ضروریات میں نہیں شمار کیا جاتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کرنے والے کو اپنی صدقہ کی ہوئی چیز کے خریدنے سے منع فرمایا ہے خواہ وہ چیز عام بازار میں فروخت ہوتی ہوئی ملے۔ مقصود یہ ہے کہ کسی ذریعہ سے بھی اِس چیز کو واپس لینا ممکن نہ رہے جو اللہ کی راہ میں دی جا چکی ہو، خواہ یہ ذریعہ خریداری ہی کیوں نہ ہو۔ جب آپؐ نے بالعوض ایسی چیز کو واپس لینے سے رُوک دیا ہے تو بلا عوض واپس لینا بدرجۂ اولیٰ ممنوع قرار پائے گا۔ صدقہ کی ہوئی چیز کو قیمت دے کر حاصل کر لینے کی اجازت دینے سے اس بات کی گنجائش نکل آتی کہ کوئی کسی فقیر کے ساتھ حیلہ بازی کرے۔ وہ اُسے ایک چیز صدقہ کے طور پر دے پھر اُسے اصل قیمت سے کم پر خرید لے اور فقیر بیچلا

یہ سمجھ کر کہ اُسے کچھ نہ کچھ تو مل ہی رہا ہے خوشی خوشی اسے کم داموں پر فروخت کردے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے اس طرح کے بکثرت نظائر منقول ہیں۔ علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں تقریباً نوے نظائر پیش کیے ہیں جن میں سدِ ذرائع کی خاطر کسی چیز سے منع کیا گیا ہے۔

"کہا گیا ہے کہ آدھے اسلامی قوانین سدِ ذرائع پر مبنی ہیں"

حاصلِ کلام یہ کہ مصالح مرسلہ اور سدِ ذرائع کے یہ دو اصول ایسے ہیں کہ اُن کو اُن کے وسیع معانی کے ساتھ زیرِ عمل لایا جائے تو یہ حاکم کو ہر طرح کے اجتماعی مفاسد کے ازالہ کا اختیارِ مطلق عطا کرتے ہیں، خصوصاً جب کہ اس میں دولت پر ٹیکس لگانے کا اختیار شامل ہے۔ یہ اختیار اگر کسی قید کا پابند اور کسی شرط سے مشروط ہے تو صرف یہ کہ اُمت کے عام مفاد و مصالح کی رعایت ملحوظ رکھی جائے اور مکمل اجتماعی عدل کے قیام کو ہدف قرار دیا جائے۔

ان تصریحات کی روشنی میں واضح ہے کہ اسلام میں انفرادی ملکیت کا اصول اس بات میں مانع نہیں ثابت ہوگا کہ ریاست نفع یا خود سرمایہ میں سے ایک حصہ وصول کر لے۔ شرط یہ ہے کہ اسلامی نظام کے بنیادی اُصول کی پوری رعایت ملحوظ رکھی جائے۔ وہ اُصول یہ ہے کہ افراد کو ذاتی ملکیت رکھنے کا حق حاصل رہے اور اس میں اضافہ کے شرعاً جائز طریقوں کے مطابق انھیں اس کے ثمرات حاصل ہوتے رہیں۔ نجی املاک میں سے محصول اسی حد تک وصول کیے جائیں جس حد تک پیش آمدہ ضرورت کا تقاضا ہو، اور ایسا طریقہ نہ اختیار کیا جائے کہ لوگ گھبرا اُٹھیں اور اُن میں پیداواری اعمال بجالانے اور دولت میں اضافہ چاہنے کا رجحان کمزور پڑ جائے .... اور ان باتوں سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ افراد کو اپنی روزی کی طرف سے اطمینان باقی رہے اور وہ ریاست کے ایسے غلام نہ بن جائیں جنھیں ڈر ہو کہ اگر اس پر تنقید کریں گے یا اس کی مخالفت کریں گے تو ان کی روزی بند کر دی جائے گی۔ کیوں کہ مسلمان پر ــــ ہر مسلمان پر ــــ یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ حکمراں پر نگاہ رکھے اور اسے اللہ کی شریعت سے انحراف سے روکے۔ بھلا اس ذمہ داری کی ادائیگی کس طرح بن پڑے گی اگر اس کی اپنی روزی اپنے ہاتھوں

میں نہ ہو، نہ اس کے پاس کوئی مال و املاک ہوں، بجز ان چیزوں کے جن کی ریاست اُسے اجازت دے۔

یہ عجیب رسم چل پڑی ہے کہ سارا زور صرف زکوٰۃ پر صرف کیا جائے۔ گویا اسلام میں مال کا حق صرف زکوٰۃ تک محدود ہے۔ ہمارا صاف صاف بیان اس غلط رسم کا پردہ چاک کرنے اور ان پیشہ ور علماء، کی حقیقت آشکارا کرنے کے لیے ضروری ہوا جن کا کاروبار آیات کی سستے داموں تجارت کرنا ہے یہ لوگ اپنے پیٹ جہنم کی آگ سے بھر رہے ہیں۔

ان لوگوں کی مغالطہ انگیزی کو دفع کرنے کے لیے یہ بھی وضاحت ضروری تھی جو سماجی تحفظ کی ان ضمانتوں کا درجہ گھٹا کر بیان کرتے ہیں جو اسلامی نظام میں فراہم کی گئی ہیں۔ اور انھیں ناکافی قرار دے کر یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اسلامی نظام دورِ حاضر کی زندگی کے تقاضے نہیں پورے کر سکتا۔ یہ ساری باتیں افتراء انگیزی اور پروپگنڈے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ ایسی باتیں کرنے والے اسلام کی حقیقت اور اسلامی نظامِ زندگی نیز اس کی عملی تاریخ سے یکسر ناواقف ہیں۔

اس کتاب میں ہمارا موضوعِ بحث "اسلام کا اقتصادی نظام،، نہیں ہے کہ ہم اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالیں۔ ہمارا موضوع اجتماعی عدل کے ضمن میں اقتصادی پالیسی کا بیان ہے... اگرچہ اسلام نے زندگی کے لیے جو مکمل نظام عطا کیا ہے اس کے ایک شعبہ کو دوسرے شعبہ سے الگ کرنا بڑا دشوار ہے۔ لیکن اس کتاب کے موضوع کی نوعیت اسلام کے اقتصادی نظام کے بارے میں مزید تفصیلات کی متحمل نہیں۔

چنانچہ ہم ذیل میں اس نظام کے بنیادی اصول اختصار کے ساتھ بیان کر دینے اکتفا کریں گے۔

۱۔ یہ نظام "مشروط نیابت،، پر مبنی ہے۔ زمین کے جملہ وسائل و املاک کا خالق و مالک اللہ سبحانہٗ ہے۔ اس نے نوعِ انسانی کو اس زمین میں اپنا نائب مقرر فرمایا ہے ـــــ اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس ملکیّت میں اللہ کی شریعت کے مطابق تصرّف کرے۔ اس شرط کی ہر خلاف ورزی تصرّف کو کالعدم کر دیتی ہے اور نیابت کے معاہدہ کو ختم کر دیتی ہے۔

۲۔ یہ نیابت عام ہے۔ لیکن افراد کو اُن کے "عمل،، کے عوض انفرادی ملکیّت کا حق حاصل ہوتا

ہے۔ چنانچہ شارع یعنی اللہ سبحانہٗ انھیں بعض متعین املاک کا مالک بنا دیتا ہے اور اس حق کو وہ عام تحفظات عطا کرتا ہے جن کے نتیجہ میں فرد کو اپنی روزی کی طرف سے اطمینان ہو جائے اور وہ دلجمی کے ساتھ باعزت طریقہ پر زندگی گزار سکے، تاکہ وہ شریعت الٰہی کے نفاذ کے سلسلہ میں نگرانی اور احتساب کی وہ ذمہ داری ادا کر سکے جو اس پر عائد کی گئی ہے۔

۳۔ انفرادی ملکیت اگرچہ اس نظام کا بنیادی اصول ہے لیکن یہ حق حصولِ ملکیت، اس میں اضافہ چاہنے اور اس کے استعمال کے ضمن میں متعدد حدود و قیود کا پابند کیا گیا ہے، جن کا منشا، فرد اور جماعت کے مصالح کا حصول اور دونوں میں سے کسی ایک کے حد سے تجاوز کر جانے کو روکنا ہے۔

۴۔ اُمتِ مسلمہ کی زندگی کا بنیادی طریقہ، انفرادی ملکیت کے اصول کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے، کفالتِ باہمی ہے۔ انفرادی ملکیت پر عاید ہونے والی جن ذمہ داریوں کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے وہ اسی اصول (کفالت باہمی) کا تقاضا ہیں اور انھیں شریعت نے واضح کر دیا ہے۔ کفالتِ باہمی پر عمل کے لیے شریعت کی عائد کردہ یہ ذمہ داریاں کافی ہیں۔

۵۔ اِس نظام کے ذریعہ اُس سے کہیں زیادہ اور بہتر اجتماعی عدل قائم ہوتا ہے جتنا انسان کے وضع کردہ کسی دوسرے نظام کے ذریعہ ممکن ہے جس میں صحیح اور غلط دونوں کی آمیزش ہوگی۔

باب ہفتم

تاریخ اِسلام سے چند مثالیں

تاریخِ اسلام سے چند مثالیں

تاریخِ اسلام میں وہ رُوح کارفرما نظر آتی ہے جسے ہم بجا طور پر "اسلام کی روح" کہہ سکتے ہیں۔ اِس دین کے مزاج اور اس کی تاریخ کا جو شخص بھی صحیح طریقہ سے مطالعہ کرے گا۔ اُس کی رُوح کو پائے گا۔ اسے یہ روح اسلام کی ہدایات اور قوانین کے پیچھے کام کرتی اور ان کے اندر جاری و ساری ملے گی۔ یہ روح اتنی واضح اور مؤثر ہے کہ کوئی انسان اس کا اثر لیے اور اس کی فضا میں محو ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ہر بنیادی اور گہرے احساس اور ہر کلی اور بلند فکر کی طرح اُسے بھی محدود الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ رُوح رجحانات اور مقاصد میں اپنی جھلک دکھاتی ہے، واقعات و حوادث اور رسوم و رواج میں جلوہ افروز ہوتی ہے، مگر اسے محدود الفاظ کا جامہ پہنانا مشکل ہے۔

یہی رُوح اُس اُفقِ اعلیٰ کے نقش و نگار واضح کرتی ہے جس کی طرف اقدام کی اسلام اپنے پیرووں کو تلقین کرتا ہے۔ یہی مقامِ بلند ہے جس تک پہنچنے کے لیے اسلام انسان کو ترغیب دیتا ہے کہ صرف فرائض کی تعمیل اور شعائرِ اسلامی کی پابندی پر اکتفا نہ کرے بلکہ اپنی طبیعت کے تقاضے سے، راضی خوشی، مزید کوشش بھی کرے۔ اس بلندی کی راہ کٹھن اور دشوار گزار ہے اور اس تک پہنچ کر اُس پر قائم رہ جانا اس سے زیادہ مشکل ہے حیاتِ انسانی کے طبعی میلانات اور ضروریاتِ زندگی کا دباؤ ان مقاماتِ بلند کی طرف پیش قدمی میں اکثر انسانوں کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے۔ اگر وہ وفورِ شوق اور خروشِ جذبات کے سہارے کبھی اس تک پہنچ بھی جائیں تو یہ چیزیں زیادہ عرصہ اس مقام کی دشواریوں

کا مقابلہ کرتے ہوئے اِس پر جمے رہنے کا موقع نہیں دیتیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس مقام بلند کے ساتھ جان و مال، اور فکر و عمل سے متعلق کچھ گراں بار ذمہ داریاں وابستہ ہیں۔ ان ذمہ داریوں میں وہ سب سے زیادہ کٹھن ہمہ دم بیدار و ہوشیار رہنے کی وہ ذمہ داری ہے جو اسلام نے فرد کے ضمیر پر عائد کی ہے، اور وہ شدّتِ احساس جو وہ فرد کے شعور کو عطا کرتا ہے۔ اس شدّتِ احساس کا تعلق ان حقوق و فرائض سے ہے جو فرد اپنی ذات، اپنے سماج، نوعِ انسانی اور پھر اس خالق کے سلسلہ میں عائد ہوتے ہیں جو اس کے چھوٹے بڑے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے اور اس کی راز کی باتوں اور خاموش سرگرمیوں سے بھی پوری طرح واقف ہے۔

اس پیش قدمی کی دشواری اور اس مقام بلند پر ثابت رہنے میں کامیابی کا مشکل ہونا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ اسلام ایک شاعرانہ تخیل یا ایک ایسا وجدانی تصور ہے کہ ہمارا شوق تو اس کے دامن چھو سکتا ہو مگر عمل کی رسائی اُس تک ناممکن ہو۔ ایسا نہیں، جس مقام بلند کا ذکر ہے اس تک پہنچنے کا ہر زمانہ میں ہر انسان کو مکلّف نہیں بنایا گیا بلکہ یہ ایک ایسا ہدف ہے جس کے نقوش واضح کر دیئے گئے ہیں تاکہ انسانیت ہر آن اُس کے حصول کے لیے سرگرم عمل رہے۔ آج بھی اس کے لیے تگ و دو کرے اور کل بھی، جس طرح کہ ماضی میں کرتی رہی ہے۔ کبھی اُس نے اُسے پا لیا اور کبھی اُس سے دور رہ گئی۔ یہ ایک ایسا آئیڈیل ہے جس میں انسان، اس کے ضمیر اور اس کی صلاحیتوں اور قوتوں پر گہرا اعتماد مضمر ہے۔ اس میں اس بات کی دلیل پنہاں ہے کہ مستقبل بعید میں انسان سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اس ہدف سے پہلے ہی ایک وسیع میدان ہے جو سعی و جہد اور کامیابی کے اس معیار کے لیے کافی ہے جو اکثر انسانوں کے لیے ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک مستقل اصول ہے کہ وہ کسی فرد کو اس کی طاقت سے زیادہ کوشش کا مکلّف نہیں بناتا (لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) اسلام کا معتدل مزاج عام انسانوں سے اتنے عمل کو بھی بخوشی قبول کر لیتا ہے کہ وہ حدود کی پابندی کریں اور زندگی کو اس سطح سے نیچے نہ گرنے دیں۔ کیونکہ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا[۲]۔ جو فرائض عائد کیے گیے ہیں، اور جو ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں وہ زندگی کی راست رَوی اور فلاح کے لیے کافی ہیں۔ رہا افقِ اعلیٰ کی راہ تو وہ ہمیشہ کھلی ہوئی ہے، مجسّم دعوتِ اقدام!

جس روح کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس نے اسلام کی عملی تاریخ کی تشکیل میں اپنا پورا اثر دکھایا

ہے۔ یہ اسی کا فیض ہے کہ اسلام، جو ایک عقیدہ اور ایک تصور کا نام تھا شخصیتوں اور تاریخی واقعات کی شکل میں مجسم ہو کر سامنے آیا۔ اب یہ مجرد نظریات کا نام نہیں رہ گیا، نہ محض ارشادات و مواعظ کا پُشتارہ اور نہ صرف تصورات و خیالات کا مجموعہ۔ اب یہ جیتے جاگتے انسانی کردار، عملی دنیا کے حقائق اور ایسے اداروں اور کارناموں کا جامہ پہن چکا تھا جو آنکھوں سے دیکھے جا سکتے تھے جنھیں کان سُن سکتے تھے۔ اور جنھوں نے عملی زندگی اور تاریخِ انسانی پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ جیسے کوئی نئی روح تھی جو اُن شخصیتوں میں پڑ کر اُن کے اندر ایک انقلاب برپا کر دیتی، پھر انھیں ایک نئے رنگ میں رنگ کر ایک نئی زندگی دے کر اٹھاتی۔

یہی صحیح توجیہہ ہے اِن عجیب شخصیتوں کی جن کا ریکارڈ تاریخ اسلامی کے شروع اور اس کے بعد کے ادوار پیش کرتے ہیں۔ یہی بات ان سارے واقعات کی کنہ تک پہنچاتی ہے جو آپ کو بلندیٔ تخیل کے گھڑے ہوئے افسانے معلوم ہوتے ہیں جو کبھی پیش نہ آئے ہوں، نہ واقعات نے ان پر گواہی دی ہو اور نہ تاریخ نے انھیں اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا ہو۔

یہی چیز پاکیزگیٔ رُوح، شجاعتِ نفس، ایثار و قربانی، مقصد میں فنا ہو جانے کی کیفیت فکر و روح کی غیر معمولی بلند پروازیوں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ان عظیم کارناموں کی بھی توجیہہ کرتی ہے جن کا پوری طرح احاطہ کرنا تاریخ کے بس سے باہر ہے۔

جو کارنامے اور غیر معمولی واقعات تاریخ کے صفحات پر پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں اُن کے اور اسلام کی قوی اور فعال روح کے درمیان ہمیں ایک گہرا ربط تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہی روح اس طاقت کا منبع ہے جس کے مظاہر تاریخِ اسلام میں چار سُو پھیلے نظر آتے ہیں۔

اگر ہم اُن کارناموں کا اس سرچشمہ سے صحیح ربط و تعلق سمجھے بغیر انھیں الگ الگ دیکھیں گے تو قوی اندیشہ ہے کہ ہمارا مطالعہ ناقص رہے گا اور یہ غلط مطالعہ ہم کو ان قوتوں کے بارے میں سخت غلط فہمی میں مبتلا کر دے گا جو کائنات و حیات میں حقیقتًا کارفرما ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہر شخص کی عظمت کا راز اس کی عبقریت میں مضمر قرار دیا جائے گا، اور اس روح کو نظر انداز کر دیا جائے گا جو اوّلین محرّک اور مؤثر ترین عامل ہے۔ جو ان عظیم افراد کے قلب و ضمیر پر اثر انداز ہوئی، جس نے زمانہ کی گاڑی کا رُخ بدل دیا، واقعات و حوادث کی باگیں خود سنبھال لیں۔ اور ان

سب کو خردشِ زندگی سے لبریز ایک تیزرَو اور ہنگامہ خیز دھارے کے سپرد کر دیا جس کی موجوں کے سہارے یہ عبقری اور یہ کارنامے اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔

اگر ہم عبقریین کے ظہور اور ان کارناموں کے صدور کو تمام تر اس طاقتور اور فعال روح کا فیضان قرار دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ دراصل یہ رُوح ایک کائناتی حرکت ہے جو کارناموں اور شخصیتوں کی اُن قوتوں سے آملی ہے جو بظاہر انفرادی مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے آفاقی ہیں۔ ان میں سے ہر فرد کی عبقریت کا معیار اس کائناتی فیض کو جذب کرنے کی وہ صلاحیت ہے جس کا اس نے مظاہرہ کیا۔ اب اگر بلند ترین رُتبہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا قرار دیا جاتا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہی وہ ذاتِ گرامی تھی جس نے اس فیض کو بتمام وکمال جذب کر لیا۔ اس کو پوری طرح اپنا لیا۔ اور اس بلند مقام پر عرصۂ دراز تک فائز رہی جو ساری عمر میں ایک یا دو عارضی اتفاقات کے علاوہ اس مقامِ بلند سے ایک لمحہ کے لیے نہ ہٹی۔ یہی وہ اتفاقی لمحات ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نبیؐ کو سختی کے ساتھ تنبیہہ فرمائی۔ ان دو مواقع کے سوا اپنی زندگی کے سارے لمحات میں اس بشرؐ کی رُوح نے اس کائناتی فیضان کو پوری طرح جذب کیے رکھنے کا عظیم کارنامہ کر دکھایا ـــــ کیوں نہ ہو، روحِ انسانی بھی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک کائناتی قوت ہے نہ کہ انفرادی۔

مقامِ نبوت کے بعد بلندئ مراتب کے مختلف درجے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف صحابیوںؓ کو، اور بعد کی تاریخ کے ادوار میں اُن کے پیروؤں کو نصیب ہوتے ہیں۔ جو فرد اس عظیم دین کی روح کو جس درجہ جذب کر سکا اُسے اُس کے مناسب رُتبہ ملا۔

یہ جامع مطالعہ ہی ہمیں بتا سکتا ہے کہ اس اسپرٹ نے انسانی روحوں کو کس طرح متأثر کیا، کس طرح اُس نے خوابیدہ عبقریتوں کو بیدار کیا اور متحرک اور فعال بنایا۔ عظیم اور محیّر العقول کارناموں کو جنم دیا اور بالآخر تاریخِ انسانی کا رُخ بدل دیا۔

اس روح کی تاثیر کا پتہ ہمیں تاریخ کے بڑے بڑے واقعات اور روزمرہ زندگی میں پیش آنے والی باتوں، دونوں کے اندر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ روحانی عظمت کو مقدار اور طول وعرض میں نہیں ناپا جا سکتا بلکہ اس کا تعلق کیفیت سے ہے، اس کا اندازہ صرف آثار و قرائن کے ذریعہ لگایا جا سکتا ہے۔ جزیرۂ عرب کے مٹھی بھر انسانوں نے بہت مختصر سی مدت میں قیصر اور کسریٰ کی دو عظیم سلطنتوں پر غلبہ حاصل

کرلیا۔ تاریخِ انسانی مختصر سی مدت میں اتنی بڑی فتح کی کوئی اور نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے لیکن اس عظیم واقعہ کی عظمت میں کوئی کمی نہ آجائے گی اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ یہی عظمت بلال حبشی نامی غلام کے اُس صبر میں بھی پائی جاتی ہے جس کا مظاہرہ آپ نے قریش کی ایذارسانی کے مقابلہ میں فرمایا۔ (رضی اللہ عنہ) قریش نے بلال حبشی کو اُن کے دین سے پھیر دینے کے لیے وہ تکلیفیں دیں جن کو برداشت کرلینا انسان کے بس سے باہر ہے۔ نیچے سے اُن کو تپتے ہوئے سنگریزوں کی گرمی جھلسا رہی تھی، پیٹ اور سینہ پر پتھروں کا بوجھ تھا، بھوک اور پیاس کی شدت بھی تھی اور دوسری تکلیفیں بھی دی جا رہی تھیں، لیکن ناقابل برداشت عذاب کی اِس دہکتی ہوئی بھٹی میں بس آپ کے منہ سے جو بات نکلی وہ تھی "احد، احد!"

یہی اسپرٹ ہے جو راہ چلتے عامی میں سرایت کرجاتی ہے تو اسے مختارِ کل سلطانِ وقت کے سامنے لاکھڑا کرتی ہے، جہاں وہ کھری کھری بات سُناتا ہے اور راہِ خدا میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتا یہی رُوح اُس خلیفۂ راشد میں نظر آتی ہے جس کی حکمرانی بہت سے ممالک پر پھیلی ہوئی ہے، لیکن وہ قناعت، خاکساری اور بے نیازی کے اعلیٰ معیار پر قائم رہتا ہے۔ دونوں افراد ایک ہی چشمہ سے سیراب ہوئے ہیں، اور وہ ہے یہ طاقتور، فعّال اور موثر رُوحِ اسلام۔

قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتوں پر عربوں کے غلبہ کا ذکر آگیا ہے تو مناسب ہوگا کہ ہم اس روح کی قوتوں کا صحیح طور پر اندازہ کرلیں۔ یہ اُن بے پناہ قوتوں پر کیسے غالب آگئی جو اس جنگ کی خاطر ان سلطنتوں میں اکٹھا کی گئی تھیں، جن پر اہلِ عرب کو بغیر اس روح کے ہرگز غلبہ نہیں نصیب ہوسکتا تھا۔ یہاں اسلام کی فتح دراصل ایک روحانی نظریہ کی فتح تھی جس نے انسانوں کے دلوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ یہ واقعہ تاریخ کی روحانی تعبیر کی تائید کرتا ہے کیونکہ یہاں مادی تعبیر سے کام نہیں چل سکتا۔ وہ اس غیر معمولی فتح کی توجیہہ نہیں کرسکتی۔

واضح رہے کہ وہ عظیم نفسیاتی انقلاب جو اسلام نے عربوں کے فکر و عمل، مقصد اور نصب العین اور سماجی اور معاشی تنظیم میں برپا کیا، اس کا درجہ ان فتوحات سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ وہ روحِ اسلام کی قوت و عظمت پر ان فتوحات سے زیادہ واضح طور پر گواہی دیتا ہے۔ آخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپؐ کی وفات کے درمیان جزیرۂ عرب کے معاشی حالات میں کون سی بنیادی تبدیلیاں واقع ہوگئی تھیں جنھوں نے عربوں کے فکر و نظر، حرکت و عمل، اور اجتماعی تنظیم کے اندر ایک انقلاب

برپا کر دیا۔؟ ان سارے کارناموں کا خالق یہی روحانی نظریہ تھا۔

یہاں ہمارے لیے اس انقلاب کا تفصیلی مطالعہ ممکن نہیں، ہم صرف اس کی ایک جھلک دکھانے پر اکتفا کریں گے۔ یہ جھلک اس بیان میں نظر آتی ہے جو اس زمانہ کے عرب نے اس دین کے منکرین کی موجودگی میں دیا تھا۔ جس کی وہ لوگ کوئی تردید نہ کر سکے تھے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب دعوتِ اسلامی اپنے ابتدائی مراحل سے گذر رہی تھی اور قریش کی ایذارسانی سے بچ کر اپنے دین کو سلامت رکھنے کی خاطر مسلمان ہجرت کرکے حبشہ چلے گئے تھے۔ قریش کو اندیشہ ہوا کہ مسلمانوں کو دارالہجرت میں اطمینان کا سانس لینے کا موقع نہ مل جائے۔ چنانچہ اس نے حبشہ کے نجاشی کے پاس دو سفیر بھیجے تاکہ وہ ان مہاجرین کو وہاں سے نکلوا دیں۔ یہ دو سفیر عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ تھے۔ انھوں نے جاکر یہ کہا:

"اے بادشاہ! ہمارے یہاں کے کچھ ناسمجھ لڑکے بھاگ کر تیرے ملک میں آبسے ہیں انھوں نے اپنی قوم کے دین کو چھوڑ دیا ہے اور تیرے دین کو بھی نہیں اپنایا ہے، بلکہ یہ اپنی جانب سے گھڑ کر ایک ایسا دین لائے ہیں جو ہمارے لیے بھی اجنبی ہے اور تیرے لیے بھی۔ ہمیں ان کی قوم کے معززین نے جن میں اُن لڑکوں کے باپ، چچا اور دوسرے اعزہ بھی شامل ہیں تیرے پاس بھیجا ہے تاکہ تو انھیں ان کے پاس واپس بھیج دے۔ وہ اُن لڑکوں سے زیادہ بالغ نظر واقع ہوئے ہیں اور یہ جن چیزوں کی بابت اعتراض کرنے اور انھیں بُرا بھلا کہتے ہیں۔ ان کو وہ ان سے بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔"

جب نجاشی نے مسلمانوں سے دریافت کیا:

"یہ دین کیا ہے جس کی خاطر تم نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا اور نہ تو میرے دین میں داخل ہوئے نہ کسی اور دین میں؟"

تو جعفرؓ بن ابی طالب نے جواب دیا:

"اے بادشاہ! ہم جاہلیت میں مبتلا تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے اور بدکاریاں کرتے تھے۔ خونی رشتوں کا پاس و لحاظ نہ کرنا اور پڑوسی کے حق سے غافل رہنا ہمارا شعار تھا۔ ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزوروں کا خون چوستا تھا۔ ہم اس حال میں تھے کہ اللہ نے ہم ہی میں سے ایک کو ہماری جانب پیغام بر بنا کر بھیجا

ہم اس کے حسب و نسب، اس کی صداقت شعاری، امانت داری اور پاک بازی سے
اچھی طرح واقف ہیں۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا، اُسے ایک جاننے اور اسی کی عبادت
کرنے کی تلقین کی۔ اس نے ہم سے کہا کہ ہم ان پتھروں اور بتوں کی پوجا ترک کر دیں جن کو
ہم اور ہمارے آبا، اللہ کے سوا پوجتے رہے ہیں۔ اُس نے سچ بولنے، امانت داری،
صلہ رحمی اور پڑوس کے ساتھ حسنِ سلوک کی، اور خوں ریزی اور بے حُرمتی سے باز رہنے
کی تلقین کی۔ اُس نے فحش، دروغ گوئی، یتیم کا مال کھانے اور شریف عورتوں پر تہمت
طرازی کرنے سے منع کیا۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں اور کسی
کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور روزے رکھیں..... الخ"

قریش کے دونوں سفیر دربار میں موجود تھے۔ اُن میں سے ایک عمرو بن العاص تھے جن میں نہ ڈپلومیسی کی کمی تھی نہ طلاقتِ لسان کی۔ مگر جعفرؓ نے اسلام کے قبل عرب کی حالت کا جو نقشہ کھینچا یا اس نئے دین کی حقیقت کے بارے میں جو کچھ کہا اس کی دونوں میں سے کسی نے تردید نہ کی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب کے ماضی اور حال کا بیان بالکل ٹھیک تھا۔

یہ تاریخ کے صفحات میں سے صرف جزیرۂ عرب کی بابت ایک گواہی تھی۔ دورِ جدید کا ایک غیر مسلم اس وقت کی پوری دنیا سے متعلق ایک ایسی ہی گواہی دیتا ہے۔ جے ایچ ڈینیسن J.H. Denison اپنی کتاب "جذبات بحیثیت اساسِ تہذیب motions as the basis of civilization میں لکھتا ہے:

"پانچویں اور چھٹی ... صدی میں مہذب دنیا تاراج کے ایک ناپائدار اور پُرخطر کراڑے پر
کھڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عظیم الشان تمدن جس کی تعمیر پر چار ہزار سال کی
انتھک کوششیں صرف ہوئی تھیں، پارہ پارہ ہوا چاہتا ہے اور انسانیت، وحشت
و بربریت کے اس دور کی طرف دوبارہ لوٹا چاہتی ہے جو اس سے پہلے گذر چکا تھا۔ مختلف
قبائل خونیں جنگوں میں ایک دوسرے سے اُلجھے ہوتے تھے۔ نہ کوئی قانون باقی رہ گیا تھا
نہ کوئی نظم۔ مسیحیت نے جس نظم کی طرح ڈالی تھی وہ اتحاد و تنظیم کی بجائے انتشار و تفریق
کا باعث بن رہا تھا۔ اس وقت تہذیب کی حالت ایک تناور درخت کی سی تھی جس کی

شاخیں دور دور تک پھیلی ہوں اور ساری دنیا اس کے سایہ تلے آجائے لیکن اندر ہی اندر اُسے گھن لگ کر اس کے گودے تک سرایت کر چکا ہو ـــــ اس ہمہ گیر فساد کے مظاہر کے درمیان وہ شخص پیدا ہوا جس نے سارے عالم کو ایک کر دکھایا"[1]

یہ کہانی لمبی ہے اور ہماری کتاب کا موضوع "اسلام" نہیں بلکہ اسلام میں اجتماعی عدل ہے۔ لہذا اب ہم خاص اس عنوان سے متعلق کچھ تاریخی نظائر سامنے لانے پر اکتفا کریں گے۔

بیداریٔ ضمیر کے نمونے

لیکن ان تاریخی نظائر سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے اہم تر موضوع یعنی اسلام کے ضمیر پر روشنی ڈالنے والی بعض مثالیں سامنے لائیں کہ اسی ضمیر پر اسلام کی ساری عمارت قائم ہے

اسلام فرد کے ضمیر کو ہر آن بیدار رہنے کی جو تعلیم دیتا ہے اور اس کے شعور کو جتنا زیادہ حساس دیکھنا چاہتا ہے اس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اسلامی تاریخ نے اس بیداریٔ ضمیر اور شدتِ احساس کے اتنے نمونے محفوظ کر رکھے ہیں کہ وہ ان صفحات میں نہیں سما سکتے۔ یہاں بہت سی مثالوں کے بجائے چند مختلف النوع نمونے پیش کیے جا سکیں گے۔

بریدہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: ماعز بنؓ مالک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا: "اے اللہ کے رسولؐ! مجھے پاک کر دیجئے"۔ آپؐ نے فرمایا: "تیرا بُرا ہو، لوٹ جا اور اللہ کے حضور توبہ و استغفار کرے"۔ راوی کہتا ہے وہ تھوڑی دور تک واپس گئے، پھر لوٹ آئے اور آپؐ سے پھر یہی کہا کہ "اے اللہ کے رسولؐ، مجھے پاک کر دیجئے"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا۔ تین بار ایسا ہی ہوا۔ چوتھی بار رسولؐ اللہ نے فرمایا: "میں تجھے کس چیز سے پاک کر دوں؟" وہ بولے: زنا سے۔ رسول اللہ نے لوگوں سے پوچھا: یہ شخص پاگل تو نہیں؟ آپ کو بتایا گیا کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟ ایک شخص نے اُٹھ کر ماعز کے منہ کی بو سونگھی تو اُسے شراب کی بو نہ ملی۔

---

[1] ماخوذ از Islam and the New World Order مصنفہ مولانا محمد علی۔ عربی ترجمہ اُستاذ احمد جودۃ السحار۔

آپؐ نے پھر ان سے پوچھا: "کیا تم نے زنا کیا ہے؟" انھوں نے کہا: "ہاں۔" اس پر آپ نے حکم صادر فرمادیا اور اُن کو سنگسار کردیا گیا۔

اس واقعہ کو دو تین دن گذرے ہوں گے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپؐ نے فرمایا: "ماعز بن مالک کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔ اس نے ایسی توبہ کی ہے جو اگر ایک پوری قوم کے درمیان تقسیم کردی جائے تو اُن سب کے لیے کافی ہو۔"

پھر آپ کے پاس قبیلۂ اَزد کے بطن غامد کی ایک عورت آئی اور اس نے کہا: "اے اللہ کے رسولؐ، مجھے پاک کردیجئے۔" آپؐ نے فرمایا: "تیرا بُرا ہو، لوٹ جا اور اللہ کے حضور توبہ استغفار کرلے۔" وہ بولی۔ "کیا آپؐ مجھے ماعز بن مالک کی طرح لوٹانا چاہتے ہیں؟ یہ زنا سے قرار پایا ہوا حمل ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "کیا تو (زنا سے) حاملہ ہے؟" اُس نے کہا: "ہاں۔" آپؐ نے اس سے کہا: "وضع حمل تک انتظار کر۔" راوی کہتا ہے کہ پھر آپؐ نے اس عورت کو بچہ جننے تک کے عرصہ کے لیے ایک انصاری کی نگرانی میں دے دیا۔ کچھ عرصہ بعد اس انصاری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر آپؐ کو مطلع کیا کہ غامدی عورت بچہ جن چکی۔ آپؐ نے فرمایا: "مگر ہم ایسا نہیں کریں گے کہ اسے سنگسار کردیں اور اس کے شیرخوار بچہ کو اکیلا چھوڑ دیں کہ کوئی اُسے دودھ پلانے والا نہ ہو۔" اس پر ایک انصاری نے اٹھ کر کہا کہ: "اللہ کے نبیؐ، اس کے دودھ پلانے کا انتظام میں اپنے ذمہ لیتا ہوں۔" راوی کہتا ہے کہ پھر رسول اللہ نے اسے سنگسار کرادیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سے یہ کہا کہ لَوٹ جا، جب بچہ جن لینا تب آنا۔ جب وہ بچہ جن لینے کے بعد آئی تو آپؐ نے فرمایا کہ جا اِسے دودھ پلا، جب دودھ چُھڑا لینا تب آنا۔ جب وہ دودھ چُھڑا چکی تو بچہ لے کر آپؐ کے پاس آئی، بچہ کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس نے آپؐ سے کہا: رسولِ خدا، میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا ہے اور اب یہ کھانا کھانے لگا ہے۔ آپؐ نے بچہ کو کسی مسلمان کے حوالہ کردیا اور اس عورت کے رَجم کا حکم صادر فرما دیا۔ چنانچہ اس کے سینہ تک گہرا ایک گڑھا کھودا گیا۔ پھر آپؐ کے حکم سے لوگوں نے اُسے سنگسار کردیا۔ خالدؓ بن ولید نے ذرا آگے بڑھ کر ایک پتھر اس کے سر پر مارا جس سے خون کے چھینٹے اُڑ کر اُن کے چہرے پر پڑے اس پر انھوں نے اس عورت کو بُرے الفاظ سے یاد کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خالد، ذرا سنبھل کر، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے، اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے جو اگر (ناجائز) چنگی وصول کرنے والا بھی کرتا تو اسے بخش دیا جاتا"۔ پھر آپ کے حکم سے اس کے جنازہ کی نماز پڑھی گئی، اور اسے دفن کر دیا گیا۔ (مسلم، نسائی)

ماعز بن مالک اور اس عورت کا کردار ہمارے سامنے ہے۔ ان میں سے کسی کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس سخت سزا سے ناواقف رہا ہوگا جو اس پر عائد ہونے والی تھی، یا اُسے اس بات کا اندازہ نہ رہا ہوگا کہ اسے کتنے بُرے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اُن کو کسی نے جُرم کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا کہ اُن کا جُرم ثابت کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود ان دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت اصرار کیا۔ آپؐ کی شفقت اور اسلام کی رحمت کا تقاضا ہوا کہ شُبہ کی بنا پر اُن کو سزا سے معاف رکھیں۔ لیکن ان دونوں نے بہت اصرار کیا۔ انھوں نے اپنے اوپر وہ سارے دروازے بند کر لیے جن سے وہ نکل کر بچ سکتے تھے۔ اس عورت نے تو رسول اللہؐ سے یہ گستاخانہ بات بھی کہہ دی کہ آپؐ نے اُسے اس طرح واپس کرنا چاہا جس طرح ماعز کو واپس کیا تھا ــــ گویا آپؐ پر دین کے معاملہ میں نرمی اور تساہل سے کام لینے کا الزام رکھ رہی ہو۔!

آخر یہ سب کیوں؟...... ان کا یہ کہنا کہ اللہ کے رسولؐ مجھے پاک کر دیجیے، اُن کے اندر ایک ایسی محرّک قوت کے وجود کی نشان دہی کرتا ہے جو خود زندہ رہنے کی خواہش پر بھی غالب ہے۔ یہ قوت ضمیر کی بیداری اور شعور کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اس گناہ سے پاک ہونے کی طلب ہے جس سے اللہ کے سوا کوئی اور واقف نہیں ہے۔ یہ اس بات سے آنے والی شرم ہے کہ کل کو اللہ کے حضور اس حال میں حاضر ہونا پڑے گا کہ ایک گناہ کیا تھا جس سے اب تک پاک نہیں ہو سکے۔

یہ ہے حقیقی اسلام۔ وہ شدتِ احساس اسی کا ظہور ہے جو مجرم کے ضمیر میں جنم لیتا ہے۔ وہ رحم و کرم اسی کا پرتو ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مجرم کو واپس کر دینے میں نمایاں ہے ـ وہ دانش مندی اسی کا فیضان ہے جس کا اظہار تہمت ثابت ہو جانے پر مجرم کو سزا دینے میں ہوتا ہے کہ اعتراف کی پاکیزگی یا توبہ کی عظمت آپؐ کو نفاذِ قانون سے نہ روک سکی۔ وجہ یہ ہے کہ مجرم اور شارعؐ دونوں ہی کو اس دین کا اپنی محکم بنیادوں پر قائم رہنا عزیز تھا۔

حدود کے بارے میں اس ضمیر کا یہ حال ہے۔ اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان اجتماعی امور

ہیں اس کا کیا حال ہوگا جس کی خاطر جان تک قربان کر دی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں شام کے لشکر کی امارت سے خالدؓ کو معزول کر کے ابو عبیدہؓ کو امیر مقرر کرنے کا واقعہ سامنے آتا ہے۔ یہ خالدؓ وہی سپہ سالار ہیں جو اس وقت تک کبھی شکست سے دوچار نہیں ہوئے تھے۔ وہ ایسے سپاہی تھے جس کی رگ وپے میں سپاہیت سرایت کیے ہوئے تھی۔ جاہلیت کے دور میں بھی اور اسلام لانے کے بعد بھی۔ ان خالدؓ کو امارت سے معزول کیا جاتا ہے مگر یہ کینہ وفساد پر نہیں اتر آتے۔ ان کو غیرت نہیں ستاتی کہ میدانِ جنگ سے رُوپوش ہو جائیں۔ کسی طرح کی بغاوت کا خیال دل میں لانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ اُسی میدانِ جنگ میں، اُسی جوش وجذبہ کے ساتھ اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے اسی تڑپ کے ساتھ، اور خدا کی راہ میں شہید ہونے کی اسی تمنا کے ساتھ مصروفِ پیکار رہتے ہیں۔ وہ اس موقعہ پر کسی وسوسہ کو اپنے دل میں راہ نہیں دیتے کیونکہ اسلام فرد کے ضمیر میں جو ہمہ وقتی بیداری اور اس کے احساس میں جو شدت پیدا کرتا ہے وہ اس سے بہت بلند ہے کہ ان جیسی باتوں کو کچھ اہمیت دے۔

اس واقعہ کا دوسرا پہلو بھی معنیٰ خیز ہے۔ یہ پہلو عمرؓ بن الخطاب سے متعلق ہے۔ درحقیقت ان کا خالد کو معزول کرنا خود اسی شدتِ احساس کا نتیجہ تھا۔ آپ نے حضرت ابو بکرؓ کے دورِ خلافت میں خالد بن ولیدؓ کی بعض ایسی غلطیاں پکڑیں جن پر آپ کا ضمیر کانپ کانپ گیا۔ ایک بات یہ تھی کہ انھوں نے مالک بن نویرہ کو قتل کرنے میں جلدی کی اور پھر اس کی بیوی کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ اس کے بعد آپ نے پھر اسی قسم کی ایک بات پکڑی، اور وہ یہ کہ مُسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ میں عین اسی صبح کو جس کے قبل والے دن بارہ سو منتخب صحابہؓ اس جنگ میں شہید ہو چکے تھے، خالدؓ نے مجاعہ کی بیٹی سے نکاح کیا تھا۔ ان باتوں کے سامنے جو میرے خیال میں بُری باتیں تھیں آپ نے اس بات کو کوئی وزن نہ دیا کہ خالدؓ سب سے بڑے سپہ سالار تھے اور انھوں نے سب سے زیادہ معرکے سر کیے تھے اُمتِ اسلامیہ شام وعراق میں فیصلہ کن جنگوں سے دوچار تھی جن میں خالدؓ کی شکست سے ناآشنا سپہ سالارانہ مہارت کی شدید ضرورت تھی لیکن خالدؓ کی فحش غلطیوں نے عمرؓ کے ضمیر میں جو ہیجان برپا کر دیا تھا اس کو ان میں سے کوئی بات ان کی اس رائے کو نہ بدل سکی کہ خالدؓ کو لشکر کی امارت سے اور پھر لشکر سے علیحدہ کر دینا ضروری ہے۔ ایک مزید سبب یہ تھا کہ خالدؓ کے ذمہ جو کام کیے جاتے وہ

انھیں آزادانہ طور پر انجام دیتے اور یہ بات حضرت عمرؓ کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ آپ کا احساس ذمہ داری یہ ضروری سمجھتا تھا کہ جزئیات میں بھی دخل دیں اور ہر معاملہ پر پوری طرح نظر رکھیں[1]۔

پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ اگر خالدؓ نے اتنی بڑی غلطی کی تھی تو حضرت ابوبکرؓ نے انھیں کیوں چھوڑے رکھا۔؟

حقیقت یہ ہے کہ خالدؓ کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ کی رائے اتنی بری نہیں تھی جتنی کہ حضرت عمرؓ کی تھی۔ آپ کا خیال تھا کہ خالدؓ سے تاویل میں غلطی ہوئی ہے اور انھوں نے قصداً کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ اسی وجہ سے باوجود ان کے اس فعل پر غضب ناک ہونے کے آپ نے انھیں معاف کردیا۔ دوسرے واقعہ کو خاص طور پر آپ نے بہت بُری نظروں سے دیکھا اور انھیں ایک دھمکی آمیز خط لکھ بھیجا۔ لیکن چونکہ آپ کے نزدیک خالدؓ کی غلطی قابلِ معافی غلطیوں میں شمار کی جا سکتی تھی لہذا آپ نے اُنھیں معاف کردیا۔

اس دور میں اسلامی ضمیر جتنے بلند مقام پر تھا اس سے اس واقعہ کی توجیہ میل کھاتی ہے چنانچہ مجھے سخت تعجب ہے کہ "ڈاکٹر ہیکل جیسے شخص کو کس چیز نے مجبور کیا کہ انھوں نے خالدؓ کے معاملہ میں ابوبکر اور عمر (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے موقف کی ایسی توجیہ کی جو اسلام کی روح سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی اگرچہ وہ آج کل گندی سیاست سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اپنی کتاب "الصدیق ابوبکرؓ" کے صفحات ۱۵۰ تا ۱۵۲ پر لکھتے ہیں:

"تم نے دیکھا کہ مالک بن نویرہ کے معاملہ میں ابوبکرؓ اور عمرؓ کے درمیان اختلاف رائے کس حد تک جا پہنچا۔ یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ یہ دونوں حضرات مسلمانوں اور اسلام کا بھلا چاہتے تھے۔ پھر کیا اس اختلاف کی بنا یہ تھی کہ خالدؓ کی غلطی ایک کے نزدیک بہت بڑی اور دوسرے کے نزدیک چھوٹی تھی یا یہ کہ اصل اختلاف اس میں تھا کہ مسلمانوں کی زندگی کے ایسے نازک موقع پر کیا پالیسی موزوں ہوگی جب کہ ارتداد کی بر چل پڑی تھی اور جزیرۂ عرب کے مختلف گوشوں میں بغاوت سر اٹھا رہی تھی۔

---

[1] استاذ صادق عرجون کی کتاب خالدؓ بن ولید سے۔

میری رائے یہ ہے کہ اختلاف اس میں تھا کہ اس موقع پر کیا پالیسی اختیار کرنا چاہیے۔ ان دونوں افراد کے مزاج میں جو فرق تھا اس کے پیشِ نظر یہ اختلاف بالکل قدرتی تھا۔ عمرؓ بے لچک عدل کا نمونہ تھے۔ ان کے نزدیک خالدؓ نے ایک مسلمان پر ظلم کیا تھا، پھر عدت گذرنے سے پہلے اس کی بیوی کو اپنے نکاح میں لے لیا تھا، ہذا اب ان کا لشکر میں رہنا کسی طرح مناسب نہ تھا تاکہ پھر انھیں ایسا کام کرنے کا موقع نہ ملے جس سے مسلمانوں میں فساد پھیلے اور اہلِ عرب کی نگاہ میں اُن کی وقعت گھٹ جائے۔ انھوں نے لیلیٰ کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر اُن کو سزا نہ دینا کسی طرح ٹھیک نہ تھا۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جاتا کہ مالک کے معاملہ میں اُن سے ایک اجتہادی غلطی ہو گئی تھی ـــــ اگرچہ عمرؓ اسے کبھی نہیں تسلیم کر سکتے تھے ـــــ تو بھی انھوں نے اس کی بیوی (لیلیٰ) کے ساتھ جو کچھ کیا وہ آپ کے نزدیک اس بات کے لیے کافی تھا کہ اُن پر حد جاری کی جائے[1]۔ یہ بات کہ وہ سیف اللہ ہیں اور ایک ایسے کمانڈر ہیں کہ فتح اُن کے رکاب میں چلتی ہے، ان کے لیے عذر نہیں بن سکتی تھی۔ اگر اس طرح کے عذر تسلیم کیے جانے لگتے تو اُس کا مطلب یہ ہوتا کہ خالدؓ اور ان جیسے لوگوں کے لیے حرام چیزیں مباح قرار دے دی گئی ہیں۔ ایسا کرنا مسلمانوں کے سامنے احترام کتاب اللہ کی بہت بُری مثال پیش کرنے کے ہم معنیٰ ہوتا۔ اپنی اس رائے کی وجہ سے عمرؓ ابو بکرؓ کو بار بار توجہ دلاتے رہے یہاں تک کہ ابو بکرؓ نے خالدؓ کو بلا کر ان کی حرکتوں پر سخت تنبیہ کی۔

ابو بکرؓ کے نزدیک موقع اتنا زیادہ نازک تھا کہ اس طرح کی باتوں کو اہمیت نہیں دی جا سکتی تھی۔ ساری مملکت خطرے کی زد میں تھی اور بلادِ عرب میں چاروں طرف بغاوت و سرکشی کے فتنے سر اٹھا رہے تھے۔ ایسی حالت میں اجتہادی غلطی سے یا بغیر غلطی کے ایک فرد یا چند افراد کے قتل کی کیا اہمیت؟ یہ کمانڈر جس پر غلطی کا الزام تھا ان خطرات سے دفاع کا سب سے طاقتور ذریعہ تھا، کسی عورت سے نکاح کر لینا بلکہ اس کے پوری طرح پاک ہونے سے پہلے اس سے خلوت کرنا اہلِ عرب کے عادات و اطوار کے خلاف نہ تھا۔

---

[1] اگر واقعی آپ کی رائے یہی ہوتی تو آپ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں خالدؓ پر حد جاری کی ہوتی۔

بالخصوص کسی فاتح کے لیے۔ کیوں کہ اسے تو جنگ کے طفیل یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ جنگ میں پکڑی ہوئی لونڈیاں اس کی ملک میں آئیں[1]۔ ضروری نہیں کہ خالدؓ جیسے عظیم اور غیر معمولی انسانوں پر بھی قانون کے نفاذ میں سختی اور اصول پرستی سے کام لیا جائے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ ایسا کرنا مفاد مملکت کے منافی ہو اور اُسے خطرات میں مبتلا کر سکتا ہو۔ اس وقت مسلمانوں کو خالدؓ کی تلوار کی شدید ضرورت تھی۔ جس دن ابو بکرؓ نے اُن کو بلا کر تنبیہ کی تھی اُسی دن مسلمانوں کو اُن کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ (خالدؓ کے مستقر) البطاح کے بالکل قریب یمامہ میں مسیلمہ بنی حنیفہ کے چالیس ہزار جوان لیے کھڑا تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کی بغاوت سب سے خطرناک بغاوت تھی۔ مسلمانوں کے کمانڈروں میں سے وہ عکرمہؓ ابن ابی جہل کو حراست میں لے چکے تھے اور اب فتح کی ساری امیدیں خالدؓ کی تلوار سے وابستہ تھیں۔ کیا صرف مالک بن نویرہ کو قتل کی بنا پر یا خالدؓ کو فتنہ میں مبتلا کر دینے والی حسین لیلیٰ کی وجہ سے خالدؓ کو معزول کر دیا جاتا اور مسلمان فوجوں کو مسیلمہ سے مغلوب ہو جانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا؛ اور اللہ کے دین کو اس عظیم ترین خطرہ میں ڈال دیا جاتا جو اس زمین پر ممکن ہے؟ خالدؓ خدا کی نشانی تھا وہ خدا کی تلوار تھا۔ لہٰذا عین مناسب ہوا کہ جب ابو بکرؓ اُنھیں طلب کریں تو صرف تنبیہ اور سرزنش پر اکتفا کریں اور اسی وقت اُنہیں یہ حکم بھی دیں کہ یمامہ جائیں اور مسیلمہ کا مقابلہ کریں۔

یہ ہے میرے نزدیک صحیح تصویر اس اختلاف کی جو اس معاملہ میں ابو بکرؓ اور عمرؓ کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔ بنی حنیفہ کے جھوٹے مدعی نبوت نے جب عکرمہؓ کو پکڑ لیا تو ابو بکرؓ نے خالدؓ کو اس سے مقابلہ کے لیے جانے کا حکم غالباً اسی لیے دیا کہ اہل مدینہ اور خاص کر وہ لوگ جو

---

[1] ایسی باتیں وہی شخص لکھ سکتا ہے جو شریعتِ اسلامی کی الف ب سے بھی ناواقف ہو۔ اگر واقعتہ خالدؓ نے ایک مسلمان پر ظلم کیا تھا تو لازم تھا کہ ان پر حد جاری کی جائے۔ پھر جب یہ شخص مسلمان تھا تو اس کی بیوی کو جنگ میں لونڈی نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

عمرؓ کی رائے سے متفق تھے یہ دیکھ لیں کہ خالدؓ کٹھن وقت پر کام آنے والا مردِ میدان ہے، اور یہ کہ آپ نے یہ حکم دیکر گویا اُنھیں دہکتی آگ میں ڈال دیا کہ یا تو وہ اُنھیں نکل جائے اور یہ میدانِ جنگ میں کام آجائیں تو یہ اُمِّ تمیم اور اس کے شوہر کے ساتھ کیے کی بہترین سزا ہوگی یا اس معرکے میں فتح اُن کے قدم چومے اور انھیں (اس گناہ سے) پاک کردے۔ چنانچہ یہ فتحیاب ہوئے اور مالِ غنیمت لے کر لوٹے۔ اور مسلمانوں کو اتنے بڑے خوف سے نجات دلائی جس کے سامنے اس کی حرکت کا کوئی وزن نہیں، جو البطاح میں سرزد ہوگئی تھی۔"

یہ ہے ڈاکٹر ہیکل کی نظر میں صحیح صورتِ حال۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص اپنے تخیل کے سہارے تاریخِ اسلامی کے اس دور میں داخل ہوتا اور ان حساس اور بیدار ضمیروں کے زیرِ سایہ لکھتا ہے لیکن اس کا اپنا قلب و ضمیر واقعات کی توجیہہ میں اس سطح سے بلند نہیں ہوتا جو سراسر موجودہ مادی دور سے متأثر بلکہ ماخوذ ہے۔ نہ کہ اسلام کی حقیقی اسپرٹ اور اس مخصوص دور میں اس کی عملی تاریخ سے۔ یہ تو موجودہ دور کی سیاست ہے جس کی نگاہ میں اچھے مقصد کے لیے بُرے ذرائع بھی جائز ہیں، جو ضمیرِ انسانی کو ہنگامی ضروریات کا تابع بنا دیتی ہے اور پھر اُسے ڈپلومیسی کا کمال اور تدبیر معاملات میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت کا مظاہرہ قرار دیتی ہے۔ اس تصویر میں جسے ڈاکٹر ہیکل واقعہ کی صحیح تصویر سمجھتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی شخصیت کتنی گھٹیا نظر آتی ہے۔ خیریت یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی شخصیت اس سے بلند نظر آتی ہے کہ آج کے ذلیل اور پست دور کا انسان جس دُوربین سے دیکھنے کا عادی ہے اُس سے اُسے دیکھا جاسکے۔ اس دُوربین کے لیے اس مقامِ بلند کو پا سکنا ناممکن ہے۔ پھر اگر دیکھنے والا شریعتِ اسلامی کی ابتدائی باتوں سے بھی ناواقف ہو تو معاملہ اور بگڑ جاتا ہے۔

اپنی کتاب "الفاروق عمرؓ" میں ڈاکٹر ہیکل نے ایک بار پھر اسی موضوع پر گفتگو کی ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ خالدؓ کی معزولی کا ارادہ کرتے وقت حضرت عمرؓ کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ کریں۔ ایک بار پھر اپنے زمانہ کی پستی نے ان کو متأثر کردیا ہے اور اُن کے ذہن پر اُس پارٹی لیڈر کا کردار مسلّط ہوگیا ہے جس کے سامنے وقتی مصالح اور مقامی ضروریات کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا جس کے لیے اسلام کی بلند مرتبہ روح کو سمجھنا ممکن ہی نہیں۔ صفحہ ۹۹۔۱۰۰ پر لکھتے ہیں:

"آخر عمرؓ نے خالدؓ کی معزولی جیسا نازک فیصلہ کیسے کیا جب کہ شام میں مسلمانوں کی ساری

فوجی طاقت خالدؓ کے تحت تھی؟ یہ طاقتیں اس وقت بڑے نازک مرحلہ سے گزر رہی تھیں۔ وہ رومیوں کے بالمقابل کھڑی تھیں۔ مگر نہ تو کھل کر مقابلہ ہوتا تھا نہ رومیوں پر ان کا کچھ بس چلتا تھا۔ اسی طرح رومی بھی مسلمانوں کا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ خالدؓ کے عراق سے وہاں آنے سے پہلے بھی یہی صورتِ حال تھی اور اُن کے آنے کے بعد بھی یہی صورت حال باقی رہی دونوں فریق موقع کے منتظر تھے کہ یہ جمود ختم ہو اور وہ دشمن پر حملہ کر سکیں۔ کیا خلیفہ کو یہ اندیشہ نہ ہوا کہ خالدؓ کی معزولی سے مسلمانوں کے اندر اُن کی دھاک کمزور پڑ جائے گی اور موقع کی نزاکت بڑھ جائے گی۔؟ کیا یہ زیادہ بہتر نہ تھا کہ وہ اس وقت تک صبر کرتے جب تک کہ خالدؓ مسلمانوں کو اس پیچیدہ مرحلہ سے گذار نہ لیتے، اور اس کے بعد جو حکم چاہتے صادر فرماتے؟

جنگی اتار چڑھاؤ میں یہ باتیں بلاشبہ قابلِ لحاظ ہیں جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے ابو عبیدہؓ نے خلیفہ کی ناپسندیدگی اور خفگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان باتوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی۔ لیکن عمرؓ نے معاملہ کو ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھا اگر وہ خالدؓ کی معزولی کا معاملہ جنگ ختم ہونے تک ملتوی رکھتے تو ان کی پالیسی کو نقصان پہنچتا اور معاملہ بد سے بدتر ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ جنگ میں یا تو مسلمانوں کو فتح ہوتی یا شکست۔ اگر شکست ہوتی تو خالدؓ کی معزولی سے اُس میں کوئی فرق نہ آتا۔ لیکن اگر خالدؓ کی قیادت میں مسلمانوں کو فتح ہوتی تو عمرؓ کے لیے یہ ممکن نہ رہ جاتا کہ کسی کمانڈر کو فتح و کامرانی کی بلندیوں سے نیچے اتار کر برطرف کر دیں۔ ایسا کرنا سخت غلطی ہوتی۔ عمرؓ بہر حال یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ شام میں یا کسی دوسری جگہ بھی خالدؓ کو سپہ سالار نہ رہنے دیں گے۔ اسی لیے آپ نے ان کی معزولی کے احکام صادر کرنے میں جلدی کی۔ اس کے لیے ان کے پاس یہ وجہ موجود تھی کہ خالدؓ نے ابو بکرؓ کی ہدایات پر پوری طرح عمل نہیں کیا۔ چونکہ اس کے بعد بھی مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی لہٰذا کوئی عمرؓ پر اعتراض نہ کر سکتا تھا۔ انھوں نے وہی کیا جسے انھوں نے ٹھیک سمجھا تھا، اور خالدؓ ایسی پوزیشن میں نہ تھے کہ ان کو برطرف کرنے والے پر کسی طرح بھی

زیادتی کرنے کا الزام نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

یہ بیسویں صدی کے ہیکل "پاشا"، کا طرزِ فکر ہے جسے وہ قرنِ اوّل کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سر تھوپ رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ حضرت ابو بکرؓ کے سلسلہ میں بھی ایسا کر چکے ہیں۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کی روح ابو بکرؓ و عمرؓ کی روح کو چھو بھی نہیں سکی ہے۔ جو اسلام کی فضا میں کچھ عرصہ سانس لینے کے باوجود ایک لمحہ کے لیے بھی بیسویں صدی کی نجاستوں سے پاک نہیں ہو سکا ہے۔ اس دَور کے جھوٹے وعدے، پُرفریب چالیں، اور ضمیر، صداقت، دین، سب پس پشت ڈال دینے والی موقع پرستی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔

آخر ہیکل نے عمرؓ کو سمجھا کیا ہے؟ اگر حالات مختلف ہوتے اور یہ موقع نہ میسّر ہوتا تو کیا عمرؓ خالدؓ کو چھوڑ دیتے ہیں؟ درآں حالیکہ خود ہیکل پاشا کی کھینچی ہوئی تصویر کے مطابق انھیں پورا یقین تھا اور اُن کا ضمیر اس پر مطمئن تھا کہ خالدؓ مالک بن نویرہ کے حق میں اور پھر اللہ اور اس کے دین کے حق میں سراسر غلط کار اور گنہ گار تھا!

ان باتوں کا لحاظ کرنا اور ان حالات کے آگے سپر ڈال دینا کیا اس عمرؓ کا کام ہو سکتا تھا جو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دے لیکن اپنی راہ نہ کھوٹی کرے، جس کا ایمان آندھیوں کا رُخ موڑ دے لیکن خود نہ مڑے۔؟

اس قسم کے کام بنو اُمیّہ اور بنو عبّاس کے بادشاہوں نے کیے ہیں اور لوگ اسے اُن کی ڈپلومیسی اور ہوشیاری پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن عمرؓ اور ابو بکرؓ اس سے بہت بلند ہیں۔ اگر بعض لوگ ان دونوں حضرات کے بارے میں بھی اسی طرح سوچنے لگتے ہیں تو اس کا اصل سبب دورِ حاضر کی اسپرٹ کی کمزوری اور اس کے معیاروں کا پست ہونا ہے۔

میں نے اس طرزِ فکر کو پیش کرنے اور اس کی لغویت واضح کرنے میں قدرے تفصیل سے کام لیا ہے تاکہ اس کھلی ہوئی مہلک غلطی کی نشان دہی کر سکوں جس میں بعض لوگ آج کل مبتلا ہیں۔ روحِ اسلام کے زمانۂ عروج میں جو طرزِ فکر پایا جاتا تھا اس کی تصویر کشی یہ لوگ آج کے مادّی دور کے طرزِ فکر کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں جو اس روحانی بیداری سے کوسوں دور ہے۔ میں اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں جو اس غلطی کے نتیجہ میں خود انسانی ضمیر اس کی بیداری اور ترقی کی ان مخفی صلاحیتوں

کے بارے میں لاحق ہو سکتی ہے جو ضمیر انسانی میں مضمر ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ذقرنِ اول کے) ان انسانوں کو کسی مصنوعی لباس میں سامنے لاؤں یا انھیں ہر طرح کی بشری کمزوریوں سے مبرا ثابت کر دوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک بار پھر لوگوں کو ضمیر انسانی پر بھروسہ کرنا سکھاؤں۔ اسی لیے میں مسلمانوں کی زندگی کے اس دور کی بالکل ٹھیک ٹھیک تصویر کھینچنا چاہتا ہوں تاکہ یہ وہ ضمیر جو اس مقام بلند کی طرف اقدام کی صلاحیت رکھتا ہو اُسے محسوس کرنے لگے۔

اب ہم مختلف شعبہ ہائے حیات میں بیداری ضمیر کے نمونے پیش کرنے کا سلسلہ پھر شروع کرتے ہیں۔ ادھر دیکھئے، خلیفۃ المسلمین عمرؓ بن الخطاب پانی کا مشکیزہ اٹھائے چلے آرہے ہیں! ان کے شاہزادے ناپسندیدگی کے لہجے میں اُن سے پوچھتے ہیں: "آپ نے ایسا کیوں کیا؟" آپ جواب دیتے ہیں: "میرا نفس غرور و خود پسندی میں مبتلا ہو گیا تھا، میں نے چاہا کہ اُسے ذلیل کروں۔" بیداریٔ احساس ملاحظہ ہو! اس شخص کے دل کے کسی گوشہ میں خلافت، فتوحات اور آئندہ آنے والی عزت و عظمت پر تھوڑی خود پسندی پیدا ہوئی۔ انھیں یہ گوارا نہ ہوا کہ یہ خود پسندی باقی رہے اور پروان چڑھے۔ وہ جھٹ نفس کو ذلیل کرنے اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہ بھی سب کے سامنے۔ اُسے اس بات ذرا پروا نہ ہوئی کہ وہ اتنی بڑی سرزمین کا مالک و مختار خلیفہ ہے جس میں عرب کے علاوہ قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے بیشتر ممالک شامل ہیں۔

اور یہ ہیں علیؓ بن ابی طالب ـــــ جاڑوں کا زمانہ ہے، ٹھنڈک کے مارے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ بدن پر گرمی کے کپڑے ہیں۔ اس کے علاوہ سردی سے بچاؤ کے لیے اور کچھ نہیں بیت المال ان کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اُن کے ضمیر کی بیداری اور شعور کی بلندی اس سے استفادہ نہیں کرنے دیتا۔

ابو عبیدہؓ عمواس میں اپنی فوج کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ عمواس کو ایک مہلک طاعون نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ کو ڈر ہے کہ "امین الامۃ" کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے چنانچہ انھیں ہلاکت کے منہ سے نکالنے کے لیے وہ انھیں خط لکھ کر بلاتے ہیں۔ خط میں لکھتے ہیں:

"اما بعد، مجھے ایک ضروری کام کے سلسلہ میں تم سے بالمشافہ گفتگو کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، تاکید کرتا ہوں کہ اس خط کو پڑھنے کے بعد اسے رکھنے سے پہلے ہی میری طرف چل پڑو۔"

ابو عبیدہؓ خط پڑھتے ہی عمرؓ کا اصل مقصد بھانپ لیتے ہیں۔ وہ سمجھ جاتے ہیں کہ آپ نے ان کو مہلک وبا کے منہ سے نکالنے کے لیے ایک بہانہ تلاش کرلیا ہے، فرماتے ہیں "اللہ امیرالمومنین کو معاف کرے": اور حضرت عمرؓ کو یہ لکھ کر بھیجتے ہیں کہ:

"میں سمجھ گیا کہ آپ کو میری کیا ضرورت ہے۔ اس وقت میرے ساتھ مسلمانوں کا پورا لشکر ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ان سے جدا ہوں۔ میں انھیں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اللہ میری اور ان کی تقدیر کا لکھا پورا نہ کردے۔ امیرالمومنین، ان وجوہ کی بنا پر میں آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھے اپنی تاکید سے بری فرمائیں اور اپنے لشکر میں رہنے دیں۔"

عمرؓ یہ خط پڑھ کر رونے لگتے ہیں۔ حاضرین دریافت کرتے ہیں کہ ابو عبیدہؓ چل بسے؟ وہ آنسوؤں کے درمیان رندھی ہوئی آواز میں جواب دیتے ہیں: "نہیں، مگر گویا کہ (وہ چل بسے) اور ایسا ہی ہوا۔

یہ تقدیر الٰہی پر گہرا ایمان ہی تو تھا جو ابو عبیدہؓ کو موت کے منہ میں روکے رہا۔ بلاشبہ، اور یہ احساس بھی کہ خود بھاگ جانا اور پورے لشکر کو موت کے منہ میں چھوڑ دینا کسی طرح مناسب نہیں جب کہ سب اللہ کی راہ کے سپاہی تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن بلالؓ بن رباح کے اسلامی بھائی ابو رویحہ خثعمی کی خواہش ہے کہ یہ یمن کے کچھ لوگوں سے ان کی شادی کی بات چیت کرنے کے لیے واسطہ بنیں۔ حضرت بلالؓ ان لوگوں سے فرماتے ہیں: "میں بلالؓ بن رباح ہوں اور یہ میرے بھائی ابو رویحہ ہیں جو دین اور اخلاق دونوں میں برے واقع ہوئے ہیں۔ تمہارا جی چاہے تو ان سے رشتہ کرلو۔ نہ جی چاہے نہ کرو۔"

بالکل صاف بات کہہ دی۔ نہ تو اپنے بھائی کی کمزوری چھپائی نہ ان لوگوں کو کسی مغالطے میں مبتلا کیا۔ انھوں نے اپنی اس حیثیت کا ذرا بھی لحاظ نہ کیا کہ وہ شادی کی گفتگو میں واسطہ بن رہے ہیں...... تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس جواب دہی سے غافل ہوجائیں جو اپنے برتاؤں کے سلسلے میں اللہ کے حضور کرنی ہوگی۔ یمن والوں نے ان کی حق گوئی پر بھروسہ کرکے رشتہ قبول کرلیا۔ ان کے لیے یہ کافی تھا کہ ایسا حق گو ان کی بیٹی کے لیے شادی کا پیغام لایا تھا۔

ابو حنیفہ کا کردار ملاحظہ ہو: "انھوں نے کچھ سامان اپنے شریک تجارت حفص بن عبدالرحمٰن کے پاس بھیجا اور ان کو مطلع کردیا کہ اس میں ایک کپڑا عیب دار ہے۔ اس کا عیب لوگوں کو بتادیں۔ حفص نے

یہ مال فروخت کر دیا مگر عیب بتانا بھول گئے۔ ناقص کپڑے کے عوض پورا دام وصول کرلیا۔ روایت ہے کہ اس کا دام تیس ہزار یا پینتیس ہزار (درہم) تھا۔ ابوحنیفہؒ نے اپنے شریک سے علیحدگی اختیار کرلی بلکہ اس قیمت کو اپنے پاکیزہ مال میں ملانا بھی گوارا نہ کیا اور اسے کل کا کل خیرات کر دیا۔[1]

روایت ہے کہ یونس بن عبید کے پاس مختلف داموں کے کپڑے تھے۔ ایک قسم تھی جس کے ہر جوڑے کا دام چار سو تھا اور دوسری قسم کا دام دو سو فی جوڑا تھا۔ یہ نماز کے لیے گئے اور اپنے بھتیجے کو دکان پر چھوڑ گئے۔ اسی اثنا میں ایک اعرابی آیا اور اس نے چار سو کی قیمت کا ایک جوڑا مانگا۔ لڑکے نے اسے دو سو والے جوڑے دکھائے وہ اُسے پسند آگئے اور وہ راضی خوشی ان کو خرید کر لے گیا۔ وہ یہ کپڑا ہاتھ میں لیے جا رہا تھا کہ راستہ میں یونس کا سامنا ہو گیا اور وہ اپنا کپڑا پہچان گئے۔ انھوں نے اعرابی سے دریافت کیا کہ اسے کتنے میں خریدا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ چار سو میں۔ انھوں نے کہا، یہ تو دو سو سے زیادہ کا نہیں، لوٹ جاؤ اور اسے واپس کر دو۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ جوڑا ہمارے ملک میں پانچ سو کا ملتا ہے اور میں نے اسے راضی خوشی خریدا ہے۔ یونس نے کہا کہ واپس چلو، کیوں کہ دین کی راہ میں خیر خواہی دنیا جہان کی دولت سے بہتر ہے۔ یہ اُسے اپنی دکان پر لے گئے اور دو سو درہم واپس کر دیے۔ پھر انھوں نے اپنے بھتیجے کو ڈانٹ سنائی اور کہا: "تجھے شرم نہ آئی، تجھے خدا کا خوف نہ لاحق ہوا، صدفی صد نفع لیتا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی نہیں برتتا!" لڑکا قسم کھانے لگا کہ خریدار نے راضی خوشی مال خریدا تھا اس پر انھوں نے کہا: "تو خود اپنے لیے جو پسند کرتا ہے وہی تو نے اس کے لیے کیوں نہ پسند کیا۔"

محمد بن منکدر سے مروی ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کے ملازم نے ایک اعرابی کے ہاتھوں پانچ پانچ (درہم) والے ٹکڑے دس (درہم) میں فروخت کر دیے۔ (محمد بن منکدر کو معلوم ہوا تو) وہ تمام دن اس اعرابی کی تلاش میں سرگرداں رہے، یہاں تک کہ اسے ڈھونڈھ نکالا اور اس سے کہا: ملازم نے غلطی کی اور پانچ کا مال تجھے دس میں دیا۔ وہ تعجب کے ساتھ بولا، مگر ہم نے تو یہ دام راضی خوشی دیے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: "تم راضی ہو تو بھی ہم تمھارے لیے وہی پسند کریں گے جو خود اپنے لیے پسند کرتے۔" یہ کہہ کر انھوں نے اسے پانچ (درہم) واپس کر دیے۔[2]

---

[1] "ابوحنیفہ بطل الحریۃ والتسامح فی الاسلام" مصنفہ استاذ عبدالحلیم الجندی۔

[2] الرسالۃ الخالدہ، مصنفہ اُستاذ عبدالرحمٰن عزام۔

ان تینوں واقعات کا راز کھولنے والی شاہ کلید یونس بن عبید کا یہ جملہ ہے کہ: "تجھے شرم نہ آئی تجھے خدا کا خوف نہ لاحق ہوا"۔ بے شک ان تمام واقعات کے پیچھے کام کرنے والی اصل قوت اپنے ضمیر کے آگے شرمانا اور خدا سے ڈرنا ہے۔ جب نفسِ انسانی اسلامی اسپرٹ کو اپنا لیتا ہے اور یہ روح رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے تو اسلام اس کے اندر پوری قوت کے ساتھ یہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

اِن چند نمونوں کے علاوہ سینکڑوں نمونے اور ہیں۔ لیکن یہ چند مثالیں اس مقامِ بلند کی طرف ہماری رہنمائی کے لیے بہت کافی ہیں جو اسلام ضمیرِ انسانی کی تطہیر و ترقی کے لیے اپنے سامنے رکھتا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ اس کو ہر طرح کی ضروریات و تعلقات سے اور جان و مال اور عزو جاہ کی محبت سے بلند ہونا سکھاتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ انسانی ضمیر ان ذمہ داریوں کو نباہے جو ہر وقت بیدار و ہوشیار رہنے اور شدتِ احساس کا حامل ہونے کا تقاضا ہیں۔

اب ہم اطمینان کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور اجتماعی عدل کے بارے میں اسلام کی عملی تاریخ کے بعض پہلو سامنے لاتے ہیں۔ اس کام میں ہمارے رہنما اسلامی تاریخ کے مذکورہ بالا بلند اور روشن نمونے ہوں گے۔

مُساوات کے نمونے

اسلام بنی نوع انسان کے درمیان کامل مساوات کا پیغام لے کر آیا تھا۔ وہ انسان کے ضمیر کو ان تمام قدروں کی غلامی سے آزاد کرانے آیا تھا جو اس مساوات میں خلل پیدا کر سکتے ہیں۔ اُوپر ہم مساوات اور آزادی کے بارے میں اسلام کا نظریہ وضاحت کے ساتھ پیش کر چکے ہیں اور ان نصوص کو سامنے لا چکے ہیں جو اِس نظریہ کی گہرائی اور اسلام کے بنیادی سماجی فکر سے اس کی گہری وابستگی پر دلالت کرتی ہیں۔ اب یہ ہم دیکھیں گے کہ یہ نظریہ عملی زندگی پر کس طرح منطبق کیا گیا۔

اس زمانہ میں ساری دنیا میں غلام، آزاد انسانوں سے الگ ایک جداگانہ طبقہ تھے۔ یہی حال جزیرۂ عرب میں بھی تھا۔ اس سلسلہ میں ہم جب محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ آپ نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کی، جو قریش کے ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، شادی اپنے آزاد کردہ غلام زید کے ساتھ کر دی۔ شادی ایک ایسا نازک مسئلہ ہے

جس میں برابری کا سوال دوسرے سوالات سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اس نبی کے سوا کسی دوسرے شخص، یا اس کے دین کی قوت کے سوا کسی دوسری قوت کے بس میں نہ تھا کہ ایسا معجزہ کر دکھائے جو آج . . . . .

. . . .

بھی ممالکِ اسلامیہ کے سوا کہیں اور ممکن نہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ میں غلامی قانوناً ممنوع ہے۔ لیکن کسی نیگرو کے لیے کسی گوری نسل کی عورت کے ساتھ، خواہ وہ کتنی ہی گئی گزری ہو، شادی کرنا ممنوع ہے۔ یہی نہیں بلکہ نیگرو کا پبلک بسوں اور دوسری سواریوں میں گوروں کے پہلو میں بیٹھنا، ان کے ساتھ ریستوران یا تھیٹر میں جانا، یا کسی سرائے یا ہوٹل میں ٹھہرنا بھی آج تک ممنوع ہے۔

ہجرت کے اولین دور میں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ کرائی تو اُن کے آزاد کردہ غلام زیدؓ اور اُن کے چچا حمزہؓ بھائی بھائی قرار پائے۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ اور خارجہ بن زید بھائی بھائی قرار دیے گیے، اور خالد بن رویحہ خثعمی اور بلالؓ بن رباح کے درمیان مواخاۃ ہوئی۔ یہ بھائی چارہ الفاظ تک نہیں محدود رہا بلکہ زندگی کا ایک ایسا پختہ رشتہ بن گیا جو خونی رشتہ کے برابر تھا۔ جان و مال اور زندگی کے سارے ہی معاملات میں اُن کے درمیان قرابت داری قائم ہوگئی۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کو غزوۂ موتہ میں فوج کا کمانڈر بنا کر بھیجا۔ پھر ان کے بیٹے اسامہؓ کو روم کی لڑائی کے لیے جانے والے ایک ایسے لشکر کا سپہ سالار بنایا جس میں مہاجرین و انصار کی اکثریت شامل تھی۔ اسی لشکر میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ شامل تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اُن کے قریب ترین ساتھی اور وزیر رہے اور آپؐ کے بعد مسلمانوں کے کامل اتفاق سے خلیفہ چُنے گئے۔ اسی لشکر میں سعدؓ بن ابی وقاص بھی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار تھے۔ ان کا تعلق بنی زہرہ سے تھا۔ جن سے آپ کا ننہالی رشتہ تھا۔ مزید برآں یہ قریش کے ان افراد میں سے تھے جنھوں نے اسلام لانے میں سبقت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں سترہ سال کی عمر میں اسلام لانے کی توفیق دی تھی۔ بڑی دولت و ثروت کے مالک تھے۔ جنگی مہارت بھی تھی اور جہاد کی خصوصی صلاحیتیں رکھتے تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصل بحق ہوئے اور حضرت ابوبکرؓ نے جیشِ اُسامہؓ کی روانگی پر اصرار کیا تو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے کمانڈر کو بھی باقی رکھا۔ آپ ان کو

رخصت کرنے اس حال میں مدینہ کے باہر تک آئے کہ اُسامہؓ سواری پر تھے اور خلیفۃ المسلمین ابوبکرؓ پیدل چل رہے تھے۔ اُسامہؓ کو یہ بات کھٹکی کہ وہ جوان ہوکر سواری پر چلیں اور رسولِ خدا کا نائب بوڑھا ہوکر پیدل چلے۔ چنانچہ انھوں نے کہا: "خلیفۂ رسول اللہ، آپ بھی سواری پر آجائیں، ورنہ میں اُتر آؤنگا۔"

خلیفہ قسم کھاکر کہتا ہے کہ: "خدا کی قسم ہرگز نہ اترنا .... ، خدا کی قسم میں ہرگز نہ سوار ہوں گا۔ میں کچھ دیر تک راہِ خدا میں اپنے پاؤں غبار آلود کرلوں تو میرا کوئی نقصان نہ ہوجائے گا۔" پھر حضرت ابوبکرؓ کو یہ خیال آیا کہ ان کو حضرت عمرؓ کی ضرورت پڑے گی، خصوصًا اب جبکہ خلافت کا بار اُن کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ عمرؓ جیشِ اُسامہؓ کے ایک سپاہی تھے۔ چونکہ اس کے امیر اُسامہؓ تھے لہٰذا ضروری تھا کہ اُن سے اجازت حاصل کی جائے۔ چنانچہ خلیفہ کہتا ہے: "اگر مناسب سمجھیں تو عمرؓ کو میری مدد کے لیے چھوڑ جائیں۔"

اللہ اللہ! "مناسب سمجھیں تو عمرؓ کو میری مدد کے لیے چھوڑ جائیے۔" یہ مقامات کتنے بلند ہیں، اتنے بلند کہ الفاظ اُن تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔

زمانہ کی گاڑی آگے بڑھتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفۃ المسلمین عمرؓ بن الخطاب، عمار بن یاسرؓ کو کوفہ کا والی مقرر فرماتے ہیں۔ حالانکہ وہ موالی میں سے تھے۔ پھر ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ عمرؓ کے دروازہ پر عمرو بن حارث بن ہشام کے بیٹے سہیل، ابوسفیان بن حرب اور چند دوسرے اکابرِ قریش باریابی کے منتظر کھڑے ہیں، لیکن آپ دو غریب موالی صہیبؓ اور بلالؓ کو ان سے پہلے بلا لیتے ہیں، کیونکہ وہ رسول اللہ کے صحابی اور جنگ بدر کے شرکا میں سے تھے۔ اس تقدیم پر ابوسفیان کے نتھنے مارے غصّہ کے پھول جاتے ہیں اور ان کی زبان سے جاہلیت کی بات نکل آتی ہے: "ایسی بات میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ان غلاموں کو اندر بلا لیا، اور ہمیں دروازے پر چھوڑ دیا۔"

عمرؓ بن الخطاب ایک دن مکہ میں کہیں جارہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ملازمین اپنے آقاؤں کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں بلکہ کنارے پر کھڑے ہیں۔ اُن کو غصّہ آجاتا ہے اور ناپسندیدگی کے لہجہ میں ان کے آقاؤں سے فرماتے ہیں: "لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ اپنے خادموں کے ساتھ ہیچ کا برتاؤ کرتے ہیں؟" پھر آپ اِن ملازمین کو بلاکر آقاؤں کے ساتھ بٹھا دیتے ہیں تاکہ وہ ان کے ہم پیالہ وہم نوالہ بن سکیں۔

حضرت عمرؓ نے نافع بن الحارث کو مکّہ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ ان سے عسفان میں آپ کی ملاقات ہوئی تو دریافت فرمایا کہ: وادی والوں پر کس کو اپنا نائب مقرر کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ابن ابزیٰ کو اپنا نائب بنا کر آیا ہوں۔ آپ نے پوچھا: ابن ابزیٰ کیا ہیں۔؟ انھوں نے بتایا کہ وہ ہمارے موالی میں سے ہیں۔ عمرؓ بولے تم نے ایک آزاد کردہ غلام کو مکّہ والوں پر اپنا نائب بنا دیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ کتاب اللہ کے قاری، فرائض کے عالم اور ساتھ ہی قاضی بھی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: کیوں نہ ہو، تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے ہیں کہ: اللہ اس کتاب کے ذریعہ بعض لوگوں کو اوپر اُٹھائے گا اور بعض کو نیچے گرائے گا۔ (اِنَّ اللہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ)۔

حضرت عمرؓ کے سوال کا مقصد اعتراض کرنا نہیں تھا بلکہ وہ ابن ابزیٰ کو نہیں جانتے تھے، لہذا انھوں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ ان کی خصوصیت کیا تھی جو وہ اس منصب پر مقرر کیے گئے۔ ورنہ یہی عمرؓ ہیں جو اپنے بعد (انتخاب خلیفہ کے لیے مقرر کی جانے والی) شوریٰ کے چھ آدمیوں کو وصیت کرتے وقت یہ فرماتے ہیں کہ: اگر ابو حذیفہ کے مولیٰ سالم زندہ ہوتے تو میں اُن کو (منصبِ خلافت پر) مقرر کر جاتا۔ گویا وہ آپ کے نزدیک شوریٰ کے چھ آدمیوں سے بہتر تھے۔ یہ چھ افراد یہ تھے: عثمان، علی، طلحہ، زبیر ابن عوف، سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم۔

موالی میں سے کسی نے قریش کے ایک فرد کو اس کی بہن سے رشتہ کا پیغام دیا اور اس کی بہن کے لیے کافی مال کی پیش کش کی۔ مگر قریشی نے اس کے ساتھ اپنی بہن کا نکاح کرنے سے انکار کر دیا۔ جب یہ بات حضرت عمرؓ کو معلوم ہوئی تو آپ نے اس قرشی سے کہا: اس کے ساتھ شادی کر دینے میں کیا چیز مانع ہے؟ وہ اچھا آدمی ہے اور اس نے تیری بہن کو عطیہ دینے میں بھی کافی فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ قریشی نے کہا: امیرالمومنین ہم اعلیٰ حسب و نسب والے لوگ ہیں، یہ میری بہن کا کفو نہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ آدمی دنیا و آخرت دونوں کا حسب لایا ہے۔ دنیا کا حسب مال ہے اور آخرت کا تقویٰ۔ اگر عورت راضی ہو تو اُسے اس آدمی کے نکاح میں دیدے۔ اس نے اپنی بہن کا منشا معلوم کیا تو وہ راضی تھی۔ چنانچہ اُس نے اس آدمی کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا۔

اس سے قبل ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح ایک آزاد کردہ غلام بلالؓ عربی النسل ابورویحہ کی شادی کے معاملہ میں سفارشی بن کر یمن والوں کے پاس گئے تھے اور انھوں نے بلالؓ کی وجہ سے ابورویحہ کی عزت

کی اور رشتہ قبول کر لیا۔

موالی کو اس بات کا پورا پورا حق حاصل تھا کہ وہ جس سمت میں چاہیں بلند سے بلند مرتبہ تک ترقی کر جائیں۔ عبداللہ بن عباسؓ کا ذکر آتا تو اُن کے ساتھ ان کے مولیٰ عکرمہ کا ذکر بھی ضرور آتا۔ اسی طرح عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ ان کے مولیٰ نافع کا، انسؓ بن مالک کے ساتھ ان کے مولیٰ ابن سیرین کا اور ابوہریرہ کے ساتھ ان کے مولیٰ عبدالرحمٰن بن ہرمز کا ذکر آنا لازمی تھا۔

بصرہ میں حسن بصریؒ اور مکہ میں مجاہد بن جبیر، عطاء بن ابی رباح اور طاؤس بن کیسان نامی فقہاء تھے (جن کا تعلق موالی سے تھا)۔

اسی طرح عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں مصر میں منصبِ افتاء پر یزید بن ابو حبیب فائز ہوئے جو دنقلہ کے تھے اور اسود کے مولیٰ تھے[1]

محنت کشوں کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ ایسا ہی تھا۔ اپنے ہاتھوں سے کام لے کر روزی کمانے والا ان کے نزدیک صرف نظریات وخیالات کی دنیا میں نہیں عملی زندگی میں بھی عزت واحترام کا مستحق تھا۔ کسی محنت کش کا پیشہ جو بھی ہو اس سے اس کی عزت میں کوئی فرق نہ آسکتا تھا۔ کہ محنت بذات خود احترام کی مستحق ہے۔ کسی محنت کش کا پیشہ کبھی بھی اس میں مانع نہیں ثابت ہوا کہ وہ علم حاصل کرے، اس میں بلند درجات تک پہنچے، اسے استاذ تسلیم کیا جائے اور اس کی عظمت تسلیم کی جائے

ابو حنیفہؒ پارچہ فروش تھے۔ آپ کے بعد بھی بہت سے فقہاء گذرے ہیں جو تاجر یا صناع تھے (مثلاً) امام خصاف احمد بن عمر بن مہیر موچی تھے۔ ان کے والد امام ابو حنیفہؒ کے رفقاء محمد اور حسن کے شاگرد تھے۔ ایک طرف تو یہ جوتا بنانے کا کام کر کے روزی کماتے تھے اور دوسری طرف (خلیفہ) مہتدی باللہ کے لیے کتاب الخراج مرتب کر رہے تھے، اور اسی زمانہ میں انھوں نے فقہ پر اپنی گراں قدر تصانیف بھی مرتب کی ہیں۔ اسی طرح کرابیسی کرابیس یعنی معمولی قسم کے کپڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ قفّال جب اپنا ہاتھ باہر نکالتے تو اس کی پُشت پر نشانات نظر آتے اور یہ بتاتے کہ یہ اس کام کے نشانات ہیں جو یہ پہلے کیا کرتے تھے۔ (یعنی تالا بنانے کا کام)۔ ابن قطلوبغا درزی کا کام کرتے تھے۔ اپنے زمانہ کے مسلّم استاد امام جصّاص

---

[1] ابو حنیفہ بطل الحریۃ والتسامح فی الاسلام، مصنّفہ عبدالحلیم ندوی۔

اپنے پیشے کی کارِی کی طرف منسوب کیے جاتے تھے۔ اسی طرح تاریخ کے صفحات سے اٹھ کر گواہی دینے کے لیے پیتل کے برتن بیچنے والے (صفار) عطر فروش (صیدلانی)۔ حلوہ فروش کے بیٹے (حلوائی)۔ آٹا بیچنے والے (دقاق)۔ صابون فروش (صابونی)۔ جوتا بنانے والے (نعالی)۔ سبزی فروش (بقالی)۔ ہانڈی بیچنے والے (قدوری) وغیرہ وغیرہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ابھی تہذیب اسلامی کی فجر طلوع ہوئی تھی کہ اس اُمت نے قرنِ اوّل میں وہ کام کر دکھایا جس کے لیے مغربی دنیا صدیوں سر مارتی رہی مگر نہ کر سکی۔ یعنی یہ کہ پیشے بذاتِ خود معزز یا ذلیل نہیں ہوتے بلکہ افراد بلند ہوتے ہیں اور بعض بلند اوصاف سے عاری ہوتے ہیں۔[1]

آزادیٔ ضمیر

انسانی مساوات کے اس اعلیٰ معیار کا بیان اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک ہم اس بات کا جائزہ نہ لے لیں کہ اسلامی سماج کا اپنے بڑے آدمیوں کے ساتھ کیا سلوک تھا۔ جب تک بڑے چھوٹوں کے ساتھ ایک صف میں نہ کھڑے ہوں اور بزرگی و برتری کی واحد بنیاد حسب و نسب اور جاہ و مال نہیں صرف عمل نہ رہ جائے۔ صرف چھوٹوں کا احترام اور تعظیم حقیقی مساوات کے لیے کافی نہیں۔

امام ابو یوسفؒ کتاب الخراج میں لکھتے ہیں: مجھ سے عبدالملک بن ابی سلیمان نے عطاء کے واسطہ سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے کہا: حضرت عمرؓ نے اپنے عُمّال کو لکھ بھیجا کہ حج کے موقع پر اُن سے ملیں۔ چنانچہ یہ سب لوگ آئے۔ آپ نے کھڑے ہو کر یہ تقریر کی:

"لوگو! میں اِن عُمّال کو اس لیے مقرر کرتا ہوں کہ راست روی کے ساتھ تمہاری سرپرستی و نگرانی کا فرض انجام دیں۔ میں نے انھیں اس لیے ہرگز نہیں مقرر کیا ہے کہ تمہاری جان و مال اور عزت و آبرو پر دست درازی کریں۔ لہٰذا اگر تم میں سے کسی کو کسی عامل کے خلاف ظلم و زیادتی کی شکایت ہو تو کھڑا ہو جائے۔"

راوی کہتا ہے کہ اس دن تمام لوگوں میں سے صرف ایک آدمی کھڑا ہوا اُس نے کہا: "امیرالمومنین! آپ کے عامل نے مجھے سو کوڑے (ناحق) مارے ہیں۔"

---

[1] ابو حنیفہ بطل الحریۃ والتسامح فی الاسلام، مصنفہ استاذ عبدالحلیم الجندی۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "کیا تم اسے کوڑے مارنا چاہتے ہو، آؤ اور اس سے انتقام لو"

اس پر عمروؓ بن العاص نے اٹھ کر کہا: "امیرالمومنین! اگر آپ اپنے عُمّال کے ساتھ یہ سلوک کرنا شروع کردیں گے تو انھیں سخت گراں گزرے گا۔ یہ ایک مستقل طریقہ بن جائے گا جس پر آپ کے بعد کے لوگ بھی عمل کریں گے"

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "پھر کیا میں اس آدمی کو بدلہ نہ دلواؤں جب کہ میں نے اللہ کے رسولؐ کو خود اپنی ذات سے بدلہ دلواتے دیکھا ہے۔ (پھر آپ نے اس آدمی سے مخاطب ہوکر فرمایا) آؤ اور اس (عامل) سے بدلہ لو"

عمروؓ بن العاص نے کہا کہ ہمیں اجازت دیجئے کہ اس آدمی کو راضی کرلیں۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: تمہیں اجازت ہے۔ چنانچہ اُن لوگوں نے اس شخص کو دو سو دینار کے بدلہ راضی کرلیا۔ ہر کوڑا دو دینار کے عوض پڑا۔

عمروؓ بن العاص نے دوسرے پر سے تو یہ بلا ٹال دی لیکن جب اُن کے بیٹے کے ایک مصری لڑکے کو مارنے کا معاملہ پیش ہوا تو عمرؓ نے اس سے بدلہ دلوایا اور اِن سے کچھ نہ بن پڑی۔ بدلہ دلواتے وقت حضرت عمرؓ کہہ رہے تھے "اس خاندانی شریف زادے کو مارو" عمروؓ بن العاص خود بھی سزا کا مزا چکھنے والے تھے مگر اس مصری نے معاف کردیا اور مارنے سے باز رہا۔

ایک دن حضرت عمرؓ بیٹھے مسلمانوں کے درمیان کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے۔ لوگوں کا اجتماع ہجوم کی شکل اختیار کرگیا تھا۔ سعدؓ بن ابی وقاص، جن کے حسب و نسب اور اسلام کی راہ میں قربانیوں کا حال ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، آگے بڑھے اور دوسرے لوگوں کو ہٹاتے ہوئے حضرت عمرؓ تک پہنچ گئے۔ عمرؓ نے یہ کہتے ہوئے اُن پر دُرّہ سنسنایا: "تو زمین پر اللہ کی حکومت کا کچھ رُعب نہیں مانتا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ تجھے جتلادوں کہ اللہ کی حکومت تجھ سے مطلق مرعوب نہیں"

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ تو خلیفہ ہیں، ان کا کیا کہنا۔

چنانچہ اب ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ خلفاء راشدین اور بادشاہوں کے ساتھ اُن کی رعایا اظہارِ خیال اور تنقید میں کس آزادی کے ساتھ پیش آتی تھی۔ اظہارِ رائے میں اس آزادی اور جرأت کا اصل منبع وجدان کی آزادی ہے جو اسلام ضمیرِ انسانی کو عطا کرتا ہے اور وہ مساواتِ مطلق جس کو

اس نے قولاً اور فعلاً متحقق کر دکھایا ہے۔

عمرؓ خلیفہ کی حیثیت میں لوگوں کو خطاب کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں: "اگر میرے اندر کوئی کجی دیکھو تو مجھے سیدھا کر دینا۔" عامۃ المسلمین میں سے ایک فرد جواب دیتا ہے کہ: "اگر ہم نے تیرے اندر کوئی کجی دیکھی تو اپنی تلوار کی دھار سے تجھے سیدھا کر دیں گے۔" عمرؓ نے اس پر صرف اتنا کہا: "اللہ کا شکر ہے جس نے عمرؓ کی رعایا میں ایسے افراد بھی پیدا کیے ہیں جو اسے اپنی تلواروں کی دھار سے سیدھا کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کو غنیمت میں کچھ یمنی چادریں ملیں۔ حضرت عمرؓ نے تمام مسلمانوں کی طرح خود بھی ایک چادر پائی اور اپنے بیٹے عبداللہؓ کو بھی ایک چادر دی۔ چونکہ خلیفہ کو کپڑے کی ضرورت تھی لہٰذا عبداللہؓ نے اپنے حصہ کی چادر بھی ان کو دے دی تاکہ دونوں کو ملا کر ایک کپڑا تیار ہو سکے۔ ایک دن آپ اسی کپڑے کو پہن کر لوگوں کو خطاب کرنے کھڑے ہوئے اور فرمایا: لوگو! سنو اور اطاعت کرو۔ سلمان نے اٹھ کر کہا ہمارے اُوپر آپ کی بات سُننا اور اطاعت کرنا واجب نہ رہا۔ عمرؓ نے پوچھا: کیوں؟ سلمان نے کہا: یہ بتایئے کہ یہ کپڑا آپ نے کیسے بنوا لیا۔ حالانکہ آپ کے حصہ میں بھی ایک ہی چادر آئی تھی اور آپ لمبے قد کے آدمی ہیں۔ آپ نے فرمایا: جلد بازی سے کام نہ لو۔ پھر آپ نے پکارا، اے عبداللہ، مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ پھر آپ نے پکارا: اے عبداللہ بن عمر، وہ بولے: اے امیر المومنین! میں حاضر ہوں۔ حضرتِ عمرؓ نے فرمایا: "تمہیں خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، بتاؤ کہ جس چادر کو میں نے تہہ بند بنایا ہے وہ تمہاری ہی چادر ہے کہ نہیں۔ انھوں نے کہا: ہاں۔ پھر سلمان نے کہا: اب آپ حکم دیجئے، ہم سُنیں گے اور اطاعت کریں گے۔

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ تو عمرؓ ہیں اُن کا کیا کہنا۔

ابو جعفر منصور کی مثال لے لیجئے جو ایک ایسی سلطنت کے بانی ہیں جس میں ہماری اصطلاح کے مطابق قانون کا مدار رسم و رواج پر تھا۔ (نہ کہ شریعت پر)۔ سفیان ثوریؒ اُن کے پاس جا کر فرماتے ہیں: "امیر المومنین۔ آپ نے اللہ اور امتِ محمدیہ کا مال ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر خرچ کیا ہے اُس کی آپ کیا توجیہہ کر سکتے ہیں؟ عمرؓ نے ایک بار حج کیا تھا جس میں اُن کے اور اُن کے ساتھیوں پر کل سولہ[16] دینار صرف ہوئے تھے۔ پھر بھی اُنھوں نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ ہم نے بیت المال پر بہت زیادہ بار ڈال دیا۔" آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ منصور بن عمار نے ہم کو کیا حدیث سُنائی تھی۔ کیونکہ آپ

اس مجلس میں موجود تھے اور سب سے پہلے آپ ہی نے اسے نوٹ کیا تھا۔ ابن مسعودؓ سے علقمہ نے، علقمہ سے اسود نے اور اسود سے ابراہیم نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے: "اللہ اور اس کے رسولؐ کے مال میں اپنی خواہش کے مطابق تصرفات کرنے والے کچھ لوگ ہیں جن کے لیے کل کو نارِ جہنم مقدر ہے۔" اس پر ابوعبیدہ نامی کاتب جو بادشاہوں کے دربار کا ایک کہنہ مشق حاشیہ نشین تھا، بول اُٹھا: امیر المومنین سے اس طرح کا کلام! سفیان نے ڈانٹ کر کہا: "خاموش! کیونکہ فرعون نے ہامان کو ہلاک کیا اور ہامان نے فرعون کو۔[1] اس پُرزور کلمۂ حق کا اعلان کرکے سفیان باہر چلے آئے۔

جابر سلاطین کی جباریت کتنی ہی بڑھ جائے، کسی ایسے شخص پر ہاتھ ڈالنا اُن کے بس سے باہر تھا جس کے دل کی دنیا آباد ہو اور ضروریات سے بلند ہو کر اللہ کے لیے یکسو ہو چکا ہو۔

واثق کا شمار بھی جابر سلاطین میں ہوتا ہے۔ اس کے پاس ایک بار اساتذہ متکلمین میں سے ایک صاحب آئے۔ انھوں نے اسے سلام کیا لیکن اس نے جواب میں سلام کرنے کی جگہ یہ کہا: لَاسَلَّمَ اللّٰهُ عَلَيْكَ (اللہ تجھ پر سلامتی نہ بھیجے) یہ سنتے ہی ان صاحب نے واثق کو یہ ڈانٹ پلائی: تمہارے اساتذہ نے تمہیں بڑی بُری تمیز سکھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم کو سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر سلام کرو یا اُسی جیسا جواب دو۔ (وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا)۔ لیکن تم نے مجھ پر نہ تو میرے سلام سے بہتر سلام بھیجا نہ اس کا جواب دیا۔[2]

ابو یوسفؒ عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ایک شخص اُن کے سامنے مقدمہ لاتا ہے۔ عباسی بادشاہ ہادی سے ایک باغ کے بارے میں جھگڑا ہے۔ ابو یوسفؒ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ حق اسی شخص کے ساتھ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ بادشاہ کے پاس گواہ ہیں۔ انھوں نے کہا: مدعی کا مطالبہ ہے کہ ہادی قسم کھائیں کہ اُن کے گواہ سچے ہیں۔ ہادی نے قسم کھانے کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے اس سے انکار کر دیا اور باغ، باغ والے کو واپس کر دیا۔ اسی طرح ایک اور مقدمہ میں جس میں آپ کے نزدیک حلف

---

[1] ابوحنیفہ، مصنفہ استاذ عبدالحلیم الجندی۔

[2] المسند جلد اوّل، مرتبہ استاذ احمد محمد شاکر۔

اٹھوانا ضروری تھا، آپ نے ہارون الرشید سے حلف اٹھوائی۔ فضل بن ربیع ہارون الرشید کے گواہ بن کر آئے تو آپ نے اُن کی گواہی رَد کردی۔ خلیفہ نے بگڑ کر اعتراض کیا کہ اس کی گواہی کیوں رَد کی، تو آپ نے کہا: ''میں نے اُسے آپ سے یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ میں آپ کا غلام ہوں۔ اگر وہ سچا ہے تو غلام کی گواہی نہیں قبول کی جاتی اور اگر جھوٹا ہے تو بھی گواہی نہیں قبول کی جاسکتی[1]''۔

یہ شمع جو اسلام نے ضمیر انسانی میں جلائی تھی تاریخ کے تاریک ترین ادوار میں بھی نہ بجھ سکی۔ تاریخ کے تمام ادوار میں اس آزادیٔ ضمیر کی، اور دوسری قدروں، طاقتوں اور تعلقات سے روحانی طور پر بلند و مستغنی ہونے کی اس شان کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔

مصر میں احمد بن طولون، بکار بن قتیبہ نامی حنفی قاضی کی بڑی عزت کرتا تھا۔ وہ آپ کی مجلس میں اس طرح آتا تھا کہ جب تک قریب نہ پہنچ جاتا آپ کو خبر بھی نہ ہوتی۔ جب اُس نے آپ سے (عباسی خلیفہ کے ولی عہد) موفق پر لعنت بھیجنے کا مطالبہ کیا تو آپ نے قدرے توقف کے بعد صرف اتنا فرمایا: أَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظَّالِمِينَ۔ کسی نے ابن طولون کو توجہ دلائی کہ قاضی نے اس قول کا ہدف اُس کو بنایا تھا تو اس نے آپ سے ان عطایا کی واپسی کا مطالبہ کیا جو اُس نے انھیں دیئے تھے۔ یہ چیزیں اسے اسی حال میں سربمہر واپس مل گئیں۔ جس حال میں وہ دی گئی تھیں۔ اُس نے آپ کو ایک کرایہ کے مکان میں قید کردیا۔ یہ ایک دریچہ میں بیٹھ کر ان لوگوں سے گفتگو کرتے رہتے جو ابن طولون سے اُسکی اجازت حاصل کرلاتے تھے۔ جب ابن طولون مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے آپ کی رہائی کا حکم صادر کردیا۔ جو قاصد یہ خبر لے کر آیا تھا اُس سے آپ نے فرمایا: ''اس سے کہنا کہ میں کافی بوڑھا ہوگیا ہوں اور تو بیمار ہے، اب جلد ملاقات ہوگی۔ ہمارے درمیان صرف اللہ ہی آڑے ہے''۔ ابن طولون نے وفات پائی تو بکار کہا کرتے تھے: ''بے چارہ مرگیا[2]''۔

''بے چارہ مرگیا'' گویا انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اگرچہ ابن طولون صاحب اقتدار تھا لیکن وہ ان سے فروتر تھا، اُس میں بیچارگی تھی۔

---

[1] ابو حنیفہ۔ عبد الحلیم الجندی۔

[2] ایضاً۔

ایوبی سلطنت کے زمانہ میں جب (مصر کے حکمران) اسماعیل نے صلیبی جنگوں میں انگریزوں کا ساتھ دیا اور اس وعدہ پر صیداء اور دوسرے قلعے ان کے حوالے کر دیے کہ وہ لوگ سلطان نجم الدین ایوب کے خلاف اس کی مدد کریں گے تو عزالدین بن عبدالسلام نے اس پر اعتراض کیا۔ بادشاہ اس اعتراض پر بھڑک اٹھا اور اس نے آپ کو معزول کر کے قید کر دیا۔ پھر اس نے قاصد کے ذریعہ انھیں ڈرایا دھمکایا اور لالچ بھی دلائی۔ قاصد نے اُن سے کہا: "آپ کا سابق عہدہ بحال کر دیا جائے گا۔ اور مزید ترقی دے دی جائے گی۔ بشرطیکہ آپ سلطان سے ذرا دب کر رہیں"۔ شیخ نے جواب دیا: "خدا کی قسم مجھے یہ بھی نہیں پسند کہ سلطان آکر میرے ہاتھ چومے۔ دراصل تم کسی اور دنیا کے آدمی ہو اور میں کسی اور دنیا کا آدمی ہوں"[1]

ظاہر بیبرس کے زمانۂ حکومت میں شیخ محی الدین نووی دمشق میں رہتے تھے۔ آپ ظاہر کو اکثر نصیحت کیا کرتے تھے۔ جب ظاہر مصر میں ہوتا تو اُسے اپنی رایوں سے خط کے ذریعہ مطلع کرتے اور جب دمشق میں ہوتا تو حق بات اس کے سامنے علی الاعلان کہتے۔ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں ایسے متعدد خطوط نقل کیے ہیں اکثر خطوط میں ظاہر کے عاید کردہ بعض محاصل کو ختم کر دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے اور دلیل یہ دی گئی ہے کہ عوام کے معاشی حالات اچھے نہیں اور نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ: "اس برس بارش کی کمی، قیمتوں میں اضافہ، غلّہ اور چارہ کی پیداوار کی قلت اور مویشیوں کی ہلاکت کے سبب باشندگان شام تنگی اور خستہ حالی میں مبتلا ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ رعایا پر مہربانی واجب ہے اور ان (اصحاب امر) کو نصیحت کرنا خود ان کی اور رعایا کی بھلائی کے لیے ہے، کیونکہ دین خیر خواہی کا نام ہے"۔

سلطان نے اس نصیحت کو سختی کے ساتھ رَد کر دیا اور اس کے ساتھ علماء کا جو رویّہ تھا اس پر تنقید کرتے ہوئے یہ اعتراض کیا کہ یہ حضرات اس زمانہ میں کیوں خاموش تھے جب شام پر تاتاریوں کے غلبہ کے وقت ان کے علاقے گھوڑوں کی ٹاپ تلے روندے جا رہے تھے۔ شیخ نے اس کا بہت زوردار جواب دیا جس میں اپنی رائے اور سابقہ نصیحت کو دہرایا اور یہ واضح کیا کہ اللہ نے علماء سے عہد لیا ہے کہ حق بات کہتے رہیں گے آپ۔ اللہ آپ سے راضی رہے۔ اس کی دھمکی کے جواب میں فرماتے ہیں:" جواب میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے کفار پر اعتراض نہیں کیا کہ وہ ہمارے ملک میں کیا روش اختیار کر رہے ہیں تو مسلمان حکمرانوں اور ایمان

---

[1] ابوحنیفہ۔ عبدالحلیم الجندی۔

قرآن کے علمبرداروں کو سرکش کافروں پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟...... ہم ان باغی کافروں کو کس بات کی یاددہانی کراتے جب کہ وہ ہمارے دین پر ذرا بھی یقین نہ رکھتے تھے؟ رہا میں تو مجھے ڈانٹ کی کوئی پروا نہیں اور یہ بات مجھے سلطان کو نصیحت کرنے سے نہیں روک سکتی کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ کام مجھ پر اور میرے علاوہ دوسروں پر بھی فرض ہے۔ ادائے فرض کے نتیجہ میں جو بھی گزرے، اللہ کے نزدیک یہ خیر اور اضافۂ درجات کا ذریعہ بنے گا...... میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، اللہ اپنے بندوں کے حال سے بخوبی واقف ہے۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حکم دیا ہے کہ وہی بات کہیں جو حق ہو اور اللہ کی راہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں۔ ہم ہر حال میں سلطان سے محبّت رکھتے ہیں اور ہمیں وہ باتیں عزیز ہیں جو اسے دنیا اور آخرت میں نفع پہنچانے والی ہوں۔"

شیخ اسی مشفقانہ زور کے ساتھ خطوط لکھتے رہے مگر ظاہر نے آپ کی نصیحت نہ مانی اور محصول وصول کرتا رہا۔ کیونکہ جنگ در پیش تھی جس میں مال اور سامان کی ضرورت تھی۔ سلطان نے اپنی تائید میں علماء کے فتوے جمع کر رکھے تھے۔ انھوں نے وہی کچھ لکھ دیا تھا جو وہ چاہتا تھا، مگر شیخ محی الدین کی رائے میں اُس کی وجہ سے اور شدت پیدا ہو گئی تھی۔ ظاہر نے انھیں بلا بھیجا کہ جس پر سب نے دستخط کیے ہیں اس پر یہ بھی دستخط کر دیں، اگرچہ پہلے آپ اُسے بہت مشفقانہ خطوط لکھتے رہے تھے مگر اس موقع پر آپ نے بہت سخت جواب دیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ: "مجھے معلوم ہے کہ تو قیدی بندوقدار کا غلام تھا اور تیرے پاس کچھ بھی نہ تھا، پھر اللہ نے تجھ پر کرم کیا اور تجھے بادشاہ بنا دیا۔ میں نے سنا ہے کہ تیرے پاس ہزار غلام ہیں اور ہر غلام کے پاس زری کا کام کیے ہوئے کپڑے ہیں۔ تیرے پاس سو لونڈیاں ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس زیورات کی ایک گٹھری ہے۔ اب اگر تو یہ سارا مال خرچ کر دے اور تیرے غلاموں کے پاس نمدے کے موٹے کپڑے رہ جائیں تو میں بھی فتویٰ دے دوں گا کہ تیرے لیے رعایا سے مال وصول کرنا جائز ہے۔"

ظاہر کو یہ سن کر غصہ آ گیا اور اس نے کہا کہ تم میرے ملک (دمشق) سے نکل جاؤ۔ آپ نے فرمایا کہ حکم کی تعمیل کروں گا۔ چنانچہ آپ شام کے نوی نامی مقام پر منتقل ہو گئے۔ اس پر دوسرے فقہاء نے یہ کہا کہ یہ ہمارے اکابر علماء اور صلحاء میں سے ایک ایسے فرد ہیں جن کے نقش قدم پر عوام چلتے ہیں لہٰذا انھیں دمشق واپس بلا لیجیے۔ چنانچہ سلطان نے ان کی واپسی کی اجازت دے دی۔ مگر شیخ نے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک ظاہر وہاں ہے میں نہیں آؤں گا۔ مہینہ بھر بعد ظاہر کا انتقال

ہو گیا۔[1]

ماضی قریب کی تاریخ میں بھی اس بلندیٔ طبع کی متعدد مثالیں ہیں۔ ہم ان میں سے صرف دو واقعات بیان کرتے ہیں جن کو میں نے سُنانے والوں سے سُنا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو سکے ہیں یا نہیں پہلا واقعہ مجھ سے اسماعیلی دور کے مشہور مؤرخ احمد شفیق پاشا مرحوم نے بیان کیا تھا۔ دوسرا واقعہ حال ہیں خدیو توفیق کے زمانے کا ہے اور اس کے راوی بکثرت ملتے ہیں۔

پہلا واقعہ ان دنوں کا ہے جب اسماعیل کے عہدِ حکومت میں سلطان عبدالعزیز مصر آیا تھا۔ اسماعیل کو اس آمد کی بڑی فکر تھی کیونکہ خدیو کا لقب حاصل کرنے کی اسکیم میں اس آمد کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ نیز اس آمد سے مصر کے سیاسی نظام کو بہت سی خصوصی مراعات ملنے کی توقع تھی۔ اسی آمد سے متعلق ایک پروگرام یہ بھی تھا کہ سلطان محل میں علماء کو شرفِ باریابی بخشے گا۔ اس باریابی کے ساتھ بہت سے آداب و رسوم بھی وابستہ تھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ آنے والا زمین بوس ہو کر تین بار تُرکی طریقہ کے مطابق کورنش بجالائے۔ اس کے علاوہ بھی نہ جانے کون کون سے دقیانوسی اور پست قسم کے غیر اسلامی رسوم و آداب تھے۔ چنانچہ محل کے منتظمین پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ کئی دن تک علماء کو باریابی کے ان آداب کی مشق کرائیں تاکہ وہ سلطان کے سامنے کوئی غلطی نہ کریں۔

جب یہ موقع آیا تو حضرات علمائے کرام اندر داخل ہوئے اور بکمال دین فراموشی و دنیا پرستی ایسے ہی، جیسے ایک بندۂ مخلوق کے آگے جُھک جُھک کر آداب بجالائے۔ زمین سے ابتدا کرتے ہوئے سر تک، پھر منہ کے پاس، پھر سینہ تک ہاتھ لاکر سلام کی رسم ادا کی اور جیسا کہ اُنھیں سکھلایا گیا تھا سلطان کی طرف رُخ اور دروازہ کی طرف پیٹھ کیے اُلٹے قدموں واپس ہوئے۔ اس لعنت سے صرف ایک عالم بچا رہا یعنی شیخ حسن العدوی۔ انھوں نے دنیا پر لات ماری، دین کو یاد رکھا اور اپنے دل میں یہ شعور بیدار رکھا کہ ساری قوت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ آزاد انسانوں کی طرح سر اٹھائے اندر داخل ہوئے اور سلطان کے بالمقابل آکر اسلامی طریقہ کے مطابق "السلام علیکم یا امیر المومنین" کہہ کر سلام کیا۔ پھر جیسا کہ حاکم سے ملاقات کرتے وقت عالم کو کرنا چاہیئے۔ اس کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے، اس کے عذاب سے ڈرنے اور اپنی

---

[1] استاذ ابوزہرہ کی کتاب "ابن تیمیہ" سے۔

رعایا کے ساتھ عدل و رحمت سے پیش آنے کی نصیحت کی۔ جب بات پوری کر چکے تو سلام کیا اور اس آزادانہ شان کے ساتھ سر اونچا کیے باہر چلے گئے۔

اب تو دربار کے منتظمین اور خدیو کے ہوش اُڑ گئے۔ انھوں نے سمجھا کہ معاملہ بگڑ گیا اور اب سلطان کے غیظ و غضب کا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا۔ انھوں نے جو کوششیں کی تھیں وہ سب رائگاں گئیں اور امیدوں کے جو تانے بانے بُنے تھے وہ سب بکھر گئے۔

مگر ایمانی کلمۂ حق بھلا کب رائیگاں جاتا۔ وہ جس حرارت اور قوت کے ساتھ دل سے نکلتا ہے اسی قوت اور حرارت کے ساتھ دلوں میں اُتر جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سلطان بے اختیار بول اٹھا کہ تمہارے یہاں صرف یہی ایک عالم ہے۔ سلطان نے صرف آپ کو خلعت سے نوازا اور باقی سارے علماء کو محروم رکھا۔

دوسرا واقعہ خدیو توفیق پاشا اور شیخ حسن الطویل کے درمیان "دارالعلوم" میں پیش آیا۔

شیخ حسن الطویل دارالعلوم میں استاذ تھے اور ایک جلباب اور بغیر گریبان کا جُبّہ پہنا کرتے تھے۔ ایک دن ناظم دارالعلوم کو یہ اطلاع ملی کہ خدیو عنقریب اس مدرسہ کو دیکھنے آنے والا ہے۔ انھوں نے مدرسہ کی صفائی، نیز آراستگی اور دیگر ساز و سامان کی درستی شروع کر دی۔ اسی اہتمام کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ شیخ حسن الطویل اپنا لباس بدل دیں اور ایک قفطان اور ایک گریبان دار جُبّہ حاصل کر لیں تاکہ اُن کا لباس حکام کے سامنے پہن کر آنے کے لائق ہو جائے۔

شیخ کو جب ناظم صاحب کے اس مطالبہ کا علم ہوا تو انھوں نے اشارۃً رضا مندی کا اظہار کر دیا اس دن بھی شیخ اپنے معمول کے مطابق پُرانی وضع میں آئے۔ البتہ اُن کے ہاتھوں میں ایک رومال تھا جس میں کپڑوں کی ایک گٹھڑی سی بندھی ہوئی تھی۔ انھیں اس لباس میں دیکھ کر ناظم کا چہرہ بگڑ گیا اور رنج و غصہ کی نمایاں کیفیت کے ساتھ اس نے آپ سے پوچھا کہ: "شیخ! جُبّہ و قفطان کہاں ہے؟" انھوں نے رومال کی طرف اشارہ کر کے بتا دیا کہ یہاں ہے۔ ناظم صاحب نے سمجھا کہ جب معزز مہمان کی آمد کا وقت قریب ہوگا تو شیخ کپڑے بدل لیں گے۔ اُسے یہ پروگرام کچھ عجیب معلوم ہوا لیکن وہ خاموش رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ مہمان آ ہی گیا جس کے سب منتظر تھے۔ مدرسہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو ناظم مدرسہ، دوسرے اساتذہ اور سارے حاضرین کے لیے **غیر متوقع**

اور انوکھا تھا۔ شیخ حسن الطویل ہاتھ میں چھڑی لیے خدیو کے سامنے آئے اور بڑی جمعیتِ خاطر کے ساتھ کہا کہ مجھ سے لوگوں نے کہا ہے کہ مجھے لازماً جُبّہ و قفطان کے ساتھ حاضر ہونا ہوگا، چنانچہ میں جُبّہ و قفطان کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ اگر آپ کو جُبّہ و قفطان چاہیئے تو وہ یہ رہا، اور اگر "حسن الطویل" چاہیئے تو یہ ہے حسن الطویل۔

قدرتی طور پر خدیو نے یہ جواب دیا کہ اُسے حسن الطویل چاہیئے!

یہ مومن بندے ہیں جن کو اسلام کی عزّت کے سوا کوئی اور عزت نہیں مطلوب۔ جن کے وجدان اور ضمیر پست اور کھوکھلی قدروں اور عارضی مفادات کے لحاظ سے بری ہیں۔ جنہوں نے اسلام کو اس کی اصل حقیقت کے ساتھ سمجھ لیا اور اُسے پورے کا پورا اپنا لیا۔ جن کو اسلام کی حقیقی، بلند مرتبہ اور طاقتور رُوح کا ادراک حاصل کر لینے کے بعد پھر کبھی اس کی ضرورت نہ پڑی کہ کسی انسان کو خوش کرنے کی فکر کریں۔ حقیقی اسلام یہی ہے۔

ممالکِ مفتوحہ کے ساتھ برتاؤ

انسانی مساوات، وجدان کی آزادی اور عدلِ مطلق سے قریبی تعلق کے پیشِ نظر مناسب ہوگا کہ اب ہم اس طرزِ عمل کا مطالعہ کریں جو ممالکِ مفتوحہ اور اسلامی ممالک میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ اختیار کیا گیا تھا۔ عدل و مساوات کی یہ قسم افراد کے دائرہ سے نکل کر گروہوں اور اسلام کی حدود سے آگے بڑھ کر ساری انسانیّت سے تعلق رکھتی ہے۔

ممالکِ مفتوحہ پر گفتگو فطری طور پر ہمارے سامنے اسلامی فتوحات کی حقیقی نوعیت اور اس کے اسباب و غایات کا موضوع لاتی ہے۔ یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے اور ہم اس سے صرف اس حد تک تعرض کریں گے جو ناگزیر ہو اور جس کا تعلق انسانیّت کے وسیع دائرہ میں اجتماعی عدل سے ہو۔

دعوتِ اسلامی عقل اور وجدان کو مخاطب کرتی ہے اور قہر کے عناصر سے بالکل پاک ہے۔ اس نے اس نفسیاتی قہر کو بھی ذریعہ نہیں بنایا جو انسان کو عاجز کر دینے والے خوارقِ عادات کی شکل میں ادیانِ سابقہ کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ اسلام وہ اوّلین دین ہے جس نے انسان کے احساس و شعور کا احترام کرتے ہوئے اسے طبعی خوارق کے ذریعہ عاجز کر دکھانے اور نفسیاتی طور پر اس کو مرعوب کرنے کی بجائے

صرف اسے مخاطب کرنے پر اکتفا کیا۔ تلوار کی مادّی طاقت کے سہارے اپنی بات منوانے کے طریقے کو اس نے بدرجۂ اولیٰ نہیں اپنایا۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ ۲۵۶:)

"دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں۔"

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط (النحل ۱۲۵:)

"اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔"

لیکن قریش اوّل روز سے مادّی طاقت سے مسلح ہو کر اس نئے دین کی راہ میں حائل ہو گئے جس فرد کو بھی اللہ نے اسلام لانے کی توفیق دی اس کو انھوں نے ستایا۔ گنتی کے مسلمانوں کو انھوں نے گھر بار، بیوی بچوں سے جُدا کر کے باہر نکال دیا۔ انھوں نے ان کے خلاف یہ سازش بھی کی کہ ان کو گھاٹی میں قید کر کے ان کا مقاطعہ کریں تاآنکہ یہ بھوک کے مارے ہلاک ہو جائیں۔ غرض یہ کہ مادّی طاقت کے استعمال کا کوئی طریقہ نہ تھا جسے انھوں نے اس دین سے لوگوں کو دُور رکھنے کے لیے استعمال کیا ہو۔

اب اسلام کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنا دفاع کرے اور اپنے پیروؤں کو اس ظلم سے بچائے۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ط وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ٥ (الحج ۳۹:)

"جن لوگوں سے (کفار) جنگ کر رہے ہیں ان کو جنگ کرنے (کا) حکم دیا گیا، کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے اور اللہ اُن کی مدد کرنے پر قادر ہے۔"

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ٥ (البقرہ ۱۹۰:)

"اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو

کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو نہیں پسند کرتا۔"

پھر وہ وقت آیا کہ پورا جزیرۂ عرب اسلام کی آغوش میں آگیا اور فتوحات کے سلسلے نے عرب کے باہر قدم رکھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان فتوحات کی غرض و غایت کیا تھی۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، اسلام خود کو ایک عالم گیر نظریہ اور آفاقی دین قرار دیتا ہے وہ خود کو کسی جزیرہ کی حدود میں محصور نہیں کر سکتا۔ وہ اپنا فیض دنیا کے ہر گوشہ اور ساری انسانیت تک پہنچانا چاہتا ہے۔ لیکن راستہ میں قیصر و کسریٰ کی دو عظیم سلطنتوں کی قوت حائل نظر آتی ہے جو اسکو فنا کر دینے کے لیے گھات لگائے ہوئے ہیں۔ یہ قوت دعوتِ اسلامی کے علمبرداروں کو زمین میں چل پھر کر لوگوں کے سامنے اس دین کی حقیقت واضح کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ اب اسلام کے لیے اس کے سوا کوئی چارا نہ رہا کہ حکومت کی جو طاقت ہدایت الٰہی اور انسانیتِ عامہ کے درمیان حائل تھی اسے ہٹا دے اور اس کی جگہ اسلامی نظام قائم کر دے جو انسانوں کے صرف خدائے واحد کی بندگی کرنے اور ان کے انسانوں کی غلامی سے نکل آنے پر مبنی ہے، تاکہ وہ اپنی بے لوث بات سب تک پہنچا سکے۔ پھر حکومت کی مادی طاقت کے درمیان سے ہٹ جانے اور اللہ کی شریعت اور اس کے نظام کے غلبہ کے ذریعہ اطاعت کے اللہ کے لیے خالص ہو جانے اور بندوں کی خدائی ختم ہو جانے کے بعد جو چاہے ارادہ و اختیار کی پوری آزادی کے ساتھ اُسے سُنے اور جس کا جی چاہے اُسے نہ قبول کرے۔ کیونکہ ہر فرد کو اپنا رویہ خود متعین کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ قرآن کے فرمان:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ج

(انفال: ۳۹)

"ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔"

میں دین کے تمام تر اللہ کے لیے ہو جانے کا یہی مطلب ہے، کیونکہ یہاں دین کے معنیٰ اطاعت کے ہیں مقصود یہ ہے کہ لوگ صرف اللہ کی حاکمیت کے تحت ہوں، بندوں کی حاکمیت سے آزاد ہو جائیں۔ پھر بغیر کسی جبر و اکراہ کے وہ اپنا عقیدہ خود منتخب کر سکیں گے۔

اس وضاحت کی روشنی میں ظاہر ہے کہ ان اسلامی فتوحات کی نوعیت اُن جنگوں سے بالکل

جداگانہ ہے جو ایک قوم اپنی طاقت کے نشے میں دوسری قوم سے کرتی ہے یا جس طرح کی سامراجی جنگیں گزشتہ صدیوں میں استحصال کی خاطر کی گئی تھیں۔ ان جنگوں کی حقیقت صرف یہ ہے کہ اسلام جس نئے عقیدہ کا علمبردار تھا اس کے اور دوسری قوموں کے درمیان حکومت کی جو مادی طاقت حائل تھی اُسے راہ سے ہٹا دیا گیا۔ قوموں کی نسبت سے یہ خالص رومانی جنگیں تھیں۔ البتہ ان قوموں پر جو حکومتیں مسلط تھیں جو ان قوموں کو اقتدار اور مادی طاقت کے سہارے اس نئے دین سے روکے ہوئے تھیں اور انھیں خدا بن بیٹھنے والے حکمرانوں کا ماتحت بنائے ہوئے تھیں، ان کے لیے یہ جنگیں مادی جنگیں تھیں۔

اسلام خود کو ساری انسانیت کا دین سمجھتا ہے اور اپنے پھیلانے کے لیے مادی جبر نہیں استعمال کرتا۔ اپنے اس اصول کے تحت اس نے اقوام عالم کے سامنے تین راستے رکھے ہیں، ہر قوم کو انہی میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہے: اسلام یا جزیہ یا جنگ۔

"اسلام" کی پیش کش اس لیے حق بجانب ہے کہ یہی واحد راہ ہدایت ہے۔ یہ اُلوہیت، کائنات حیات اور انسان کی بابت جدید ترین اور مکمل ترین نظریہ ہے۔ یہ وہ دروازہ ہے جس میں داخل ہوتے ہی ایک غیر مسلم سارے مسلمانوں کا بھائی بن جاتا ہے۔ وہ مسلمانوں جیسے حقوق کا مستحق اور اُن کے فرائض کا پابند قرار پاتا ہے۔ حسب و نسب اور مال و جاہ کسی اعتبار سے بھی دوسرے مسلمان اس نومسلم پر برتری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ وہ نسل، رنگ، قوم، خاندان کسی چیز کے سبب بھی دوسروں سے مختلف نہیں قرار پا سکتا۔

یہی حال جزیہ کی پیش کش کا ہے۔ مسلمانوں کو مملکت کے تحفظ کی خاطر اپنا خون تک بہا دینا ہوتا ہے۔ سماج کے تحفظ کے لیے وہ زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ ایک غیر مسلم بھی اسلامی مملکت کے زیر سایہ امن و سکون سے فیضیاب ہوتا ہے۔ داخلی اور خارجی تحفظ اور ان تمام سہولتوں سے مستفید ہوتا ہے جو اسلامی مملکت اپنے باشندوں کے لیے فراہم کرتی ہے۔ معذوری یا بڑھاپے میں اسے اجتماعی کفالت کا سہارا بھی ملتا ہے۔ ایسی صورت میں عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ بھی ان تمام کاموں میں اپنے مال کے ذریعہ شریک ہو۔ زکوٰۃ کی نوعیت چونکہ مالی ٹیکس سے پہلے ایک اسلامی عبادت کی ہے۔ لہٰذا اسلام نے، جو اسلام نہ قبول کرنے والوں کے احساسات کا بڑا لحاظ کرتا ہے، یہ نہیں پسند کیا کہ ان کو ایک اسلامی عبادت کے اپنانے پر مجبور کرے۔ چنانچہ اس نے ان سے بجائے زکوٰۃ کے جزیہ کی شکل میں ٹیکس وصول کیا۔ جزیہ عائد کرنے میں یہ

حقیقت بھی سامنے رہی ہے کہ مملکت کے لیے جانی قربانی صرف مسلمان ہی پیش کرتے ہیں۔ مزید برآں جزیہ تسلیم و رضا کی علامت ہے اور یہ ظاہر کرتی ہے کہ طاقت کے ذریعہ اسلام کی راہ نہ روکی جائے گی اور اسلام اور عوام کے درمیان کوئی حائل نہ ہوگا۔ یہی اسلام کا اصل مقصد تھا۔

رہی تیسری صورت یعنی جنگ، تو حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جزیہ دونوں شکلوں کو ٹھکرا دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ (حکومت) اسلام اور عام انسانوں کے فکر کے درمیان حائل رہنے پر مُصر ہے۔ ایسی صورت میں ناگزیر ہو جاتا ہے کہ طاقت کے بل پر کیے جانے والے اس اصرار کو طاقت ہی کے ذریعہ ختم کر دیا جائے کہ یہی واحد آخری علاج ہے۔

اسلام نے ممالک مفتوحہ میں اپنے انسانی مقاصد کو پوری طرح عمل کا جامہ پہنایا۔ اسلام لانے کی شکل میں اس نے ان تمام باشندوں کو تمام امور میں عرب والوں کے برابر حقوق دیئے، اور جزیہ ادا کرنے کی شکل میں بھی ان کو ہر طرح کے اعلیٰ انسانی حقوق سے نوازا۔ یہاں تک کہ اس نے جنگ کی شکل میں بھی اُن کے ساتھ انصاف اور انسانیت کا سلوک کیا۔

بعض مفتوحہ ممالک میں حکمرانوں کے مسلمان ہو جانے کے بعد اسلام نے بدستور انھیں لوگوں کو وہاں حکمران رہنے دیا۔ فارسی النسل باذان کو حضرت ابوبکرؓ نے یمن کا حاکم باقی رکھا۔ اسی طرح صنعاء کے حاکم فیروز کو اس کے عہدہ پر برقرار رکھا۔ جب عربی النسل قیس بن عبد یغوث نے ان کو وہاں سے نکال دیا تو ابوبکرؓ نے عربی مسلمان کے مقابلہ میں اس فارسی مسلمان کی مدد کی اور اسے دوبارہ وہاں بحال کیا۔

اسی طرح مسلمانوں نے بلادِ مفتوحہ میں ان غیر مسلم ماتحت افسران اور امارت سے نیچے کے عہدیداران کو اُن کے عہدوں پر برقرار رکھا جو خلوص کے ساتھ مفادِ عامہ کی خدمت کرتے نظر آئے۔

اسلامی قانون اُن محاربین کی تمام املاک پر قبضہ کر لینا فاتح کے لیے جائز قرار دیتا ہے جو نہ اسلام لائیں، نہ جزیہ دینا قبول کریں بلکہ جنگ کرنا طے کریں۔ اس کے باوجود حضرت عمرؓ کے دور میں جب فارس فتح ہوا تو آپ نے روحِ اسلام کا تقاضا محسوس کرتے ہوئے ایک دوسری ہی پالیسی اختیار کی۔ آپ نے زمین کو بدستور زمین والوں کی ملکیت میں رہنے دیا البتہ اس پر خراج عائد کر دیا۔ آپ نے بیک وقت دو مصلحتوں کا خیال رکھا۔ ایک مصلحت تو خود مفتوحہ ممالک کی تھی۔ باوجود اس کے کہ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تھی کہ اس طرح ان کو اپنا ذریعہ معاش بدستور میسّر رہے اور وہ اس پر محنت کر کے

گزر بسر کرسکیں۔ دوسری مصلحت مسلمانوں کی آئندہ نسلوں سے متعلق تھی، آپ نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ ساری زمینیں موجودہ فاتحین کو دے دیں اور آئندہ نسلوں کو اس کے فوائد سے محروم کردیں۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ ان زمینوں سے خراج وصول کیا جائے اور وہ ہمیشہ مصالح عامّہ پر صرف کیا جاتا رہے تاکہ آئندہ بھی مستحقین کو مناسب حصے ملتے رہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مفتوحہ ممالک کے ساتھ اسلام کا برتاؤ ہمیشہ انسانیت پر مبنی رہا۔ اس نے ہمیشہ انھیں اپنی خوبیوں سے استفادہ کا موقع دیا اور بغیر کسی قید اور شرط کے ان کو اسلام کی خصوصیات کے اپنانے اور اس کے فوائد سے بہرہ یاب ہونے کی اجازت دی۔ اس نے اس بات کی دعوت دینے میں بھی کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا کہ وہ لوگ ان خوبیوں اور خصوصیات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلہ میں اس نے کسی کے لیے بھی اُس کے رنگ، نسل، زبان یا مذہب کو رکاوٹ نہ بننے دیا۔ ہر ایک کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ اجتماعی بہبود کی خاطر جو کچھ کر سکتا ہو کرے۔ اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح اسلام کے ایک خاص شعبہ یعنی فقہ و قانون سازی میں ممالک مفتوحہ کے باشندوں اور موالی نے امتیازی مقام حاصل کیا تھا حیات عامّہ کا کوئی قابل ذکر شعبہ نہیں جو تمام تر صرف اہل عرب کے فکر و عمل کا مرہونِ منت رہا ہو۔ یہاں تک کہ امارت اور ولایت کے مناصب بھی ان لوگوں کے حصہ میں آئے ہیں جو ہر ملک کے محاصل پہلے اس ملک کے مصالح پر خرچ کیا کرتے تھے۔ مرکزی بیت المال کو اس کا صرف وہ حصہ منتقل ہوجاتا تھا جو فاضل ہوتا۔ ان مفتوحہ ممالک کی حیثیت نوآبادیات کی نہ تھی کہ فاتحین ان کے باشندوں کے جان و مال کو اپنے عیش و عشرت کا ذریعہ بنائیں۔

اتنی ہی واضح حقیقت وہ آزادی ہے جو اسلام نے مفتوحہ ممالک کے باشندوں کو اپنے مذہبی مراسم کی ادائیگی کے سلسلہ میں عطا کی تھی۔ اس نے ان کی عبادت گاہوں، کلیساؤں اور خانقاہوں نیز اُن کے علماء اور راہبوں کی حفاظت کا ذمہ خود اپنے سر لیا۔ اس نے ان سے کیے ہوئے معاہدوں کی اتنی دیانت داری کے ساتھ پابندی کی جس کی مثال بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ آج بھی اس معاملہ میں اسلام کی ڈالی ہوئی رسم زندہ اور قائم ہے۔

جب ہم اسلام کا مقابلہ دورِ حاضر کی مغربی تہذیب اور اس کے اس برتاؤ کے ساتھ کرتے ہیں جو یہ تہذیب ان ممالک کے ساتھ کرتی ہے جو بدقسمتی سے استعمار کے پنجوں میں پھنس جاتے ہیں تو اسلام

اپنی تاریخ کے ہر دور میں زیادہ وسیع، بلند اور پاکیزہ نظر آتا ہے۔ آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تعلیم و تربیت اور معاشی تعمیر و ترقی کے باب میں مغربی تہذیب کی خوبیوں سے اِن ممالک کو قصدًا محروم رکھا جاتا ہے تاکہ جتنی طویل مدت تک ممکن ہو یہ ممالک مغربی استعمار کے لیے ایک دودھاری گائے بنے رہیں۔ اس کے علاوہ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے انسانی شرف و عزت کو ذلیل و پامال کرنا، قصدًا اخلاقی فساد پھیلانا، گروہی اور جماعتی فتنوں کے بیج بونا اور انھیں پروان چڑھانا اور قوموں، اور جماعتوں اور افراد کو ہر ممکن طریقہ سے "لوٹنا کھسوٹنا" استعماری طاقتوں کا شیوہ بن گیا ہے۔

اہلِ مغرب آج جس مذہبی آزادی کا دم بھرتے ہیں اس سے پہلے ان کے یہاں وہ دَور بھی گزر چکا جس میں اُندلس کی "تحقیقاتی عدالتوں" کی بہیمانہ سزائیں اور مشرق میں صلیبی جنگوں کی سفاکیاں ملتی ہیں۔ آج بھی یہ مذہبی آزادی محض ایک دکھاوا ہے۔ چنانچہ جنوبی سوڈان میں مسیحی مشنریوں کو سلطنت کی ساری قوتوں کی تائید حاصل ہے لیکن مسلمانوں کا داخلہ بھی ممنوع ہے۔ وہ تجارت کی غرض سے بھی وہاں نہیں جا سکتے۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں ایک انگریز کمانڈر ایلن بی (Allenby) نے بیت المقدس میں داخل ہوتے وقت یہ کہہ کر یورپ کے ہر فرد کا ذہن کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا تھا کہ "صلیبی جنگیں درحقیقت آج ختم ہوئی ہیں"۔ فرانسیسی جنرل کاترو نے ۱۹۴۰ء میں دمشق کے گزشتہ انقلاب کے موقع پر وہاں کھڑا ہو کر یہ کہتا ہے: "ہم صلیبی مجاہدین کے پوتے ہیں، جسے ہماری حکومت نہ پسند ہو وہ یہاں سے نکل جائے"۔ اس سے ملتی جلتی ایک بات اس کے ایک ہم مشرب نے ۱۹۴۵ء میں الجزائر میں کہی تھی۔ رہا کمیونسٹ بلاک تو وہاں مسلمانوں کو مٹا دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔ چوتھائی صدی کے مختصر سے عرصہ میں روس میں مسلمانوں کی تعداد چار کروڑ دو لاکھ سے گھٹ کر دو کروڑ چھ لاکھ رہ گئی ہے۔ آج کل انھیں ان راشن کارڈوں سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے جس کے بغیر وہاں اشیاءِ ضرورت کی فراہمی محال ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ تم جب چاہو تمھیں نماز پڑھنے کا حق حاصل ہے۔ مگر حکومت تم کو کھانا نہیں دے گی۔ تم اپنے خدا سے کھانا مانگو۔ یہی سلوک ان کے ساتھ یوگوسلاویہ اور دوسری جگہوں پر بھی کیا جاتا ہے۔

اسلام ہمہ گیر انسانی عدل اجتماعی کی وہ بلند چوٹی رہا ہے جس تک یورپین تہذیب نہ پہنچی ہے نہ پہنچ سکے گی۔ کیونکہ یہ جامد مادہ کی تہذیب ہے جو قتل و غارت گری، خوں ریزی اور زبردستی پر مبنی ہے[1]

---

[1] اس اجمال کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "السلام العالمی والاسلام" اور مصنف کی کتاب "دراسات اسلامیہ" کا باب "اسلامی فتوحات کا مزاج"۔

باہمی کفالت اور تعاون

معذور، اور ذی استطاعت، غریب اور امیر، فرد اور جماعت، محکوم اور حاکم اور اسی طرح تمام بنی نوع انسان کے درمیان رحم و کرم، نیکی و خیرخواہی اور باہمی تعاون کی جو صفات اسلام کو مطلوب ہیں ان پر ہم اوپر گفتگو کر چکے ہیں۔ اب ہم تاریخ سے اس کے چند عملی نمونے پیش کریں گے اسلام کی طویل تاریخ ایسے نمونوں سے بھری پڑی ہے۔

اسلام لاتے وقت حضرت ابوبکرؓ کے پاس تجارتی نفع کی آمدنی سے چالیس ہزار درہم جمع تھے اسلام کے بعد انھوں نے تجارت کے ذریعہ کافی نفع کمایا۔ مگر جس دن انھوں نے اپنے رفیق، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مدینہ کو ہجرت کی ہے اس دن اس ساری پونجی میں سے صرف پانچ ہزار درہم باقی رہ گئے تھے۔ اپنا سارا سرمایہ آپ ان کمزور مسلمانوں کا فدیہ ادا کرنے میں صرف کر چکے تھے جو غلام تھے اور جنھیں اپنے آقاؤں کے ہاتھ ہر طرح کا عذاب سہنا ہوتا تھا۔ اسی مال میں سے آپ نے فقراء اور مساکین کی امداد کی تھی۔

حضرت عمرؓ بن الخطاب ایک غریب آدمی تھے۔ انھیں خیبر میں ایک زمین ملتی ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر فرماتے ہیں: "مجھے خیبر میں ایک زمین ملی ہے، اتنا قیمتی مال مجھے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ آپ اس کے سلسلہ میں کیا حکم دیتے ہیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو جواب دیتے ہیں: "تمہارا جی چاہے تو اصل جائداد کو اپنی ملکیت میں باقی رکھتے ہوئے اس (کے منافع) کو صدقہ کر دو۔" چنانچہ حضرت عمرؓ نے اُسے فقراء اور قرابت مندوں کے لیے، غلاموں کے آزاد کرانے، کمزوروں کی مدد اور فی سبیل اللہ کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ یہ شرط لگا دی کہ اس کا ولی (نگراں) معروف کے مطابق اس میں سے خود کھانے اور اس سے بے جا فائدہ اٹھائے بغیر کسی دوست کو کھلانے کا مجاز ہوگا۔ اس طرح آپ نے اپنے عزیز ترین مال کو راہِ خدا میں دے کر اللہ تعالیٰ کے اس قول کا منشا پورا کر دیا کہ:

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ (آل عمران: ۹۲)

"تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ وہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنھیں

تم عزیز رکھتے ہو"

خلافت سے قبل حضرت عثمانؓ کے پاس شام سے ایک تجارتی قافلہ آتا ہے۔ یہ گیہوں، روغنِ زیتون اور منقہ سے لدے ہوئے ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ قحط کی وجہ سے مسلمانوں پر بہت سخت دن گزر رہے تھے۔ بہت سے تاجر آپ کے پاس آکر یہ کہتے ہیں کہ آپ لوگوں کی ضرورت مندی سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ مال ہمارے ہاتھ فروخت کر دیجئے۔ آپ فرماتے ہیں: بڑی خوشی کے ساتھ، یہ بتاؤ کہ مجھے قیمت خرید پر کتنا نفع دو گے؟ تاجروں نے کہا کہ دوگنے دام لے لیجئے۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ مجھے تو اس سے زیادہ کی پیش کش کی جا چکی ہے۔ وہ لوگ بھونچکے ہو کر پوچھتے ہیں کہ ابو عمرو! مدینہ کے سارے تاجر تو اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ کوئی دوسرا آدمی ہم سے پہلے آپ سے نہیں ملا ہے، آخر یہ کون ہے جس نے آپ کو یہ پیش کش کی ہے۔؟ آپ جواب دیتے ہیں، اللہ نے مجھے ایک کے دس دینے کا وعدہ کیا ہے، کیا تم اس سے زیادہ دے سکتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ عثمانؓ نے اللہ کو گواہ ٹھہرا کر اعلان کر دیا کہ اس قافلہ کا سارا مال اللہ کی راہ میں فقراء اور مساکین کے لیے صدقہ ہے۔

علیؓ اور ان کے گھر والوں کے پاس ایک دن ستو کی بنی ہوئی تین روٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ روٹیاں انھوں نے ایک مسکین، ایک یتیم اور ایک قیدی پر صدقہ کر دیں۔ مسکین، یتیم اور قیدی شکم سیر ہو گئے اور یہ خود فاقہ کر کے سو رہے۔

حسینؓ پر قرض کا بار بڑھ گیا ہے۔ ابی نیزر کا چشمہ آپ کی ملک ہے مگر آپ اس لیے نہیں فروخت کرتے کہ اس سے غریب مسلمان سینچائی کا کام لیتے ہیں۔ وہ ان غریبوں کے استعمال میں آئے اور آپ بنو ہاشم کے اعلیٰ ترین خاندان کے چشم و چراغ ہوتے ہوئے قرض کا بار اُٹھائے رہیں۔

مدینہ میں انصار نے مہاجرین کو اپنے مال اور مکان ہر چیز میں شریک ٹھہرا لیا۔ ان کو اپنا بھائی بنا لیا۔ ان کی طرف سے دیت ادا کی۔ ان کے قیدیوں کا فدیہ دیا۔ غرض یہ کہ ان کو بالکل اپنا بنا لیا جیسا کہ قرآن خود فرماتا ہے:

وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ
عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ (الحشر: ۹)

"جو کچھ مہاجرین کو دیا جائے اس پر لوگ اپنے دل میں تنگی نہیں پاتے اور انھیں اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں خواہ خود فاقہ کشی میں مبتلا ہوں۔"

جب تک اسلامی ممالک مغرب کی مادی تہذیب کے اثرات سے پاک رہتے ہیں۔ زندگی کے اس رشتہ میں اسلام کی روح کارفرما رہتی ہے۔ اُستاذ عبدالرحمٰن عزام اپنی کتاب "الرسالۃ الخالدہ" میں لکھتے ہیں:

"میں نے شمالی افریقہ کے طوارق نامی قبائل کو باہمی تعاون اور تکافل کی یہ مبارک زندگی بسر کرتے دیکھا ہے۔ ان میں کوئی فرد بھی صرف اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ پوری جماعت کے لیے زندہ رہتا ہے۔ اس کو سب سے زیادہ فخر ان کاموں پر ہوتا ہے جو وہ جماعت کے لیے کرتا ہے۔ میری توجہ ان حالات کی طرف اس طرح مبذول ہوئی کہ ایک شہری باشندہ فرانسیسیوں کے یہاں سے ہجرت کرکے ان لوگوں کے درمیان فزان میں اقامت گزیں ہوا۔ وہ ان کے ساتھ رہا اور ان کی مہربانی کے سہارے زندگی گزارتا رہا۔ پھر وہ طلبِ رزق کے لیے باہر نکلا تاکہ اس احسان کا بدلہ ادا کر سکے۔ اس نے اپنے گھر والوں کو اس اسلامی گروہ کے پاس چھوڑ دیا۔ قسمت نے ساتھ نہ دیا اور وہ کچھ کما نہیں سکا۔ وہ ہمارے پاس مصراتہ میں امداد کا طالب ہو کر آیا۔ ہم نے اس کی اتنی مدد کی کہ وہ اپنے گھر والوں کے پاس واپس جا سکے لیکن وہ تقریباً ایک سال کے بعد میرے پاس پھر آیا۔ میں نے سمجھا کہ وہ اپنے گھر والوں کے پاس سے آ رہا ہے۔ لیکن اُس نے تردید کی اور کہا کہ میں اب اس قابل ہو گیا ہوں کہ اپنے گھر والوں کے پاس جا سکوں۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے؟ اس نے بتایا کہ گزشتہ ملاقات کے وقت مجھے جو کچھ ملا تھا اس سے میں نے کاروبار کیا اور اب میرے پاس اتنا جمع ہو گیا ہے کہ میں طوارق کے پاس واپس جا سکوں۔ میں نے پوچھا کہ تم اپنے بال بچوں کے پاس واپس جاؤ گے کہ طوارق کے پاس؟ اس نے کہا کہ میں پہلے طوارق کے پاس جاؤں گا کیوں کہ انھوں نے میری غیر حاضری کے دوران میرے بال بچوں کو ٹھکانا دیا۔ اب میں جا کر اُن لوگوں کے بچوں کی کفالت کروں گا جو غیر حاضر ہوں۔ اور مجھے اللہ نے جو کچھ دیا ہے اسے اپنے اور اپنے پڑوسیوں کے بچوں کے درمیان تقسیم کر دوں گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ

کیا تمہارے سماج میں پڑوسیوں کے باہمی تعلقات اُسی نوعیت کے ہیں جس طرح کے تم اپنے پڑوسیوں کے ساتھ رکھتے ہو؟ اس نے کہا کہ ہم سب اچھے بُرے ہر حال میں ایک دوسرے کے برابر شریک رہتے ہیں۔ جو ضروریات سے فاضل ہوتا ہے وہ (کمانے والے) مالک کا حق ہوتا ہے ہم میں سے ہر شخص کو اس بات سے بڑی شرم آتی ہے کہ وہ خالی ہاتھوں گھر واپس جائے۔ اپنے گھر والوں سے شرم نہیں آتی بلکہ ان پڑوسیوں سے جو ہمارا اسی طرح انتظار کرتے ہیں جس طرح گھر والے۔"

اپنا یہ مشاہدہ بیان کرنے کے بعد مصنف اِس پر تبصرہ کرتے ہوئے حقیقتِ واقعہ کی بہت صحیح ترجمانی کرتا ہے؛

"یہ اجتماعی اسپرٹ طوارق کی اس جماعت یا انہی جیسے بدؤں اور صحرائی باشندوں تک محدود نہیں۔ نہ یہ اُن کی گروہی عصبیت کا ثمرہ ہے۔ یہی وہ اسلامی اسپرٹ ہے جو آج ان گروہوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے جو جدید مادیت کی فضا سے دور رہتے ہیں۔ میں نے اس روح کو ان قصبات اور شہروں میں بھی فعال اور کارفرما پایا جو آج اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، خواہ اُن کے باشندے عربی ہوں یا عجمی، گورے ہوں یا کالے اور خواہ یہ مقامات مشرق میں ہوں یا مغرب میں۔ میں نے بہت سے مقامات پر مسلمانوں کو اب بھی تعاونِ باہمی اور ایک دوسرے کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانے والی بھلی زندگی گزارتے دیکھا ہے۔ ان کروڑوں انسانوں کی بہ نسبت جو مغرب کی مادّی تہذیب پر فریفتہ ہیں یہ لوگ اب بھی صالح سماج سے بہت قریب ہیں جو داعی اوّل (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مطلوب تھا۔ مغرب زدہ لوگ صرف اپنے مطلب سے غرض رکھتے ہیں چاہے جماعت کا شیرازہ بکھر جائے۔ یہ اپنی ہوس کی تکمیل کو خود اپنے گھر والوں کے ساتھ حُسن سلوک پر مقدم رکھتے ہیں، پڑوسیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

یہ باہمی کفالت جس کی تعلیم اسلامی اسپرٹ دیتی ہے، صرف انفرادی اور اجتماعی وجدان کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ دی گئی۔ حکومت بھی اسے نافذ کرنے اور عملی جامہ پہنانے کا اہتمام کرتی تھی۔ چنانچہ عمرؓ بن خطاب نے بیت المال سے دودھ چھڑائے بچّوں، بوڑھوں اور بیماروں کے لیے وظائف مقرر کیے

واضح رہے کہ یہ اخراجات زکوٰۃ کے معروف مصارف کے علاوہ ہیں۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسے اس دور کے لیے سماجی تحفظ Social Security کا نظام قرار دیا جا سکتا ہے۔

آپ نے عام الرمادہ میں جب لوگ بھوک کا شکار ہو رہے تھے چوری کی سزا معطل کر دی تھی۔ کیوں کہ اس بات کا شبہ تھا کہ چوری پر بھوک نے مجبور کر دیا ہو۔ اسلام میں شبہ کی بنا پر حدود ٹال دی جاتی ہیں۔

ذیل کا واقعہ اجتماعی تکافل کی عملی تطبیق کے باب میں ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انفرادی ملکیت کے حق کی اصل نوعیت کیا ہے اور وہ سماج میں کن حدود کا پابند ہے۔

روایت ہے کہ ابن حاطب بن ابی بلتعہ کے چند غلاموں نے مزینہ کے ایک آدمی کی اونٹنی چرالی ان کو پکڑ کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں لایا گیا۔ انھوں نے اس کا اعتراف کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے کثیر بن الصلت کو ان کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ جب وہ تعمیل کے لیے چلے تو آپ نے ان کو روک دیا اور فرمایا: "سنو! خدا کی قسم اگر مجھے یہ نہ معلوم ہوتا کہ تم ان غلاموں سے خوب کام لیتے ہو، مگر انھیں بھوکا رکھتے ہو یہاں تک کہ یہ اس حال کو پہنچ جاتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی حرام کھالے تو بھی جائز ہوگا" تو میں ضرور ان کے ہاتھ کٹوا دیتا۔" پھر آپ نے عبدالرحمن بن حاطب بن ابی بلتعہ کو مخاطب کر کے فرمایا "خدا کی قسم میں نے ایسا (یعنی قطع ید) تو نہیں کیا مگر تیرے اوپر ایسا تاوان عاید کر دوں گا کہ تو چیخ اٹھے" پھر آپ نے مزینہ والے آدمی سے دریافت فرمایا کہ "تیری اونٹنی کے کیا دام لگ رہے تھے"؟ اس نے کہا چار سو۔ عمرؓ نے ابن حاطب سے کہا "جاؤ اور اسے آٹھ سو ادا کرو"۔ آپ نے چوری کے مجرم غلاموں کو سزا سے معاف رکھا۔ کیونکہ ان کے آقا نے انھیں بھوکا رکھ کر چوری کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ سدِ رمق کے محتاج تھے۔

اسلام کی تاریخ میں اجتماعی تکافل کی شان کو جو چیز دوبالا کرتی ہے وہ اس کا اسلامی دائرہ سے نکل کر پوری انسانیت کے لیے عام ہونا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے نابینا کو ایک دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا: "تمہیں کس چیز نے اس حالت تک پہنچایا؟" اس نے جواب دیا: جزیہ، ضرورت اور بڑھاپا۔ عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر لے گئے اور اتنا کچھ دیا جو اس وقت کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔ پھر آپ نے بیت المال کے خزانچی کو کہلا بھیجا کہ اس شخص اور اس جیسے دوسرے

اشخاص کی طرف توجہ کرو۔ خدا کی قسم یہ انصاف کی بات نہیں کہ ہم اس کی جوانی (کی کمائی) کھائیں اور بڑھاپے میں اُسے دھتکار دیں۔ زکوٰۃ فقراء اور مساکین کے لیے ہے اور یہ اہلِ کتاب کے مساکین میں سے ہے آپ نے اس فرد اور اس جیسے دوسرے افراد کو جزیہ سے بری قرار دیا ہے۔

جب آپ نے دمشق کا سفر کیا تو ایک ایسی بستی سے گزرے جہاں کچھ جذام کے مریض عیسائی بستے تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کو زکوٰۃ کی مد سے امداد دی جائے اور ان کے لیے راشن جاری کیے جائیں

تیرہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزرا جب کہ اسلام کی رُوح نے عمرؓ کو انسانیت کے اس بلند مقام پر پہنچا دیا تھا کہ انھوں نے سماجی تحفظ کو ایک انسانی حق قرار دے دیا جو کسی مخصوص مذہب یا فرقہ کے ساتھ مشروط نہ تھا جس پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا کہ محتاج کا عقیدہ کیا ہے اور وہ کس شریعت کا پابند ہے۔

یہ وہ مقامِ بلند ہے جس کی طرف اقدام میں آج انسانیت کے قدم تھک چکے ہیں اور وہ اب بھی بہت دور ہے

سیاسی نظام

ریاست کے باضابطہ سیاسی اور معاشی نظام کے سلسلہ میں اسلام کی زندگی میں ایک مثالی دور گزرا ہے جس پر تاریخ گواہ ہے۔ افسوس صد افسوس کہ یہ دَور زیادہ طویل نہ تھا۔ آئندہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ اس کا سبب کیا تھا۔ تاکہ ہم جان سکیں کہ یہ اسباب اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام کی عین فطرت میں داخل ہیں جیسا کہ بعض حضرات کا دعویٰ ہے یا ان کا شمار ان خارجی اتفاقات میں ہے جس کا اس نظام کے مزاج سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلے ہم سیاسی نظام پر گفتگو کریں گے کیونکہ مالی پالیسی عملاً ہمیشہ اس کے تحت اور اس کے مزاج کے تابع رہی ہے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب ہوا تو آپؐ نے حضرت ابو بکرؓ کو بُلا بھیجا کہ وہ نماز میں امامت کریں۔ جب حضرت عائشہؓ نے یہ عذر پیش کرتے ہوئے نظرِ ثانی کی درخواست کی کہ ابو بکرؓ رقیق القلب آدمی ہیں، نماز پڑھنے کھڑے ہوں گے تو لوگ ان کی آواز نہ سُن سکیں گے تو آپؐ کو غصہ آگیا۔ آپؐ نے حضرت یوسفؑ (کو بہکانے والی) عورتوں کا ذکر کیا اور حضرت ابو بکرؓ

کو امامت کے لیے بلانے پر اصرار کیا۔

کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ رسولؐ اللہ نے اپنے رفیقِ غار کو خلیفہ مقرر کر دیا؟ کیا مسلمانوں نے اس سے صراحتہً یہی سمجھا تھا؟

ہمارے نزدیک یہ دونوں مفروضے دُور از قیاس ہیں۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خلیفہ مقرر کرنا ہوتا اور اگر خلیفہ بنا کر جانا اس دین میں فرض ہوتا تو جس طرح آپؐ نے اپنے دین کے دوسرے فرائض کو علی الاعلان بتا دیا تھا اسی طرح خلیفہ بنانے کا کام بھی علی الاعلان کرتے اگر مسلمانوں نے صاف طور پر یہ سمجھ لیا ہوتا کہ آپ ابوبکرؓ کو خلیفہ مقرر فرما رہے ہیں تو سقیفہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان کسی بحث کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ انصار ایسے نہ تھے کہ رسولؐ اللہ کے فیصلہ پر اعتراض کرتے۔

درحقیقت یہ معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ پر چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ لوگ خود اطمینان حاصل کر لیں اور دوسروں کو بھی مطمئن کر لیں کہ خلافت کا سب سے زیادہ مستحق کون فرد ہے۔ اگر سقیفہ کے موقع پر بحث اس نتیجہ تک پہنچی کہ خلیفہ مہاجرین میں سے ہو تو یہ اسلام میں فرض نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کی جماعت میں کسر وانکسار کے بعد اتفاق رائے سے طے پانے والا ایک فیصلہ تھا۔ انصارؓ اس فیصلہ کو رد کر سکتے تھے، اُن پر اعتراض کوئی نہیں کر سکتا تھا لیکن عملاً یہ ہوا کہ انصار حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر راضی ہو گئے۔ کیونکہ آپ خلافت کے لیے دوسروں سے زیادہ اہل تھے۔ ان کے سامنے وہ مقامی عوامل بھی تھے جو مدینہ میں اوس وخزرج کے مابین کام کر رہے تھے۔

اس موقع پر اس متفقہ فیصلہ کا، کہ خلافت مہاجرین میں رہے گی، یہ مطلب نہیں تھا کہ خلافت لازماً قریش کے اندر رہے۔ اگر معاملہ کی نوعیت یہ ہوتی تو حضرت عمرؓ اصحابِ شوریٰ کا تقرر عمل میں لاتے وقت یہ نہ فرماتے کہ "اگر ابو حذیفہ کے مولیٰ سالم زندہ ہوتے تو میں ان کو خلیفہ مقرر کر جاتا۔" ظاہر ہے کہ سالمؓ قریشی نہیں تھے۔ پھر اسلام کی روح بھی اس بات سے اِبا کرتی ہے کہ قریش کو محض اس وجہ سے دوسرے مسلمانوں سے برتر قرار دے دیا جائے کہ وہ "قریش" اور رسول اللہ انھیں کے نسب سے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خود یہ فرمایا ہے کہ:

من بطأ به عمله لم يسرع به نسبه۔ (مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی)

"جس کو اس کے عمل نے پیچھے رکھا اُسے اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکے گا"

حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر فرما گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کو پابند کر دیا تھا۔ اُن کو پورا حق حاصل تھا کہ اس تقرر کو رد کر دیں۔ حضرت عمرؓ اس بناء پر خلیفہ نہیں ہوگئے کہ ابوبکرؓ اُن کو نامزد کر گئے تھے، بلکہ آپ کی خلافت لوگوں کے آپ کے ہاتھ بیعت کرنے پر منعقد ہوئی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنے بعد چھ افراد کی ایک شوریٰ مقرر فرما دی جو خلافت کے لیے اپنے اندر سے ایک فرد کا انتخاب کرنے کی ذمہ دار تھی۔ مسلمان اس کے پابند نہ تھے کہ لازماً انھیں چھ میں سے کسی ایک کو منتخب کریں، بلکہ انھوں نے خود سے یہی فیصلہ کیا کیوں کہ حقیقت واقعہ گواہ تھی کہ یہ چھ افراد بہترین افراد تھے اور عمرؓ کا انتخاب اس حقیقت کے مطابق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے انہی چھ کے اندر سے کسی کا انتخاب مناسب سمجھا۔

حضرت علیؓ کے لیے بیعت میں ایسا ہوا کہ کچھ لوگ اِس پر راضی تھے اور کچھ لوگ اس کے خلاف ہوگئے۔ اس کے نتیجہ میں پہلی بار مسلمانوں میں آپس میں جنگ ہوئی۔ اس کے بعد وہ المیے رونما ہوئے جنھوں نے اسلام کی رُوح، اس کے سیاسی اور اقتصادی اُصولوں اور دوسرے شعبوں میں اس کے تصورات کو ادر بُری طرح مجروح کر دیا۔

اس سرسری جائزہ سے حکومت کے بارے میں اسلام کا اصل نظریہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں کا آزادانہ انتخاب وہ واحد چیز ہے جو کسی کو حکمران بنا سکتی ہے۔ حضرت علیؓ کو جو رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے لڑکے، اُن کے داماد اور اُن کے سب سے قریبی رشتہ دار تھے خلافت کے معاملہ میں مؤخر کرتے وقت مسلمان اس حقیقت کو خوب سمجھ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ علیؓ کو مؤخر کرنا، بالخصوص عمرؓ کے بعد، ان کی حق تلفی کر رہا ہو لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس تاخیر کو اسلام کے نظریۂ حکومت کی صحیح ترجمانی کے باب میں بہت اہمیت حاصل رہی ہے اس میں یہ مصلحت مضمر تھی کہ وراثت کا شائبہ بھی اس منصب کے قریب نہ آئے کیونکہ یہ اسلام کی رُوح اور اُس کے بنیادی اصولوں سے بعید ترین تصور ہے۔ حضرت امام کے ساتھ جو حق تلفی بھی ہوئی، اس نظریہ کا عملی مظاہرہ بہرحال اس سے زیادہ اہم تھا۔

اس کے بعد بنو اُمیہ کا دور آیا اور انھوں نے اسلامی خلافت کو بنو اُمیہ کے اندر محصور رہنے والی

مستبدانہ بادشاہت میں تبدیل کر دیا۔ یہ اسلامی تعلیمات کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ "جاہلیت" کا اثر تھا جس نے رُوحِ اسلامی کو معطل کر دیا۔ یہاں بعض روایات کا ذکر کافی ہوگا جو یہ بتاتی ہیں کہ یزید بن معاویہؓ کی بیعت کن حالات میں عمل میں آئی تھی۔

شام میں یزید کے لیے بیعت لینے کے بعد معاویہؓ نے سعیدؓ بن العاص کو یہ ذمہ داری سپرد کی تھی کہ کسی ترکیب سے اہلِ حجاز کو اس کا قائل کر دیں۔ وہ اس کوشش میں ناکام رہے۔ پھر معاویہؓ خود مال و دولت اور لاؤ لشکر سمیت مکّہ گئے اور اکابر مسلمین کو بلا کر اُن سے کہا:

"تمہارے ساتھ میرا جو برتاؤ رہا ہے اور جس طرح میں نے تمہارے رشتوں اور تعلقات کا لحاظ رکھا ہے اس سے تم بخوبی واقف ہو۔ یزید تمہارا بھائی ہے اور تمہارے چچا کا لڑکا ہے۔ میری خواہش ہے کہ جہاں تک خلافت کے نام کا تعلق ہے تم یزید کو آگے بڑھا دو۔ عملاً سارا عزل و نصب، جمعِ محاصل اور تقسیمِ مال تم خود انجام دینا۔"

عبداللہ بن الزبیرؓ نے ان کو جواب دیا کہ ان کے لیے مناسب یہی ہے کہ یا تو ——— ابو بکرؓ کا طریقہ اختیار کریں کہ انھوں نے ایک ایسے شخص کے حق میں وصیت کی جو اُن کے خاندان سے نہ تھا، یا وہ کریں جو عمرؓ نے کیا تھا کہ معاملہ کو چھ ایسے افراد کے باہمی مشورہ پر چھوڑ دیں جن میں اُن کا کوئی لڑکا یا رشتہ دار نہ شامل تھا۔

معاویہؓ مارے غصہ کے بھڑک اُٹھے اور کہا: "تمہارے سامنے کوئی اور شکل بھی ہے؟" ابن الزبیرؓ نے کہا کہ نہیں۔ معاویہؓ نے دوسرے لوگوں کی طرف مڑ کر پوچھا کہ تم کیا کہتے ہو؟ ان لوگوں نے کہا کہ ہم سب ابن زبیرؓ سے متفق ہیں۔ پھر معاویہؓ نے ان لوگوں کو دھمکی دیتے ہوئے کہا:

"جس نے متنبہ کر دیا اُس نے اپنے لیے عذر فراہم کر لیا۔ میں نے تم کو خطاب کیا تو تم میں سے ایک شخص نے اٹھ کر سب کے سامنے میری تردید کر دی۔ میں اسے برداشت کر لیتا ہوں اور معاف کر دیتا ہوں۔

لیکن اب میں ایک ایسی بات کہنے کھڑا ہوا ہوں کہ خدا کی قسم اگر تم میں سے کسی نے اس کے جواب میں ایک جملہ بھی کہا تو قبل اس کے کہ اُسے کوئی دوسرا جملہ سُناتی دے تلوار اُس کا سر تن سے جُدا کر چکی ہوگی۔ اب ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر کرے۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ یہ ہے کہ معاویہؓ کے حفاظتی دستہ کے سالار نے حجاز کے ان تمام عمائدین کے سر پر دو دو آدمی مسلط کر دیئے جو اس تجویز کے خلاف تھے۔ معاویہؓ نے سالار کو حکم دے دیا تھا کہ اگر ان میں سے کوئی فرد **میری مخالفت** میں ایک جملہ بھی منہ سے نکالے تو اُس کو یہ دونوں آدمی تلوار کا نشانہ بنا دیں۔

پھر معاویہؓ منبر پر آئے اور یہ کہا:

"یہ لوگ مسلمانوں کے سردار اور اُن میں کے بہترین افراد ہیں، ان کی رائے کے بغیر کوئی معاملہ نہیں طے کیا جاتا، نہ اُن کے مشورہ کے خلاف کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں نے یزید کی خلافت پر راضی ہو کر بیعت کر لی، تم لوگ بھی اللہ کا نام لے کر بیعت کر لو۔"[1]

چنانچہ عوام نے بیعت کر لی۔!!

یزید کی حکومت اس بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔ وہ بنیاد جسے اسلام کبھی بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور خود یہ یزید کون ہے؟ یہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں عبداللہؓ بن حنظلہ کہتے ہیں:

"خدا کی قسم ہم یزید کے خلاف اس وقت کھڑے ہوئے جب ہمیں یہ اندیشہ ہو چلا کہ ایسا نہ ہو کہ ہم پر آسمان سے پتھر برسائے جائیں ——— یہ شخص ماؤں، بہنوں، بیٹیوں سے (ایک ساتھ) نکاح کرتا ہے۔ شراب پیتا ہے اور نمازیں ترک کرتا ہے۔ خدا کی قسم اگر اور لوگ میرے ساتھ نہ ہوتے تو بھی میں اللہ کی راہ میں ضرور قربانی دیتا۔"

ہو سکتا ہے کہ یہ یزید کے ایک دشمن کی مبالغہ آمیزی ہو۔ لیکن بعد میں یزید نے عملاً جو کچھ کیا، مثلاً حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اتنے بُرے طریقہ سے قتل کرنا، بیت اللہ کا محاصرہ اور اُس پر سنگ باری وغیرہ، وہ اس بات پر گواہ ہے کہ یزید کے دشمنوں نے ذرا بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا۔

صحیح صورتِ حال کچھ بھی رہی ہو، کسی کو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ مسلمانوں میں

---

[1] ابن الاثیر۔ حوادث ۵۶ھ ہجری۔ ہم یقین کے ساتھ ان روایات کو صحیح قرار دینا نہیں پسند کرتے۔ لیکن خود اسلام کے تصور کو بگڑنے سے بچانے کے لیے اتنا ضرور کہیں گے کہ اگر یہ روایات صحیح ہیں تو ایسا کرنا اسلام میں نظامِ حکمرانی کے بنیادی مزاج کے منافی تھا۔ کوئی دلیل یا عذر اس طرزِ عمل کو درست نہیں قرار دے سکتا۔

میں صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ کے ہوتے ہوئے خلافت کے لیے موزوں ترین فرد یزید تھا۔ اصل غرض یہ تھی کہ حکومت اموی خاندان میں آجائے اور وراثتی نظام اختیار کرلے۔ یہ رُجحان اسلام، اسلامی نظام اور اسلامی رُجحان کے دل میں چھرا بھونک دینے کے مترادف تھا۔

ان حقائق کو ہم نے اس لیے پیش کیا ہے کہ اسلام میں موروثی بادشاہت کا جو نیا طریقہ بغیر کسی سند کے شروع کیا گیا تھا اس سے اسلام کا، اس کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں کا بَری ہونا واضح ہوجائے، اور اسلام میں حکمرانی کا تصور اپنی اصل حقیقت کے مطابق سامنے آجائے۔

طرزِ حکمرانی کے نمونے

اس حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم طرزِ حکمرانی کے کچھ نمونے مختلف اَدوار مثلاً حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے دور، پھر حضرت عثمانؓ اور مروان کے عہد اور پھر حضرت علیؓ کے عہد اور اسی طرح شاہانِ بنواُمیہ اور اُن کے بعد بنوعباس کے دور سے سامنے لائیں، جو اس وقت آئے جب کہ اسلام کو اس کے ابتدائی دور میں ہی اتنا زبردست صدمہ پہنچ چکا تھا۔

جب مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کو خلافت کا منصب سنبھالنے کو کہا تو ان کی نظر میں اپنا کام اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں میں اللہ کے دین اور اس کی شریعت کو نافذ کرنے کی ذمہ داری اَدا کریں۔ اس طرح کا کوئی خیال ان کے پاس بھی نہیں پھٹکا کہ یہ منصب اُن کے لیے کچھ ایسی چیزوں کو مباح کرتا ہے جو کل، جب کہ وہ رعیت کے ایک عام فرد تھے، مباح نہیں تھیں۔ یا اُنھیں کوئی نیا حق دیتا ہے جو کل تک نہیں حاصل تھا۔ یا اُن ذمہ داریوں میں سے کسی ذمہ داری کو ساقط کرتا ہے ــــــ جو کل تک اُن کے سر پر تھیں، چاہے ان ذمہ داریوں کا تعلق آپ کی اپنی ذات سے ہو، یا خاندان والوں سے ہو، یا اللہ تعالیٰ سے ہو۔ سقیفہ میں جب آپ کے ہاتھوں پر بیعت ہوچکی تو کھڑے ہوکر فرمایا:

"اگر میں اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دوں تو میری مدد کرنا اور کج روی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کردینا۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ تم میں جو کمزور ہے وہی میرے نزدیک طاقتور ہے تاآنکہ میں اس کا حق اسے پہنچادوں۔ انشاء اللہ۔ اور جو طاقتور ہے وہی میرے نزدیک کمزور شمار ہوگا تاآنکہ میں اُس سے حق وصول کرلوں انشاء اللہ۔ جب بھی کسی قوم نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے جی چرایا ہے اللہ نے اُسے

ذلیل وخوار کر دیا۔ جب بھی کسی قوم میں فحش کا دور دورہ ہوا اللہ نے بلا استثنا سب پر مصیبت نازل کر دی۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا رہوں تم لوگ میری اطاعت کرنا، اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت کی ذمہ داری نہیں۔

حضرت ابو بکرؓ کا مکان مدینہ سے قریب سُنخ میں تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا معمولی مکان تھا۔ جب آپ خلیفہ ہو گئے تب بھی آپ نے نہ مکان بدلا نہ خود اس مکان میں کوئی تبدیلی عمل میں لائے سُنخ میں اپنے مکان سے مدینہ تک صبح و شام پیدل آتے اور جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایک گھوڑا سواری میں ہوتا مگر وہ گھوڑا بیت المال کا نہ تھا بلکہ آپ کا تھا۔ جب کام کا بار بڑھ گیا تو آپ مدینہ منتقل ہو گئے۔

تجارت کر کے اپنی روزی کماتے تھے۔ (خلیفہ منتخب ہونے کے بعد) صبح ہوئی تو چاہا کہ کاروبار کے لئے جائیں، مسلمانوں نے روک لیا اور کہا، یہ ذمہ داری تجارت کے ساتھ پوری طرح اَدا نہیں کی جاسکیگی اس پر آپ نے پوچھا: ایسے انداز میں جیسے کہ رزق ملنے کے کسی دوسرے طریقہ سے بالکل ناآشنا ہوں! پھر میں کیسے گذارا کروں گا؟ لوگوں نے معاملہ پر غور کیا اور اُن کے کاروبار نہ کر سکنے اور فرائض منصبی کے لیے وقف ہو جانے کے عوض بیت المال سے اُن کی اور اُن کے اہل و عیال کی خوراک کے لیے بقدر کفایت وظیفہ مقرر کر دیا۔

اس کے بعد جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو آپ نے مسلمانوں کے مال سے بَری رہنے کی خاطر تورُعاً یہ حکم دیا کہ آپ نے بیت المال سے جو کچھ لیا ہے اس کا حساب کیا جائے اور اُتنا آپ کی زمین اور دوسرے اموال سے لیکر بیت المال کو واپس کر دیا جائے۔ اسلام نے حاکم و محکوم کے ضمیر کو جس ہمہ دم بیداری کا مکلف بنایا ہے اور ہر فرد کو جو حساس شعور عطا کیا ہے۔ اس کے زیر اثر آپ کا حال یہ تھا کہ رعایا کے ہر فرد کی ضروریات کے بارے میں خود کو جواب دِہ اور ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس معاملہ میں آپ اس حد کو جا پہنچے تھے کہ سُنخ میں آپ کے پڑوس میں جو ضعیف اور بے سہارا لوگ رہا کرتے تھے ان کی بکریوں کو دوہنا آپ نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ جب آپ نے خلافت کا منصب سنبھالا تو ایک لڑکی کو یہ کہتے سُنا: "اب تو تم ہمارے لیے بکریاں نہ دوہا کرو گے۔" آپ نے فرمایا: "کیوں نہیں، اپنی جان کی قسم مَیں تمہاری خاطر اُنھیں دُوہا کروں گا۔"

چنانچہ آپ ان کو دوہتے رہے۔ کبھی کبھی بکری کی مالکہ سے پوچھتے: اے لڑکی! مکھن نکال دوں یا خالص دودھ رہنے دوں۔ کبھی وہ کہتی کہ مکھن نکال دو۔ کبھی کہتی صرف دودھ دوہ دو۔ جو وہ کہتی آپ کر دیتے۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں حضرت عمرؓ مدینہ کی ایک اندھی عورت کی خبرگیری کیا کرتے تھے۔ پھر ایسا ہونے لگا کہ جب بھی آپ پہنچتے یہ دیکھتے کہ اس عورت کی ضروریات پوری ہو چکی ہیں ایک دن یہ چھپ کر بیٹھ رہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ابوبکرؓ آکر اس کے کام کر جاتے ہیں۔ خلافت اور اس کی ذمہ داریاں بھی آپ کو اس کام سے نہ روک سکیں۔ اُن کو دیکھ کر حضرت عمرؓ پکار اُٹھے:

"آپ ہی ہیں، میری جان کی قسم آپ ہی ہیں!"

یہ ابوبکرؓ کے تصورِ حکمرانی کی ایک ہلکی سی جھلک تھی۔ آپ کی جگہ حضرت عمرؓ نے لی تو بھی یہی تصور باقی رہا۔ عمرؓ نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ اُن کا یہ منصب اُن کے حقوق میں کوئی اضافہ کر دیتا ہے البتہ اس نے آپ کی ذمہ داریوں میں اللہ کی شریعت کو نافذ کرنے کی ذمہ داری کا اضافہ ضرور کر دیا۔

بیعت کے بعد آپ نے خطبہ دیا، فرمایا: "لوگو! میں تم ہی میں کا ایک آدمی ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر مجھے خلیفۂ رسولؐ اللہ کی بات ٹھکرانا ناپسند نہ ہوتا تو میں ہرگز تمہارے معاملات کی ذمہ داری نہ قبول کرتا۔"

آپ نے دوسرے خطبہ میں فرمایا:-

"میرے اُوپر تمہارے سلسلہ میں کچھ ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں جن کا میں ذکر کرتا ہوں، تم مجھ سے اُن کا مواخذہ کرتے رہنا۔ میری ذمہ داری ہے کہ تمہارے خراج اور فَیْ کو ضابطہ کے مطابق وصول کروں اور جو مال میرے پاس آئے وہ حق کے مطابق صرف ہو۔ میری ذمہ داری ہے کہ تمہیں ہلاکت کے منہ میں نہ ڈالوں اور تمہیں زیادہ عرصہ سرحدوں پر تعینات نہ رکھوں اور جب تم جنگ کے سلسلہ میں گھر سے دور رہو تو میں تمہارے گھر والوں کا سرپرست ہوں گا۔"

آپ فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے اللہ کے مال کو اپنے لیے یتیم کے مال کی حیثیت دے رکھی ہے اگر مجھے ضرورت نہ پڑی تو اس سے مستغنی رہوں گا، اور اگر ضرورت پڑی تو معروف کے مطابق اس

ہیں سے کھاؤں گا۔"

ایک بار آپ سے دریافت کیا گیا کہ اللہ کے مال میں سے آپ کے لیے کتنا لینا حلال ہے؟ آپ نے فرمایا: "میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں اپنے لیے اس میں کتنا حلال سمجھتا ہوں۔ میرے لیے دو کپڑے لینا حلال ہے۔ ایک جاڑے کے لیے، ایک گرمی کے لیے۔ اور حج اور عمرہ کرنے کے لیے سواری نیز میری اور میرے گھر والوں کی خوراک وہ ہوگی جو قریش کے کسی متوسط الحال فرد کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد میں عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں، جو اُن کو ملے گا، مجھے بھی ملے گا۔"

آپ نے اسی طرح زندگی گزاری مگر اکثر آپ نے ان چیزوں کے معاملہ میں بھی شدت برتی جن کو اپنے لیے حلال قرار دے چکے تھے۔ ایک دن بیمار پڑ گئے۔ علاجاً شہد تجویز کیا گیا۔ بیت المال میں شہد کا ایک کپا موجود تھا۔ جب منبر پر تشریف لائے تو فرمایا: "تم لوگ اجازت دو تو اُسے استعمال کر لوں، ورنہ وہ میرے لیے حرام ہے۔" لوگوں نے اجازت دے دی۔

مسلمانوں نے یہ شدت پسندی دیکھی تو کچھ لوگ آپ کی صاحبزادی اُم المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس گئے اور یہ کہا: "عمرؓ نے اپنے اوپر شدت اور تنگی کی حد کر رکھی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ نے رزق میں فراخی عطا کر دی ہے۔ اُن کو چاہیئے کہ اس فیئے میں سے حسبِ خواہش فراخی کے ساتھ لے لیا کریں۔ مسلمانوں کی طرف سے اُن کو ایسا کرنے کی پوری اجازت ہے۔" جب حضرت حفصہؓ نے آپ سے اس بارے میں گفتگو کی تو جواب دیا "اے عمر کی بیٹی حفصہ! تو نے اپنی قوم کا ساتھ دیا مگر اپنے باپ کے ساتھ بدخواہی کی۔ میرے گھر والوں کا میرے جان و مال پر حق ہے مگر دین اور امانت پر نہیں ہے۔"

آپ اپنے اور اپنی رعیت کے درمیان مساوات کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ جب عام الرمادہ کا مشہور قحط پڑا اور لوگ بھوک کا شکار ہوئے تو آپ نے قسم کھالی کہ جب تک لوگ بحال نہ ہو جائیں گے گھی اور گوشت زبان پر نہ رکھیں گے۔ آپ نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ تیل کھاتے کھاتے بدن کی جلد سوکھ کر سیاہ ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد بازار میں گھی کا ایک کپا اور دودھ کا ایک مشکیزہ فروخت ہو رہا تھا تو آپ کا ایک غلام اسے چالیس درہم میں خرید لیا۔ اس نے واپس آکر آپ کو بتایا کہ اب اللہ نے آپ کی قسم پوری کر دی۔ کیونکہ بازار میں گھی کا ایک کپا اور دودھ کا ایک مشکیزہ بکنے کو آیا تھا اور میں نے اُسے آپ کے لیے خرید بھی لیا۔ مگر جب آپ کو دام معلوم ہوئے تو فرمایا کہ بہت گراں خریدا ہے، دونوں چیزیں صدقہ کر دو۔ مجھے اسراف کر کے کھانا پسند نہیں ہے۔ سر جھکا کر تھوڑی دیر سوچتے رہے۔ پھر فرمایا: "جو کچھ رعیت پر گزرتی ہے اگر وہی مجھ پر

نہ گزرے تو مجھے اُن کے مسائل کی صحیح اہمیت کیسے محسوس ہوگی ؟"

آپ کا نظریہ یہ تھا کہ جس چیز سے رعایا محروم ہو اس سے خود کو بھی محروم کر لیں تاکہ اس کے مسائل کا صحیح اندازہ ہو سکے، جیسا کہ آپ نے خود فرمایا۔ دراصل آپ کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ حکومت کی ذمہ داریاں اٹھا لینے کی وجہ سے آپ کو کچھ ایسے امتیازی حقوق بھی مل جاتے ہیں جن سے دوسرے محروم ہیں۔ آپ سمجھتے تھے کہ اگر اس معاملہ میں عدل پر نہیں قائم رہ سکے تو لوگوں کی اطاعت کے مستحق نہیں رہ جائیں گے۔ اس سے پہلے ہم یمنی چادروں کا قصہ بیان کر چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ کس طرح آپ نے خود یہ فرما دیا تھا کہ آپ عدل پر نہ قائم رہ جائیں تو آپ کی اطاعت کی ذمہ داری ساقط ہو جائیگی یہ بات اسلام کے نظامِ حکمرانی کا ایک اہم اُصول واضح کرتی ہے۔ یعنی یہ کہ امام غیر عادل اطاعت کا مستحق نہیں۔ خواہ وہ اللہ ہی کی حاکمیت کا اقرار کرنے والا اور اسی کی شریعت کو نافذ کرنے والا ہو مگر اپنے فیصلوں میں انصاف نہ کرتا ہو۔

آپ کے ذہن میں یہ اسلامی شعور بہت راسخ تھا۔ ہر آن آپ کو اس کا احساس رہتا تھا چنانچہ ایک بار آپ نے ایک آدمی سے ایک گھوڑے کا مول بھاؤ کیا۔ پھر آزما کر دیکھنے کی خاطر اس پر سواری کرنے لگے۔ گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اور زخمی ہو گیا۔ آپ نے چاہا کہ اسے اُس کے مالک کو واپس کر دیں، لیکن اُس نے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ دونوں یہ مقدمہ لے کر قاضی شریح کی عدالت میں گئے۔ انھوں نے دونوں فریق کے دلائل سُننے کے بعد کہا: "امیر المومنین ! جو چیز آپ نے خریدی تھی اُسے لے لیجئے، ورنہ جس حال میں اُسے لیا تھا اُسی حال میں واپس کر دیجئے۔" عمرؓ بول اُٹھے "! اسے کہتے ہیں فیصلہ کرنا !" پھر آپ نے شریح کو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کے بدلے کوفہ کا قاضی بنا دیا۔

جب سیاست و حکمرانی کے باب میں حضرت عمرؓ کا تصور یہ تھا تو اس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ حکمراں کے اعزہ و اقرباء کو رعیت کے دوسرے افراد کے مقابلہ میں کوئی امتیازی مقام حاصل ہو چنانچہ جب آپ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن نے شراب پی تو حد جاری کرنا لازمی ہو گیا۔ اس سلسلہ میں آپ کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ اسی طرح عمروؓ بن العاص کے لڑکے نے ایک مصری پر زیادتی کی تو قصاص ضروری قرار پایا۔ مال کے بارے میں آپ کی پالیسی یہ رہی کہ عمالِ حکومت ہر اس اضافے کے بارے میں جواب دہ قرار پائے جو اُن کے اموال میں منصب پر آنے کے بعد ہوا ہو۔ ایسا اس اندیشہ کے تحت کیا گیا کہ یہ اضافے

مسلمانوں کے مال کو نقصان پہنچا کر یا اپنے منصب سے بے جا فائدہ اٹھا کر تو نہیں کیے گئے۔ یہ سوال کہ "یہ کہاں سے حاصل ہوا؟" وہ بنیادی اصول ہے جس کے تحت آپ نے جب بھی معقول وجوہ پائے اپنے ایک ایک عامل پر گرفت کی۔ چنانچہ والیٔ مصر عمرؓو بن العاص کے مال میں سے اسی اصول کے تحت آدھا حصہ بیت المال میں لے لیا گیا۔ یہی سلوک آپ نے کوفہ میں اپنے والی سعدؓ بن ابی وقاص کے ساتھ برتا۔ اسی طرح آپ نے ابو ہریرہؓ کا مال ضبط کر لیا جو بحرین میں آپ کے والی تھے۔

حضرت عمرؓ کے تصورِ حکمرانی کا خلاصہ یہ ہے کہ رعیت دین کی حدود میں رہتے ہوئے اطاعت وفاداری اور خیر خواہی کرے اور راعی عدل اور بہی خواہی کرے۔ چنانچہ آپ نے اپنی رعایا کے ایک فرد کی اس بات کو بجا تسلیم کیا کہ: "اگر ہم نے تیرے اندر کجی دیکھی تو اسے اپنی تلواروں سے سیدھا کر دیں گے۔" گویا آپ نے یہ اصول تسلیم کیا کہ رعیت کو حاکم کی اصلاح اور درستی کا حق حاصل ہے۔ ایک دن آپ نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "میں نے تم پر اپنے عمّال کا تقرر اس لیے نہیں کیا ہے کہ تمہارے منہ پر طمانچے ماریں، تمہاری عزت و آبرو پر حرف رکھیں اور تمہارے اموال غصب کرتے پھریں۔ میں نے انھیں اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ تمہیں تمہارے رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سُنّت سکھائیں۔ اب اگر کسی شخص پر کوئی عامل ظلم کرتا ہے تو اس کو میری طرف سے اس کی مطلق اجازت نہیں، اس شخص کو چاہیے کہ معاملہ کو میرے سامنے رکھے تاکہ میں اس عامل سے بدلہ لوں۔" اس طرح آپ نے حاکم کے ان حدودِ اختیار کی نشان دہی فرما دی جن سے تجاوز صحیح نہیں۔

حاکم کی ذمّہ داریوں کی گرانباری کا بھی شدید احساس تھا جس کی وجہ سے آپ نے یہ نہیں گوارا کیا کہ خطاب کے خاندان میں سے اس بار کو اٹھانے والے ایک سے دو ہوں۔ چنانچہ آپ نے صاف صاف منع کر دیا کہ آپ کے بیٹے عبد اللہ کو اس کے لیے نہ چنا جائے۔ اگرچہ آپ نے اُنھیں اصحابِ شوریٰ میں شامل رکھا تھا۔ اس موقع پر آپ نے وہ مشہور جُملہ کہا جو آپ کے تصورِ خلافت کی بہت صحیح ترجمانی کرتا ہے:

"ہم کو تمہارے معاملات کی ذمّہ داری اپنے سر لینے کا ذرا بھی شوق نہیں۔ میں نے خود لیے اچھا نہیں پایا کہ اب اپنے خاندان میں سے کسی اور کے لیے اس کی تمنا کروں۔ اگر یہ واقعی خیر ہے تو ہم اس میں سے اپنا حصہ پا چکے، اور اگر یہ شر ہے تو آلِ عمرؓ کے لیے یہی کافی ہے کہ اُن میں

سے ایک آدمی سے محاسبہ ہو۔"

حضرت عثمانؓ کا طرزِ حکمرانی

بے شک حکمرانی کی حقیقت کے بارے میں یہ تصور حضرت عثمانؓ کے عہد میں کچھ بدل گیا تھا' اگرچہ اس تبدیلی کے باوجود دائرۂ اسلام کے اندر ہی تھا۔

خلافت کا بار حضرت عثمانؓ کے سر اس وقت آیا جب آپ کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔ اور ان کی آڑ لیکر مروان بن الحکم بہت سے معاملات میں اسلام سے ہٹی ہوئی روش اختیار کرتا رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرم طبیعت اور اپنے رشتہ داروں سے آپ کی غیر معمولی محبت و شفقت، ان دونوں باتوں کے نتیجہ میں بعض ایسے اقدامات ہو گئے جن کو ان صحابۂ کرام میں سے بہت سے حضرات نے بُرا سمجھا جو آپ کے پاس موجود تھے۔ ان اقدامات کے اثرات مرتب ہوئے اور اُن کے نتائج کو اس فتنہ میں بھی دخل رہا جس سے اسلام کو زبردست صدمہ پہنچا۔

حضرت عثمانؓ نے اپنے داماد حارث بن حکم کو ان کی شادی کے دن بیت المال سے دو لاکھ درہم عطا کیے۔ صبح ہوئی تو مسلمانوں کے خزانچی زید بن ارقم غمگین چہرہ اور اشک آلود آنکھیں لیے آپ کے پاس آئے اور یہ درخواست کی کہ اُن کو اُن کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا جائے۔ جب آپ نے ان سے سبب معلوم کیا اور یہ پتہ چلا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ نے اپنے داماد کو مسلمانوں کے مال میں سے عطیہ دیا ہے تو تعجب کے ساتھ کہا: "ابن ارقم! تم اس بات پر رو رہے ہو کہ میں نے صلۂ رحمی کی؟" روحِ اسلام کا جاندار شعور رکھنے والے اس شخص نے جواب دیا کہ: "نہیں، امیرالمومنین یہ بات نہیں، بلکہ میں اس بات پر رو رہا ہوں کہ ایسا تو نہیں کہ آپ نے یہ مال اس انفاق کے عوض لیا ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کیا کرتے تھے۔ خدا کی قسم آپ اُسے سَو درہم بھی دیتے تو بہت ہوتا۔" حضرت عثمانؓ کو اُس شخص پر غصہ آگیا۔ جس کا ضمیر خلیفۃ المسلمین کے رشتہ داروں کی خاطر مسلمانوں کے مال میں اتنے تصرف کی بھی گنجائش نہیں پاتا تھا۔ انھوں نے زید بن ارقم سے کہا: "ابنِ ارقم! تم کنجیاں رکھ دو ہم کو دوسرا آدمی مل جائے گا۔"

اس طرح کے توسّع کی مثالیں حضرت عثمانؓ کے یہاں بہت ملتی ہیں، آپ نے ایک دن زبیرؓ کو

چھ لاکھ عطا کیا، طلحہؓ کو دو لاکھ دیا اور مروان بن الحکم کو افریقہ کا ۵/۱ خراج عطا کر دیا۔ اس پر صحابہؓ کی ایک جماعت نے جس کے لیڈر حضرت علیؓ تھے آپ پر اعتراض کیا تو آپ نے جواب دیا کہ: "میرے بھی کچھ عزیز اور رشتہ دار ہیں (جن کے ساتھ مجھے حسنِ سلوک کرنا چاہیئے)" لوگوں نے اس جواب کو قابلِ اعتراض قرار دیتے ہوئے سوال کیا: "کیا ابوبکرؓ و عمرؓ کے عزیز اور رشتہ دار نہ تھے؟" آپ کا جواب یہ تھا کہ "ابوبکرؓ اور عمرؓ اپنے رشتہ داروں کو محروم رکھ کر اللہ سے اجر کے متوقع ہوتے تھے اور میں اُن کو عطا یاد دے کر اجر کی توقع کرتا ہوں"۔ اس پر یہ لوگ غصہ ہو کر یہ کہتے ہوئے اُن کے پاس سے اُٹھ کر چلے آئے کہ "خدا کی قسم اگر یہ بات ہے تو اُن دونوں کی روش ہمیں آپ کی روش سے زیادہ محبوب ہے"

مال کے علاوہ منصبِ ولایت کا حال یہ تھا کہ عثمانؓ کے اعزہ پر اس کی بارش ہو رہی ہے۔ انہی لوگوں میں معاویہؓ بھی شامل ہیں جن کی سلطنت میں اضافہ کر کے حضرت عثمانؓ نے فلسطین اور حمص کو بھی شامل کر دیا۔ ان کو چاروں فوجوں کا کمانڈر بنا دیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس بات کے لیے راہ ہموار کر دی کہ مال اور فوجیں جمع کر چکنے کے بعد حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانہ میں سلطنت کے دعویٰ دار بن کر کھڑے ہو سکیں۔ انہی لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رد کردہ حکم بن عاص بھی شامل تھا جس کو حضرت عثمانؓ نے پناہ دی تھی اور جس کے لڑکے مَروان بن الحکم کو اپنا بااختیار وزیر مقرر کیا تھا اور اس کا رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی السرح بھی۔

صحابۂ کرامؓ خطرناک نتائج کے حامل ان اقدامات کو دیکھ کر دوڑ دوڑ کر مدینہ آتے تاکہ اسلامی روایات کو بگڑنے سے اور خلیفۃ المسلمین کو آزمائش سے بچائیں۔ مگر خلیفہ کا حال یہ تھا کہ بڑھاپے اور ضعیف العمری کے سبب مروان پر اُن کا کوئی کنٹرول باقی نہیں رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اندر صحیح اسلامی اسپرٹ کے کارفرما ہونے کا سوال ہے ان پر الزام رکھنا یا شبہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن یہ بات بھی اس سے کچھ کم دشوار نہیں کہ ہم انہیں غلطی سے پاک قرار دیں ــــ غلطی کا سبب ہمارے نزدیک مروان کی وزارت اور حضرت عثمانؓ کا بڑھاپا تھا۔

ایک بار لوگوں نے جمع ہو کر حضرت علیؓ بن ابی طالب کے سر یہ ذمہ داری ڈالی کہ وہ حضرت عثمانؓ کے پاس جا کر ان سے گفتگو کریں۔ آپ اُن کے پاس گئے اور یہ فرمایا:

"میرے پیچھے عوام ہیں جنھوں نے مجھ سے آپ کی بابت گفتگو کی ہے۔ مگر خدا کی قسم

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سے کیا کہوں۔ میں کوئی ایسی بات نہیں جانتا جس سے آپ ناواقف ہوں نہ آپ کو کوئی ایسی بات سمجھا سکتا ہوں جس پر خود آپ کی نظر نہ ہو۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں اُسے آپ بھی جانتے ہیں۔ کسی بات تک ہماری رسائی آپ سے پہلے نہیں ہوئی کہ ہم آپ کو اس سے آگاہ کر سکیں۔ نہ کوئی بات ایسی ہے جس سے صرف ہم ہی واقف ہوں اور اب اُسے آپ تک پہنچائیں۔ کوئی بات ایسی نہیں جو آپ سے چھپا کر صرف ہمیں بتائی گئی ہو۔ آپ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا، اُن کی باتیں سُنیں، اُن کی صحبت میں رہے، اُن سے رشتہ قائم کیا نہ تو ابو قحافہؓ راست روی میں آپ سے بڑھ کر تھے نہ ابن خطابؓ آپ کی بہ نسبت خیر سے زیادہ قریب تھے۔ رحمی قرابت کے اعتبار سے بھی آپ رسولؐ اللہ سے زیادہ قریب ہیں، اور سسرالی رشتہ میں بھی آپ کا حصّہ ان دونوں سے زیادہ ہے۔ کسی معاملہ میں بھی وہ آپ سے آگے نہ تھے۔ لہذا آپ اپنے نفس کے معاملہ میں اللہ سے ڈریے۔ کیونکہ آپ کو نہ تو اندھیرے سے روشنی کی طرف لانے کی ضرورت ہے نہ ناواقفیت سے علم کی طرف۔ صحیح راہ بالکل واضح اور کھلی ہوئی ہے۔ دین کے نشانات اب بھی قائم ہیں۔ عثمانؓ! جان لو کہ اللہ کے نزدیک سب سے افضل بندہ وہ امام عادل ہے جس کو خود بھی ہدایت پر چلنا نصیب ہوا اور اس نے دوسروں کو بھی ہدایت کی راہ دکھلائی۔ کسی معلوم سنّت کو قائم کیا یا کسی قابلِ ترک بدعت کو مٹایا۔ خدا کی قسم! ہر چیز واضح ہے۔ سُنّتیں قائم ہیں، اُن کے پرچم بُلند ہیں۔ اللہ کے نزدیک بدترین آدمی وہ ہے جو خود بھی راہ سے بے راہ ہو اور دوسرے بھی اس کے سبب گمراہ ہوئے۔ کسی جانی پہچانی سنّت کو مٹا دیا اور قابلِ ترک بدعت کو زندہ کر کے رُواج دیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ قیامت کے دن ظلم و جور کرنے والے امام کو اس حال میں لایا جائے گا کہ اُس کا نہ کوئی مددگار ہوگا۔ نہ کوئی عذر سُننے والا۔ چنانچہ وہ جہنّم میں جھونک دیا جائے گا۔[1]

حضرت عثمانؓ نے جواب دیا:

---

[1] طبری نے اس کو ۳۴ھ کے واقعات میں بیان کیا ہے۔

"خدا کی قسم میں خوب جانتا تھا کہ لوگ یہی کچھ کہیں گے جو تم نے کہا۔ سنو! خدا کی قسم، اگر میری جگہ تم ہوتے تو نہ میں تم پر سخت گیری کرتا نہ عیب نکالتا، نہ (ہدفِ طعن بننے کے لیے) اکیلا چھوڑ دیتا۔ میں یہ اعتراض لے کر نہ کھڑا ہوتا کہ تم نے صلہ رحمی کیوں کی؟ کسی حاجت مند کی حاجت روائی کیوں کی؟ کیوں کسی خستہ حال بے گھر کو ٹھکانا دیا؟ اور کیوں ایسے لوگوں کو ولایت کا منصب دیا جس قسم کے لوگوں کو عمرؓ بھی یہ منصب دیا کرتے تھے؟ علیؓ! میں تمہیں خدا کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں، کیا تم نہیں جانتے کہ مغیرہؓ بن شعبہ اس منصب پر فائز ہے؟"

انھوں نے کہا: "ہاں (خوب جانتا ہوں)"

عثمانؓ: "جانتے ہو نا کہ اسے عمرؓ نے والی بنایا تھا؟"

علیؓ: "ہاں"

عثمانؓ: "پھر اگر میں نے رشتہ داری اور قرابت کی وجہ سے ابن عامر کو والی بنایا تو تم اس پر مجھے کیوں ملامت کرتے ہو؟"

علیؓ: "میں آپ کو بتاتا ہوں کہ حقیقتِ حال کیا ہے۔ عمرؓ جس کو والی بناتے تھے اُن کا جوتا اس کے سر پر ہوتا تھا، اس کے خلاف ایک حرف بھی اُن تک پہنچتا تو اُسے فوراً حاضر ہونے کا حکم دیتے اور پھر معاملہ کو آخری حد تک پہنچا کر دم لیتے۔ یہی چیز ہے جو آپ نہیں کرتے۔ آپ خود کمزور پڑ گئے اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نرمی برتنے لگے۔"

عثمانؓ: "اور تمہارے قرابت داروں کے ساتھ بھی تو!"

علیؓ: "بلاشبہ اُن کا مجھ سے قریبی رشتہ ہے لیکن دُوسرے اُن سے افضل ہیں۔"

عثمانؓ: "تم جانتے ہو کہ عمرؓ نے اپنی خلافت کے پورے عرصہ میں معاویہؓ کو والی بنائے رکھا۔ پھر میں نے بھی انھیں والی برقرار رکھا۔"

علیؓ: "میں آپ کو خدا کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں نا کہ معاویہؓ عمرؓ سے اس سے زیادہ ڈرتے تھے جتنا عمرؓ کا غلام یرفاء اُن سے ڈرتا تھا۔؟"

عثمانؓ: "ہاں۔"

علیؓ: "اب صورتِ حال یہ ہے کہ معاویہؓ آپ سے رائے لیے بغیر فیصلے کرتے رہتے ہیں اور آپ کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ وہ لوگوں سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ یہ عثمانؓ کا حکم ہے۔ یہ بات آپ تک پہنچتی ہے مگر آپ معاویہؓ کی تردید نہیں کرتے۔"

بالآخر حضرت عثمانؓ کے خلاف ایک فتنہ اٹھ کھڑا ہوا جس میں حق و باطل اور خیر و شر دونوں کی آمیزش تھی۔ لیکن اسلامی زاویۂ نگاہ سے واقعات کا مطالعہ کرنے اور اسلامی اسپرٹ کی روشنی میں مسائل و معاملات کو سمجھنے والوں کے لیے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ شورش عمومی اعتبار سے اسلامی اسپرٹ کا ایک احتجاج تھی۔ یہ رائے ظاہر کرتے وقت ہم اس حقیقت سے غافل نہیں کہ اس شورش کے پیچھے ابن سبا یہودی کی سازش کام کر رہی تھی۔ اُس پر اللہ کی لعنت ہو۔

حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ کے حق میں ہم یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ خلافت کا بار اُن پر آخر عمر میں پڑا جب کہ اموی گروہ کے لوگ ان کو گھیرے ہوئے تھے اور خود اُن کی عمر اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ اُن کی پوزیشن بعینہٖ وہ تھی جو اُن کے رفیق حضرت علیؓ بن ابی طالب نے بیان کی ہے کہ "اگر میں اپنے گھر میں بیٹھ رہوں تو وہ کہیں گے کہ تو نے مجھے، میرے رشتہ کو اور میرے حقوق کو فراموش کر دیا اور اگر میں اُن سے گفتگو کرتا ہوں تو وہ کرتے وہی ہیں جو خود چاہتے ہیں۔ مروان اُن سے جو چاہتا ہے کراتا رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھانے اور بوڑھے ہو چکنے کے بعد اب وہ پوری طرح اس کے قابو میں چلے گئے ہیں، جدھر چاہے انھیں لے جاتا ہے۔"

خلیفۂ ثالث کے بڑھاپے کے زمانے میں اس اُبھرتے ہوئے دین کے اموی گروہ کے ہاتھ میں چلے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عملی روایات کو اس کی نظری تعلیمات کی بنیاد پر قائم رہنے کا مزید موقع اور طویل تر عرصہ نہ میسّر آ سکا۔

آپ کے طویل عرصۂ خلافت کے نتیجہ میں اموی گروہ کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ اور انھیں شام اور دوسرے ممالک میں قدم جما لینے کا موقع مل گیا۔ مزید برآں (جیسا کہ آئندہ بیان کیا جائے گا) حضرت عثمانؓ کی پالیسی کے نتیجہ میں دولت کا تمرکز بڑھ گیا اور آپ کے خلاف شورش نے اُمّتِ اسلامیہ کی بنیادوں کو بالکل ابتدائی دور ہی میں ہلا کر رکھ دیا۔

اس عرصے کی تاریخ اور اس کے حالات اس دین کی جن خوبیوں پر گواہ ہیں ان کے ساتھ ہی وہ زندگی

اور حکومت نیز حکمرانوں اور رعایا کے حقوق کے بارے میں انسانوں کے تصورات میں ایک زبردست انقلاب کا پتہ دیتے ہیں۔ البتہ جو فتنہ رونما ہوا اس کی خطرناکی اور اُس کے دوررس اثرات کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔

حضرت عثمانؓ کے بعد

حضرت عثمانؓ اپنے پروردگار کی آغوشِ رحمت میں جا بسے۔ وہ گئے تو اموی سلطنت عملاً قائم ہو چکی تھی۔ اور اس کے اسباب خود انھوں نے فراہم کیے تھے۔ ساری مملکت بالخصوص شام میں ان کو قدم جمانے کا موقع دیا۔ آپ نے بنو اُمیہ کے اپنے اصولوں کو جو اسلامی روح کے منافی تھے۔ مثلاً غنیمت، منافع اور دوسری طرح کے اموال کو اپنی ذات کے لیے مخصوص کر لینا، بھائی چارہ، ایثار اور کفالت باہمی سے لاپرواہی برتنا وغیرہ...... کارفرما ہونے کا موقع دیا۔ اس چیز نے ملّت اسلامیہ کے اندر دینی رُوح کو بہت کمزور کر دیا۔ وہ جذبات بھی کم اہم نہیں جو رعیّت کے دل میں کبھی بجا طور پر اور کبھی بے جا طور پر ان باتوں کے ردِّ عمل میں پیدا ہوئے کہ خلیفہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ترجیحی سلوک روا رکھتا ہے، انھیں لاکھوں کی رقمیں انعام میں دیتا ہے، رسولؐ اللہ کے دشمنوں کو والی مقرر کرنے کے لیے آپؐ کے صحابیوں کو معزول کر دیتا ہے، اور ابو ذرؓ جیسے لوگوں پر صرف اس لیے سختی کرتا ہے کہ وہ مال کو جمع کر کے خزانوں میں رکھنے اور اس عیش پرستی کی مخالفت کرتے تھے جس میں اہل ثروت ڈوبے ہوئے تھے۔ ابو ذرؓ نے اس انفاق، حسنِ سلوک اور پاک بازی کی دعوت بلند کی جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی تھی۔ اس قسم کے جذبات جب عام ہو جاتے ہیں تو ان کا قدرتی نتیجہ صحیح یا غلط، بہر حال یہی ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کے اندر بغاوت کا مادّہ اُبھرنے لگے اور کچھ کے اندر انحطاط پیدا ہو جائے۔ جن لوگوں کے دلوں میں دین کی روح گھر کر چکی ہوتی ہے وہ اِن باتوں پر خاموشی کو گناہ سمجھنے لگتے ہیں اور اُن کے خلاف جذبات اُن کو بغاوت پر اُبھارتے ہیں، اور جن لوگوں نے اسلام کو محض ایک لبادہ کے طور پر اُوڑھ رکھا ہوتا ہے، جن کو دنیا کی ہوس اپنے پیچھے دوڑاتی رہتی ہے، جو ہر وقت ہوا کے رُخ کے ساتھ اپنا رُخ بدلنے کے لیے تیار رہتے ہیں، اُن کے مزاج بگڑ جاتے ہیں اور بدعنوانیوں کی طرف جھک جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت کے آخری زمانہ میں پیش آیا تھا۔

جب حضرت علیؓ مسندِ خلافت پر آئے تو اصلاحِ حال کوئی آسان کام نہ رہ گیا تھا۔ عثمانؓ کے

عہد میں جن لوگوں نے نفع اندوزیاں کی تھیں، خاص کر بنو اُمیہ نے اچھی طرح یہ جان لیا تھا کہ علی رضؓ اُن کے معاملہ میں چپکے نہ بیٹھیں گے۔ اپنے مصالح کے تحت وہ قدرتی طور پر معاویہؓ کی طرف مائل ہو گئے۔

علیؓ یہ مشن لے کر اُٹھے کہ حکام اور عامتہ النّاس کو ایک بار پھر اسلام کے اصل تصورِ حکمرانی کا حامل بنائیں۔ آپ کا حال یہ تھا کہ آپ کی بیویؓ اپنے ہاتھوں سے جو پیستی تھیں اور وہی آپ کی غذا تھی۔ ایک بار جَو کی ایک بوری پر مہر کر رہے تھے، فرمایا: "میں اپنے پیٹ میں صرف وہی چیز داخل کرنا پسند کرتا ہوں جسے مَیں جانتا ہوں کہ حلال و طیب ہے۔" کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ کو کپڑا اور کھانا خریدنے کے لیے اپنی تلوار فروخت کردینی پڑی۔ کوفہ میں قصرِ ابیض میں قیام کرنا پسند نہیں فرمایا بلکہ اِن جھونپڑوں کو ترجیح دی جن میں غریب لوگ رہا کرتے تھے۔ آپ کی طرزِ معیشت کا اندازہ اس روایت سے ہو سکتا ہے جو آپ کی بابت نضر بن منصور نے عقبہ بن علقمہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کی ہے۔ کہا ہے: "میں علی علیہ السلام کے پاس گیا تو اُن کے سامنے کھٹا دودھ جس کی بُو سے مجھے تکلیف ہو رہی تھی اور روٹی کا سوکھا ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا: امیرالمومنین! کیا آپ ایسی چیزیں کھاتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا: ابوالجنوب! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زیادہ روکھا سُوکھا کھاتے اور اس سے موٹا کپڑا پہنتے تھے (آپ نے اپنے لباس کی طرف اشارہ کیا) اگر مَیں اُن کی روش پر نہ چلوں تو اندیشہ ہے کہ اُن کا ساتھ نہ نصیب ہو۔" اسی طرح ہارون بن عنزہ نے اپنے باپ سے آپ کے بارے میں روایت کی ہے کہ: "میں خورنق میں علیؓ کے پاس گیا۔ جاڑے کا موسم تھا اور اُن کے بدن پر صرف ایک پھٹا پُرانا قطیفہ (مخملی لبادہ) تھا، جس میں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا: امیرالمومنین! اللہ نے آپ اور آپ کے گھر والوں کے لیے اس مال میں کچھ حق مقرر کیا ہے اور آپ اپنے ساتھ یہ برتاؤ کر رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: واللہ میں تمہارا کوئی نقصان نہیں کروں گا، یہ میرا وہی قطیفہ ہے۔ جسے میں مدینہ سے لایا تھا۔"

ایسا نہیں تھا کہ حضرت علیؓ اپنے اور اپنے گھر والوں کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے وقت اِس حقیقت سے ناآشنا رہے ہوں کہ دین اس سے بہت زیادہ کی اجازت دیتا ہے۔ وہ یہ ضروری نہیں قرار دیتا کہ اپنے کو ہر طرح کی آسائش سے محروم رکھ کر رُوکھے سُوکھے اور موٹے جھوٹے پر قناعت کرتے ہوتے ایک زاہدانہ زندگی گزار دی جائے۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت بھی مسلمانوں کے

ایک عام فرد کی حیثیت میں بیت المال سے ان کا حصہ اس سے کئی گنا زیادہ تھا جو وہ لے رہے تھے۔ نیز یہ بھی کہ بحیثیت ایک حاکم کے جو عوام کی خدمت کے لیے وقف ہو اُن کا حصہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ وہ چاہتے تو اتنا لے سکتے تھے جتنا کہ عمرؓ نے بعض ممالک کے والیوں کے لیے مقرر کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے جب عمارؓ بن یاسر کو کوفہ کا والی بنایا تو اُن کے اور اُن کے معاونین کے لیے چھ سو درہم ماہانہ مقرر کیے۔ عام افراد کی طرح جو عطاء ان کے حصہ میں آتی تھی وہ علیحدہ، نیز روزآنہ آدھی بکری اور آدھی بوری آٹا دیا جاتا تھا۔ اِس طرح آپ نے عبدؓ اللہ بن مسعود کو کوفہ میں لوگوں کی تعلیم اور بیت المال کی نگرانی پر مامور کیا تو سو درہم ماہانہ اور چوتھائی بکری روزانہ مقرر کیا۔ عثمان بنِ حنیف کے لیے اس سالانہ عطاء کے علاوہ جو پانچ ہزار درہم کے بقدر تھی، چوتھائی بکری روزانہ اور ڈیڑھ سو درہم ماہانہ مقرر کیا۔

علیؓ نے اپنے ساتھ جو کچھ کیا وہ اِن باتوں سے ناواقف رہتے ہوئے نہیں کیا۔ دراصل وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ حاکم نمونہ بنتا ہے، اور اس پر شک کی بھی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ چوں کہ خزانۂ عام اس کے تحت ہوتا ہے لہذا اس پر اس میں خرد برد کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے والیوں اور عام رعایا کے لیے احتیاط و پرہیز گاری میں نمونہ بنتا ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے نفس کو ابوبکرؓ اور عمرؓ کی عزیمتوں کا پابند بنایا۔ جو لوگ اللہ کے دین پر رسولؐ اللہ کے نائب مقرر ہوئے تھے ان کے لیے یہ اونچا معیار ہی موزوں تھا۔

حضرت علیؓ اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ نظامِ حکومت کو دوبارہ اُس سانچہ میں ڈھالیں جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد آنے والے دونوں خلفاء نے اُسے ڈھالا تھا۔ انھوں نے اپنی زرہ ایک عیسائی کے پاس پائی۔ اسے لے کر اپنے قاضی شریح کے پاس گئے اور رعایا کے ایک عام فرد کی طرح اس کے خلاف ایک مقدمہ پیش کیا۔ فرمایا: "یہ زرہ میری ہے اور میں نے نہ اُسے فروخت کیا ہے نہ ہبہ کیا ہے"۔ شریح نے عیسائی سے دریافت کیا کہ امیرالمومنین جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی بابت تمہیں کیا کہنا ہے؟ اس عیسائی نے کہا: "زرہ تو یقیناً میری ہے مگر امیرالمومنین بھی میرے نزدیک جھوٹے آدمی نہیں ہیں۔ شریح نے علیؓ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: "امیرالمومنین! کوئی ثبوت ہے؟" حضرت علی ہنس دیئے اور فرمایا: "شریح نے ٹھیک کہا، میرے پاس ثبوت تو ہے نہیں"۔

چنانچہ قاضی نے یہ فیصلہ کیا کہ زرہ عیسائی کو دے دی جائے۔ وہ اسے لیکر جانے لگا اور "امیرالمومنین" اسے دیکھتے رہے۔ چند قدم جاکر وہ عیسائی واپس آیا۔ اور کہنے لگا: "میں تو اب یہ گواہی دیتا ہوں کہ یہ انبیاء کے احکام ہیں۔ امیرالمومنین مجھے اپنے قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ اُن کے خلاف فیصلہ دیتا ہے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ امیرالمومنین! خدا کی قسم یہ زرہ آپ کی ہے۔ جب آپ نے صفین کی طرف کوچ کیا تو میں لشکر کے پیچھے ہو لیا۔ یہ زرہ آپ کے بادامی رنگ والے اونٹ پر سے نکلی ہے۔" حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جب تم ایمان لے آئے تو اب یہ تمہاری ہے۔[1]

آپ نے جو دستور مقرر کیا تھا وہ وہی تھا جسے آپ نے بیعت کے بعد اپنے خطبہ میں بیان کیا تھا:

"لوگو! میں تم ہی میں کا ایک آدمی ہوں۔ جو حقوق تمہارے لیے ہیں وہی میرے لیے بھی ہیں اور جو ذمہ داریاں تم پر عاید ہوتی ہیں وہ مجھ پر بھی عاید ہوتی ہیں۔ میں تمہیں تمہارے نبی کے طریقہ پر چلاؤں گا اور مجھے جن باتوں کے نفاذ کا حکم دیا ہے انھیں تم پر نافذ کروں گا۔ سُن لو! عثمانؓ نے جتنی جاگیریں عطا کی ہیں اور اللہ کے مال میں سے جتنا مال بھی لوگوں کو انعام واکرام کے طور پر دیا ہے وہ بیت المال میں واپس لایا جائے گا کیونکہ حقیقت کو کوئی چیز نہیں بدل سکتی اگر میں نے یہ دیکھا کہ اس مال کے ذریعہ عورتوں سے شادی کی جاچکی ہے یا لونڈیاں خریدی جاچکی ہیں یا اس مال کو مختلف ملکوں میں پھیلایا جاچکا ہے تو بھی میں اُسے واپس لاؤں گا۔ کیونکہ عدل میں بڑی وسعت ہے اور جس کے لیے حق تنگ ثابت ہوا اس کے لیے ظلم وجور اور زیادہ تنگ ہوگا۔"

"لوگو! آگاہ رہو، ایسا نہ ہو کہ کل کو تم میں سے وہ لوگ جن پر دنیا چھاگئی اور وہ عمارتوں کے مالک بنے، جن لوگوں نے نہریں نکالیں، گھوڑوں پر سواری کی، غلام چھوکروں کو خدمت گار بنایا، انھیں جب میں اس عیش وعشرت سے محروم کردوں اور اُن کے اصل حقوق کی حدوں میں واپس لاؤں تو وہ کہنے لگیں کہ ابن ابی طالب نے ہمیں ہمارے حقوق سے محروم کردیا۔ سُنو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی مہاجرین وانصار میں سے جو کوئی بھی یہ سمجھتا ہے کہ صحبتِ رسولؐ کی

---

[1] عبقریۃ الامام۔ استاذ عباس محمود عقاد۔

وجہ سے اس کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہے وہ جان لے کہ یہ فضیلت کل کو اللہ کے حضور کام آئے گی اور وہی اس کا اجر و ثواب عطا کرے گا۔ آگاہ رہو کہ جس شخص نے بھی خدا اور اس کے رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہی، ہماری ملّت کی تصدیق کی، ہمارے دین میں داخل ہوا، اور ہمارے قبلے کی طرف رُخ کیا۔ وہ اسلام کے دیے ہوئے حقوق کا مستحق اور اس کے مقرر کردہ حدود کا پابند ہوگیا۔ تم سب اللہ کے بندے ہو، اور یہ مال اللہ کا مال ہے، یہ تمہارے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا۔ اس کے سلسلہ میں کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ متقی لوگوں کے لیے اللہ کے پاس بہترین جزا ہے۔"

یہ بات بالکل قدرتی تھی کہ نفع اندوز لوگ حضرت علیؓ سے خوش نہ رہیں اور مساوات کے قانون سے ان لوگوں کو تشفی نہ ہو جو امتیازی سلوک کے عادی اور خود کو دوسروں پر ترجیح دینے کے خوگر ہو چکے تھے، یہ لوگ بالآخر دوسرے کیمپ سے جا ملے۔ یہ اُمیّہ کا کیمپ تھا۔ جہاں انھیں اس حق و انصاف کو پامال کر کے اپنی اغراض پوری کرنے کا موقع مل سکتا تھا جس پر علی رضی اللہ عنہ کو اتنا اصرار تھا۔

جن لوگوں کو معاویہؓ کے اندر ایسی ڈپلومیسی، ہوشیاری اور مہارت نظر آتی ہے جو علیؓ کے اندر نہیں پائی جاتی، اور جو اس بات کو معاویہؓ کے بالآخر فتحیاب ہونے کی اصل وجہ قرار دیتے ہیں۔ وہ حالات کا مطالعہ کرنے میں غلطی کرتے ہیں اور حضرت علیؓ کی حقیقی قدر اور اُن کے اصل فرض کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے۔ حضرت علیؓ کا پہلا اور آخری فریضہ یہ تھا کہ اسلامی روایات کو اُن کی حقیقی قوت واپس دلائیں اور دین میں اس کی اصل روح دوبارہ پھونکیں۔ اس میل کچیل سے اس روح کو پاک کریں جو عثمانؓ کے بڑھاپے اور کمزوری کے زمانہ میں اُمیّہ کے ہاتھوں اُس میں آ گیا تھا۔

اس معرکہ میں اگر وہ معاویہؓ کے طور و طریق اختیار کرتے تو اُن کا مشن ہی ناکام رہتا اور اس دین میں فی نفسہٖ اس بات کو کوئی قیمت حاصل نہ ہوتی کہ انھوں نے خلافت کی جنگ اپنے لیے جیت لی۔ علیؓ یا تو علیؓ باقی رہیں یا خلافت اُن کے پاس سے چلی جائے، بلکہ اس کے ساتھ ان کی جان بھی چلی جائے تو کیا پروا۔ یہ وہ صحیح فہم تھا جو اُن کے ذہن سے ایک لمحہ کے لیے بھی غائب نہیں ہوا۔ کرم اللہ وجہہٗ۔ ایک روایت کے مطابق ـــــ بشرطیکہ یہ روایت صحیح ہو ـــــ آپ نے فرمایا: "خدا کی قسم معاویہؓ مجھ سے زیادہ چالاک نہیں، مگر وہ دھوکے دیتے ہیں اور کھلی کھلی نافرمانیاں کرتے ہیں۔ اگر دھوکہ دہی ناپسند نہ ہوتی تو میں سب سے

زیادہ چالاک ہونا:

علیؓ اپنے رب کو پیارے ہوئے اور بنو اُمیہ کا دور آیا۔ اگر اُمیہ کے آگے عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایمان، اُن کی پرہیزگاری اور اُن کی رقیق القلبی ایک روک بن کر کھڑی تھی تو اب یہ دیوار ڈھ گئی اور انحراف کی راہ کھل گئی۔

اس کے بعد بھی اسلام زمین پر پھیلتا رہا مگر اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ اس کی روح ٹھٹھر کر رہ گئی اگر خود اس دین کے مزاج میں ایک قوت نہ پوشیدہ ہوتی اور اس کی روحانی طاقت میں فیض رسانی کی بے پناہ صلاحیت نہ ہوتی تو اُمیہ کا دور اس کو اس کی اصل راہ سے ہٹا دینے کے لیے کافی تھا۔ مگر اس کی روح مقابلہ کرتی رہی اور قوت پکڑتی رہی، اور آج بھی اس میں کشمکش اور فتحیابی کی مخفی قوت باقی ہے۔

اُمیہ کے زمانہ سے مسلمانوں کے بیت المال کے حدود بہت وسیع ہوگئے۔ اور وہ بادشاہوں، اُن کے خوشامدیوں اور حاشیہ نشینوں کے لیے مالِ غنیمت بن کر رہ گیا۔ اسلامی عدل کی بُنیادیں منہدم ہوگئیں حکمراں طبقہ مخصوص امتیازات کا مالک بن بیٹھا: اُن کے متوسلین کو منافع ملنے لگے۔ اور اس کے حاشیہ نشینوں کو نذرانے۔ غرض یہ کہ خلافت بادشاہت اور وہ بھی جابر بادشاہت میں بدل گئی، جیسا کہ اس کی بابت صفائے روحانی کے ایک دُور رس لمحہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

اب ہم خوشامدیوں، گویوں اور لہو و لعب کرنے والوں کو انعام و اکرام دینے کی خبریں سُننے لگے۔ چنانچہ ایک اُموی بادشاہ نے معبد کو بارہ ہزار دینار دیے اور ایک عباسی بادشاہ ہارون الرشید نے اسمٰعیل بن جامع نامی مغنی کو محض ایک راگ پر چار ہزار دینار عطا کیے اور ساتھ ہی ایک عمدہ سازو سامان اور نقش و نگار والا مکان بھی دیا۔ حالات کا بہاؤ اسی رُخ پر جاری رہا کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے یہ دھارا رُکتا اور پھر بہنے لگتا۔

عمرؒ بن عبد العزیز

اب عمرؒ بن عبد العزیز کے عہد کا ذکر ضروری ہے۔ یہ عہد عہدِ خلافت کا بقیہ تھا۔ یہ ایسی تیز روشنی تھی جس نے پورا راستہ روشن کر دیا۔ آپ نے اپنے عہد کا افتتاح غصب کردہ حکومت کو اس کے اوّلین حقدار یعنی اُمتِ اسلامیہ کو واپس کر کے کیا۔ کیونکہ ضروری ہے کہ اُمتِ اسلامیہ آزادانہ طور پر راضی خوشی اپنا

امام منتخب کرے نہ کہ فوج کی طاقت یا وراثت کے ذریعہ۔ آپ منبر پر آئے اور یہ فرمایا:

"لوگو! مجھے اس ذمہ داری کی آزمائش میں میری رائے لیے بغیر، بلا طلب اور بغیر مسلمانوں سے مشورہ کیے ہوئے مبتلا کر دیا گیا۔ میری بیعت کا جو قلادہ تمہاری گردنوں میں پڑا ہوا ہے اُسے میں خود الگ کرتا ہوں اور تم خود کسی کا انتخاب کر لو"

لوگ پکار اُٹھے: امیرالمومنین! ہم آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں۔ آپ کی امارت پر ہم سب راضی ہیں۔ اللہ آپ کی امارت کو مبارک کرے۔ آپ صاحبِ امر رہیئے۔ اس طرح آپ نے امارت کے معاملہ میں اصل طریقہ کو پھر سے جاری کیا۔ کیوں کہ بغیر مشورے اور رضامندی کے امارت نہیں منعقد ہوسکتی۔

پھر آپ نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"لوگو! مجھ سے پہلے کچھ حکمراں ایسے گذرے ہیں جن کی محبت کو تم نے صرف اس لیے نباہا کہ اس ظلم کو دفع کر سکو جو بصورتِ دیگر وہ تم پر کرتے۔ آگاہ رہو کہ جب خالق کی نافرمانی ہو رہی ہو تو مخلوق کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے۔ جس نے خود اللہ کی اطاعت کی اس کی اطاعت کرنا واجب ہو گیا۔ مگر جس نے اللہ کی نافرمانی کی اس کی اطاعت نہیں کی جانی چاہیے۔ جب تک میں تمہارے معاملہ میں اللہ کی اطاعت کرتا رہوں تم بھی میری اطاعت کرتے رہو مگر جب میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں"

عنانِ اقتدار سنبھالتے ہی اُنھوں نے ظلماً لی ہوئی املاک کی واپسی کی طرف توجہ کی۔ اُس کی ابتدا خود اپنی ذات سے کی۔ فرمایا: مناسب ہے کہ اپنے سے پہلے کسی اور سے اس کی ابتدا نہ کروں۔ چنانچہ آپ نے اپنے تحت جو آراضی اور دوسرے سامان تھے ان کا جائزہ لیا تو سب کے سب آپ کے قبضہ سے نکل گئے۔ یہاں تک کہ ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی۔ اس کے نگ کو دیکھا تو فرمایا: اسے ولید نے مغربی علاقوں سے آنے والے اموال میں سے بغیر کسی حق کے مجھے دے دیا تھا۔ چنانچہ اُسے واپس کر دیا۔ آپ کے پاس جتنی جاگیریں تھیں وہ سب آپ نے واپس کر دیں۔ آپ کے پاس یمامہ میں چند جاگیریں، یمن میں مکیدس اور جبل الورس اور فدک تھے، ان سب کو آپ نے چھوڑ دیا اور مسلمانوں کو واپس کر دیا۔ صرف سویدا میں ایک چشمہ کو اپنے پاس باقی رکھا جسے آپ نے اپنی عطاء کی رقم سے کھدوایا تھا۔ اس کے منافع ہر سال آپ کے پاس آتے رہتے تھے جو کم و بیش ڈیڑھ سو دینار تھے۔

جب آپ نے طے کر لیا کہ آپ کے پاس جو کچھ ہے اُسے واپس کر دیں گے تو حکم دیا اور لوگوں میں منادی کر دی گئی کہ "الصلاۃ جامعۃ" آپ منبر پر تشریف لائے، اللہ کی حمد و ثنا بیان کی، پھر فرمایا:

"امابعد! ان لوگوں نے ہمیں ایسی چیزیں عطا کی تھیں جن کا لینا ہمارے لیے چنداں مناسب نہ تھا، نہ ہی اُن کا دینا مناسب تھا۔ یہ اموال میرے قبضہ میں آ چکے تھے اور اللہ کے سوا کوئی مجھ سے اُن کا محاسبہ کرنے والا نہ تھا۔ آگاہ رہو کہ میں نے اس طرح کے سارے عطایا کی واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کی ابتدا میں اپنی ذات اور اپنے گھر والوں سے کرتا ہوں۔

مزاحم! تم پڑھنا شروع کر دو۔"

اس سے قبل ایک تھیلی حاضر کی جا چکی تھی جس میں متعلقہ کاغذات تھے۔ مزاحم نے ایک تحریر پڑھنا شروع کی۔ پھر عمرؒ اسے لے لیتے۔ ان کے ہاتھ میں ایک قینچی تھی جس سے وہ اُسے تراشتے جاتے یہاں تک کہ ایک کاغذ بھی ایسا نہ بچا جسے آپ نے چاک نہ کر ڈالا ہو۔ اس کے بعد اپنی بیوی فاطمہ بنت عبد الملک بن مروان کا معاملہ ہاتھ میں لیا۔ ان کے پاس ایک نادر ہیرا تھا جو ان کو ان کے باپ نے دلوایا تھا۔ آپ نے اُن سے کہا: "تم اپنا زیور بیت المال میں واپس کر دو، ورنہ مجھے اپنے سے جدا ہو جانے کی اجازت دو، دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو۔ مجھے یہ بات گوارا نہیں کہ میں اور وہ ایک گھر میں رہیں۔" انھوں نے کہا: "امیرالمومنین! میں آپ کا انتخاب کرتی ہوں۔ اس ایک ہیرے کی کیا حقیقت اس سے کئی گنا زیور ہوتا تو بھی میں آپ ہی کو ترجیح دیتی۔" چنانچہ آپ کے حکم سے اسے بیت المال میں داخل کر دیا گیا۔ جب عمرؒ کا انتقال ہو گیا اور یزید بن عبد الملک خلیفہ ہوا تو اُس نے اپنی بہن فاطمہ سے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں وہ ہیرا تمہیں واپس کر دوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نہیں چاہتی عمرؒ کی زندگی میں تو میں نے اُسے خوشی خوشی دے دیا اور اب ان کی وفات کے بعد اُسے واپس لے لوں، خدا کی قسم ایسا نہیں ہوگا۔ جب اُس نے یہ اصرار دیکھا تو اُسے ان کے گھر والوں اور بچوں میں تقسیم کر دیا۔

عمرؒ نے صرف یہی نہیں کیا کہ اپنے پاس جتنا ناحق مال تھا وہ واپس کر دیا بلکہ مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ بیت المال سے اپنے لیے کچھ بھی نہ لیتے تھے اور فئ کے مال میں سے اپنی ذات پر ایک درہم بھی نہیں خرچ کرتے تھے، حالانکہ عمرؓ بن الخطاب نے اس میں سے اپنے لیے دو درہم روزانہ مقرر کیا تھا۔ چنانچہ عمرؒ بن عبد العزیز سے کہا گیا کہ آپ اتنا ہی لے لیا کریں جتنا عمرؓ لیتے تھے تو بھی مناسب ہوتا۔ مگر انھوں نے

کہاکہ: "عمرؓ بن الخطاب کے پاس ذاتی مال کچھ نہیں تھا اور میرا حال یہ ہے کہ میرا ذاتی مال ہی میرے لیے کافی ہو جاتا ہے۔"

آپ نے بنی مروان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ان کے پاس جو اموال ناحق انھیں ان کے اصل مالکوں کو واپس کر دیں۔ روایت ہے کہ حمص کا ایک ذمی آیا اور اس نے کہا: امیرالمومنین! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیں۔ آپ نے کہا کس معاملہ میں؟ اس نے بتایا کہ عباس بن ولید بن عبدالملک نے میری زمین غصب کرلی ہے۔ عباس وہیں پر بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے اس سے کہا، عباس کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا: "یہ زمین مجھے امیرالمومنین ولید بن عبدالملک نے دی تھی، انھوں نے اس بارے میں مجھے ایک تحریر لکھ دی ہے۔" آپ نے پوچھا: "ذمی! اب تم کیا کہتے ہو۔؟" اس نے کہا: ـــــ "امیرالمومنین! میں آپ سے کتاب اللہ عزّ وجل کے مطابق فیصلہ کا مطالبہ کرتا ہوں۔" عمرؒ نے کہا: "ہاں! ولید بن عبدالملک کی تحریر کے مقابلہ میں اللہ کا فرمان زیادہ واجب العمل ہے۔ عباس! تم اس کو اس کی چیز واپس کر دو۔" چنانچہ انھوں نے وہ زمین اسے واپس کر دی۔

ولید بن عبدالملک کا ایک لڑکا تھا جس کا نام رَوح تھا۔ اس نے بادیہ میں پرورش پائی تھی اور بالکل اعرابی معلوم ہوتا تھا۔ کچھ لوگ عمرؒ کے پاس حمص میں واقع چند دوکانوں کی بابت مقدمہ لے کر آئے۔ یہ دوکانیں دراصل ان لوگوں کی تھیں مگر رَوح کے باپ وَلید نے اُس کے نام لکھدی تھیں۔ عمرؒ نے اس سے کہاکہ ان کی دوکانیں واپس کردو۔ رَوح نے جواب دیاکہ دوکانیں وَلید کی دستاویز کے مطابق میری ملکیت ہیں۔ آپ نے جواب دیاکہ "ولید کی دستاویز تمہارے کام نہیں آئے گی دوکانیں ان لوگوں کی ہیں، اس بات پر ثبوت فراہم ہوچکا ہے۔ اب تم ان کی دوکانیں اُن کے حوالے کردو۔" پھر رَوح اور حمص کا ایک آدمی اُٹھ کر وہاں سے واپس آنے لگے۔ راستہ میں رَوح نے حمصی کو دھمکی دی۔ وہ لوٹ کر عمرؒ کے پاس آیا اور کہاکہ: "امیرالمومنین! خدا کی قسم وہ مجھے دھمکی دے رہا ہے" عمرؒ نے کعب بن حامد سے جو ان کے محافظ دستوں کے سالار تھے حکم دیاکہ رَوح کے پاس جاؤ، اگر وہ دوکانیں اس کے حوالے کردے تو خیر ورنہ اس کا سر کاٹ کر میرے پاس لاؤ۔ یہ بات سُن کر رَوح کا ایک بہی خواہ دربار سے باہر آیا اور رَوح کو عمرؒ کے حکم سے باخبر کردیا۔ رَوح کے ہوش اُڑ گئے۔ کعب اس کے پاس اس حال میں گئے کہ تلوار کو ایک بالشت کے بقدر نیام سے باہر کھینچ چکے تھے۔ انھوں نے اس سے کہاکہ چلو اور دوکانیں

خالی کردو۔ اس نے کہا: ہاں۔ اور جاکر ان کی دوکانیں خالی کرکے ان کے حوالہ کردیں۔

لوگ پے درپے اُن کے سامنے ظلم و غصب کے معاملات پیش کرتے رہے۔ ظلماً لی ہوئی املاک سے متعلق کوئی معاملہ ایسا نہ تھا جس کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہو اور آپ نے جائداد واپس نہ دلوائی ہو۔ خواہ وہ آپ کے قبضہ میں رہی ہو یا کسی دوسرے کے قبضہ میں۔ آپ نے بنی مروان وغیرہ سے وہ سارے اموال واپس لے لیے جو ظلم و جور کے ذریعہ ان کو منتقل ہوئے تھے۔ آپ بغیر قطعی ثبوت کے بھی ان مظالم کی تلافی کردیتے۔ اس سلسلہ میں آپ معمولی ثبوت کو بھی کافی سمجھتے۔ جب آپ کو اندازہ ہوجاتا کہ کسی آدمی کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے تو اس کی ملکیت واپس دلوانے کا فیصلہ کردیتے آپ ان لوگوں پر پختہ ثبوت فراہم کرنے کی ذمہ داری اس لیے نہیں ڈالتے تھے کہ آپ کو بخوبی معلوم تھا کہ آپ سے پہلے حکمراں لوگوں کے ساتھ یہ زیادتیاں کرتے رہے ہیں۔ روایت کی جاتی ہے کہ ظلماً لیے ہوئے اموال کی واپسی میں آپ نے عراق کا بیت المال خالی کردیا۔ یہاں تک کہ شام سے وہاں مال لے جانے کی ضرورت پڑ گئی۔

سلیمان بن عبدالملک نے عنبسہ بن سعید بن العاص کو جو اموی خاندان کے ایک فرد تھے۔ بیس ہزار دینار عطا کرنے کا حکم دیا۔ حکم نامہ مختلف دفاتر میں گھومتا ہوا بالآخر دفتر مہر میں پہنچا اور اب صرف قبضہ باقی رہ گیا۔ مگر قبل اس کے کہ یہ اسے عملاً وصول کرسکیں سلیمان کا انتقال ہوگیا۔ عنبسہ عمرؒ بن عبدالعزیز کے دوست تھے۔ صبح ہوتے ہی وہ روانہ ہوئے کہ عمرؒ سے سلیمان کے عطیہ کے بارے میں بات کرلیں۔ آئے تو دیکھا کہ اُن کے دروازے پر بنواُمیہ حاضر ہیں اور اپنے معاملات پر گفتگو کی خاطر داخلہ کی اجازت کے منتظر ہیں۔ جب انھوں نے عنبسہ کو دیکھا تو بولے کہ بہتر ہوگا کہ ہم خود گفتگو کرنے سے پہلے دیکھ لیں کہ وہ اُن کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ عنبسہ آپ کے پاس گئے اور کہا کہ امیرالمومنین! امیرالمومنین سلیمان نے مجھے بیس ہزار دینار دینے کا حکم جاری کیا تھا۔ یہ حکم مُہر کے دفتر میں پہنچ گیا تھا اور صرف وصولی باقی رہ گئی تھی کہ ان کا انتقال ہوگیا اور میرے خیال میں آپ اس کارِ احسان کی تکمیل بدرجۂ اولیٰ فرمادیں گے، کیوں کہ میرے اور آپ کے درمیان اس سے زیادہ قریبی تعلق ہے جتنا کہ میرے اور امیرالمومنین سلیمان کے درمیان تھا۔ عمرؒ نے پوچھا کہ وہ رقم کتنی ہے۔؟ انھوں نے بتایا کہ بیس ہزار دینار۔ عمرؒ بن عبدالعزیز نے کہا کہ بیس ہزار دینار تو مسلمانوں کے چار ہزار خاندانوں کے لیے کافی ہوگا، اور میں اسے ایک فرد کو دے دوں؟ خدا کی قسم

مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ عنبسہ کہتے ہیں کہ یہ سُن کر میں نے وہ تحریر اُٹھا کر پھینک دی جس میں چک مرقوم تھا۔ عمرؒ نے کہا کہ تحریر اپنے پاس رکھنے میں حرج نہیں، ممکن ہے تم پر کوئی ایسا حکمراں آئے جو اس مال کے سلسلہ میں مجھ سے زیادہ جری ہو اور اس چک کی تعمیل کرادے۔ چنانچہ میں نے اُسے اٹھا لیا اور باہر نکل کر بنو اُمیہ کے پاس آیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ اس سلسلہ میں کیا ہوا۔ وہ بول اُٹھے کہ اس کے بعد تو کوئی امید نہیں رہ جاتی تم جا کر ان سے درخواست کرو کہ ہمیں دوسرے علاقوں میں جا بسنے کی اجازت دے دیں۔ میں آپ کے پاس واپس گیا اور کہا: "امیرالمومنین! آپ کی قوم کے لوگ دروازے پر کھڑے آپ سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ جو وظائف پہلے ملا کرتے تھے وہی اب بھی ملتے رہیں۔ عمرؒ نے جواب دیا: بخدا، یہ مال میری ملکیت نہیں ہے اور نہ مجھے ایسا کرنے کی کوئی گنجائش نظر آتی ہے۔ میں نے کہا: امیرالمومنین! ایسی شکل میں وہ آپ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ ان کو مختلف ممالک میں جا کر قسمت آزمائی کرنے کی اجازت دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ: وہ جو چاہیں کریں، میری طرف سے اجازت ہے۔ میں نے کہا، میں بھی یہی کرنے والا ہوں۔ آپ نے کہا: ہاں، تمہیں بھی اجازت ہے مگر میری رائے یہ ہے کہ تم ٹھیرو۔ تمہارے پاس نقد سرمایہ بہت ہے اور میں سلیمان کا ترکہ فروخت کرنے والا ہوں، ہو سکتا ہے اس میں سے تم کوئی ایسی چیز خرید سکو جس کے منافع سے تمہارے اس نقصان کی تلافی ہو جائے۔ عنبسہ کہتے ہیں کہ: چنانچہ میں وہیں مقیم رہا اور میں نے سلیمان کے ترکہ میں سے ایک لاکھ کا مال خریدا اور اُسے عراق لے جا کر دو لاکھ دینار میں فروخت کیا۔ وہ چک بھی میں نے محفوظ رکھا اور عمرؒ کی وفات کے بعد جب یزید بن عبدالملک حکمراں ہوئے تو میں سلیمان کی تحریر اُن کے پاس لے گیا اور انھوں نے اس کی تعمیل کرادی۔"

"حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے بنو مروان کو جمع کر کے یہ کہا کہ تمہیں شرف و عزت اور مال و دولت سب کچھ نصیب ہوا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس اُمت کی مجموعی دولت کا نصف یا دو تہائی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ لہذا لوگوں کے جو حقوق تمہارے قبضہ میں ہیں ان کو انھیں واپس کر دو، اور مجھے اس بات پر مجبور نہ کرو کہ میں بتمام ناپسندیدگی تم کو ایسی باتوں پر مجبور کروں جو تمہیں ناگوار گزریں۔ لیکن کسی نے بھی اس کا جواب نہیں دیا۔ آپ نے مطالبہ کیا کہ مجھے جواب دو۔ تو اُن میں سے ایک شخص نے کہا: خدا کی قسم ہم ان اموال سے دست بردار نہیں ہوں گے جو کہ ہمیں اپنے آباء سے ملے ہیں۔ ہم اس طرح اپنے بیٹوں کو مفلس بنانا اور اپنے آباء کی ناشکری کرنا نہیں گوارا کر سکتے، تا آنکہ ہمارے سرتن سے جدا ہو جائیں۔ عمرؒ نے کہا:

خدا کی قسم اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ تم میرے خلاف انہی عوام کو ساتھ کر لو گے جن کے لیے میں اُن حقوق کا مطالبہ کر رہا ہوں تو میں بہت جلد تم کو کچل کر رکھ دیتا۔ مگر مجھے فتنہ کا خطرہ ہے۔ اگر اللہ نے مجھے باقی رکھا تو انشاء اللہ میں ہر حق دار کو اس کا حق دلا کر دم لوں گا۔[1]

لیکن آپ اپنی خواہش کے مطابق اتنی زندگی نہ پا سکے کہ سب کے حقوق واپس دلوا سکتے۔ آپ کے بعد وہ لوگ آئے جو عمرؒ کے طریقہ کو چھوڑ کر اُمیہ کے طریقہ پر چلے۔ جب بنو عباس آئے تو وہ بھی بادشاہ بن کر آئے۔ وہ آئے تو فساد رُونما ہو چکا تھا۔ لوگ دینی طور طریق سے بہت دور جا چکے تھے، کیوں کہ اُمیہ نے ایک طویل عرصہ تک اُنھیں دینی طریقہ سے دور رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عباسی حکمراں اموی حکمرانوں سے چنداں بہتر نہ تھے۔ وہ بھی اسی طرح کی جابرانہ شہنشاہی تھی۔

بادشاہت

چونکہ یہاں ہم اسلامی حکومت کی نہیں بلکہ حکمرانی کے باب میں اسلامی اسپرٹ کی تاریخ بیان کر رہے ہیں لہٰذا ہم اس روح میں تبدیلی واضمحلال کے مظاہر سامنے لانے کے لیے بادشاہوں کے عہد کے تین خطبے پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ خلفاء کے عہد کے جو تین خطبے اوپر گزر چکے ہیں ان سے ان کا موازنہ ان دو کے درمیان فرقِ عظیم کو بخوبی واضح کر دے گا۔

صلح کے بعد معاویہؓ نے کوفہ میں عوام کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"کوفہ کے باشندو! کیا تمہارا خیال ہے کہ میں نے نماز، زکوٰۃ اور حج کی خاطر تم سے جنگ کی ہے؟ دریں حالیکہ میں بخوبی جانتا تھا کہ تم نماز پڑھتے ہو، زکوٰۃ دیتے ہو اور حج بھی کرتے ہو۔ نہیں، میں نے تم سے اس لیے جنگ کی کہ تم پر اور تمہاری گردنوں پر اپنا حکم چلاؤں اللہ نے تمہاری ناپسندیدگی کے باوجود میری مراد پوری کی۔ آگاہ رہو کہ اس فتنہ میں جو کچھ جانی اور مالی نقصان ہوا اس کا کوئی بدلہ یا معاوضہ نہیں دلوایا جائے گا۔ اور میں نے جتنی شرطیں بھی طے کی تھیں وہ میرے ان دونوں قدموں تلے پامال ہیں۔"

---

[1] عمرؒ بن عبدالعزیز، مصنفہ استاذ احمد زکی صفوت۔

اسی طرح انھوں نے مدینہ والوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"اما بعد! خدا کی قسم میں نے امارت تمہاری کسی محبت کے نتیجہ میں نہیں پائی جس کا مجھے علم ہو۔ نہ تم کو اس پر کوئی خوشی ہوئی، بلکہ میں نے تم سے اس تلوار کے ذریعہ کشمکش کی ہے۔ تمہاری خاطر میں نے اپنی طبیعت کو ابن ابی قحافہ کے طرزِ عمل پر آمادہ کرنا چاہا، چاہا کہ وہ عمرؓ کی روش اختیار کرے، مگر اس نے شدت کے ساتھ اباء کیا۔ پھر میں نے چاہا کہ وہ عثمانؓ کے توسعات پر ہی راضی ہو جائے مگر وہ اس پر بھی نہیں آمادہ ہوئی۔ لہٰذا میں نے اُسے ایک ایسی راہ پر ڈالا ہے جس میں میرا بھی بھلا ہے اور تمہارا بھی۔ خوش اسلوبی کے ساتھ مل جل کر کھانا پینا ہوگا۔ اگر تم مجھے اپنے میں سب سے بہتر نہیں پاتے تو بھی حکومت کرنے کے لیے تمہارے لیے بہتر ہوں۔"

منصور عباسی نے ذیل کا خطبہ اس وقت دیا ہے جب کہ اُموی سلسلہ حکمرانی کے تصور کو جو شکل دے سکتا تھا دے چکا تھا۔ یہاں تک کہ عباسیوں کے عہد میں یہ تصور بادشاہت کے ایک مقدس اور منجانب اللہ حق ہونے کے تصور میں بدل چکا تھا جب کہ اسلام اس تصوّر سے ناآشنا ہے۔ اس نے کہا:

"لوگو! میں اللہ کی زمین پر اُس کا سُلطان ہوں۔ اُس کی تائید اور توفیق سے تم پر حکومت کروں گا۔ میں اس کے مال پر اس کی طرف سے مقرر کیا ہوا محافظ ہوں۔ اس کی مشیّت اور اس کے مطابق اس میں تصرّف کرتا ہوں اور اس کے اذن کے تحت اس میں سے عطائیں دیتا ہوں۔ اللہ نے مجھے اس (خزانے) کا قفل بنایا ہے۔ اگر وہ مجھے کھولنا چاہتا ہے تو تم کو عطا دینے یا تمہارے درمیان رزق تقسیم کرنے کے لیے کھول دیتا ہے اور بند کرنا چاہتا ہے تو بند کر دیتا ہے۔"

پھر تو طرزِ حکمرانی اسلام اور اس کی تعلیمات کے دائرہ سے باہر نکل گیا۔

مالی نظام

مالی نظام، نظامِ حکمرانی کے تابع تھا۔ حکّام حکمرانی کا جو تصور رکھتے تھے اور والی

اور رعیت کے حقوق کے بارے میں جس طرح سوچتے تھے ان کی مالی پالیسی بھی اسی طرح کی ہوتی تھی۔ محمد صلی اللہ تعالی علیہ وسلم شیخین اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کے ادوار میں اسلامی نظریہ کارفرما رہا۔ یعنی یہ کہ اموالِ عامہ جماعت کی ملکیت ہیں۔ حاکم اپنی ذات اور عزیز و اقارب کے لیے اس میں سے کچھ لینے کا اسی وقت مجاز ہے جب اس کا حق ثابت ہو جائے۔ اسی طرح حاکم اس بات کا پابند تھا کہ ہر شخص کو اتنا ہی دے جتنا کہ اس کا واقعی حق ہو، کہ اس معاملہ میں حاکم اور دوسرے لوگ یکساں ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جب اس تصور میں تھوڑا سا بگاڑ پیدا ہوا تو بھی عام لوگوں کو اپنے حقوق پورے کے پورے ملتے تھے۔ البتہ غالباً مال کی اتنی فراوانی کے سبب کہ لوگوں کے مقررہ وظائف دینے کے بعد بھی کافی بچ رہتا تھا، خلیفہ کا خیال تھا کہ اپنے اعزہ اور دوسرے جن لوگوں کو وہ چاہے ان کے ساتھ اپنی صواب دید کے مطابق حسنِ سلوک کا اسے پورا پورا اختیار تھا۔ اس کے بعد جب حکمرانی جابر بادشاہوں کے ہاتھ میں چلی گئی تو سارے حدود و قیود اُٹھ گئے اور حاکم عوام کو محروم کر دینے یا عطا کر دینے کے باب میں خود کو بالکل آزاد سمجھنے لگا۔ ایسا اگر کبھی کبھی حق کے مطابق ہوتا تو اکثر و بیشتر علی ناحق ہوتا۔ مسلمانوں کے مال میں حکام، ان کی اولاد اور ان کے خوشامدیوں اور حاشیہ برداروں کے لیے عیش و عشرت کی بے حد و حساب گنجائش نکل آئی۔ آخر کار حکام اس طرح مال کے معاملہ میں اسلام کی مقرر کی ہوئی تمام حدود کو پھاندتے چلے گئے۔

یہ ہے صورتِ حال کا اجمالی نقشہ۔ اب ہم چند تاریخی نظائر کے ذریعہ اس کی تفصیلات سامنے لائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے بیت المال کے جو ذرائع آمدنی چلے آرہے تھے وہ یہ تھے:
فریضۂ زکوٰۃ، جو مسلمانوں پر اُن کے اموال کی مختلف قسموں میں عاید کیا گیا ہے مثلاً سونا، چاندی زرعی اجناس، پھل، مویشی، سامانِ تجارت، دفینے اور خزانے وغیرہ۔ عام طور پر اس محصول کی اوسط شرح چالیسواں حصہ ہے۔ یہ محاصل اپنی آٹھ معروف مدات میں صرف کیے جاتے ہیں۔
جو ذمی جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کرلیں اُن سے جزیہ، جو اس زکوٰۃ اور جانی قربانی کے بالمقابل ہے جو مسلمان ادا کرتے ہیں۔

فَے، یعنی وہ مال جو مسلمانوں کو مشرکین سے لڑائی کیے بغیر بلا محنت مشقت اٹھائے مل جائے۔

قرآن کی نص صریح کے مطابق یہ سارا مال اللہ اور اس کے رسولؐ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

مالِ غنیمت، جو مشرکین سے جنگ کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے اس ۵/۴ حصہ جنگ کرنے والوں کے لیے ہے اور باقی ۵/۱ فئے کی طرح ہے اور انہی مدات میں صرف ہوتا ہے۔

یا غنیمت کی جگہ پر خراج، جو زمینوں پر عاید کیے جانے والے محصول کا نام ہے جو مشرکین کے قبضہ میں تھیں اور مسلمان جنگ کے ذریعہ ان پر قابض ہوگئے تھے۔ یا جن کو مشرکین کے قبضہ میں باقی رکھتے ہوئے اُن پر اُن سے صلح کرلی گئی ہو، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فارس کی زمینوں کے سلسلہ میں کیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بیت المال کی آمدنی بہت زیادہ نہ تھی۔ مہاجرین اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ آئے تھے اور انصار نے انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے مال ومتاع میں شریک کرکے بھائی بنالیا تھا۔ مسلمانوں کی تعداد بھی محدود تھی۔ غزوات سے پہلے بیت المال کا واحد ذریعہ آمدنی رضاکارانہ انفاق فی سبیل اللہ تھا۔

جب غزوات کا سلسلہ شروع ہوا اور ہجرت کے دوسرے سال زکوٰۃ فرض ہوئی تو اصل ذریعہ آمدنی یعنی زکوٰۃ اور ایک اور ذریعہ یعنی غنیمت کا اضافہ ہوا جس کا ۵/۴ لڑنے والوں کو دے دیا جاتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدل کو ایک حصہ اور سوار کو دو حصہ، یا ایک روایت کے مطابق تین حصہ دیا کرتے تھے۔ گویا آپؐ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ "ہر ایک کا حصہ اس کی قربانی کے مطابق"۔ اسی طرح آپؐ تنہا آدمی کو ایک حصہ اور بیوی والے کو دو حصے دیتے تھے۔ اس طور پر آپ نے دوسرا اُصول یہ بنایا کہ "ہر ایک کا حصہ اس کی ضرورت کے مطابق"۔ ــــــ غنیمت کا باقی ۵/۱ ان مدات میں صرف ہوتا جن کا اوپر ذکر گزر چکا ہے۔

پھر ایک نئی بات یہ ہوئی کہ غزدۂ بنی نضیر میں پہلی بار فئے حاصل ہوئی۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے لیے مخصوص کردیا۔ انصار میں سے آپؐ نے صرف دو غریب آدمیوں کو اس میں سے حصہ دیا۔ اس کے بعد قرآن نے ایک آیت میں اس بُنیادی اسلامی اصول کا اعلان کیا کہ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ۔

بیت المال کی آمدنی پے درپے فتوحات اور زمین پر اسلام کی حدود میں وسعت کے ساتھ بڑھتی

رہی۔ فراخی اور خوش حالی رفتہ رفتہ مسلمانوں کے تمام گروہوں میں یکساں طور پر عام ہوگئی کیونکہ اسلام کے مقرر کردہ حصوں کے مطابق وہ سب بیت المال کی آمدنی میں برابر کے شریک تھے۔

جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے اور کچھ لوگ مرتد ہوگئے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر بیٹھے تو ابوبکرؓ نے وہ موقف اختیار کیا جو تاریخ میں مشہور ہے۔ آپؓ نے یہ نہ بھلائی جا سکنے والی بات کہی:

واللہ لو منعونی عقالا کانوا یودونہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علی منعہ۔

"خدا کی قسم! اگر یہ لوگ مجھے اونٹ کے پاؤں میں باندھی جانے والی ایک رسی بھی، جسے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کرتے رہے ہیں، دینے سے انکار کر دیں گے تو میں اس انکار کی بنا پر اُن سے جنگ کروں گا۔"

اس معاملہ میں آپ نے عمرؓ بن الخطاب کی رائے کے خلاف موقف اختیار کیا۔ بعد میں وہ حضرت ابوبکرؓ کی رائے مان گئے اور مطمئن ہوگئے کہ صحیح موقف وہی ہے۔ لیکن شروع میں اُن کی رائے یہ تھی کہ یہ لوگ چونکہ لا الٰہ الّا اللہ کا اقرار کرتے ہیں اس لیے ان کے خلاف جنگ جائز نہیں۔ ان کا اختلاف اتنا شدید تھا کہ انہوں نے قدرے تیز لہجہ میں کہا کہ: ہم ان لوگوں سے جنگ کیسے کر سکتے ہیں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما گئے ہیں:

امرت ان اقاتل الناس حتّٰی یقولوا لا الٰہ الا اللہ وان محمدًا رسول اللہ۔ فمن قالھا فقد عصم منی مالہ ودمہ الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ۔

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ یہ نہ کہہ دیں کہ لا الٰہ الّا اللہ اور یہ کہ محمد رسول اللہ ــــ جس نے یہ کہہ دیا اس نے اپنی جان و مال کو میری طرف سے محفوظ کر لیا بجز اس کے کہ اسلام کی رُو سے (ان کے جان یا مال پر) حق ثابت ہو جائے۔ ان کی (نیتوں) کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔"

اس پر حضرت ابوبکرؓ نے پورے اعتماد کے ساتھ ان کو یہ جواب دیا کہ "خدا کی قسم جو نماز

اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کرے گا اس سے میں ضرور جنگ کروں گا۔ کیونکہ زکوٰۃ مال میں واجب ہونیوالا حق ہے۔" حضرت عمرؓ اسی وقت پکار اُٹھے: "خدا کی قسم میں نے محسوس کر لیا کہ اللہ نے ابوبکرؓ کے دل کو جنگ کرنے پر پوری طرح مطمئن کر دیا ہے، اب میں نے بھی سمجھ لیا کہ یہی صحیح ہے۔"

اِس لافانی موقف کو اختیار کر کے آپ نے تاریخ میں عملی طور پر اسلام کی پالیسی کے ایک اہم اُصول کو نافذ کر دکھایا۔ یعنی یہ کہ مال میں سے اللہ تعالیٰ نے جماعت کا جو حق جن حدود میں اور جن مقداروں کے ساتھ مقرر فرما دیا ہے اسے وصول کرنے کے لیے جنگ کرنا اور قتل کرنا حق بجانب ہے۔

ابوبکرؓ زکوٰۃ کی آمدنی کو اس کی مقرر کردہ مدات میں صرف کرنے کے سلسلہ میں، اور اسی طرح خُمس اور دوسری آمدنیوں کے صرف کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر چلتے رہے۔ خود اپنے لیے آپ وہی معمولی سی رقم لیتے جو مسلمانوں نے آپ کے لیے مقرر کر دی تھی۔ کہا گیا ہے کہ یہ رقم صرف دو درہم یومیہ تھی ___ اس کے بعد آپ لوگوں کو اُن کے مقرر کردہ وظائف دیتے۔ پھر بیت المال میں جو کچھ بچ رہتا اُسے جہاد کی خاطر فوجیں تیار کرنے میں صرف کرتے۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا جس پر آپ اور حضرت عمرؓ کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ تقسیم اموال میں سابقین اوّلین اور بعد میں اسلام لانے والوں، آزاد افراد اور موالی، مردوں اور عورتوں سب کو مساوی قرار دیا جائے۔ حضرت عمرؓ اور صحابہؓ کی ایک جماعت کا اصرار تھا کہ جن لوگوں نے اسلام کے سلسلہ میں پیش قدمی کی ہو اُن کو حسبِ مراتب مقدم رکھا جائے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے یہ فرمایا کہ: "تم نے جس اوّلیت اور افضلیت کا ذکر کیا ہے اس سے میں بخوبی واقف ہوں۔ مگر یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا ثواب اللہ جلّ شانہٗ عطا فرمائے گا۔ یہ معاش کا معاملہ ہے۔ اس میں مساوات برتنا ترجیحی سلوک کرنے سے بہتر ہے۔"

اس مساوات پر عمل ہوتا رہا اور جیسے جیسے آمدنی بڑھتی گئی فراخی اور خوش حالی سارے مسلمانوں کو یکساں فیضیاب کرتی رہی یہاں تک عمرؓ بن خطاب کا دور آیا۔ وہ اب بھی اپنی سابق رائے پر قائم تھے یعنی یہ کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی ہے اُسے میں اُن لوگوں کے مساوی نہیں قرار دوں گا جو آپؐ کے ساتھ ہو کر لڑے ہیں۔"

ایک دن بحرین میں آپ کے گورنر ابو ہریرہؓ بہت سامال لے کر آئے۔ ان کی روایت ہے کہ

"بحرین سے میں پانچ لاکھ درہم لے کر آیا۔ میں شام کے وقت عمرؓ بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور میں نے کہا: امیرالمومنین یہ مال لیجئے۔ آپ نے دریافت کیا: کتنا مال ہے؟ میں نے جواب دیا: پانچ لاکھ درہم۔ فرمایا: جانتے ہو پانچ لاکھ کتنا ہوتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں، سو ہزار، سو ہزار، سو ہزار..... پانچ بار یہی کہا۔ مگر آپ نے کہا کہ: معلوم ہوتا ہے کہ تم عالم غنودگی میں ہو، آج کی رات تم جاؤ اور صبح تک آرام کرو۔ پھر آنا۔ چنانچہ صبح ہوئی تو میں آپ کے پاس پھر گیا اور کہا کہ یہ مال مجھ سے لے لیجئے۔ آپ نے پھر پوچھا کہ کتنا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ پانچ لاکھ درہم۔ آپ نے پوچھا کہ کیا یہ پاکیزہ طریقے سے وصول ہوا ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے تو یہی معلوم ہوا ہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"لوگو! ہمارے پاس بہت سا مال آگیا ہے اگر تم چاہتے ہو کہ پیمانوں سے ناپ ناپ کر تمہیں دیں تو ایسا کریں، شمار کر کے لینا پسند کرو تو شمار کر کے دیں، اور وزن کر کے لینا چاہو تو وزن کر کے دیں" اس پر لوگوں میں سے ایک شخص نے اٹھ کر یہ کہا: امیرالمومنین! لوگوں کے لیے باقاعدہ رجسٹر مرتب کر لیجئے جس کے (اندراج) کے مطابق ان کو دیا جایا کرے۔ حضرت عمرؓ کو یہ تجویز پسند آئی۔ چنانچہ آپ نے مہاجرین کے لیے فی کس پانچ ہزار، انصار کے لیے فی کس تین ہزار اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے لیے فی کس بارہ ہزار مقرر فرمایا......" یہاں ہم نے یہ روایت اس لیے نقل کی ہے کہ یہ بعض افراد کو بعض پر ترجیح دینے کی اس رائے کی وضاحت کرتی ہے جو حضرت عمرؓ رکھتے تھے۔ نیز یہ اس وقت کے معیارِ فراوانی کا پتہ دیتی ہے جب کہ نصف ملین رقم کو ایک ایسا خواب سمجھا جائے جسے صرف سونے والے بیان کر سکتے ہوں۔ آگے چل کر بڑی بڑی فتوحات کے بعد صورتِ حال بالکل بدل گئی۔

ابو یوسفؒ کتاب الخراج میں لکھتے ہیں: "مجھ سے مدینہ کے ایک استاذ نے اسماعیل بن محمد السائب سے، انھوں نے زید سے، اور انھوں نے اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے یہ حدیث بیان کی ہے کہ انھوں نے کہا، میں نے عمرؓ بن خطاب رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ: اُس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، کوئی فرد ایسا نہیں جس کا اس مال میں کچھ حق نہ ہو چاہے وہ اسے (عملاً) ملے یا نہ ملے۔ اس میں کسی فرد کا حق دوسرے سے زیادہ نہیں بجز غلام کے۔ اس کے سلسلہ میں میری حیثیت بھی وہی ہے جو تم میں سے کسی فرد کی ہے۔ لیکن ہمارے درجات کا تعین اللہ کی کتاب کی روشنی میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی رفاقت کے پیشِ نظر ہوگا۔ اسلام کی راہ میں آدمی جن آزمائشوں سے گزرا اور وہ اسلام میں جتنا

پہلے داخل ہوا، اس کا لحاظ کیا جائے گا۔ اسلام کی حالت میں آدمی کے مال دار ہونے یا ضرورت مند ہونے کا بھی لحاظ رکھا جائے گا۔ خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو صنعاء کی پہاڑی پر مویشی چرانے والے چرواہے کو بھی اس مال میں سے اس کا حصہ اسی جگہ پر پہنچ جائے گا، قبل اس کے کہ (اس کے لیے بھاگ دوڑ کرنے میں) اس کا چہرہ تمتما اُٹھے۔"

"آپ نے ہر اس شخص کے لیے جو جنگ بدر میں شریک تھا پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر کیا۔ ان تمام لوگوں کے لیے جن کا اسلام اہلِ بدر کے اسلام جیسا تھا، مثلاً حبشہ کو ہجرت کرنے والوں اور جنگ اُحد میں شرکت کرنے والوں کے لیے چار ہزار درہم سالانہ۔ اہل بدر کے لڑکوں کے لیے آپ نے فی کس دو ہزار مقرر کیے۔ البتہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کی قربت کے سبب ان کے والد کے بقدر وظیفہ دیا۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر کیا۔ ہر اس شخص کے لیے جس نے فتح سے قبل ہجرت کی تھی۔ آپ نے تین ہزار درہم سالانہ مقرر کیے اور جو لوگ فتح ہونے پر ایمان لائے تھے ان کے لیے فی کس دو ہزار، مہاجرین وانصار کے لڑکوں کو بھی آپ نے اتنا ہی دیا۔ عام لوگوں کے لیے عطایا کی تعیین میں آپ نے اُن کے رتبہ، علم قرآن اور راہِ اسلام میں جہاد کو معیار بنایا۔ باقی تمام لوگوں کو آپ نے ایک صف میں رکھا۔ چنانچہ جو مسلمان مدینہ آتے اور وہاں قیام کرتے ان کے لیے پچیس دینار مقرر کر دیا تھا۔ اہل یمن کے لیے جسے شام اور عراق کے مانند قرار دیا گیا تھا، دو ہزار، ہزار، نوسو، پانچ سو اور تین سو کے عطایا مقرر کیے گئے تھے۔ تین سو سے کم کسی کو نہ ملتا تھا۔ آپ کا کہنا تھا کہ اگر مال میں فراوانی اور ہوئی تو میں ہر ایک کے لیے چار ہزار درہم مقرر کر دوں گا، ایک ہزار اس کے سفر کے لیے، ایک ہزار اسلحہ کے لیے، ایک ہزار گھر والوں کے اخراجات کے لیے چھوڑ جانے کی خاطر اور ایک ہزار اس کے گھوڑے اور خچر کے لیے۔[1]"

عطایا کی تقسیم کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے جو اصول مقرر کیا تھا اس کی پابندی بعض افراد کے سلسلہ میں ضروری نہیں سمجھی۔ ان افراد کو آپ نے انہی کے درجہ کے دوسرے افراد سے زیادہ عطا کیا عمرؓ بن ابی سلمہ کے لیے آپ نے چار ہزار درہم مقرر کیے۔ یہ عمر اُمّ المومنین اُم سلمہؓ کے صاحب زادے

---

[1] الفاروق عمرؓ۔ جلد دوم۔ ڈاکٹر ہیکل۔

تھے۔ محمد بن عبداللہ بن جحش نے اس پر اعتراض کیا اور امیرالمومنین سے کہا: آپ کس بنا پر عمر کو ہم سے زیادہ دے رہے ہیں، جب کہ ہمارے باپوں نے بھی ہجرت کی تھی اور وہ بھی جنگ بدر میں شریک تھے۔ ابن خطابؓ نے انکو یہ جواب دیا کہ "میں ان کو اس مقام کی بنا پر زیادہ دے رہا ہوں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اُن کو حاصل تھا۔ جو شخص اس سلسلہ میں مجھ پر اعتراض کر رہا ہے وہ اُم سلمہؓ جیسی ماں لائے، میں اس کی بات مان لوں گا۔" آپ نے اسامہ بن زید کے لیے چار ہزار درہم مقرر کیے۔ اس پر عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: "آپ نے میرے لیے تو تین ہزار مقرر کیے اور اسامہ کے لیے چار ہزار۔ حالانکہ میں ایسے معرکوں میں بھی شریک رہا ہوں جن میں اسامہ نہیں شریک ہو سکے تھے۔" حضرت عمرؓ نے ان کو جواب دیا: "میں نے انھیں اس لیے زیادہ دیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تم سے زیادہ محبوب تھے۔ آپؐ کے باپ بھی آپؐ کو تمہارے باپ سے زیادہ محبوب تھے۔" آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیوی، اسماءؓ بنت عمیس کے لیے ایک ہزار درہم، ام کلثومؓ بنت عقبہ کے لیے ایک ہزار درہم، اور عبداللہ بن مسعود کی ماں کے لیے ایک ہزار درہم کی رقمیں مقرر فرمائیں۔ ان کی عورتوں کو آپ نے ان کی مخصوص پوزیشن کے باعث انہی جیسی دوسری عورتوں سے زیادہ عطا کیا کیونکہ یہ اُن مردوں کی بیویاں یا مائیں تھیں جن کو دوسروں پر فضیلت حاصل تھی۔[1]

گویا مال کی تقسیم کے سلسلہ میں یہ دو رائیں بنیں۔ ابوبکرؓ کی رائے اور عمرؓ کی رائے۔ عمرؓ کی رائے اپنی پشت پر ایک سند رکھتی تھی: "جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی ہے ان کو میں ان لوگوں کے مثل نہیں قرار دوں گا جنھوں نے آپؐ کے ساتھ ہوکر جنگ کی ہے۔" یہ اصول کہ جو شخص اسلام کی راہ میں جن آزمائشوں سے گزرا ہے اس کا لحاظ کیا جائے گا۔ اسلام میں اس رائے کے لیے ایک بنیاد موجود ہے اور وہ ہے محنت اور اس کے بدلہ میں مساوات کا اصول۔ اسی طرح ابوبکرؓ کی رائے بھی اپنی سند رکھتی ہے: "لوگ اللہ کے لیے اسلام لائے ہیں اور اُن کے اجر بھی اس کے ذمہ ہیں، وہ قیامت کے دن انھیں پورا پورا اجر عطا کرے گا۔ یہ دنیا قدر کفایت سے زیادہ نہیں۔"

لیکن ہم بلاکسی تأمل اور تردد کے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کو ترجیح دیں گے کیونکہ یہ مسلمانوں کے مابین مساوات پیدا کرنے کی خاطر زیادہ موزوں ہے۔ اور مساوات اس دین کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول

---

[1] الفاروق عمرؓ۔ جلد دوم۔ ڈاکٹر ہیکل۔

ہے۔ یہی پالیسی ان خطرناک نتائج سے بچنے کے لیے بھی زیادہ مفید اور مؤثر ہے جو اس تفاوت کے نتیجہ میں رونما ہوئے۔ مثلاً ایک طبقہ کی دولت کا بہت بڑھ جانا اور سال بہ سال منافع کے ذریعہ بڑھتے چلے جانا۔ اقتصادیات کی رُو سے یہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ نفع میں اضافہ راس المال کے اضافہ کے تناسب سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اس پالیسی کے یہی وہ نتائج تھے جن کو حضرت عمرؓ نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں خود دیکھ لیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ اگر وہ اگلے سال زندہ رہے تو سب کے عطایا مساوی کردیں گے۔ اس موقع پر آپ نے یہ بات بھی جو کافی مشہور ہے:

لو استقبلت من امری ما استدبرت لاخذت من الاغنیاء

فضول اموالھم فرددتھا علی الفقراء۔

"جو فیصلے میں پہلے کرچکا ہوں انھیں اگر اب پھر سے کرنے کا موقع ملتا تو میں اغنیاء سے زائد از ضرورت مال لے کر اسے فقراء کے درمیان تقسیم کردیتا"

مگر افسوس! وقت گزر گیا اور زمانہ عمر سے آگے نکل گیا، اور وہ المناک نتائج رُونما ہوئے جنہوں نے اسلامی سماج کا توازن درہم برہم کردیا۔ اس کے بعد جب مروان کے تصرفات شروع ہوئے جن کو عثمانؓ گوارا کرتے جاتے تھے تو ان ہی نتائج نے فتنہ کا دروازہ کھول دیا۔

گویا حضرت عمرؓ نے اپنی اس رائے سے کہ مسلمانوں کے درمیان تقسیم عطایا میں امتیازی سلوک برتا جائے، اس کے بُرے نتائج دیکھنے کے بعد، رجوع کرکے حضرت ابوبکر کی رائے اختیار کرلی تھی۔ حضرت علیؓ کی رائے بھی خلیفہ اوّل کی رائے کے مطابق تھی ــــ واضح رہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت کو شیخین کی خلافت کا ایک فطری تسلسل قرار دے کر حضرت عثمانؓ کے عہد کو جس میں مروان کا حکم چلتا تھا، ایک خلاء سمجھتے ہیں جو اُن کے درمیان حائل ہوگیا تھا ــــ اس وجہ سے ہم اب حضرت علیؓ کے عہد پر گفتگو کریں گے اور اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے عہد کے حالات پر روشنی ڈالیں گے۔

حضرت علیؓ نے تقسیم عطایا کے باب میں مساوات کا اُصول اختیار کیا۔ آپ نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں اس کی صراحت کردی تھی۔ فرمایا:

"سُنو! رسول اللہ کے صحابیوں میں سے، مہاجرین یا انصاری، جو شخص بھی یہ رائے رکھتا ہو کہ صحبت کی بنا پر اسے دوسرے لوگوں پر فضیلت حاصل ہے اُسے یہ

معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ فضیلت کل کو اللہ کے یہاں کام آئے گی۔ اور اس کا اجر وثواب بھی دہی دے گا۔ خوب سمجھ لو کہ جس شخص نے بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہا، ہماری ملّت کی تصدیق کی، ہمارے دین میں داخل ہوا اور ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کیا اُس نے اپنے اوپر اسلام کے حقوق و فرائض عاید کر لیے۔ دراصل تم سب اللہ کے بندے ہو اور یہ مال اللہ کا ہے، تمہارے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا۔ اس کے معاملہ میں کسی کو کسی دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ البتہ متقی لوگوں کے لیے اللہ کے پاس بہترین جزا ہے۔"

یہی صحیح اسلامی اُصول ہے جو اسلامی مساوات کی رُوح سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہ اسلامی سوسائٹی میں توازن قائم رکھنے کا ضامن ہے اور دولت کی افزائش کے اسی قدر مواقع باقی رکھتا ہے جس قدر کہ محنت مشقت کے ذریعہ ممکن ہے۔ یہ کسی کو نفع آور کاموں کے لیے دوسروں سے زائد مال فراہم کر کے اسے دوسروں سے زیادہ مواقع نہیں دیتا۔

حضرت عمرؓ اپنے آخری دنوں میں اس اصول کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ لیکن ان کی قضا سبقت کر گئی اور آپ کی شہادت واقع ہوگئی اور آپ اپنا یہ ارادہ، بلکہ اپنے دو ایسے ارادے نہ پورے کر سکے جن کے حق میں فیصلہ کر چکے تھے۔ ایک ارادہ اس بات کا تھا کہ مال داروں سے ان کا فاضل مال لیکر غربار میں تقسیم کر دیں گے۔ کیونکہ یہ فاضل مال زیادہ تر تقسیم عطایا میں عدمِ مساوات برتنے کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا۔ دوسرا ارادہ یہ تھا کہ تقسیم عطایا کے باب میں مساوات کا اُصول اختیار کر لیں تاکہ یہ تفاوت دوبارہ نہ رونما ہو سکے اور اسلامی سماج میں انتشار کا جو عمل شروع ہوگیا تھا وہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو۔

جب عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اِن دو فیصلوں میں سے ایک کو بھی قابلِ عمل نہیں سمجھا۔ فاضل مال کو مال داروں کے پاس رہنے دیا۔ اسے واپس نہیں لیا۔ اور عطایا میں تفاوت کو بھی برقرار رکھا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے لوگوں کو عطائیں دینے میں خوب فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ نتیجتہً مال دار لوگ اور زیادہ مال دار ہو گئے۔ غربار کو بھی کبھی کبھی کچھ فراخی نصیب ہو جاتی تھی۔ آپ نے ان لوگوں کو بڑی بڑی رقمیں عطا کرنا شروع کر دیا جن کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ پھر آپ نے قریش کو اس کی کھلی

چھٹی دے دی کہ اپنے جمع کردہ سرمایہ کے ذریعہ زمین کے گوشہ گوشہ میں تجارت کرتے پھریں اور اس طرح اُسے کئی گنا بڑھالیں۔ آپ نے بڑے بڑے مال داروں کے لیے یہ بات بھی رَوا رکھی کہ سواد کے علاقہ میں دوسرے ممالک میں خوب عمارتیں اور زمینیں خریدیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ کے دورِ خلافت کے آخری زمانہ میں پورے اسلامی سماج میں دولت کی تقسیم میں زبردست تفاوت پیدا ہوگیا۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔

حضرت ابوبکرؓ اور اُن کے بعد حضرت عمرؓ اس پالیسی پر شدت کے ساتھ عمل کرتے تھے کہ اکابرِ قریش کی ایک معتدبہ جماعت کو مدینہ میں مستقلاً رہنے پر مجبور کریں۔ یہ حضرات اُن لوگوں کو مفتوحہ ممالک میں آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت اس لیے نہیں دیتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ جب ان کے گرد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی قرابت، اسلام کی راہ میں اُن کی قربانیوں اور جہاد میں اُن کی پیش قدمی کے باعث اعوان و انصار جمع ہوجائیں تو ان سرداروں کی نظریں مال و دولت اور اقتدار و حکومت کی طرف اٹھنے لگیں واضح رہے کہ آزادی کے اسلامی تصور کے تحت ایسا کرنے کو کسی طرح بھی انفرادی آزادی کو پامال کرنے کے ہم معنیٰ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیوں کہ اسلام میں یہ آزادی اجتماعی مصالح اور سماجی خیر خواہی کے حدود کی پابند ہے۔ جب حضرت عثمانؓ کا دور آیا تو آپ نے ان لوگوں کو زمین میں نقل و حرکت کی کھلی آزادی دیدی صرف یہی نہیں بلکہ آپ نے انھیں اس پر اُبھارا کہ اپنے سرمایہ کو ممالکِ مفتوحہ میں مکانات اور زمین خریدنے میں لگائیں، کیوں؟ جب کہ آپ ان میں سے بعض لوگوں کو لاکھوں کی رقمیں عطا کر چکے تھے۔

بلاشبہ یہ سب مسلمانوں اور بالخصوص ان کے اکابر کے ساتھ حسنِ سلوک اور مہربانی کے طور پر کیا گیا تھا۔ لیکن اِس پالیسی نے ایسے مفاسد کو جنم دیا جو ابوبکرؓ و عمرؓ کی دُوربین نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ اس نے اسلامی جماعت میں زبردست معاشی تفاوت اور سماجی امتیازات پیدا کر دیے۔ نیز اس نے ایک ایسے طبقہ کو جنم دیا جو خود بے عمل رہتا اور بغیر کسی محنت مشقت کے اس کو اس کا رزق ہر چہار جانب سے آکر ملتا رہتا۔ اس طرح وہ عیش کوشی ایک بار پھر رونما ہوگئی جس کے خلاف اسلام اپنی ہدایات اور اپنے قوانین دونوں کے ذریعہ مسلسل اعلان جنگ کرتا رہا تھا اور حضرت عثمانؓ کے قبل کے دونوں خلفاء بھی اس سے برسرِ پیکار رہے اور کوشش کرتے رہے کہ اسے سر اٹھانے کا ذرا موقع بھی نہ ملے۔

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو بعض لوگوں کے اندر روحِ اسلامی نے جوش کیا۔ اُن میں نمائندہ شخصیت ابوذرؓ کی ہے جو اُن میں سب سے زیادہ تیز اور انقلابی تھے۔ یہ وہی جلیل القدر صحابی ہیں جن پر

حال ہی میں مصر کے دا ئرۃ الافتاء نے بر سرِ غلط ہونے کا فتویٰ صادر کرنے کی ضرورت محسوس کی اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ دین میں ابوذرؓ سے زیادہ بصیرت رکھتا ہے۔ پھر جب حالات بدل گئے تو اُس نے اپنا فتویٰ بھی بدل دیا اور اُن کے رجحانات کی تائید میں فتویٰ صادر کر دیا۔ جیسے خدا کا دین کوئی مالِ تجارت ہو جسے یہ ادارہ خواہشات کے بازار میں فروخت کر رہا ہو۔!

ابوذرؓ نے عیش پرستوں کو اُن کی اس عیش پرستی پر چیلنج کیا جو اسلام کے لیے یکسر ناقابل تسلیم تھی۔ انھوں نے خاص طور پر بنو اُمیہ اور معاویہؓ کی اس پالیسی پر تنقید کی کہ وہ اِس عیش پرستی کو نہ صرف گوارا کر رہے تھے بلکہ اس کو فروغ دے رہے تھے اور اس میں خود بھی بُری طرح ملوث تھے۔ آپ نے خود حضرت عثمانؓ کے اس طریقہ کو قابلِ اعتراض قرار دیا کہ وہ بیت المال سے ہزاروں لاکھوں کی رقمیں انعام میں دیں اور اس طرح دولت مندوں کی دولت اور عیش کوشوں کی عیش کوشی میں اضافہ کریں۔

ان کو معلوم ہوا کہ عثمانؓ نے مروان بن حکم کو افریقہ کے خراج کا پانچواں حصہ، حارث بن حکم کو دو لاکھ درہم اور زید بن ثابت کو ایک لاکھ درہم عطا کیے ہیں۔

ابوذرؓ کے ضمیر کے لیے یہ باتیں ناقابلِ برداشت تھیں، وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور لوگوں سے کہنے لگے۔

"اب ایسے کام کیے جانے لگے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتے۔ خدا کی قسم نہ تو اللہ کی کتاب میں اُن کی کوئی سند ہے نہ اُس کے نبیؐ کی سنت میں۔ خدا کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ حق پامال کیا جا رہا ہے، باطل کو از سرِ نو زندگی بخشی جا رہی ہے، سچے آدمی کو جھٹلایا جا رہا ہے اور بغیر تقویٰ کے لوگوں کو ترجیح دی جا رہی ہے ـــــ اے دولت مندو! غریبوں کے ساتھ بھائی چارہ کرو ـــــ اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں خدا کی راہ میں نہیں خرچ کرتے ان کو بشارت دو کہ ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں پر آگ سے داغ لگائے جائیں گے ـــــ اے مال جمع کرنے والے جان لے کہ مال میں تین شرکاء ہیں: اوّلاً تقدیر ہے، جو تجھ سے اجازت نہیں لے گی کہ تباہی یا موت کے ذریعہ تیرے مال کا اچھا حصہ لے جائے یا بُرا حصہ۔ ثانیاً وارث ہے، جو منتظر ہے کہ تیری آنکھیں بند ہوں اور وہ مال پر قبضہ کر لے اور تو خود مفلس رہ جائے گا

تیسرے نمبر پر تیرا حق ہے۔ اگر یہ ممکن ہو کہ تو تینوں میں سے سب سے کمزور شریک بن کر نہ رہے تو ضرور اس کا اہتمام کر۔۔۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ط

"تم نیکی کے درجہ کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک ان چیزوں کو (راہِ خدا میں) خرچ نہ کروگے جو تمہیں محبوب ہیں۔"

لوگو! تم اب ریشمی پردے اور دیباج کے بنے ہوئے گاؤ تکیے استعمال کرنے لگے ہو اور اب تمہیں آذر بائیجان کے بنے ہوتے (عمدہ) نمدے پر سونے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر سویا کرتے تھے۔ تمہارے یہاں اب طرح طرح کے کھانوں کا دور چلتا ہے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کی روٹی بھی اتنی میسّر نہ ہوتی تھی کہ شکم سیر ہو کر کھاتے۔۔۔۔۔"

مالک بن عبداللہ الزیادی ابوذرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: ایک بار انھوں نے عثمانؓ بن عفان کے یہاں اذنِ باریابی چاہا۔ انھوں نے اُن کو بلایا۔ ان کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا بھی تھا۔ عثمانؓ نے کہا: کعب! عبدالرحمٰن کا انتقال ہوگیا اور انھوں نے (کافی) مال چھوڑا ہے۔ ان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا: اگر وہ اس میں سے اللہ کا حق ادا کرتے رہے تو اُن پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سُن کر ابوذرؓ نے اپنا ڈنڈا اُٹھایا اور کعب کو رسید کیا۔ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ:

ما احب لو ان لی ھذا الجبل ذھبا انفقہ ویتقبل منی، اذر خلفی منہ ست اواق۔

"اگر میرے پاس اس پہاڑ کے برابر سونا ہوتا جسے میں راہِ خدا میں خرچ کرتا اور اللہؓ اُسے قبول فرماتا رہتا تو میں اس میں سے چھ اوقیہ بھی پیچھے چھوڑ جانا پسند نہیں کرتا۔"

(یہ حدیث سُناکر) انھوں نے تین بار عثمانؓ کو قسم دلاکر پوچھا کہ کیا تم نے اسے سُنا ہے؟ وہ بولے: ہاں۔[1]

---

[1] حدیث نمبر ۴۵۳۔ المسند جلد اول۔ مؤلفہ استاذ احمد محمد شاکر۔

اس طرح کی دعوت کو برداشت کرنا معاویہؓ اور مروان بن حکم کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ وہ اس بات پر برابر عثمانؓ کو ان کے خلاف اکساتے رہے یہاں تک کہ ابوذرؓ کو اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کا یا فساد فی الارض کا ارتکاب کیے بغیر جس پر کہ شریعتِ اسلام کی رُو سے مجرم کو ملک بدر کیا جا سکتا ہے، ملک بدر ہو کر ربذہ چلے جانا پڑا۔

یہ پکار ایسے ضمیر کی بیداری کا مظہر تھی جسے دولت کی بے حد فراوانی کے باوجود خواہشات مغلوب نہ کر سکی تھیں۔ دولت کا ارتکاز اتنا بڑھ گیا تھا کہ اب اس نے اسلامی جماعت کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا تھا اور اُن بنیادوں کو مٹا رہا تھا، جنہیں یہ دین لوگوں کے درمیان قائم کرنے آیا تھا۔ ہمارے لیے یہ کافی ہوگا کہ دولت کی اس فراوانی کے کچھ نمونے دیکھ لیں جن کا ذکر مسعودی نے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"عثمانؓ کے زمانہ میں صحابہؓ نے خوب مال و جائداد جمع کیا۔ چنانچہ جس دن حضرت عثمانؓ کی شہادت واقع ہوئی اُن کے خزانچی کے پاس ان کا ڈیڑھ لاکھ دینار اور دس لاکھ درہم نقد جمع تھا۔ وادی القریٰ اور حنین وغیرہ میں ان کی جائدادوں کی قیمت ایک لاکھ دینار تھی، اس کے علاوہ آپ نے بکثرت گھوڑے اور اونٹ چھوڑے تھے۔ زبیرؓ کی وفات کے بعد ان کی چھوڑی ہوئی صرف ایک جائداد کی قیمت تقریباً پچاس ہزار دینار تھی، اس کے علاوہ انھوں نے ہزار گھوڑے اور ہزار لونڈیاں چھوڑی تھیں۔ طلحہؓ کو عراق سے ایک ہزار دینار یومیہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ اور سراۃ کی جانب سے اس سے بھی زیادہ رقم آتی تھی۔ عبدالرحمٰن بن عوف کے اصطبل میں ایک ہزار گھوڑے تھے، اُن کے پاس ایک ہزار اونٹ اور دس ہزار بھیڑ بکریاں بھی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد اُن کے ترکہ کا ایک چوتھائی چوراسی ہزار کے بقدر تھا۔ زیدؓ بن ثابت نے اس قدر سونا چاندی چھوڑا تھا کہ جو کلہاڑیوں سے کاٹا جاتا تھا، جو مال و جائداد انھوں نے چھوڑا وہ اس کے علاوہ ہے۔ زبیرؓ نے ایک محل بصرہ میں، ایک مصر میں ایک کوفہ میں اور ایک اسکندریہ میں تعمیر کرایا تھا۔ اسی طرح طلحہؓ نے کوفہ میں ایک عالی شان مکان تعمیر کروایا اور مدینہ میں ایک محل تعمیر کیا۔ جس میں چونا، پختہ اور ساگوان کی لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ سعدؓ بن ابی وقاص نے عقیق میں ایک عالی شان مکان بنوایا جس کی چھتیں بہت اونچی اور صحن بہت وسیع تھے اور اس کے بالائی حصہ پر بُرجیاں تھیں۔ مقداد نے مدینہ میں

ایک محل تعمیر کرایا جس کے اندر باہر دونوں طرف گچ کاری کردائی۔ یعلیٰ بن منبہ نے پچاس ہزار دینار اور اس کے علاوہ تین لاکھ درہم کی قیمت کی جائدادیں اور دوسرے سامان چھوڑے[1]۔

یہ تھی دولت کی وہ فراوانی جس کی ابتدا بہت چھوٹے پیمانہ پر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عطایا کی تقسیم میں بعض مسلمانوں کو بعض سے زیادہ دینے کی پالیسی کے نتیجہ میں ہوئی تھی۔ یہ وہی پالیسی ہے جسے ختم کرنے اور اس کے بُرے اثرات کا ازالہ کرنے کا حضرت عمرؓ تہیہ کر چکے تھے۔ آپ نے ایسا کر کے دکھا دیا ہوتا اگر اس سے قبل آپ کو خنجر کے اس وار نے نشانہ نہ بنا لیا ہوتا جو صرف عمرؓ کے دل میں نہیں بلکہ خود اسلام کے دل میں پیوست ہو گیا۔ پھر یہ فراوانی دن بدن فزوں تر ہوتی گئی۔ حضرت عثمانؓ نے اس پالیسی کو باقی رکھا اور اس سے اس فراوانی میں اور اضافہ ہوا۔ حضرت عثمان نے اس کے علاوہ جو انعام و اکرام دیے اور جاگیریں عطا کیں وہ علیحدہ ہیں۔ اس کے بعد کچھ ایسے اسباب رُونما ہوتے رہے کہ دولت کی بہتات بہت تیزی سے بڑھی خاص طور پر متفرق اور مختلف املاک اور جائدادوں کو یکجا کرنا اور نفع آور کاروبار کے مختلف ذرائع کو اپنے قبضہ میں لے آنا، کیونکہ حضرت عثمانؓ نے ممالک مفتوحہ میں زمینیں خریدنے اور بڑی بڑی املاک حاصل کرنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ ابوذر کے دل سے جو گہری اور مخلصانہ پکار بلند ہوئی تھی اس کی مخالفت بھی اس کی ایک اہم وجہ بن گئی۔ اگر یہ دعوت اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی اور صدرِ مملکت کو ہمنوا بنا سکتی تو اس میں اتنی صلاحیت موجود تھی کہ صورت حال کی اصلاح کر دے اور حضرت عمرؓ نے اپنے آخری دنوں میں مال داروں کی فاضل دولت لے کر غربا میں تقسیم کر دینے کا جو فیصلہ کیا تھا اسے عملاً نافذ کر دکھائے۔ امام کے لیے اپنے اختیارات کی رُو سے یہ بالکل جائز ہوتا کہ اُمت کو ان نقصانات سے بچانے کے لیے ایسا کرے۔ بلکہ سماجی مصالح کے حصول کے لیے اس پر ایسا کرنا فرض تھا

اگر ایک طرف دولت کا تمرکز اور اس کی فراوانی تھی تو دوسری طرف اسی نسبت سے فقر و فاقہ اور خستہ حالی کا ظہور لازمی تھا۔ قدرتی طور پر غیظ و غضب اور انتقامی جذبات بھی پیدا ہو رہے تھے۔ یہ سارا مواد جمع ہوتا رہا اور پکتا رہا تا آنکہ اس نے ایک ہیجان انگیز فتنہ کو جنم دے کر چھوڑا جس سے اسلام

---

[1] عثمانؓ، مصنفہ استاذ صادق عرجون۔

کے دشمنوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ بالآخر اس فتنہ نے عثمانؓ کی جان لے لی اور اس کے ساتھ ہی اُمت اسلامیہ کے امن و سلامتی کو بھی لے اُڑا اور اُسے انتشار اور ہیجان کے الاؤ میں جھونک دیا۔ اس فتنہ کی آگ اُس وقت تک نہ دبی جب تک اس نے خود روحِ اسلام کو اپنے مہیب دھوئیں سے نہ ڈھک لیا اور امت کو سلطنتِ جبر کے چنگل میں نہ دے دیا۔

کوئی غیر متوقع بات نہ تھی کہ عثمانؓ کے بعد علیؓ نے عدل و مساوات کی جو پالیسی اختیار کی اُس پر سرمایہ دار طبقہ اور وہ لوگ جو تقسیم عطایا میں ترجیحی سلوک سے مستفید ہو رہے تھے، بھڑک اُٹھیں انھوں نے اس پالیسی کے ترک کا مشورہ دیا، اور ظاہر کیا کہ اس مشورہ کا محرک یہ اندیشہ ہے کہ آپ کے خلاف بغاوت نہ ہو جائے۔ آپ کے زندہ ضمیر میں اسلام کی جو رُوح کارفرما تھی اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا جو آپ نے دیا کہ: "کیا تم مجھے یہ مشورہ دے رہے ہو کہ مجھے جن لوگوں کے معاملات کا سربراہ کار بنایا گیا ہے ان پر ظلم کر کے کسی کی مدد حاصل کروں؟ یہ مال میرا ہوتا تو بھی میں اُن کے درمیان مساوات برتتا۔ پھر جب یہ خدا کا مال ہے تو اس کے خلاف کیسے کر سکتا ہوں! اچھی طرح سمجھ لو کہ مال کو علیٰ ناحق عطا کرنا تبذیر و اسراف کے تحت آتا ہے۔ دنیا میں بلاشبہ ایسا کرنے والے کو کچھ اُوپر اٹھا سکتا ہے مگر آخرت میں یہ روش اسے یقیناً ذلیل کر کے رہے گی۔"

بنو اُمیہ نے مالی نظام کے سلسلہ میں ایک مختلف روش اختیار کی تا آنکہ عمرؓ بن عبدالعزیز کا دور آیا اور آپ نے ظلماً حاصل کی ہوئی املاک کی واپسی اور مسلمانوں کے مال کے بے جا صرف سے احتراز کی وہ پالیسی اختیار کی جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اب بنی اُمیہ کو بھی وہی کچھ مل سکتا تھا جو سارے مسلمانوں کو مل سکتا تھا۔ اب خوشامدیوں اور قصیدہ خوانوں کا اِس مال میں کوئی حصہ نہ تھا کیونکہ خلیفہ نے قصیدہ گو شعراء سے قطع تعلق کر لیا اور انھیں بیت المال سے کوئی انعام نہیں دیا۔

جریر کے ساتھ آپ کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ جریر نے اُن کی شان میں ایک قصیدہ کہا تو عمرؓ نے اس سے کہا: "ابن خطفی! کیا تو مہاجرین کی اولاد میں سے ہے کہ ہم جو اُن کو دیتے ہیں وہی تجھ کو بھی عطا کر دیں یا انصار کی اولاد میں سے ہے کہ جو اُن کا حق ہوتا ہے وہی تیرا حق قرار پائے، یا پھر یہ بتا کہ تو غریب مسلمانوں میں سے ہے کہ ہم تیری قوم کے صدقات کے ذمہ دار کو حکم دے دیں کہ تیری قوم کے دوسرے لوگوں کو جو کچھ دیا کرتا ہے وہی تجھے بھی دیا کرے۔" اُس نے جواب دیا:

"امیر المومنین! میں ان گروہوں میں سے کسی سے بھی تعلق نہیں رکھتا بلکہ اپنی قوم کے سب سے زیادہ مال دار اور خوش حال لوگوں میں سے ہوں۔ لیکن آپ سے مَیں اس (انعام) کا طالب ہوں جس کا مجھے (سابق) خلفار نے عادی بنایا ہے، یعنی چار ہزار دراہم اور کپڑے اور سواریاں جو اس کے ساتھ ملا کرتی ہیں۔" عمرؓ نے جواب دیا: "اپنا کیا ہر ایک کے سامنے آئے گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرے خیال میں اللہ کے مال میں تیرا کوئی حق نہیں نکلتا۔ البتہ میری ذاتی عطا ملنے تک انتظار کرتا کہ میں دیکھوں کہ میرے اہل وعیال کے واسطے سال بھر کے لیے کتنا کافی ہوگا، اتنا محفوظ کرلوں اور اگر کچھ فاضل بچ رہے تو وہ تجھے دیدوں۔" جریر نے کہا: "نہیں اللہ امیر المومنین کو اور زیادہ عطا کرے اور اُن کی تعریف کی جائے، میں راضی خوشی جاتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "یہ مجھے زیادہ پسند ہے۔" چنانچہ جریر وہاں سے چلا آیا تو عمرؓ نے کہا کہ اس کے شر سے بچنا چاہیئے۔ اسے میرے پاس پھر بلالاؤ۔ لوگ اسے بُلا لائے تو آپ نے اس سے کہا: "میرے پاس چالیس دینار اور دو جوڑے کپڑے ہیں۔ جب اُن میں سے ایک کو دھوتا ہوں تو دوسرے کو پہن لیتا ہوں۔ مَیں اُن چیزوں کو اپنے اور تمہارے درمیان آدھا آدھا تقسیم کرلیتا ہوں، اگرچہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ عمرؓ کو اس کی ضرورت تجھ سے زیادہ ہے۔" جریر نے کہا: "امیر المومنین کو اللہ اور زیادہ عطا کرے، خدا کی قسم میں بالکل راضی ہوں (مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں)۔" آپ نے فرمایا کہ: "اچھا، جب تو نے قسم کھائی تو ہم تجھے بتائیں کہ تیری اس دعا اور (ہمارا عطیہ نہ قبول کرکے) ہمیں تنگی سے محفوظ رکھنے نے مجھے تیری تعریف سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ اب تو ہمارا دوست بن کر جا۔"

جب مسلمانوں کے مال کا اس طرح تحفظ کیا جائے اور اسے اس کے واقعی مستحقین تک پہنچایا جائے تب راویوں کا یہ بیان چنداں موجبِ حیرت نہیں کہ عمرؒ بن عبدالعزیز کے دور میں لوگوں کو اتنی فراخی نصیب ہوگئی تھی کہ بعض علاقوں میں کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ ملتا تھا۔ کیونکہ عام طور پر لوگ اپنے دوسرے حقوق کے باعث مالِ زکوٰۃ سے مستغنی ہوچکے تھے۔ یحییٰ بن سعد اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ: "مجھے عمرؒ بن عبدالعزیز نے افریقہ کے صدقات کا عامل بناکر بھیجا۔ میں نے اسے جمع کیا اور ایسے غریبوں کی تلاش کی جنھیں مال دے سکوں، مگر مجھے وہاں کوئی غریب نہ ملا، کوئی ایسا شخص نہ ملا جو یہ مال لینا چاہتا ہو، کیوں کہ عمرؒ بن عبدالعزیز نے لوگوں کو غنی کردیا تھا۔ مَیں نے اس رقم سے غلام خریدے اور انھیں آزاد کردیا۔"

حقیقت یہ ہے کہ فقر و حاجتمندی صرف مال کے ارتکاز کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہر زمانہ میں فقراء

حد سے زیادہ مال دار لوگوں کے ظلم و جور کا نشانہ ہوتے ہیں اور حد سے زیادہ مال دار لوگوں عموماً بڑے بڑے انعامات اور جاگیروں بخشش، لوٹ کھسوٹ، ظلم اور بے جا نفع اندوزی کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں۔

بنو امیہ اور ان کے بعد بنو عباس کے زمانہ میں بیت المال بادشاہوں کے لیے اس طرح مباح تھا جیسے کہ ان کی ملکِ خاص ہو۔ حالانکہ اس زمانہ میں دو الگ الگ بیت المال ہوتے تھے۔ ایک عام اور ایک خاص۔ پہلے کے بارے میں یہ تصور تھا کہ اس کی آمدنیاں اور مصارف سلطان کے لیے مخصوص ہیں۔ لیکن یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ بعض عام اموال بیت المالِ خاص میں داخل کر دئیے جاتے ہیں اور بعض خاص مصارف عام بیت المال سے پورے کیے جاتے ہیں۔

استاذ آدم میز Adam Mez کی کتاب اسلامی تہذیب چوتھی صدی ہجری میں، (جس کا عربی ترجمہ استاذ محمد عبد الہادی ابوریدہ نے کیا ہے) آیا ہے کہ:

"عطایا اور وہ ساری رقمیں جو دار الخلافہ کے اخراجات سے متعلق ہوتی تھیں بیت المالِ عام سے حاصل کی جاتی تھیں۔ ہمارے پاس چوتھی صدی ہجری کے اوائل کی ایک تاریخی دستاویز ہے جو ان اموال کی قسموں کی تفصیل پر مشتمل ہے جو بیت المال خاص میں داخل کی جاتی تھیں۔

۱۔ وہ متروکہ اموال جو باپ اپنے بیٹوں کے لیے اس بیت المال میں چھوڑ جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ مال رشید نے چھوڑا، یعنی چار کروڑ آٹھ لاکھ دینار۔ معتضد (۲۷۹ - ۲۸۹ ھ) اپنے دورِ خلافت میں ہر سال اخراجات کے بعد مالِ خاص کی آمدنی میں سے دس لاکھ دینار بچا لیتا تھا۔ یہاں تک کہ نوّے ۹۰ لاکھ دینار جمع ہو گئے اس کی خواہش تھی کہ ایک کروڑ پورا کر لے تو اسے گلا کر ایک سلّی میں تبدیل کر دے۔ اس نے نذر مانی کہ جب یہ تمنا پوری ہو جائے گی تو اس سال رعیت پر سے تہائی محصول معاف کر دے گا۔ اس کا ارادہ تھا کہ یہ سلّی بابِ عامہ پر رکھ دی جائے گی تاکہ ہر کس و ناکس کو اطلاع ہو جائے کہ اس کے پاس ایک کروڑ دینار ہیں اور وہ اس سے مستغنی ہے۔ مگر تمنا کی تکمیل سے پہلے اسے موت نے آ لیا۔ معتضد کے بعد مکتفی (۲۸۹ - ۲۹۵ ھ) کا دور آیا۔ اس نے خزانہ کو ایک کروڑ چالیس لاکھ تک پہنچا دیا۔

۲۔ خراج اور سرکاری املاک سے حاصل شدہ رقوم جو فارس اور کرمان سے (اخراجات وضع کرنے کے بعد) حاصل ہوتی تھیں (۲۹۹ھ سے ۳۲۰ھ، ۹۱۱ء سے ۹۳۲ء) تک ان رقوم کی سالانہ مقدار دو کروڑ تیس لاکھ رہی ہے۔ ان میں سے چالیس لاکھ بیت المال عام میں اور باقی ایک کروڑ نوّے لاکھ

بیت المالِ خاص میں داخل کیے جاتے تھے البتہ اس میں سے ان ہنگامی اخراجات کو وضع کر دینا ضروری ہے جن کی ان ممالک میں ضرورت پڑ جاتی تھی۔ چنانچہ ۳۰۳ھ (۹۱۵ء) میں خلیفہ نے ان ممالک کی فتح پر ستر لاکھ سے زائد صرف کیا تھا۔

۳۔ مصر اور شام کے اموال۔ مثلاً اہل ذمہ سے وصول ہونے والا جزیہ عوام کے بیت المال میں داخل کرنے کی بجائے خلیفہ کے بیت المال میں داخل کیا جاتا تھا جو امیر المومنین ہونے کے سبب اصولی طور پر اس کا حق تھا۔

۴۔ وہ مال جو برطرف کیے ہوئے وزراء، سکریٹری اور افسران کے اموال اور ان کی جائدادوں کی ضبطی کے ذریعہ حاصل ہوتا تھا۔ اسی طرح وہ مال جو ترکوں سے حاصل کیا جاتا۔[1]

۵۔ خراج اور املاک سے حاصل ہونے والی رقمیں جو سواد، اہواز اور مشرقی اور مغربی علاقوں سے بیت المالِ خاص میں لائی جاتی تھیں۔

۶۔ وہ اموال جو خلفاء باقی بچا لیتے تھے۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری کے دونوں آخری خلفاء (معتضد اور مکتفی) دس لاکھ سالانہ بچاتے تھے۔ مقتدر بھی اتنا ہی بچا لیتا تھا۔ اس طور پر پندرہ سال کی بچت ایک کروڑ پچاس لاکھ ہوتی ہے۔ یعنی اس رقم کا تقریباً نصف جو خلیفہ رشید نے چھوڑی تھی۔"

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ خلیفہ کہلانے والے بادشاہوں نے عام مسلمانوں کے اموال پر کتنی دست درازیاں کی تھیں۔ مالیات کا نقشہ اسلامی اصولوں سے کتنا مختلف ہو چکا تھا۔ ایک طرف دولت اور عیش پرستی کتنی زیادہ تھی اور دوسری طرف محرومی اور فقر و فاقہ کتنا شدید ہو چکا تھا' اور اسلامی سماج اسلامی طور طریق سے دُور اور اسلامی اُصولوں سے منحرف ہو جانے کے سبب کتنے انحطاط کا شکار ہو چکا تھا۔

چند بُنیادی اُصول

لیکن ان باتوں کے باوجود اسلام کی عملی تاریخ نے اتنا ضرور کر دکھایا کہ مالی پالیسی کے ضمن میں

---

[1] خلیفہ اپنے خادموں اور خاندانِ خلافت کے ان موالی کے مال ورثہ میں پاتا تھا جو صاحبِ اولاد نہیں ہوتے تھے۔ چونکہ یہ افراد عموماً اعلیٰ عہدے دار ہوتے تھے جن کی آمدنی بہت زیادہ تھی لہٰذا اس ذریعہ سے خلیفہ کے خزانہ میں بہت سا مال آ جاتا تھا۔

بہت سے بنیادی اصول طے کر جائے۔ باوجود اس رجعت کے جس سے انسانیت کی بدقسمتی سے اُسے اپنے ابتدائی عہد ہی میں بنی اُمیہ کی وجہ سے دوچار ہونا پڑا، اسلامی تاریخ نے اسلام کے بہت سے نظریات کو عمل کا جامہ پہنا کر دکھایا۔

عملی تاریخ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ :

۱۔ غریب لوگ اسلام میں پیش قدمی کرنے والوں کے مقابلہ میں مالِ عام کے زیادہ حق دار ہیں

مسند احمدؒ بن حنبل میں آیا ہے کہ: ہم سے بکر بن عیسیٰ نے حدیث بیان کی ہے کہ ہم سے ابو عوانہ نے بروایت مغیرہ، بروایت شعبیؒ، بروایت عدیؓ بن حاتم، یہ روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا ہے: "میں اپنی قوم کے کچھ افراد کے ہمراہ عمرؓ بن الخطاب کے پاس گیا۔ وہ طے کے بعض افراد کے لیے دو ہزار کے وظیفے مقرر کرنے لگے اور مجھ کو نظر انداز کرتے رہے۔ عدیؓ بن حاتم کہتے ہیں کہ میں آپ کے سامنے آ کھڑا ہوا، پھر بھی انہوں نے اعراض کیا۔ میں پھر اُن کے سامنے آیا مگر پھر بھی انھوں نے نظریں پھیر لیں۔ میں نے عرض کیا: امیر المومنین! کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ یہ سن کر ہنسنے لگے۔ یہاں تک کہ ہنستے ہنستے پیٹ کے بل چت لیٹ گئے۔ پھر آپ نے فرمایا: "ہاں، بخدا میں تمہیں خوب پہچانتا ہوں۔ تم اس وقت ایمان لائے جب دوسروں نے کفر پر اصرار کیا، تم اس وقت آگے بڑھے جب دوسروں نے پیٹھ دکھائی، تم نے ان حالات میں وفاداری کا ثبوت دیا جب دوسرے دھوکہ دے گئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ زکوٰۃ کی وہ پہلی رقم جس سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے صحابہؓ کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ بنو طے کی زکوٰۃ کی رقم تھی جسے میں رسول اللہ کی خدمت میں لایا تھا۔ ......" پھر حضرت عمرؓ نے عذر پیش کرنے شروع کر دیئے اور فرمایا: "میں نے اس مال میں سے صرف ایسے لوگوں کے لیے وظائف مقرر کیے ہیں جن پر عاید ہونے والی ذمہ داری نے ان کو فاقوں سے نڈھال کر رکھا ہے، کیونکہ وہ لوگ اپنے اپنے قبیلہ کے اکابر ہیں۔"

اُن حضرت عمرؓ کا یہ قول جنھوں نے عطایا کی تقسیم میں اسلام میں پیش قدمی کرنے والوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا تھا، بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس سے بہت کچھ ثابت ہوتا ہے۔ دراصل اسلامی سماج میں "ضرورت" اوّلین بنائے استحقاق ہے۔ یہ اصول بتاتا ہے کہ اسلام ضرورت مندی اور فقر و فاقہ کو کتنا ناپسند کرتا ہے اور اس کے ازالہ کو تمام دوسرے اُمور پر مقدم رکھتا ہے۔

۲۔ یہ کہ اسلام کے لیے یہ بات بالکل ناقابلِ برداشت ہے کہ ایک طرف تو دولت کی

بے انتہا فراوانی ہو اور دوسری طرف اس سے یکسر محرومی۔ وہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے صاحبِ امر کو اس بات کی پوری آزادی دیتا ہے کہ موجودہ حالات کے مطابق مناسب اقدامات کرے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جو تاریخی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ آپؐ نے بنی نضیر کی فیٔ کو تمام تر فقراء مہاجرین میں تقسیم کیا تاکہ پہلی فرصت میں اسلامی سماج میں یک گونہ توازن پیدا کرسکیں۔ اس سے صرف دو غریب انصاری مستثنیٰ تھے (جنھیں آپ نے اس موقعہ پر حصہ دیا تھا)۔ پھر قرآن نے آکر اس تاریخی نظیر پر مہر تصدیق ثبت کردی گئی۔ "لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً م بَیْنَ الاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ" تاکہ (مال و دولت) صرف تمہارے مال دار لوگوں کے درمیان گردش نہ کرتا رہ جائے۔

یہ نظیر بڑی معنیٰ خیز، پختہ اور اہم ہے۔ اس کی رُو سے مسلمان صاحبِ امر جو اللہ کی شریعت کو نافذ کرتا ہے، ہر وقت اس بات کا اختیار رکھتا ہے کہ خزانۂ عام میں سے اہل حاجت کی اتنی مدد کرے جس سے اسلامی جماعت میں توازن بحال ہوجائے اور اسلام کی یہ خواہش پوری ہوجائے کہ مختلف طبقوں کے درمیان ایسا تفاوت نہ پایا جائے جو اس عام توازن کو درہم برہم کردے۔

۲۔ استطاعت اور عدم استطاعت کی مناسبت سے محصول کی مختلف شرحیں مقرر کرنے کا اصول۔ چنانچہ جب ذمیوں پر ٹیکس لگایا گیا تو اُن کے مختلف گروہوں کے لیے ذیل کی شرحیں مقرر کی گئیں:

ا۔ مال دار لوگ۔ ان سے فی کس ۴۸ درہم سالانہ لیا جائے گا۔

ب۔ متوسط الحال لوگ۔ ان سے فی کس ۲۴ درہم سالانہ لیا جائے گا۔

ج۔ محنت کش غرباء ان سے فی کس بارہ درہم لیا جائے گا۔

ایسا غریب جسے خیرات دی جاتی ہو، وہ آدمی جو محنت سے معذور ہو، اندھے، اپاہج، پاگل اور آفت رسیدہ معذور افراد سے جزیہ نہیں وصول کیا جائے گا۔۔۔۔ عورت اور بچہ پر جزیہ نہیں عاید ہوگا۔

عام الرمادہ میں جب قحط کے سبب فاقہ کشی کی نوبت آگئی۔ تو حضرت عمرؓ نے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے محصلین نہیں بھیجے بلکہ لوگوں کو خشک سالی رفع ہونے تک معاف رکھا۔ جب خوش حالی کا دور آیا اور عوام نے اطمینان کا سانس لیا تو آپ نے محصلین بھیجے اور انھوں نے استطاعت رکھنے والوں سے دوسرے حصہ کا مطالبہ کیا۔ ایک عام الرمادہ کا اور دوسرا سالِ رواں کا۔ غیر مستطیع افراد کو انھوں نے معاف رکھا۔ پھر

آپ نے حکم دیا کہ دو حصوں میں سے ایک حصہ اُن غیر مستطیع افراد کو دے دیا جائے اور محصل آپ کے پاس صرف ایک حصہ لے کر واپس آئے۔

۴۔ یہ اصول کہ محاصل کی وصولی کی خاطر کسی کو ضرورتِ زندگی سے محروم نہ کیا جائے اور نہ وصولی میں قوت سے کام لیا جائے۔ علیؓ بن ابی طالب نے اپنے ایک عامل سے کہا: "جب تم اُن کے پاس جاؤ تو محاصل وصول کرنے کی خاطر، ان کے گرمی یا جاڑے کے کپڑے، یا کھانے کی چیزیں، یا سواری کا جانور نہ فروخت کرنا۔ وصولی کے لیے کسی کو ایک کوڑا بھی نہ مارنا۔ نہ کسی کو ایک پاؤں پر کھڑا کرنا، چاہے کتنا ہی خراج کیوں نہ باقی ہو۔ کیونکہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے ان کی ضروریات سے فاضل مال وصول کریں۔

۵۔ "ہر شخص کو اس کی قربانیوں کے مطابق" کے اصول کے پہلو بہ پہلو یہ اُصول کہ "ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت میں سے اکیلے آدمی کے لیے ایک حصہ اور شادی شدہ کے لیے دو حصہ مقرر کیا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ وظائف کی تعیین میں محنت کے ساتھ حاجت کا لحاظ بھی رکھا جانا چاہئے۔ ورنہ جہاد میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں کو یکساں مشقت اٹھانا پڑتی ہے ـــــــ البتہ شادی شدہ کی ضرورت دو چند ہے، لہٰذا اس کا حصہ بھی دوگنا کر دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ صرف ضرورت بھی اسلام میں حصولِ ملکیت کا ایک مستقل بالذات ذریعہ ہے۔ اس اُصول کو اجتماعی تحفظ Social Security کے باب میں بہت اہمیت حاصل ہے۔

۶۔ ہر مجبور اور ضرورت مند کے لیے اجتماعی تحفظ کا اُصول۔ حضرت عمرؓ نے نوزائیدہ بچے کے لیے سو درہم مقرر کیے تھے۔ جب بچہ کچھ بڑھ جائے تو دو سو درہم، اور جب بالغ ہو جائے تو اس سے بھی زیادہ دیے جاتے تھے۔ جو بچے پھینکے ہوئے ملتے تھے ان کے لیے سو درہم مقرر ہوتا تھا، اور اس کی سرپرستی قبول کرنے والے کو بچہ کی پرورش کی خاطر مزید وظیفہ دیا جاتا تھا۔ بچہ کی دودھ پلائی اور دیگر اخراجات بیت المال سے ادا کیے جاتے تھے اور جب وہ بڑا ہو جاتا تھا تو اُسے دوسرے بچوں کے برابر حصہ ملتا تھا۔

حضرت عمرؓ کی یہ فراخ دلی اسلام کی فراخ دلی کا پَرتو ہے۔ کیونکہ پھینکا ہوا بچہ اپنی جگہ

بالکل معصوم ہے اور اپنے مجرم ماں باپ کے گناہ کا قطعاً ذمہ دار نہیں۔ اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اندھے یہودی اور کوڑھ کے مریض عیسائیوں کے لیے بیت المال سے رقمیں مقرر کر دی تھیں عمرؓ کے مزاج میں یہ اسلامی فراخ دلی یکساں طور پر سارے انسانوں کے لیے تھی نہ کہ صرف مسلمانوں کے لیے۔ یہ ضرورت، مجبوری اور محرومی کے خلاف اجتماعی تحفظ ہے۔

۷۔ یہ اُصولی سوال کہ "کہاں سے حاصل ہوا؟" کیوں کہ حاکم کو کوئی ایسا خصوصی تحفظ حاصل نہیں کہ جماعت اس کے کمائے ہوئے مال کے بارے میں اس سے محاسبہ نہ کر سکے۔ تاکہ اسے معلوم ہو کہ یہ مال اُسی کا مال ہے یا جماعت کا ہے۔ اسی اُصول کی تعیین اس بات کی ضامن ہے کہ کوئی حاکم مالِ عامّ پر دست درازی سے پہلے کئی بار سوچے گا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے سارے والیوں کے ساتھ اس اصول پر عمل کیا۔ پھر حضرت علیؓ نے بھی بعض والیوں کے ساتھ ایسا کیا۔

۸۔ اصولِ زکوٰۃ۔ جو اُن تاریک ترین ادوار میں بھی معطّل نہیں ہوا جو رُوحِ دین سے دور ہو گئے تھے۔ کیوں کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد کے شروع میں اہل ردّہ سے جنگ کے بعد ایک شخص نے بھی نظری یا عملی طور پر اس کا انکار نہیں کیا، تا آنکہ ہمارے زمانہ میں مغربی تہذیب کو غلبہ نصیب ہوا اور اس کے نتیجہ میں اسلامی اصولوں میں سے آخری زندہ اُصول بھی پامال ہو گیا۔

۹۔ عام اجتماعی کفالت کا اُصول۔ جو ہر بستی کے لوگوں کو ہر اس فرد کے بارے میں جواب دہ قرار دیتا ہے جو وہاں بھوک کی وجہ سے موت کا شکار ہو جائے۔ یہ جواب دہی فوجداری قانون کے تحت آتی ہے۔ ہر بستی والوں پر اس طرح مر جانے والے فرد کی دیّت دینی واجب ہوتی ہے۔ وہ اس فرد کے قاتل قرار پاتے ہیں جو ان کے درمیان رہتے ہوئے بھوک کی وجہ سے موت کا شکار ہو گیا۔

اس اُصول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بھوکے یا پیاسے کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ اگر اسے بھوک یا پیاس کے سبب اپنی جان جانے کا اندیشہ ہو تو وہ کھانا یا پانی رکھنے والے سے جنگ کر سکتا ہے، اور اگر یہ اُسے قتل کر دے تو اُس پر نہ دیت لازم آئے گی اور نہ اُخروی عذاب ہو گا۔

۱۰۔ حُرمتِ سُود، اور تنگ دستی کی شکل میں قرض دار کو مہلت دینے کا اُصول۔ سُود کی حُرمت بھی برابر قائم رہی تا آنکہ جدید تہذیب نے آکر اُسے مباح کر دیا۔ یہ بَلا فرانسیسی قانون کے ذریعہ ہمارے سر آئی اور اس نے اسے ہماری عام اقتصادی زندگی کی اہم بنیاد بنا دیا، حالانکہ اس کی قطعاً ضرورت

نہ تھی ۔ اس کے رواج کی اصل وجہ صرف یہ تھی کہ عملی زندگی سے اخلاقی قدروں کا اثر مٹ گیا تھا اور لوگوں کے دلوں سے نیکی اور باہمی تعاون کی اسپرٹ رخصت ہو چکی تھی ۔ دریں حالیکہ اسلام اس اسپرٹ کو سماج کی بنیاد اور لوگوں کے باہمی معاملات کی اصل قرار دیتا ہے ۔

یہ باتیں بر و مواساۃ اور اجتماعی تکافل کی ان قدروں کے علاوہ ہیں جو قانون کے ذریعہ نافذ کرنے کی چیزیں نہیں ۔ خود ہمارا ماضی قریب جسے ہمارے اجداد نے نہیں ہمارے آباء نے ہر اسلامی دیہی علاقہ میں دیکھا ہے ۔ جو عالم اسلام پر مغرب کی مادی تہذیب کے استیلاء کے باوجود اب بھی کسی قدر باقی ہے ، اسلامی معاشروں پر اسلامی اسپرٹ کے اثرات کی گواہی دیتا ہے ، وہاں اس اسپرٹ کے فیض سے قانون اور جبر کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی ۔ یہ بے شمار اوقاف جو آج اپنے اصل مقاصد کے خلاف استعمال کیے جا رہے ہیں اور جن پر مختلف لیڈروں نے مختلف ناموں کے تحت مختلف بہانوں سے قبضہ کر رکھا ہے ، یہ سب ماضی قریب و بعید کے اُن مسلمانوں کے دلوں میں موجزن رحمت ، نیکی ، کفالت باہمی اور اجتماعی تحفظ کے جذبات پر گواہ ہیں ۔ ان کے دلوں کو مغرب کی سنگ دلی ، مُردہ شعور ، جامد مادی تہذیب نے نہیں بگاڑا تھا ۔

کمزوروں کے اجتماعی تحفظ کا یہ خیال اتنا بڑھ گیا تھا کہ انسانوں کے علاوہ حیوان بھی اس سے فیض یاب ہوئے ۔ چنانچہ کمزور جانوروں کی پناہ گاہ بنانے کے لیے بھی بعض وقف کیے گئے ہیں جہاں آکر وہ بھوک اور پریشان حالی سے بچ سکتے ہیں ۔

ابتدائی مرحلہ میں طرزِ حکمرانی اور اقتصادی پالیسی کے ضمن میں کچھ بگاڑ پیدا ہو جانے سے جو دور رس اثرات مرتب ہوئے اُن کے باوجود حقیقی اسلام یہی ہے ۔

یہ ہے اسلام اپنی اُس عملی تاریخ میں جو واقعات کے پیکر میں سامنے آ چکی ہے ۔ جہاں تک اُس کے عام اُصولوں کا سوال ہے اسلام میں ہمیشہ یہ استعداد موجود رہی ہے اور رہے گی کہ جو معاشرہ اس کی بنیاد پر قائم ہو اور جس میں اس کی شریعت کو قانون کا درجہ دیا جائے ، اس میں پیش آنے والے نئے مسائل کو حل کر سکے اور اس کی بدلتی ہوئی ضروریات کے تقاضے پورے کرتا رہے ۔ اسلام ان تقاضوں کو ہمہ گیری اور توازن کے ساتھ پورا کر سکے گا اور اس طرح افراط و تفریط کی انتہاؤں کے درمیان ٹھوکریں کھانے سے محفوظ رہے گا جس طرح انسان کے وضع کردہ نظامہائے زندگی اور انسانی تجربات ٹھوکریں

کھا رہے ہیں۔ انسانیت کو ان تجربات پر بہت کچھ قربان کرنا پڑا ہے۔ ان کی خاطر اس نے بہت کچھ کھویا ہے[1]۔

رہا اسلام کا حال اور اس کا مستقبل، تو اس پر ہم آئندہ باب میں روشنی ڈالیں گے۔

---

[1] مصنف کی کتاب "الاسلام ومشکلات الحضارۃ" کا باب "اضطراب وانتشار" ملاحظہ ہو۔

باب ہشتم

اسلام کا حال اور مستقبل

اسلام کا حال اور مستقبل

ہم اِس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ اسلامی زندگی از سرِ نو شروع کی جائے۔ معاشرہ اسلامی ہو جس میں اسلامی عقیدہ رائج اور اِسلامی تصورِ زندگی رائج ہو، ساتھ ہی اِسلامی شریعت نافذ ہو اور اِسلامی نظام قائم ہو۔

ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اِس انداز کی اِسلامی زندگی اس زمین کے ہر گوشے میں ایک طویل عرصہ سے مفقود ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایسا ہونے کی بنا پر خود اِسلام کا وُجود بھی ٹھٹھر کر رہ گیا ہے۔

با وجود اس کے بہت سے لوگوں کو جو یہ پسند کرتے ہیں کہ 'مسلمان' رہیں ہماری اس بات سے ایک دھچکا سا لگے گا۔ اور اُن پر یاس و خوف طاری ہو جائے گا کہ ہم اس آخری بات کا اعلان کیوں ضروری سمجھتے ہیں ہم اس کا اعلان اِس دعوت کا علمبردار ہونے کے ساتھ کرتے ہیں کہ اِسلامی زندگی کے از سرِ نو آغاز کی ضرورت ہے، اِس نہج پر کہ معاشرہ اسلامی ہو، اِس میں اِسلامی عقیدہ رائج ہو اور اسلامی تصورِ زندگی رائج ہو۔ ساتھ ہی اِسلامی شریعت نافذ ہو۔ اور اسلامی نظام قائم ہو۔ ہمارے نزدیک اس حقیقت کو اِس زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور اس کا اعلان کرنے سے یاس و نا اُمیدی پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ نہ اس دعوت اور اِس کے سِلسلے میں جد و جہد کے نتائج سے مایوس ہونے کا کوئی جواز ہے۔ اس کے برعکس ہمارے نزدیک اس المناک حقیقت کا اعلان کہ عرصۂ دراز سے کرۂ ارض میں چہار سُو اسلامی زندگی موقوف ہو چکی ہے اور اِسی وجہ سے اسلام کا وُجود بھی ٹھٹھر کر رہ گیا ہے۔ اسلام کی دعوت اور اسلام کے احیاء کی جدّ و جہد کا ایک تقاضا اور اس سلسلے کی ایک ناگزیر ضرورت ہے جس سے مفر نہیں۔

یہ اس دین کے بارے میں ایک یقینی حقیقت ہے کہ یہ اس وقت تک نہ تو بطورِ عقیدہ کے ضمیر

میں راسخ ہو سکتا ہے نہ عملی زندگی میں 'دین' کا درجہ حاصل کر سکتا ہے جب تک انسان اس بات کی گواہی نہ دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ یعنی حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے...... وہ حاکمیت جو قضا و قدر اور احکام و شریعت دونوں صورتیں اختیار کرتی ہے۔ یہ دونوں پہلو اُس عقیدہ کی بُنیاد ہونے کے اعتبار سے ایک ہی درجہ رکھتے ہیں جو انسانی ضمیر میں اس بنیاد کے بغیر راسخ نہیں ہو سکتا۔ اسلام عملی زندگی میں دین کے طور پر اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک یہ عقیدہ عملی زندگی میں ایک نظام کی صورت نہ اختیار کرے۔ یہی نظام 'دین' ہے جس میں انسانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں اور بحیثیت مجموعی' صرف اللہ کی شریعت نافذ ہو گی۔ اس میں حاکم اور محکوم دونوں ہی 'الوہیت' کے دعویٰ سے دستبردار ہو چکے ہوں گے جس کا طریقہ یہ ہو گا کہ وہ حاکمیت کے دعوے دار نہ ہوں' اور جس طرح دوسرے انسان اپنے لیے قانون سازی کرتے ہیں' دستور بناتے ہیں اور نظام وضع کرتے ہیں اس طرح یہ انسان ایسی قانون سازی نہیں کریں گے جس کی اللہ نے اجازت نہ دی ہو۔ اور جو اللہ کی شریعت سے نہ ماخوذ ہو۔ اللہ کی شریعت سے ماخوذ قانون سازی وہ ہو گی جس میں شریعت کے منصوص قوانین کو بعینہٖ اختیار کر لیا جائے۔ اور جن اُمور کی بابت کوئی واضح اور متعین حکم نہ ملے اُن میں اسلام کے عام اور بُنیادی اُصولوں کے دائرہ میں رہتے ہوئے اجتہاد کیا جائے۔ اور اس طرح اللہ سبحانہٗ کے اِس حکم کی پیروی کی جائے کہ :-

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (نساء:۵۹)

"پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزع ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔"

دین کے مفہوم اور اسلام کے معنیٰ کا یہ بیان ہمارا طبع زاد نہیں۔ اتنے اہم مسئلہ میں جس سے اللہ کے دین کے مفہوم کی تعیین اور آج دنیا میں اسلام کے 'وجود' کے موقوف ہو جانے کا فیصلہ لازم آتا ہو، ساتھ ہی کروڑوں انسانوں کے اس دعوے پر نظرِ ثانی لازم آتی ہو کہ وہ مسلمان ہیں... اس اہم ترین مسئلہ میں آدمی کے لیے بطورِ خود فتویٰ دینا، دُنیا اور آخرت دونوں میں ہلاکت مول لینے کے مُرادف ہو گا۔

دین کا یہ مفہوم اور اسلام کے یہ معنی خود اللہ سبحانہٗ نے واضح فرما دیئے ہیں جو اس دین کا الٰہ اور اس اسلام کا رب ہے۔ یہ وضاحت اس نے ایسی قطعی نصوص میں فرمائی ہے جن کی کوئی دوسری تاویل ممکن نہیں :

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ط أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ

(یُوسُف: ۴۰)

فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے"۔

وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ

(مائدہ: ۴۹)

"پس اے محمدؐ! تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق اُن لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو۔ اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف... نازل کی ہے"۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ٥

(مائدہ: ۴۵)

"اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں"۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

(نساء: ۶۵)

تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ اپنے باہمی اختلاف میں تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سربسر تسلیم کر لیں"۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ج فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ

تَأْوِيْلًا (نساء: ۵۹)

"اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو تو یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے۔ اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے"

ہر آیت ایک ہی حقیقت پر زور دیتی ہے:۔ وہ یہ کہ صرف اللہ کی حاکمیت کا اقرار کئے بغیر نہ اسلام معتبر ہے نہ ایمان۔ جس مسئلہ میں باہم اختلاف ہو ــــ جن کے بارے میں کوئی متعین اور واضح حکم نہ دیا گیا ہو کیونکہ نص کی موجودگی میں نہ رائے کی گنجائش ہے نہ اختلاف رائے کی ــــ اس میں بھی اسی حاکم کی طرف رجوع کیا جائے اور زندگی کے تمام امور صرف اسی کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصل کئے جائیں، کسی اور جانب نگاہ نہ اٹھے۔ ان فیصلوں کو عملاً قبول کرنے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان پر دل سے راضی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہی "دین قیم" ہے اور یہی وہ سپرد کامل ہے جو اللہ کو انسانوں سے مطلوب ہے۔

جب ہم دین اور اسلام کے اس مفہوم کی روشنی میں، جسے خود اللہ نے متعین فرمایا ہے، آج کی دنیا کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں کہیں بھی اس دین کا وجود نظر نہیں آتا۔ جب سے مسلمانوں کا آخری گروہ دنیا سے گیا جو پوری انسانی زندگی میں حاکمیت کو صرف اللہ کے لئے مخصوص کرتا ہے۔ اس وقت سے اس دین کا وجود موقوف ہے۔ یعنی اس وقت سے جب سے مسلمانوں نے اپنی زندگی کے تمام معاملات میں صرف اللہ کی شریعت کے مطابق عمل کرنے کا طریقہ ترک کر دیا۔

ہماری ذمہ داری ہے کہ اس المناک حقیقت کو سامنے لائیں اور اس کا اعلان کریں، اور اس اندیشے کو خاطر میں نہ لائیں کہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں جو مسلمان رہنا چاہتے ہیں، اس سے حسرت و یاس پیدا ہوگی، کیونکہ ایسے لوگوں کے لیے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے کہ مسلمان رہنے کی صورت کیا ہے؟

اس دین کے دشمنوں نے صدیوں اس بات پر بڑی کوشش کی ہے اور آج بھی اسی مکر و فریب میں مشغول ہیں کہ اس تلخ حقیقت کے شعور اور اس کا دو بدو سامنا کرنے سے اسلام پسندوں پر جو ہراس طاری ہو سکتا ہے اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ اسلام پسند لوگوں کو اس اعلان سے یک گونہ اضطراب لاحق

ہو جائے گا کہ اس دین کا وجود ہی اس دم سے موقوف ہو چکا ہے جب سے مسلمانوں کے سماج نے اپنے تمام... امور و مسائل میں صرف اللہ کی شریعت کو حکمراں بنانا ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ ایسا کرتے ہی وہ حاکمیت (یا الوہیت) کو اللہ سبحانہ کے ساتھ مخصوص کرنا چھوڑ بیٹھے ہیں۔ — کیونکہ صرف اللہ کے حاکم ماننے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اُس کا قانون نافذ کیا جائے، یا کم از کم یہ اس کا لازمی اور ناگزیر تقاضا ہے۔

اسلام کے یہ بد باطن، مکار دشمن اسلام پسندوں کے اندیشہ و اضطراب سے غلط فائدہ اُٹھا کر انسانوں کی اس کثیر تعداد کو غافل اور بےحس بنا دینا چاہتے ہیں جو بھی چاہتی ہے کہ مسلمان بن کر رہے۔ یہ انہیں اس مغالطہ میں رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ عملاً مسلمان ہی ہیں، اسلام کے ساتھ سب خیریت ہے اور انسان اپنے اوپر اس دین کے قانون کو نافذ کیے بغیر بھی 'مسلمان' رہ سکتا ہے، بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ یہ عقیدہ رکھیں کہ حاکمیت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ اور جو انسان اپنے لیے حاکمیت کا دعویٰ دار ہوگا وہ کفر کا مرتکب ہوگا۔ اور اس دین سے خارج ہو جائے گا۔

اس مکر و فریب کا جال اتنا پھیل چکا ہے کہ مستشرق ولفرڈ کینٹول اسمتھ نے ایک پوری کتاب "اسلام دورِ حاضر میں" بنیادی طور پر یہ ثابت کرنے کے لیے لکھی ہے۔ ترکی کا وہ سیکولرزم جس کا علمبردار اتاترک تھا۔ "اسلامی" ہے۔ بلکہ یہی سیکولرزم دورِ حاضر کی تاریخ میں واحد کامیاب "اسلامی تحریک" ہے۔ جو مسلمان اسلام کا وجود برقرار رکھنا چاہتے ہیں ان کو اسی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے کیونکہ یہی واحد صحیح طریقۂ کار ہے۔

فساد اس درجہ بڑھ چکا ہے لہٰذا ہمیں بھی اس کے مقابلے میں اس حقیقت کا اعلان کرنا ضروری ہے جس سے بہت سے ایسے لوگ ڈرتے ہیں جو مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں اور اس لیے یہ تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں کہ اس دین کا وجود موقوف ہو چکا ہے...... تا کہ اس دین کے دشمن اس دین کے شیدائیوں کو جو مغالطہ دے رہے ہیں اس کا پردہ چاک ہو۔

اس اعلان کے نتیجہ میں یاس و حسرت کی جو تلخیاں نمودار ہوں ان سے ہمیں گھبرانا نہ چاہیئے۔ کیونکہ ہمیں پورا یقین ہے کہ مستقبل اسی دین کا ہے۔ اور اس کے وجود کا یہ ٹھہراؤ ہمیشہ کے لیے نہیں، بلکہ اب زیادہ عرصہ باقی نہ رہے گا۔ صلیبی اور صہیونی سامراج زمین میں جتنے بلبلے بھی چھوڑ رہے ہیں وہ عنقریب بیٹھ جائیں گے۔ جیسا کہ حباب بر آب کا انجام ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا اور چمکدار ہو۔

یہ دین جو عارضی طور پر ناپید ہو گیا ہے اُس کی جڑیں اس زمین میں بڑی گہری ہیں، اور اس سے

زیادہ گہری جڑیں وہ انسانی فطرت میں رکھتا ہے۔ بارہ صدیوں تک اس دین کا زمین پر عملاً موجود رہنا اس بات کی ضمانت ہے کہ اسے اس سرزمین سے محو نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ کی فطرت کو جس کے مطابق اس نے انسان کو بنایا ہے صلیبی اور صیہونی سامراج کی سازشیں ہمیشہ دبا کر نہیں رکھ سکتیں۔ اس سرزمین پر جہاں بارہ سو سال سے زیادہ عرصہ تک اس دین کا وجود عملاً متحقق رہا ہے مستقبل بھی اسی دین کے لیے ہے۔ یہی بات دنیا کے ان دوسرے ملکوں کے بارے میں بھی صحیح ہے جہاں فطرت ان مذاہب، نظاموں اور احکام سے نبرد آزما ہے جو اس پر مسلط کر دیئے گئے ہیں۔

یہ ہے اس دین کا حال ــــ کہ اس کا وجود موقوف ہے۔ کیونکہ یہ دین پایا جائے گا تو اسی مفہوم میں جو اللہ کو مطلوب ہے، یعنی یہ کہ انسانی زندگی میں صرف اسی کا حکم چلے۔ اور اس کے ذریعہ زمین پر بھی اللہ ہی کی الوہیت اسی طرح عملاً متحقق ہو جس طرح وہ آسمان پر عملاً قائم ہے۔ یعنی اس کے احکام کی پیروی اور شریعت کی اتباع کے ذریعہ اسی طرح بالفعل قائم ہو جس طرح قضاء و قدر کے ذریعہ قائم ہے، اور اللہ کے اس ارشاد کے مطابق کر دکھایا جائے کہ :

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَآءِ إِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ إِلٰهٌ (الزخرف : ۸۴)

”وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا۔“

اور یہ ہے اس دین کا مستقبل ــــ اس دین کے دوبارہ وجود میں آنے کی فوری اور قوی اُمید ــــ ایسی امید جسے اس کے وجود کی طویل تاریخ تقویت بخشتی ہے اور فطرت میں اس کا راسخ وجود مزید استحکام عطا کرتا ہے

البتہ اس فوری اور قوی امید کا مطلب یہ نہیں کہ ہم عارضی طور پر اس وجود کے ٹھہر جانے کے تاریخی اسباب پر بحث نہ کریں۔ آج اس کے وجود کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں اُن کا جائزہ نہ لیں۔ اور اسے عملاً وجود میں لانے کے لیے اولین مرحلے میں جو کوششیں لازماً درکار ہوں گی ان کا پتہ نہ لگائیں۔

گزشتہ باب میں ہم اس صدمے کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جو مسلم معاشرہ کو اپنے ابتدائی دور میں پہنچا تھا۔ یہ صدمہ بنی امیّۃ کا اس معیارِ بلند سے گر جانا تھا جس پر یہ معاشرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کے زمانے میں فائز تھا۔

اب ہم اختصار کے ساتھ ان اہم صدمات کی طرف اشارہ کریں گے جو اِس دین کو وقتاً فوقتاً پہنچے

رہے اور جن کے مقابلہ پر یہ اس طویل عرصے میں ثابت قدمی کے ساتھ جما رہا۔

سب سے پہلا صدمہ عباسی حکومت کے قیام اور اس کے ایسے عناصر پر بھروسہ کر لینے سے پہنچا جو اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ ابھی یہ عناصر اسلام کے حق میں پوری طرح یکسو نہیں ہوئے تھے۔ قومی تعصب ان کے مزاج میں راسخ تھا اور ان کا اسلام اس عصبیت سے بری طرح متاثر ہوتا رہتا تھا۔ آگے چل کر عباسی حکومت نے ان لوگوں کو چھوڑ دیا جن کے سہارے وہ اب تک قائم تھی اور جو اب کچھ کچھ اسلام کے رنگ میں رنگتے چلے جا رہے تھے۔ ان کو چھوڑ کر اس نے ترک، شراکیہ، ویلم اور دوسری قوموں پر اعتماد کیا حالانکہ یہ لوگ حقیقی اسلام سے یکسر نابلد تھے۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ حکومت نے بالکل خلافِ اسلام عناصر پر بھروسہ کیا اور اس کے نتیجے میں خود اس کا اثر قبول کرنے لگی۔ ان عناصر اور خود حکومت کا مقابلہ کرنے والی اور ان کے علی الرغم اسلام کو باقی اور زندہ رکھنے والی اگر کوئی چیز تھی تو روحِ اسلام تھی، کیونکہ وہ زبردست قوت حیات اور مخفی طاقت کی حامل ہے۔

اس کے بعد تاتاریوں کے تباہ کن حملے ہوئے جنھوں نے پورے عالم اسلامی کو وحشت انگیزی سے تاراج کر دیا۔ بالآخر اسلام نے خود تاتاریوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اس طرح جذب کر لیا کہ وہ اس کی قوت و استحکام کا ذریعہ بن گئے۔ مگر قبل اس کے کہ یہ عمل تکمیل کو پہنچتا ان حملوں نے اسلامی اسپرٹ کو شدید صدمہ پہنچا دیا اور اسلام کے اداروں اور رسوم پر گہرے اثرات مرتب کر دیئے۔ اگرچہ اسلامی حکومت تاتاریوں کے حملے کے سامنے نہ ٹھہر سکی لیکن خود امتِ اسلامیہ باہم مربوط اور طاقتور رہی۔ امت بعض مخصوص قوانین کے سلسلہ میں دینی اصولوں سے دور چلی گئی مگر فی الجملہ دین کی بنیادوں پر قائم رہی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ رومن امپائر جس کو بنیادیں مستحکم کرنے اور ترقی کرنے کے لئے تقریباً ایک ہزار سال کا موقع ملا تھا ہن اور گوتھ Goth قوموں کے حملوں کے سامنے ایک صدی بھی نہ ٹھہر سکی اور اس طرح برباد ہوئی کہ چند علامات و آثار کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا۔ اس کے برعکس اسلامی حکومت کو دیکھیے کہ اسے جڑیں پکڑنے اور استحکام کے لیے بمشکل نصف سے کچھ زائد وقت ملا تھا مگر وہ حکمراں خاندانوں کے باہمی جھگڑوں اور تاتاریوں اور دوسری قوموں کے حملوں کے علی الرغم ایک وسیع خطۂ زمین پر مسلسل قائم رہی۔ اسلام نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کی کتنی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔

آگے بڑھیے تو مغرب میں طرابلس کی ٹریجڈی اور مشرق میں صلیبی جنگ کا المیہ نظر آتا ہے۔ اسلام پہلے

صدمہ کو برداشت نہ کرسکا، لیکن دوسرے سے فتحیاب ابھرا اور آج تک صلیبی جنگوں والی ذہنیت کی وحشیانہ دشمنی کا، خواہ وہ پوشیدہ طور پر ہو یا کھلم کھلا، مسلسل مقابلہ کرتا چلا آرہا ہے۔

مگر جس ٹریجڈی نے اسلام کی کمر توڑ دی وہ عہدِ حاضر میں رونما ہوئی جب یورپ ساری دنیا پر چھا گیا اور صلیبی استعمار کا منحوس سایہ سارے عالم اسلامی پر پڑنے لگا۔ اس نے اسلامی اسپرٹ کو فنا کر دینے کے لئے اپنی ساری قوتیں اکٹھا کر لیں۔ جو دشمنی اس نے صلیبی جنگوں سے ورثہ میں پائی تھی اس سے تحریک اور جذبہ حاصل کیا۔ مادی طاقت اور تمدنی ترقی کو ساتھ لیا۔ دوسری طرف امتِ مسلمہ جس داخلی ضعف اور انتشار کا شکار تھی۔ اور اس طویل عرصہ میں رفتہ رفتہ اپنے دین کی حقیقی تعلیمات و ہدایات سے دور ہو گئی تھی۔ اس نے استعمار کا کام آسان تر کر دیا۔

اسلام اور مغرب

ہم کو ظاہری باتوں سے صلیبی ذہنیت رکھنے والی اس گہری دشمنی کے بارے میں دھوکہ نہیں ہونا چاہیئے جو یورپ کی سرشت میں داخل ہے۔ ہمیں مذہبی آزادی کے احترام کے ڈھونگ سے مغالطہ نہ ہو، نہ ہم اس خیالِ خام کا شکار رہوں کہ اب گزشتہ زمانے کی طرح ایسے محرکات باقی نہ رہے جو یورپ کو اسلام دشمنی پر اُبھاریں۔ لہذا آج وہ مسیحیت کے مفاد کی خاطر اس طرح کمربستہ نہیں جس طرح صلیبی جنگوں کے دوران میں تھا۔

یہ سب محض مغالطہ ہے، خالص فریب۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں لارڈ ایلبن نے Allenby نے یہ کہہ کر یورپ کے ضمیر کی بالکل صحیح ترجمانی کی تھی کہ "صلیبی" جنگیں درحقیقت آج ختم ہوئی ہیں"، سوڈان کا گورنر بھی اس وقت اسی ضمیر کی ترجمانی کر رہا تھا جب اس نے جنوبی سوڈان میں حکومت کے سارے وسائل اور ساری قوتوں کو مشینریوں کے تابع بنا دیا تھا اور مسلمان تاجروں کو اس علاقہ سے گزرنے سے بھی روک دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بڑا معنی خیز ہے۔ ایک سرکاری ملازم نے جو عرصہ سے جنوب میں متعین تھا شمال کی طرف تبادلہ کے لئے متعدد درخواستیں دیں۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر اسے ایک تدبیر سوجھی اور اس نے ایک دن بلند آواز سے نماز کے لیے اذان دی۔ یہ چیز دوسرے ہی دن اس کے تبادلہ کی وجہ بن گئی۔

واضح رہے کہ انگلستان دوسرے یورپین ممالک کی بہ نسبت دوسرے مذاہب کے ساتھ اپنی پالیسی میں زیادہ روادار، اخفاء سے کام لینے والا اور ہوشیار واقع ہوا ہے۔

بعض لوگوں کو واقعتاً تعجب ہوتا ہے کہ اسلام کے خلاف تعصب یورپ کے شعور میں اتنی شدت کے ساتھ کیسے باقی رہ سکتا ہے جب کہ یورپ خود مسیحیت سے بیزار ہوچکا اور وہ فضا ہی ختم ہوگئی جب اس کے کانوں میں صرف پادریوں اور یروشلم کی زیارت سے واپس آنے والوں ہی کی آوازیں گونجا کرتی تھیں جیسا کہ صلیبی جنگوں کے زمانے میں تھا۔ مگر ہم ذیل کے دو حقائق پر غور کرتے ہیں تو یہ تعجب ختم ہوجاتا ہے۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ صلیبیوں نے جو شر پھیلایا ہے وہ صرف تلواروں کی جھنکاروں تک ہی محدود نہیں تھا۔ بلکہ اصلاً اور اولاً وہ ایک تہذیبی فساد تھا۔ یورپ کی فکر کے مسموم ہونے میں سب سے بڑا دخل اس بات کو حاصل ہے کہ یورپ کے لیڈروں نے اسلامی تعلیمات اور اس کے اعلیٰ اقدار کو مغرب کے جاہل عوام کے سامنے مسخ کرکے پیش کیا۔ اس وقت یورپ والوں کے ذہن میں اس مضحکہ خیز خیال نے جگہ بنالی کہ اسلام حیوانی جذبات اور شہوانیت پر مبنی دین ہے، اس کی عبادات دکھاوے کے مظاہر ہیں اور قلب کے تزکیہ و تطہیر سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ یہ خیال جس طرح راسخ ہوا تھا اسی طرح باقی رہا۔ اسی دور میں محمد رسول اللہ کی توہین (معاذاللہ) "میرا کتا" کہہ کر کی گئی تھی۔[1]

بغض و کینہ کے یہ تخم ہر چہار طرف بو دیئے گئے تھے۔ صلیبیوں کی حمیتِ جاہلیہ نے یورپ کے مختلف علاقوں میں پر پرزے نکالے۔ اسی ذہنیت نے اندلس کے عیسائیوں کو اس بات پر ابھارا کہ اپنے ملکوں کے کاندھوں کو بت پرستوں کے جوئے سے آزاد کرنے کے لئے جنگ کریں۔ اسلامی اسپین کی مکمل تباہی میں کئی صدیاں لگ گئیں۔ عرصۂ دراز تک یہ جنگ بائی کاٹ اور محاصرہ کی شکل میں جاری رہی۔ اس عرصہ میں یورپ میں اسلام دشمنی کی جڑیں گہری ہوتی گئیں اور پھیلتی گئیں۔ جنگ کا انجام یہ ہوا کہ اسپین میں اسلامی دور کو ایسی وحشت و بربریت اور ظلم و ستم کے ذریعہ جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا کہ اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اس کامیابی پر پورا

---

[1] (Mahomed) اور (Mahound) دونوں کے ظاہر کا موازنہ ma متکلم کی شاہانہ ضمیر ہے اور ہاؤنڈ (Hound) جرمن لفظ (Hound) سے بنا ہے جس کے معنی کتے کے ہیں۔ یہ توہین کرنے والے ان دونوں الفاظ کی صوتی مماثلت سے کھیلا کرتے تھے۔ یعنی "ماہومد اور ماہنڈ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " اسلام دوراہے پر۔

مصنف محمد اسد لیوپولڈ ریس۔

یورپ مسرت و شادمانی کے غلغلوں سے گونج اٹھا۔ اگرچہ یہ لوگ یہ جانتے تھے کہ اس کے نتیجہ میں وہاں علم اور تمدن کو بھی فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اس کی جگہ قرونِ وسطیٰ کی جہالت دبربریت کا دور دورہ ہوگیا۔"

"قبل اس کے کہ اسپین میں ان حوادث کا طوفان تھمنے کو آتا اور سکون کے حالات پیدا ہوتے ایک واقعہ اتنا زبردست رونما ہوا جس نے مغربی دنیا اور اسلام کے تعلقات کو بد سے بدتر کر دیا۔ یہ واقعہ قسطنطنیہ کا ترکوں کے ہاتھ میں چلا جانا تھا۔ یورپ کے نزدیک بیزنطیوم (قسطنطنیہ) یونان وروما کی قدیم شان وشوکت کا آخری مظہر تھا۔ وہ اسے ایشیا کی مذہبی اقوام کے مقابلے میں یورپ کا "محفوظ قلعہ" سمجھتے تھے۔ اب قسطنطنیہ کے سقوط سے گویا اسلام کے ریلے کے لئے یورپ کے دروازے کھل گئے۔ اس کے بعد کی صدیوں میں جو جنگ سے برپا ہیں اسلام دشمنی صرف تہذیبی دشمنی نہیں رہی بلکہ اب مسئلہ ایک اہم سیاسی مسئلہ کی شکل اختیار کرچکا تھا۔ اس نئے عنصر نے اس دشمنی کو شدید تر بنا دیا۔"

"ان تمام باتوں کے پہلو بہ پہلو یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نزاع سے یورپ نے بہت فائدہ اٹھایا۔ نشاۃِ جدیدہ یعنی یورپ میں علوم وفنون کے احیاء کو اکثر مغرب ومشرق کے درمیان مادی ربط کا مرہونِ منت قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس نے اس سلسلہ میں اسلامی خصوصاً عربی ماخذ سے بہت استفادہ کیا ہے۔ درحقیقت یورپ نے اس ربط واتصال سے اس سے کہیں زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ جتنا عالمِ اسلامی کو ہوا۔ لیکن یورپ نے اس احسان کا اعتراف نہیں کیا۔ کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا۔ کہ یورپ کی اسلام دشمنی کچھ کم ہو مگر عملاً اس کا نتیجہ الٹا ہوا۔ جتنا زمانہ گزرتا گیا۔ یہ دشمنی بڑھتی گئی۔ اور بالآخر ایک عادت بن گئی۔ لفظ "مسلم" کے ہر ذکر کے ساتھ یورپ کا قومی شعور تمتما اٹھا۔ یہ چیز ان کے یہاں ضرب المثل میں داخل ہوگئی اور یورپ کے ہر مرد اور عورت کے دل ودماغ میں سما گئی۔ اس سے زیادہ موجب حیرت یہ بات ہے کہ تمام تہذیبی تبدیلیوں کے باوجود یہ خصلت باقی رہی۔ آگے چل کر مذہبی اصلاح کا دور آیا۔ یورپ مختلف فرقوں میں تقسیم ہوگیا اور ہر فرقہ دوسرے کے خلاف مسلح ہوکر میدان میں اتر پڑا لیکن اسلام دشمنی ان تمام فرقوں میں مشترک تھی۔ پھر وہ زمانہ آیا جب خود دینی احساس پر مردنی چھانے لگی، مگر اسلام دشمنی اس دور میں بھی جاری رہی۔ اس حقیقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مشہور فرانسیسی فلسفی اور شاعر والٹیر Voltair جو اٹھارہویں صدی میں عیسائیت اور اس کے کلیسا کے سخت ترین مخالفین میں سے تھا۔ اسلام اور پیغمبرِ اسلام سے بھی شدید ترین بغض رکھتا تھا۔ اس کے تین سال بعد وہ دور آیا جب مغربی علمائے دوسری تہذیبوں کا مطالعہ شروع کیا اور ان کی طرف قدرے ہمدردانہ

ذہنیت کے ساتھ متوجہ ہوئے مگر اسلام کے سلسلہ میں جو حقارت آمیز رویہ ان کو ورثہ میں ملا تھا وہ اب بھی ان کی علمی گفتگوؤں میں غیر معقول تعصب کی شکل میں جاری رہا۔ تاریخ نے یورپ اور اسلام کے مابین جو خلیج حائل کر دی تھی وہ اب بھی باقی رہی اسلام کی تحقیر یورپ کے فکر کا ایک بنیادی خاصہ بن گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ حال تک مستشرقین میں پیش پیش وہ لوگ تھے جو ساتھ ہی اسلامی ممالک میں سرگرم عمل عیسائی مبلغ بھی تھے۔ وہ اسلام کی تعلیمات کی جو مسخ کردہ شکلیں سامنے لاتے تھے۔ ان کو اس انداز پر ڈھالا جاتا تھا کہ 'بت پرستوں' کی طرف سے یورپ کے نقطۂ نظر کو متاثر کر سکے۔ یہ فکری کجی اب بھی باقی ہے اگرچہ استشراقی علوم Oriental Studies مشنریوں کے اثر سے آزاد ہو گئے اور اب یہ عذر بھی پیش نہیں کیا جا سکتا کہ ان علوم کے غلط مذہبی تعصب کی وجہ مشنریوں سے ان کا موروثی تعلق ہے مستشرقین کی اسلام دشمنی ایک موروثی خصلت اور طبعی خاصہ ہے۔ جو صلیبی جنگوں اور ان سے وابستہ دوسرے عوامل کے اُن اثرات کا نتیجہ ہیں جو انہوں نے یورپ کے قدیم باشندوں کے ذہنوں پر مرتب کیے تھے۔"

"بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی پرانی نفرت' جو اصلاً دینی تھی اور عیسائی کلیسا کے روحانی تسلط کی وجہ سے اس زمانے میں ممکن ہو سکی تھی' اب بھی یورپ کے ذہن پر چھائی رہے، جب کہ مذہب کا مسئلہ اب یورپ کے لئے بجز ایک گزری ہوئی بات کے اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

"اس طرح کی 'نفسیاتی' گرہیں قابل تعجب نہیں، کیونکہ علم نفسیات کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ انسان تمام اعتقادات کو بھول جاتا ہے جو اسے بچپن میں سکھائے جاتے ہیں مگر بعض مخصوص قصوں کا اثر کبھی زائل نہیں ہوتا جو کہ ان بھولے ہوئے اعتقادات سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ قصے اور روایات اس انسان کی زندگی کے ہر دور میں ہر طرح کے عقلی دلائل کا مقابلہ کرتی رہتی ہیں۔ یہی حال اسلام کے سلسلہ میں یورپ والوں کا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو مذہبی احساس اسلام سے نفرت کے باعث بنا تھا وہ ایک مادیت زدہ زندگی کے غلبہ کی وجہ سے اپنی موت آپ مر گیا لیکن اس کے باوجود وہ قومی نفرت اب بھی یورپ کی ذہنیت کا ایک جزو لاینفک بنی ہوئی ہے۔ ہر فرد کے ذہن میں اس نفرت کی شدت یکساں نہیں۔ لیکن ہر فرد کے ذہن میں اس کا وجود قطعی ہے۔ صلیبی جنگوں کی اسپرٹ ایک چھوٹے پیمانے پر سہی ہمیشہ یورپ کے ذہن پر چھائی رہی۔ عالم اسلامی کے سلسلہ میں یورپین تہذیب کا موجودہ موقف بھی اس روایتی "مجاہد" کی یاد تازہ کر دیتا ہے جو جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ میں اتر چکا ہو[1]

---

[1] اسلام دوراہے پر، لیوپولڈ ویس محمد اسد۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کی صلیبی سامراجیت کے لئے اس بات کو نظر انداز کر دینا ناممکن ہے کہ اسلامی روح سامراجیت کی راہ میں ایک زبردست روڑا ہے جسے پارہ پارہ کر دیئے یا اپنی جگہ سے ہٹا دیئے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ بعض زر خرید یا فریب خوردہ لوگوں کی یہ بات بالکل لغو ہے کہ یورپ دین و مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اسے کسی طاقت کا منبع نہیں سمجھتا اور اگر عالم اسلامی سے کچھ خطرہ محسوس کرتا ہے تو صرف اس کی مادی طاقت کے سبب۔ دین دراصل نام ہے ایک روحانی قوت کا جس میں مادی قوتوں کو اکسانے اور ابھارنے کی بے پناہ تاثیر پنہاں ہے۔ پھر اسلام اور مسیحیت میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اسلام ہر طرح کی بنیادی تیاریاں کرنے تم کر مقابلہ کرنے اور ہر طرح کی قربانیاں دینے پر ابھارتا ہے اور کمزوری کا شکار ہو کر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے والو کو دنیا اور آخرت دونوں میں برے انجام کی دھمکی دیتا ہے:۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔ (الانفال: ۶۰)

”اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لئے تیار رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ کر سکو۔“

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ

(النساء: ۱۴۴)

”اے ایمان لانے والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔“

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ

(النساء: ۷۴)

”اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیئے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کریں۔“

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ (آل عمران: ۱۳۹۔۱۴۰)

”دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔“

معلوم ہوا کہ دین ایک روحانی قوت ہے اور مادی طاقت بہم پہنچانے کے لیے ایک للکار بھی ہے۔ دین ہر حملے کے مقابلے میں خود ایک چٹان ہے اور جم کر مقابلہ کرنے کی تلقین بھی ہے۔ امریکی اور یورپین استعمار کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس دین کا دشمن بن کر رہے۔ اسلام دشمنی کے مظاہر مختلف قوموں کے طرزِ استعمار کے ساتھ مختلف ہوتے رہتے ہیں اور احوال وظروف کے ساتھ نئی نئی شکلیں اختیار کر رہے ہیں۔ مثلاً فرانس نے مغرب کے سارے عرب ممالک میں اسی دشمنی کے تحت بربر قوم کی محافظت یا کسی اور بہانے کے سارے اسلام کے خلاف کھلم کھلا جنگ کا اعلان کر رکھا ہے۔ دمشق میں اس کے نمائندے دن دہاڑے یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ صلیبی مجاہدین کی نسل سے ہیں۔ انگلستان مکر و فریب کی راہ اختیار کرتا ہے اور خاموشی اور اخفاء کے ساتھ مصر کے تعلیمی اداروں میں اپنے نفوذ کی راہیں نکالتا ہے تاکہ ایک ایسی ذہنیت پروان چڑھائے جو اسلامی زندگی، بلکہ مشرقی زندگی کی ساری قدروں کو حقارت کی نظر سے دیکھے۔ جب وہ اس ذہنیت کے حامل اساتذہ کی ایک پوری نسل کو تیار کر چکا تو اس نے ان کو کالجوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں پھیلا دیا تاکہ وہ آئندہ نسلوں کے ذہن کو اس سانچہ میں ڈھالیں اور ایسے نصاب اور لائحہ عمل تیار کریں جو اس ذہنیت کو پروان چڑھائیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے اس بات کا پورا اہتمام کیا کہ وزارتِ تعلیم کے ان مناصب سے جو رہنمائی اور پالیسی وضع کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اسلامی تہذیب کی سچی نمائندگی کرنے والے عناصر کو دور رکھا جائے۔ اس مہم کو ایک ایسے طبقہ کے سپرد کرنے کے بعد جو مصر کی عام ذہنیت کی تشکیل میں بہت زیادہ مؤثر ہے۔ انگریزوں کو اس کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ دینی رجحانات کے خلاف کھلم کھلا جنگ کریں۔ جہاں تک جنوبی سوڈان کا تعلق ہے وہاں اسے ان چالوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ وہاں اس کا جو موقف تھا وہ مسیحی مبلغین اور مسلمان تاجروں کے سلسلہ میں اس پالیسی سے سامنے آتا ہے جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اور امریکہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے اور ایسے طریقے رائج کرتا ہے کہ پورے عالم اسلامی میں اسلام کے عقیدہ، اخلاق اور تحریکیت کو پامال کر کے اسے فنا کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔

تمام استعماری ممالک اس دین کی دشمنی اور تخریب کے سلسلے میں گزشتہ کئی صدیوں سے ایک ہی روش پر چل رہے ہیں۔ اور ابھی تک وہ اس سوچی سمجھی روش پر پورے اتفاق و تعاون کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اس حقیقت کا مشاہدہ صاف طور پر اس موقف کے اندر کیا جا سکتا ہے جو مغربی اقوام نے ہر اس مسئلہ میں اختیار کر رکھا ہے جس کا اسلام سے دور یا نزدیک کوئی بھی تعلق ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں یہودیوں کا اقتصادی اثر مغرب کو اس

سمت میں لے جا رہا ہے، یا جن کے خیال میں انگریزوں کے اغراض اور اینگلو سیکسن اقوام کا مکر و کید انہیں اس روش پر چلا رہا ہے، یا جن کے نزدیک فیصلہ کن چیز مغربی بلاک اور مشرقی بلاک کا باہمی نزاع ہے۔ سب کے سب معاملہ کے ایک ایسے پہلو کو نظر انداز کر رہے ہیں جس کا ان تمام عوامل کے ساتھ اضافہ ضروری ہے۔ یہ پہلو وہ صلیبی ذہنیت ہے جو مغرب کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے اور اس کی ذہنیت میں راسخ ہو چکی ہے۔ استعمار کو روحِ اسلام سے جو خطرہ لاحق ہے اس کے تحت اسلام کی قوت کو کچل دینے کی کوشش نے سارے اہل مغرب کو اسلام کے خلاف متحد کر رکھا ہے۔ اسلام دشمنی نے اشتراکی روس اور سرمایہ دار امریکہ کو ایک صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ عالمی صہیونی تحریک نے اسلام دشمنی میں اور اس کے خلاف مغرب کی صلیبی استعماری دنیا نیز مشرق کی اشتراکی مادی دنیا دونوں میں اسلام دشمن عناصر کو متحد کرنے میں جو حصہ لیا ہے اسے بھی نہ بھولنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کر کے مدینہ آنے اور اسلامی حکومت کے قائم ہونے سے آج تک یہودیوں نے مسلسل یہی کام کیا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ان تمام طوفانوں کے باوجود جن سے اس کشتی کو شروع سے سابقہ رہا، ان اثرات کے علی الرغم جو اتنی جلد ان حملوں سے دوچار ہونے کے باعث اس کے نوزائدہ نظام پر مرتب ہوئے۔ پھر دورِ جدید میں مغربی تہذیب کے اپنے مادی اور ثقافتی طاقتوں سمیت چھا جانے اور بہت سے مسلمانوں کو اسلام کی تخریب کے لئے استعمار کا آلہ کار بنانے کے باوجود خود روحِ اسلام پوری طرح محفوظ رہی۔ جو قوت اس میں مضمر تھی وہ پوری انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی رہی۔ اور چودہ سو سال تک ہمارے دور تک عالمی سیاست اور اس کے رُخ پر برابر اثر انداز ہوتی چلی آرہی ہے۔ دنیا میں کوئی سیاسی یا عسکری حرکت نہ رہی جس میں اسلام کا کوئی حصہ نہ رہا ہو۔ یہ بات آج بھی صحیح ہے، اگرچہ دنیائے اسلام کی سماجی، معاشی اور روحانی زندگی بری طرح انتشار و اختلال کا شکار ہے۔

عالمِ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ

درحقیقت پژمردگی اور گوشہ گیری کا دور اب گزر چکا۔ اور ان زبردست حملوں کے باوجود

جو احیاء اسلام کے علمبرداروں پر ہر جگہ کیے جا رہے ہیں۔ اسلام ایک بار پھر سیلاب کی طرح امنڈ رہا ہے اسلام کے اندر مضمر قوت حیات کے یہ ایسے مظاہر ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام کے پاس قوت کا اتنا سرمایہ موجود ہے کہ ایک اسلامی زندگی کا از سر نو آغاز عمل میں لایا جا سکے۔ ایسی زندگی جو صرف آرزوں اور فال نیک کے سہارے نہیں بلکہ ایسی عملی اور ٹھوس بنیادوں پر قائم ہو جن کو آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہو۔ اسلامی زندگی کی تشکیل نو آج بکھرے عناصر کو یکجا کرنے اور تعمیر نو کی دوسری تیاریوں کے مرحلے سے گزر رہی ہے، باوجود ان مشکلات وموانع کے جن کا اسے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے اور جن کے سبب کبھی کبھی اسے رک جانے یا چند قدم پیچھے ہٹ جانے پر بھی مجبور ہونا پڑتا ہے۔ لیکن یہ مشکلات وموانع محض حباب بر آب ہیں جو خود فنا ہو جائیں گے۔ یہ موسم گرما کے بادل ہیں جنھیں ہوائیں اڑا کرلے جائیں گی۔

میں اس بات میں پختہ اور غیر مشروط یقین رکھتا ہوں کہ عالم اسلامی میں اسلامی زندگی کی تجدید ممکن ہے اور مستقبل میں اسلام صرف چند ممالک کا نہیں بلکہ دنیا کا نظام بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن میں اس یقین کے باوجود یہ نہیں چاہوں گا کہ خیالی جوش وخروش کی رو میں بہہ کر یہ دعویٰ کر بیٹھوں کہ یہ کوئی آسان کام ہے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اس راہ میں متعدد عظیم مشکلات حائل ہیں۔ بہت سے بڑے بڑے کام ایسے ہیں جن کو انجام دیئے بغیر ہم خود اسلامی سوسائٹی میں بھی حقیقی اسلامی زندگی کی تجدید کی توقع نہیں کر سکتے۔ ان عظیم مشکلات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ اور ان ضروری کاموں کی صحیح نشان دہی ایک اہم کام ہے۔ جس مقصد کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی بلندی اور اس مقصد کے لئے کمربستہ ہونے والوں پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کی عظمت، دونوں کا شعور اس بات کا تقاضا کرتا ہے۔

خواہش کے عمل کا جامہ پہننے اور امید کے عملاً بر آنے کے لئے صرف جوشیلے نعرے کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ اس راہ کی مشکلات اور ذمہ داریوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیا جائے اور جن لوگوں کو ان نعروں کے ذریعے جوش دلانا مقصود ہے ان کو اس عظیم جد وجہد پر کمربستہ کر دیا جائے جو اس راہ میں کامیابی کے لئے ناگزیر ہے۔

قدرتی طور پر عرصۂ دراز تک نظام حکومت اور روح اسلام کے درمیان جو بُعد رہا ہے اس کے سبب اب اسلامی طرز حکمرانی کو اپنانا ایک مشکل کام ہو گیا ہے۔ آج سیاسی اور سماجی نظام، زندگی کی...

مختلف قدریں اور ضابطے اور نفسیاتی اور ذہنی رجحانات چند متعین بنیادوں پر قائم ہیں جن کو بدلنا عرصہ دراز تک کافی جدوجہد کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ جتنا زیادہ زمانہ گزرتا جائے گا اتنی ہی مشکل بڑھتی جائے گی۔ اور اتنی ہی زیادہ، اتنے ہی طویل عرصہ تک جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔

زمانی بعد کے علاوہ ایک دوسرا عامل بھی کام کر رہا ہے۔ اس دنیا میں ہم اکیلے نہیں اور نہ ہم بقیہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر رہتے ہیں۔ ہمارے بہت سے مسائل و مصالح دنیا کے دوسرے ممالک سے وابستہ ہیں جن پر ایک ایسی تہذیب چھائی ہوئی ہے جو جیسا کہ ہم آگے بتائیں گے اسلامی ذہنیت کی بالکل ضد ایک دوسری ذہنیت کی حامل ہے۔ یہ بات بھی اسلامی زندگی کی تجدید نو کے سلسلے میں ہمارے قدموں کو سست کر دیتی ہے۔ اور ہماری ذمہ داریوں میں بہت سے اضافے کر دیتی ہے۔

یہ حقیقت اس آخری عامل کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیتی ہے کہ مغربی دنیا جس سے ہمارے بہت سے مفادات وابستہ ہیں، اب ہم سے بہت زیادہ طاقتور ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور کی طرح اب ہم اس پر غالب نہیں ہیں۔ نہ ہمارے پاس اتنی قوت ہے کہ ہم اس کا مقابلہ کر سکیں۔ پھر وہ ہماری اور خاص طور پر ہمارے دین کی دشمن بھی ہے۔ وہ یہ کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ ہم اسلامی نظام کی از سر نو تعمیر عمل میں لائیں اور حقیقی اسلامی زندگی کا پھر سے آغاز کریں۔ اب ایسا کرنا غیر معمولی جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔ اوسط درجہ کی کوششیں صرف اس شکل میں کارگر ہو سکتی تھیں جب ہم مغرب پر حاوی ہوتے یا کم از کم اس کے برابر طاقتور ہوتے، یا وہ ہمارا اور اس دین کا جس کی طرف ہم لوٹنا چاہتے ہیں دوست اور خیر خواہ ہوتا۔

لیکن ان باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی نظام کو دوبارہ اختیار کرنا محال ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک بہت عظیم اور دشوار کام ہے اور اس کے لئے غیر معمولی کوششوں کی ضرورت ہوگی۔ اس کا اہم تقاضا یہ ہے کہ اس پورے جوش و خروش کے ساتھ ایمان لایا جائے۔ اس کی راہ میں جو مصائب جھیلنے ہوں گے ان کو... برداشت کرنے کی جرأت پیدا ہو۔ اس کے لئے پُر مشقت اور اَن تھک کوششیں کرنا ہوں گی، ان کو جم کر کیا جائے۔ اور اس بات میں گہرا یقین پیدا ہو جائے کہ آج اسلامی دنیا اور ساری انسانیت کو اس نظام کی شدید ضرورت ہے۔ جو موجودہ نظام میں جوڑ پیوند لگا کر کام نہ چلانا چاہے بلکہ وہ از سر نو ایک مکمل جدید نظام قائم کرنے کا عزم رکھتی ہے۔

اس ضمن میں اس حقیقت کا ذکر غالباً برمحل ہوگا کہ موجودہ مغربی تہذیب پچیس سال کے مختصر سے

عرصہ میں دنیا کو دو بار عالم گیر جنگوں سے دوچار کر چکی ہے۔ دوسری جنگ کے بعد اس نے دنیا کو مغربی اور مشرقی دو مستقل بلاکوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اب ہر آن ایک تیسری جنگ کا خطرہ لاحق ہے۔ ہر جگہ اضطراب و بے چینی عام ہے۔ دنیا کے تین چوتھائی علاقہ میں فقر و فاقہ اور افلاس کا دور دورہ ہے۔ دنیا کا نظم متزلزل ہے اور وہ تعمیر نو کے لیے نئی بنیادیں تلاش کر رہی ہے۔ اس کو کسی ایسی نئی روحانی طاقت کی ضرورت ہے جو ایک بار پھر انسان کو انسانیت کے اُصول سکھا دے۔

اِن باتوں کے باوجود ہمیں مغربی دنیا کے اسلامی تہذیب کی بنیادوں کو قبول کر سکنے کی صلاحیت کے بارے میں زیادہ خوش گمانی میں نہیں مبتلا ہونا چاہیئے۔ یہ معاملہ یکسر مختلف ہے۔ بلاشبہ برنارڈ شا جیسا آدمی کہتا ہے کہ مغربی دنیا کا رُخ اُسی طرف ہے۔ وہ پیشن گوئی کرتا ہے کہ مغربی دنیا اسلام کی طرف آ رہی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"میں نے پیشن گوئی کی تھی کہ مستقبل میں محمدؐ کا دیا ہوا دین یورپ میں مقبول ہو کر رہے گا درحقیقت یہ دین آج بھی یورپ کو پسند آنے لگا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں عیسائی مذہبی طبقہ نے اپنی ناواقفیت یا گھناؤنے تعصب کی بنا پر اسلام کی تصویر کو زیادہ سے زیادہ خوفناک بنا کر پیش کیا تھا۔ دراصل وہ محمدؐ اور اُن کے دین سے نفرت میں حد سے تجاوز کر رہے تھے وہ اُن کو حضرت مسیحؑ کا دشمن سمجھتے تھے۔ میرے نزدیک یہ فرض ہے کہ محمدؐ کو انسانیت کا نجات دہندہ قرار دیا جائے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ان جیسا آدمی آج کی دنیا کی قیادت سنبھال لے تو وہ یقیناً ساری مشکلات کے حل میں کامیاب ہو سکے گا اور دنیا کو امن و فلاح سے بہرہ یاب کر سکے گا۔ آج دنیا ان دونوں چیزوں کی کتنی زیادہ محتاج ہے"۔

"انیسویں صدی کے بعض منصف مزاج مفکرین محمدؐ کے لائے ہوئے دین کی اصل قدر و قیمت کو پوری طرح سمجھ گئے تھے۔ کارلائل، گوئٹے اور گبن انہی میں سے چند ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اسلام کے بارے میں یورپ کے نقطۂ نظر میں کچھ خوشگوار تبدیلیاں رُونما ہوئیں بیسویں صدی میں یورپ اس سلسلہ میں کافی آگے بڑھ چکا ہے اور محمدؐ کے عقیدہ کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے لگا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والی صدیوں میں وہ اور آگے بڑھے اور اپنی مشکلات کے حل کے لیے اس عقیدہ کی قدر و قیمت کا پوری طرح قائل ہو جائے

میری قوم اور یورپ کے بہت سے افراد نے حال میں محمدؐ کا دین قبول کر لیا ہے۔ یہ بات ہمیں اس اعلان میں حق بجانب قرار دیتی ہے کہ اسلام کی طرف یورپ کا انقلاب شروع ہو چکا ہے۔[1]

لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ برنارڈ شا کی یہ پیشین گوئی پیشین گوئی ہی رہی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ یہ بات مسلمانوں کے شعور و احساس کے لیے افیون کا کام نہ کرے کہ وہ چین سے بیٹھ کر انتظار کرنے لگیں کہ یورپ ان کے دین کو کب قبول کرتا ہے؟ بہرحال ایسا ہونے کی توقع، کم از کم یہ کہ قبل از وقت ہے۔ اس کے دو خاص اسباب ہیں:

پہلا سبب وہ موروثی اسلام دشمنی ہے جو یورپ اور امریکہ کے مزاج میں گہری جڑیں پکڑ چکی ہے آج کل اس دشمنی میں یہ بات مزید اضافہ کر رہی ہے کہ اس روڑے کا درمیان میں حائل ہونا مشرقی اور مغربی دونوں استعماروں کے خلاف ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ رومن تہذیب کے دور سے عہد جدید تک یورپ کی ذہنیت مادی بنیادوں پر قائم رہی ہے اور روحانی نقطہ نظر کا اثر اس پر بہت خفیف ہے۔ یہ بات قدرے تفصیلی گفتگو چاہتی ہے۔ اس کی افادیت صرف اس موضوع تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ اس اہم سوال کا جواب بھی سامنے لاتی ہے کہ کیا اسلامی اور مغربی تہذیب کے درمیان باہم تعاون ممکن ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کے حدود کیا ہیں؟

پہلے باب میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ یورپ ایک دن کے لیے بھی مسیحی نہیں رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ والوں کے ایک مختصر اور کم پیداآور علاقہ میں آباد ہونے کے سبب وہاں جو کش مکش ہمیشہ جاری رہتی تھی اس نے اس بات کا موقع ہی نہیں دیا کہ مسیحیت کے فراخ دلانہ اصول ان سنگلاخ زمین میں جڑیں پکڑ سکتے۔ خود مسیحیت کے اپنے مزاج میں جو زہد، عملی زندگی سے کنارہ کشی اور مسائلِ حیات کے حل سے گریز کی جو خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ اس پر مستزاد ہیں۔ اب ہم ان دو اسباب پر ایک اور سبب کا اضافہ کرتے ہیں جس کی طرف پہلے باب میں ہم نے صرف ایک ہلکا سا اشارہ کیا تھا۔ وہ سبب یہ ہے کہ مضبوطی

---

[1] "حیاتِ محمدؐ"، مصنفہ محمد حسین ہیکل نے یہ عبارت رسالہ نور الاسلام شمارہ نمبر ۴ ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء سے نقل کی ہے۔ مترجم۔

کے ساتھ ہی ہوئی رومن ایمپائر بدستور مسیحیت کی راہوں میں حائل رہی اور یورپ کے مسیحیت قبول کرنے کے باوجود رومن ایمپائر کی تعلیمات یورپ کی نئی تہذیب کی بُنیادیں بن گئیں۔ کیونکہ یورپ کی زندگی پر مسیحیت کے اثرات بہت سطحی تھے اور کبھی گہرائی تک نہ پہنچ سکے۔

یہاں ہم "اسلام دوراہے پر" نامی کتاب سے چند فقرے نقل کریں گے جو ہماری منشا کی وضاحت کے لیے کافی ہوں گے:

"رومن ایمپائر جس فکر پر مبنی تھی وہ دوسری قوموں کو بزورِ قوت تباہ کر دینے یا مادرِ وطن کی خاطر ان کے استحصال کی فکر تھی۔ ایک مخصوص طبقہ کے آرام و آسائش کی خاطر دوسروں پر ظلم و زیادتی میں رومیوں کو نہ کوئی خرابی نظر آتی تھی نہ وہ اُسے اخلاقی انحطاط سمجھتے تھے۔ وہ "عدلِ رومی" جس کا اتنا چرچا ہے صرف رومیوں کے لیے مخصوص تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا رجحان زندگی اور تہذیب کے خالصتہً مادی تصور کی بنیاد پر ہی پنپ سکتا ہے۔ اس مادی تصور کو اس فلسفیانہ ذوق نے کچھ شائستگی ضرور بخشی تھی جس پر اُن کے یہاں زور دیا جاتا تھا، لیکن یہ تصور بہر حال ہر طرح کی روحانی قدروں سے دور تھا۔ درحقیقت رومیوں نے دین کا مزا ہی نہیں چکھا۔ ان کے روایتی دیوتا یونانی خرافات کی بھونڈی نقالی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے تھے۔ یہ محض خیالی پیکر تھے جنھیں عرفِ عام کی رعایت کرتے ہوئے گوارا کر لیا جاتا تھا۔ انھیں کبھی بھی زندگی کے عملی مسائل میں مداخلت کی اجازت نہ تھی۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ جب ان سے کچھ دریافت کیا جائے تو اپنے پروہتوں کے واسطے سے اس کا منظوم جواب دے دیا کریں۔ لیکن اُن سے یہ توقع نہیں کی جاتی تھی کہ وہ انسانیت کو اخلاقی قوانین بھی عطا کریں۔"

"یہ وہ مٹی تھی جس میں جدید مغربی تہذیب کا پودا پروان چڑھا۔ بلاشبہ اپنی نشوونما کے دوران اس نے متعدد دوسرے عوامل کا اثر قبول کیا۔ چنانچہ قدرتی طور پر وہ اس تہذیبی ورثہ میں متعدد تبدیلیاں عمل میں لائی جو اُسے روما سے ملا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مغرب کے اخلاقی رجحانات اور اس کے مقاصدِ حیات آج بھی وہی ہیں جو رومن تہذیب نے اسے عطا کیے تھے۔ چونکہ قدیم روما کی اجتماعی اور

فکری فضا ہمیشہ ـــــ نہ صرف بالفرض بلکہ واقعتہً ـــــ خالصتہً افادی تھی نہ کہ دینی، لہٰذا جدید مغرب کی فضا بھی ایسی ہی ہے۔ آج یورپ کے افراد کے پاس دین کے سراسر لغو ہونے کے لیے کوئی دلیل نہیں، نہ ہی وہ کسی ایسی دلیل کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ جدید یورپین فکر عموماً مطلق تصورِ اخلاق کو عملی مسائل و مباحث کے دائرہ سے خارج سمجھتا ہے۔ اگرچہ وہ دین کے ساتھ رواداری برتتا اور کبھی کبھی اس بات پر زور دیتا ہے کہ دین ایک عرفِ عام بن چکا ہے۔ مغربی تہذیب انکارِ خدا میں نہ صراحت اختیار کرتی ہے نہ شدت، مگر اس کے نزدیک اس کے موجودہ فکری نظام میں خدا کے تصور کا نہ تو کوئی فائدہ ہے نہ اس کی گنجائش ہے۔ مغرب نے ذہنِ انسانی کی اس عاجزی کو کہ وہ زندگی کا کلی ادراک و احاطہ کرنے سے قاصر ہے ایک شرف و فضیلت کا درجہ دے دیا ہے۔ چنانچہ جدید یورپین فرد صرف ان خیالات کو کوئی عملی اہمیت دینا چاہتا ہے جو تجربی علوم کے دائرہ میں ہوں یا کم از کم یہ کہ انسانی سماجی تعلقات کو محسوس حد تک متأثر کر سکتے ہوں۔ چونکہ وجودِ خدا کا مسئلہ دونوں میں سے کسی قسم میں نہیں آتا۔ لہٰذا یورپ کے ذہن کا میلان شروع ہی سے اس طرف ہوتا ہے کہ خدا کو کوئی عملی اہمیت نہ دی جائے۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ رجحان مسیحی طرزِ فکر سے کس طرح ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ مسیحیت، جسے مغربی تہذیب کے روحانی نظام کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، اسلام ہی کی طرح ایک مذہب ہے جو اخلاق کے مطلق تصور پر مبنی ہے۔ بلاشبہ حقیقت یہی ہے مگر اس سے بڑی غلطی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ جدید مغربی تہذیب کو مسیحیت کا پروردہ قرار دیا جائے۔ جدید مغرب کی حقیقی فکری بنیادیں ان قدیم رومن تصورات میں ملتی ہیں جو زندگی کو مطلق تصورات سے عاری خالصتہً مفادات کا معاملہ قرار دیتے ہیں۔ اس نظریہ کی ترجمانی ان الفاظ کے ذریعہ کی جا سکتی ہے: "چونکہ انسانی زندگی کے آغاز اور جسمانی موت کے بعد اس کے انجام کی بابت ہمیں کوئی قطعی علم ـــــ جو علمی تجربہ و تحقیق اور جسمانی تخمین پر مبنی ہو ـــــ حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی ساری قوتیں مادی اور ذہنی

امکانات کی تکمیل پر مرکوز کردیں۔ ہمیں ان مطلق اخلاقیات اور آدابِ زندگی کا پابند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں جو علمی ثبوت سے عاری دعووں پر مبنی ہیں۔" اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ یہ رجحان اصلاً لادینی ہے۔ جدید مغربی تہذیب کے علمی کارناموں کو مسیحی تعلیمات کی طرف منسوب کرنا ایک زبردست تاریخی غلطی ہے۔ آج مغرب کی تہذیب جس سائنٹفک مادی ترقی میں دوسری تمام تہذیبوں پر فوقیت لے جا چکی ہے، اس میں مسیحیت کا حصہ بہت کم ہے۔ یہ ترقی درحقیقت نتیجہ ہے اس طویل کش مکش کا جو یورپ کو مسیحی کلیسا سے اور زندگی پر اس کی حکمرانی سے کرنی پڑی ہے۔ آج عوام کی اکثریت کے لیے مسیحیت اسی طرح ایک رسمی چیز بن کر رہ گئی ہے جس طرح قدیم روما کے نزدیک اس کے دیوتا تھے جن سے عملی زندگی پر کوئی حقیقی اثر مرتب کرنے کی نہ توقع تھی نہ انھیں اس کی اجازت دی جا سکتی تھی۔

بلاشبہ آج بھی مغرب میں کچھ افراد ایسے ہیں جو مذہبی طرز پر سوچتے اور محسوس کرتے ہیں اور اپنے اعتقادات اور اپنی تہذیب کی اسپرٹ میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی اَنتھک کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ افراد مستثنیات میں سے ہیں۔ اوسط یورپی افراد، خواہ وہ جمہوریت پسند ہوں یا فسطائی، سرمایہ دار ہوں یا بالشویک، صنعتی مزدور ہوں یا فلسفی، صرف ایک ایجابی مذہب رکھتے ہیں اور وہ ہے مادی ترقی کی پرستش۔ یعنی یہ عقیدہ کہ زندگی کا صرف ایک مقصد ہے: زندگی کو زیادہ سے زیادہ سہل اور خوشگوار بنانا۔ یا رائج الوقت محاورہ میں "قدرت کے قہر سے آزاد کرنا"۔ اس مذہب کے مندر، عظیم الشان کارخانے، سینما گھر، کیمیائی تجربہ گاہیں، ناچ گھر اور بجلی گھر ہیں۔ اس کے مہنت اور پُجاری، بینکر، انجینیر، فلمی ستارے صنعتی لیڈر اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ طاقت اور مسرت کے لیے باہم مسابقت ہے۔ اس سے ایسے گروہ پیدا ہو رہے ہیں جو سرتاپا مسلح ہو کر ایک دوسرے کے خلاف برسرِ جنگ ہیں اور یہ تہیہ کیے ہوئے ہیں کہ جب بھی اُن کے مفاد ٹکرائیں گے وہ ایک دوسرے کو فنا کر کے رکھ دیں گے۔ تہذیبی اعتبار سے اس کا نتیجہ ایک ایسے انسان کی تخلیق ہے جس کا فلسفۂ اخلاق عملی فوائد کا تابع ہے اور جس کے پاس خیر و شر کا اعلیٰ ترین معیار مادی ترقی ہے۔"

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ آج کا یورپین ضمیر رُوحِ اسلام کو جذب کرنے اور انسانیت کی مشکلات کے حل میں اس سے مدد لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ متعدد انقلابات اور بہت سی تبدیلیوں کے بعد ایسا ہونا ناممکن نہیں رہ جائے گا، بالخصوص جب کہ خود اسلامی دنیا از سرِ نو اسلامی زندگی کی تعمیر کی طرف متوجہ ہوگی۔ ایسی اسلامی زندگی جس کے آثار و مظاہر نمایاں ہوں، بُنیادیں مستحکم ہوں، جس میں مغرب کا حقیقت پسند ذہن ایسے حقیقی اور عملی مظاہر کا مشاہدہ کر سکے جو اُس کے حواس کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں اور اس کے طرزِ فکر میں اعتدال پیدا کر سکیں لیکن ذاتی طور پر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ مغرب کے اسلامی روح سے کسی پہلو سے بھی متأثر ہونے کے لیے ابھی ہمیں پُشتہا پُشت انتظار کرنا ہوگا۔

اُوپر کی گفتگو سے یہ حقیقت بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ اسلامی طرزِ فکر جو اخلاقی مقاصد کو اعمال کی غرض و غایت قرار دیتا ہے موجودہ مغربی طرزِ فکر سے میل کھا سکے جو اخلاق کے افادی مقاصد کو منتہائے نظر بناتا ہے۔ آج جبکہ ہم ایک سچی اور صحت مند اسلامی زندگی کی تعمیر کی مہم لے کر اُٹھے ہیں ہمیں اس حقیقت کا پورا لحاظ رکھنا چاہئیے۔ ہمیں اس زندگی میں خارج سے مستعار لی ہوئی چیزوں کا جوڑ نہیں لگانا ہے کیونکہ یہ پیوند ہمارے فکر کی اصل بناوٹ سے ذرا بھی مناسبت نہیں رکھتے۔

اسلام کی طرف دعوت دینے والے بعض حضرات مغربی طرزِ فکر مستعار لے کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں مگر فکر و نظر اور طریق و مسلک کے باب میں مغربی انداز کو مستعار لے کر اسلامی زندگی کے احیاء کی کوشش میں انھیں پہلے ہی قدم پر اعترافِ شکست کرنا پڑتا ہے۔ وہ جس زندگی کی تجدید کرنے چلے تھے بالآخر اسی کو فنا کے گھاٹ اتارنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس واحد فطری طریقہ کار کو پہلے ہی قدم پر چھوڑ دیتے ہیں جس سے اسلامی زندگی کا احیاء ممکن ہے۔ یعنی یہ کہ اسلامی اُصولوں کو اپنا رہنما بنائیں جو کہ زندگی کی عمارت کی بنیاد اخلاق پر رکھتے ہیں، اور اخلاق کی آخری غرض و غایت منفعت اور مفاد کو قرار دینے کی بجائے اعمال کے اخلاقی مقاصد کو اپنا مطمحِ نظر بناتے ہیں۔

اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اسلام زندگی کے سارے معقول مقاصد کے حصول کا اہتمام کرتا ہے۔ ساتھ ہی وہ ان تمام اُمور میں اخلاقی پہلو کے تحفظ کا پورا لحاظ رکھتا ہے۔ یہ بات بھی سامنے آچکی ہے کہ اسلام کی عظیم حرکی قوت اس کی اسی خوبی میں مضمر ہے کہ وہ زندگی کو مختلف خانوں میں نہیں تقسیم کرتا۔ مقاصد اور اُن کے ذرائع کے درمیان کوئی تضاد پیدا نہیں ہونے دیتا اور

زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں کے درمیان یا انسان اور کائنات کے مزاج میں کسی تعارض کا قائل نہیں۔ اس کے برعکس وہ زندگی کو ایک اکائی قرار دیتا ہے جو کامل توافق اور ہم آہنگی کے ساتھ ان مقاصد کی طرف بڑھتی ہے۔

پس اسلام انسانیت کو زندگی کے بارے میں ایک مکمل نظریہ عطا کرتا ہے۔ یہ نظریہ مختلف حالات پر منطبق ہونے یا فروعی معاملات میں رہنمائی کے سلسلہ میں ہمیشہ ترقی اور نشوونما کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اپنی بنیاد یا رجحان کے معاملہ میں مصالحت یا پیوندکاری برداشت نہیں کرسکتا۔

اس جامع فکر کے اپنے فطری نتائج کو پوری طرح بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ اُسے مکمل طور پر نافذ کیا جائے ورنہ اس کی بنیاد یا رجحان میں ذراسی تبدیلی بھی اس میں ایسا خلل پیدا کردے گی جس کے بعد اس زندگی کی تشکیل ناممکن ہے جس کا نقشہ اسلام پیش کرتا ہے۔

جہاں تک زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ اس کُلّی فکر کی بنیاد پر تطبیق و تفریع میں نشوونما کا سوال ہے یہ ایک فطری امر ہے۔ خود اسلام کا مزاج اُسے ضروری قرار دیتا ہے، اس کی ترغیب دیتا ہے، اس کے ذرائع ووسائل فراہم کرتا ہے اور اس کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے۔ قیاس، اجتہاد، اور وہ وسیع اختیارات جو اللہ کی شریعت کے مطابق حکومت کرنے والے صاحبِ امر کو دیئے گئے ہیں۔ یہ سب ہمیشہ عملی زندگی کے ساتھ ساتھ چلنے اور اس کے نت نئے تقاضوں کی تکمیل کے لیے تطبیق و تفریع میں نشوونما جاری رکھنے کے زندہ اور فعّال ذرائع ہیں۔

صرف ایک بات کا اہتمام ضروری ہے کہ تطبیق اور تفریع اسلام کے بُنیادی اور اُصولی افکار سے بے جوڑ نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ اُن کے رُجحان کو نظرانداز کرکے کسی دوسرے رُخ پر چل پڑیں یا رُوحِ اسلام کو دغا دے کر اس کی سیدھی صاف اور طاقت ور رُوح کی بجائے کسی دوسرے اسپرٹ کو اپنالیں۔

جب اسلامی معاشرہ عملاً برپا ہو جائے گا تو اس معاشرہ پر اس دین کے قوانین کو منطبق کرنے اور اس ضمن میں اجتہاد کرنے کے لیے ایک وسیع میدان سامنے ہوگا۔ کسی جزئی مسئلہ میں کسی بات کو رَد کردینے یا قبول کرلینے کے لیے ہمارا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اسے اسلام کے بُنیادی فکر اور اس کے عام مزاج پر رکھیں جو چیز اسلام کے بُنیادی فکر اور روح کے موافق نظر آئے اُسے قبول کرلیں اور جو چیز اُن کے خلاف واقع ہوتی ہو اُسے رَد کردیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں یہ بات ایمان کی طرح راسخ اور جوش و خروش

کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہو کہ ہم ایک ایسا نظریۂ حیات رکھتے ہیں جو ان تمام نظریہ ہائے حیات سے بہتر و برتر ہے جو دوسرے مذاہب، فلسفوں یا تہذیبوں کے متبعین کے پاس رہے ہیں۔ کیونکہ یہ نظریہ اللہ کا دیا ہوا ہے جو زندگی کا خالق ہے۔

لیکن یہ ایک مجمل بات ہے اور ضرورت ہے کہ اس عظیم مقصد تک پہنچنے کے لیے جو عملی طریقے اختیار کرنے ہوں گے اُن کو وضاحت کے ساتھ سامنے لایا جائے۔ اب ہم اللہ کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ گفتگو شروع کریں گے۔

اسلامی فکر کا احیاء

اسلامی زندگی کے ازسرِ نو آغاز کے لیے یہ کافی نہیں کہ اسلامی شریعت کی بُنیاد پر نئے قوانین وضوابط بنا دیئے جائیں اور نئے انتظامی ادارے قائم کر دیئے جائیں۔ کیونکہ ان دو بنیادوں میں سے صرف ایک بنیاد ہے جن پر اسلام مطلوبہ زندگی کی تعمیر عمل میں لاتا ہے۔ اس بنیاد کا درجہ بھی ثانوی ہے پہلی بنیاد وہ صحیح عقیدہ ہے جو الوہیت کو اللہ سبحانہٗ کے لیے مخصوص سمجھتا ہو اور اس بنا پر صرف اسی کو حاکم تسلیم کرتا ہو اور اللہ کے سوا کسی کا یہ حق تسلیم نہ کرتا ہو کہ وہ حاکمیت کا مدعی ہو کر اور عملاً اپنا حکم چلا کر اُلوہیت کا دعویٰ دار ہو۔

اجتماعی عدل اس اسلامی زندگی کا ایک جزء ہے۔ یہ اسی وقت مکمل طور پر شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا جب خود یہ زندگی پوری طرح عملی شکل اختیار کرلے۔ اسے بقا کی ضمانت صرف اسی صورت دی جا سکتی ہے جب اُسے اس کی مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ اس کا حال بھی اس ضمن میں دوسرے نظاموں جیسا ہے۔ ضروری ہے کہ اس پر پوری طرح ایمان ہو اور اس کی صلاحیتوں پر کامل اعتماد ہو۔ ایسا نہ ہوگا تو یہ عدل اپنی معنوی بنیادوں سے محروم ہو جائے گا۔ اور صرف قانون کے جبر اور اجتماعی ضابطہ بندی کے دباؤ کے بل پر قائم ہوگا۔ اس جبر کی عمر صرف اس لمحہ تک ہوتی ہے جب کہ اس سے بچ نکلنے کے مواقع مل جائیں۔

اسی لیے اسلامی قانون سازی کو زیادہ آسانی کے ساتھ اتباع واطاعت میسّر آجاتی ہے، کیونکہ وہ ایک دینی عقیدہ پر بھروسہ کرتی ہے۔ ضروری ہے کہ ہم اس عقیدہ کو ازسرِ نو زندہ کرنے کی فکر کریں۔ اور اس کے گرد جو تحریفات، تاویلات اور شبہات جمع ہو گئے ہیں ان کا ازالہ کریں تاکہ یہ عقیدہ اس قانونی نظام

کی پُشت پناہی کر سکے جس کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں، اور ایک حقیقی اسلامی زندگی کا قیام ممکن ہوجائے اس طرح یہ زندگی قانون اور ہدایت و ترغیب کی ان دو بنیادوں پر قائم ہو سکے گی جن کو اسلام اپنے جملہ مقاصد کے حصول میں ذریعہ بناتا ہے۔

مگر زندگی کی تنظیم عمل میں لانے والی اسلامی قانون سازی کی فکر کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم افراد اور گروہوں کے دلوں میں اسلامی عقیدہ کو اس کی ان بنیادوں پر از سرِ نو اُستوار کرنے کی کوشش کریں جن کی وضاحت اس باب کے آغاز میں کی گئی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم ایسی ثقافت، تربیت کے ایسے ذرائع اور فکر بنانے کے ایسے طریقوں سے کام لے کر جو سراسر مغربی ہیں، اور اسلامی فکر کے دشمن ہیں، اسلامی فکر کیسے پیدا کر سکتے ہیں۔ اوّلاً یہ نظامِ تعلیم و تربیت، مادی بنیادوں پر قائم ہے جو زندگی کے بارے میں اسلام کے نظریہ کی عین ضد ہے۔ ثانیًا اسلام دشمنی اس کی سرشت میں داخل ہے خواہ یہ مقصد ظاہر ہو یا پوشیدہ۔

سچی بات تو یہ ہے کہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، اسلامی فکر کے احیاء کے لیے مغربی فکر کو ذریعہ بنا کر ہم پہلے ہی قدم پر اپنی شکست کا اعلان کر دیتے ہیں۔ سب سے پہلے اسی مغربی فکر سے نجات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک خالصتہً اسلامی طرزِ فکر اختیار کرنا ناگزیر ہے تاکہ یہ اطمینان ہو سکے کہ جو چیز اس کے نتیجہ میں جنم لے گی وہ دوغلی نہیں اصلی ہوگی۔

اسلامی فکر میں 'حاکمیت' کا تصور صرف اسی حد تک محدود نہیں کہ احکام و قوانین قبول کر لیے جائیں اور انہی کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔ اللہ کی بندگی کی صورت صرف یہی نہیں کہ صرف اسی سے شریعت حاصل کی جائے اور اسی شریعت کو جملہ امور میں فیصلہ کن قرار دیا جائے۔ اس صورت میں جب کہ ہم لفظ شریعت کو سیاسی نظام کے اُصولوں اور اس کے قوانین کے محدود معنیٰ میں استعمال کریں کیونکہ اسلامی فکر میں شریعت کے معنیٰ صرف اتنے ہی نہیں۔

اللہ کی شریعت سے مراد وہ ساری ہدایات ہیں جو اللہ نے انسانی زندگی کی تنظیم کے لیے دی ہیں۔ یہ ہدایات عقاید، اصولِ حکمرانی، معاملاتِ زندگی، حصولِ علم کے طریقوں، غرض یہ کہ عقیدہ و نظریہ، نظریہ کے مقدمات، قوانین، اخلاق اور معاملات ہر ایک سے متعلق ہیں۔ یہ ہدایات ان قدروں اور معیاروں کی صورت میں ملتی ہیں جن کو معاشرہ میں حکمراں ہونا چاہیئے۔ جن پر چیزوں، واقعات اور شخصیتوں

کو پرکھا جانا چاہیئے۔ فکری اور فنی سرگرمیوں اور علم کے تمام شعبوں کو بھی انہی ہدایات کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔

ضروری ہے کہ ان تمام امور میں اللہ ہی سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہم تشریعی احکام کی صورت میں اُس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں جہاں تک حاکمیت، یعنی اس کے اس پہلو کا تعلق ہے جو احکام و قوانین سے وابستہ ہے۔ اس کی یہ نوعیت بحیثیت مجموعی اسلامی فکر کی بنیادوں کی طرف رجوع اور ان امور سے متعلق اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت میں جو تفصیلی ہدایات ہیں ان کے مطالعہ کر کے سمجھی جا سکتی ہیں۔ اس طرح یہ بات بھی کسی حد تک واضح ہو چکی ہے کہ یہی نوعیت ان قدروں اور معیاروں کی بھی ہے جن کو معاشرہ میں رائج ہونا چاہیئے اور جن پر واقعات اور اشخاص کو پرکھا جانا چاہیے۔ ہر سماج میں رائج اقدار اسی تصور کا عکس ہوتی ہیں جو وجود، وجود اور اس کے خالق کے مابین رشتوں اور اس وجود کے مختلف پہلوؤں کے باہمی روابط نیز ان مقاصد و اہداف کے بارے میں پایا جائے جنھیں اس تصور نے معاشرہ کے مقاصد و اہداف کا مقام دیا ہو، یا یہ بتایا ہو کہ وہی انسانی زندگی کے مجموعی مقاصد ہیں۔

اس بات کو ایک مثال کی مدد سے سمجھئے۔ اسلامی تصور کے مطابق وجودِ انسانی کا مقصود عبادت ہے ــــــ یعنی یہ کہ بندوں کی بندگی سے آزاد ہو کر صرف خدا کی بندگی کی جائے ــــــ انسان کا منصب یہ ہے کہ زمین پر اللہ کی نیابت کرے اور اللہ کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کے تحت، اسی کے دائرہ میں رہتے ہوئے، زمین کی قوتوں اور وسائل و ذخائر سے استفادہ کرے۔ ان میں تجزیہ و ترکیب اور مادّی ایجاد و اختراع کے ذریعہ زندگی کو نمو بخشے اور ترقی دے۔ تاکہ وہ مادّی زندگی میں ان خوش نما اور خوشگوار چیزوں سے لُطف اندوز ہو سکے جو اللّٰہ نے اپنے بندوں کے لیے بنائی ہیں اور اپنی روحانی زندگی میں مادّی دباؤ اور تنگی سے آزاد رہ کر ترقی کر سکے۔ اسلامی تصور کے مطابق زندگی میں برتری کا معیار تقویٰ ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ (تم میں سے اللہ کے نزدیک برتر وہ ہے جو زیادہ تقویٰ شعار ہو۔) اسلام میں اخلاق و معاملات کی بنیاد تقویٰ ہے کیوں کہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور انسان کی عبودیت کا اظہار ہے، اور یہی اس کیفیت اور ان رجحانات کو جنم دیتا ہے جن پر اخلاق کی پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ ان مقدمات کو ہم اوپر واضح کر چکے ہیں، پھر بھی یہاں اُن کا دوبارہ ذکر

کررہے ہیں۔ تاکہ واضح ہوجائے کہ اسلام اپنی مخصوص قدریں رکھتا ہے جن کا منبع وہی ہے جو عقیدہ کا منبع ہے۔ کوئی دوسری چیز ان اقدار کا ماخذ نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ صرف اللہ کی الوہیت کے حضور بندگی بجالانے کا یہی تقاضا ہے۔ "اللہ کی شریعت" کے اصل مفہوم کے اعتبار سے یہ قدریں بھی اسی مفہوم کا جزء ہیں۔ شریعت کی اصطلاح آج جن محدود معنیٰ میں استعمال کی جاتی ہے فی الحقیقت اس کے معنیٰ اتنے محدود نہیں ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ مسلمان عقیدہ وفکر، اخلاق ومعاملات، اور معاشرہ میں رائج قدروں اور معیاروں کو اللہ جل شانہٗ کے سوا کسی دوسرے ماخذ سے نہیں حاصل کرسکتا۔ ان چیزوں کو صرف اللہ ہی سے حاصل کرنے کا مسئلہ عقیدہ کا مسئلہ ہے، کیونکہ انھیں اللہ کے سوا کسی اور سے اخذ کرنا صرف اللہ کی الوہیت کے حضور مکمل بندگی کے اعتراف کے منافی ہے۔ ان میں رہنمائی حاصل کرنے کی نوعیت بھی وہی ہے جو قانونی احکام کے سلسلہ میں رہنمائی حاصل کرنے کی ہے جن کے بارے میں اللہ کا حکم ہم اوپر واضح کرچکے ہیں۔

اخلاقی قدریں نہ زرعی ہوتی ہیں نہ صنعتی۔ زرعی سماج یا صنعتی سماج اپنی مخصوص علیحدہ اخلاقی قدریں نہیں رکھتا۔ بورژوا سماج اور پرولتاری سماج کے لیے الگ الگ اخلاق کا تصور غلط ہے ایسا نہیں کہ بورژوا سماج کے لیے کچھ قدریں ہوں اور پرولتاری سماج کے لیے دوسری قدریں ہوں۔ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی اخلاق الگ الگ نہیں ہوتے، نہ سرمایہ دارانہ قدریں اور اشتراکی قدریں علیحدہ وجود رکھتی ہیں۔ اخلاق یا تو اسلامی ہوگا یا جاہلی۔ قدریں اسلامی ہوتی ہیں یا جاہلی، ان کی کوئی تیسری قسم نہیں ہوتی۔ اخلاق واقدار کی ایک قسم وہ ہے جو اس تصور سے پیدا ہوتی ہے کہ ایک ہی آقائی ہے اور ہر چیز اور ہر ذی روح بندگی کے ایک ہی رشتہ میں منسلک ہے۔ اخلاق واقدار کی دوسری قسم وہ ہے جو بہت سے آقاؤں کے تصور سے جنم لیتی ہے ـــــ اگرچہ آقائیت کی شکلیں مختلف ہیں ـــــ جس کی بنیاد مختلف آقاؤں کے درمیان انسانی ضمیر کی پراگندگی اور انسانی زندگی کے بٹ جانے پر ہے اخلاق واقدار کا ایک نظام وہ ہے جو اس وجود، اپنے خالق سے اس کے رشتہ، اس کائنات میں انسان کے مقام، وجود انسانی کے مقصد اور اس کے منصب وکردار، نیز مادی کائنات، ذی روح مخلوقات اور ابنائے جنس سے انسان کے تعلقات وروابط اور پھر اُن سب کے اللہ سے تعلق کی نوعیت کے اسلامی تصور سے ابھرتا ہے۔ اخلاق واقدار کے دوسرے نظام وہ ہیں جو مختلف جاہلی تصورات سے اُبھرتے ہیں۔ اسلامی

تصور کے ماسوا ہر تصور جاہلی تصور ہے۔ یہ وہ مختلف و منتشر راہیں ہیں جو کبھی بھی خدائے واحد کی راہ سے نہیں ملتیں، وہ راہ جس کی وضاحت خدا نے اپنی کتاب میں خود کردی ہے۔ نہ کہ اس راہ کا وہ فہم جو کچھ لوگ اپنی خواہشات کے مطابق گھڑ لیتے ہیں ــــــ اور یہی وجہ ہے کہ یہ من گھڑت راہیں کبھی خدا تک نہیں پہنچا سکتیں

اجتماعی نظام، سیاسی ادارے اور اقتصادی ڈھانچے تمام تر اعتقادی تصور کی شاخیں اور اسی تصور سے اُبھرنے والی قدروں کی عملی تطبیق کا نتیجہ ہیں۔ اس وجہ سے لازم ہے کہ ان کا ماخذ اسلامی تصور کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ اور انھیں شریعت اسلامی ہی سے اخذ کیا جائے ـــــــ شریعت ان محدود معنی میں نہیں جن میں یہ اصطلاح آج کل استعمال کی جاتی ہے بلکہ اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے۔ یہ بات اللہ واحد ہی کو الٰہ تسلیم کرکے اسی کی بندگی میں سر تسلیم خم کردینے کا تقاضا ہے کہ ہم ان امور کی بابت رہنمائی صرف ہدایتِ الٰہی سے حاصل کریں۔ ان کا درجہ بھی وہی ہے جو شریعت کے موجودہ محدود معنی یعنی قانون احکام کا ہے۔ آج حاکمیت کے مفہوم کو بھی قانونی احکام صادر کرنے تک محدود کردیا گیا ہے، حالانکہ شریعت کا دائرہ زیادہ وسیع ہے اور حاکمیت کا اطلاق بھی موجودہ متداول مفہوم سے وسیع تر ہے۔

اگرچہ اس جیسی کتابیں پڑھنے والوں کے لیے یہ باتیں نہ نئی ہوں گی نہ انوکھی مگر اس پر زور دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام امور عقیدہ کے مسئلہ میں شامل ہیں، کیوں کہ ان کا تعلق بلاواسطہ اور براہ راست خدائے واحد کی مکمل بندگی کے اقرار یا عدمِ اقرار سے ہے۔

جو بات کسی قدر انوکھی ہوگی، وہ ادب، آرٹ، سائنس اور دوسرے علوم و افکار سے متعلق سرگرمیوں میں اسلامی تصور سے رہنمائی حاصل کرنا اور ہدایاتِ الٰہی کی طرف اس طور پر رجوع کرنا ہے کہ یہ بھی عقیدہ سے تعلق رکھنے والے امور ہیں اور ایسا کرنا بھی اللہ واحد ہی کو الٰہ تسلیم کرکے اس کی مکمل بندگی اختیار کرنے کا لازمی تقاضا ہے۔

آرٹ اور ادب کے ضمن میں اس موقف کی وضاحت میں ایک پوری کتاب لکھی جاچکی ہے[1] جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ادب اور آرٹ سے متعلق جملہ انسانی سرگرمیاں، انسان کے تصورات، تأثرات، ردِ عمل اور رجحانات کے انسانی اظہار سے عبارت ہیں اور یہ سب کچھ ایک مسلمان کے قلب و دماغ میں راسخ اسلامی تصور ہی کے تحت بلکہ اسی سے پیدا ہونے والی چیزیں ہیں۔ کیونکہ کائنات، ذہنِ انسانی اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلو اور کائنات و حیات اور نفسِ انسانی کے بنانے والے سے اُن کا تعلق سب اس تصور کے

---

[1] محمد قطب: منہج الفن الاسلامی۔

دائرہ میں شامل ہے۔ یہ چیزیں مسلمان کے اس مخصوص تصور کا عکس ہیں جو وہ انسان کی حقیقت کائنات میں اس کے مقام، وجودِ انسانی کے مقصد، اس کے منصب و کردار اور اس کی اقدارِ حیات کے بارے میں رکھتا ہے۔ اسلامی تصور محض نظریاتی تصور نہیں بلکہ ان تمام امور سے متعلق حقائق کا حامل ہے۔ کیونکہ وہ ایک رہنما اعتقادی تصور ہے۔ جس کی فعال تاثیر انسان کے ہر اظہار و تاثر پر چھا جاتی ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم اختصار کے ساتھ اس مسئلہ پر مزید گفتگو کریں گے۔

یہ بات کہ سائنس اور دوسرے علوم و افکار سے متعلق جملہ کوششوں میں اسلامی تصور اور الٰہی ماخذ سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ اللہ واحد ہی کو الٰہ تسلیم کر کے اسی کی بندگی کرنے کا تقاضا پورا ہو اور عقیدہ کی جہت سے مسلمان کا اسلام معتبر قرار پائے، ایسی بات ہے جس پر ہمارے لیے قدرے تفصیلی اظہارِ خیال ضروری ہے۔ کیونکہ یہ اس دور کے قارئین یہاں تک کہ ان مسلمانوں کو بھی انوکھی یا اَن کہی معلوم ہو گی جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایمان و اسلام اس وقت تک معتبر نہیں جب تک حاکمیت اور قانون سازی صرف اللہ کے لیے مخصوص سمجھی جائے۔

مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ کسی ایسے معاملہ میں ہدایتِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے ماخذ سے رہنمائی حاصل کرے جو عقیدہ، نظریۂ کائنات، عبادت، اخلاق، سماجی قدروں، یا سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام کے اصولوں اور بنیادوں سے متعلق ہو، یا جس کا موضوع یہ ہو کہ انسانی تاریخ میں کارفرما قوتیں اور انسانی سرگرمیوں کے محرکات کیا ہیں۔ یہ باتیں ایک مسلمان کسی ایسے مسلمان ہی سے سیکھ سکتا ہے جس کی دین داری اور تقویٰ پر اور اس بات پر پورا اعتماد ہو کہ وہ عملی زندگی میں بھی اپنے عقیدہ پر پوری طرح قائم ہے۔

البتہ مسلمان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ مجرد سائنس مثلاً کیمسٹری، فزکس، بیالوجی، آسٹرانومی علمِ صنعت اور علمِ زراعت، ایڈمنسٹریشن کے فنی اور انتظامی پہلو، اور مختلف کاموں کے کرنے کے عملی طریقے، نیز فنی پہلو کی حد تک طریقِ جنگ اور اسی جیسے دوسرے علوم و فنون میں جس سے چاہے تعلیم و تربیت حاصل کرے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، جب مسلم معاشرہ قائم ہو تو اس میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ اُن تمام امور کو اجتماعی فرائض سمجھتے ہوئے ہر میدان میں زیادہ سے زیادہ تیاری کی جائے اور کچھ افراد ہر میدان میں ایسی مہارت پیدا کر لیں کہ باقی افراد کے سر سے ان فرائض کفایہ کی انجام دہی کی ذمہ داری

ساقط ہو جائے۔ اگر ایسا نہ ہوسکا تو ان امور کا بقدر کفایت اہتمام نہ ہوگا اور ایسی فضا نہ بنائی جاسکے گی کہ ان تمام میدانوں میں سرگرمی جاری رہے، ترقی کرے اور اچھے نتائج سامنے لائے، پھر پورا معاشرہ گناہ گار ہوگا۔ لیکن جب تک یہ معاشرہ قائم نہ ہو مسلمان افراد کو چاہیئے کہ مسلم اور غیر مسلم ہر ایک سے ان مجرّد علوم اور عملی فنون کو سیکھیں، مسلم و غیر مسلم ہر ایک کی کوشش سے فائدہ اٹھائیں اور مسلمانوں اور غیر مسلموں سب سے کام لیں۔ کیوں کہ یہ ان امور میں داخل ہیں جن کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: "أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ" (اپنے دنیوی معاملات کے بارے میں تم زیادہ علم رکھتے ہو)۔ ان کا تعلق حیات و کائنات، انسان، وجودِ انسانی کے مقصد، نیز انسان کے منصب و کردار اور کائنات اور خالقِ کائنات سے اس کے رشتہ کی نوعیت سے نہیں ہے۔ یہ علوم و فنون اصولِ زندگی، قوانینِ حیات اور ان اداروں اور نظاموں سے کوئی بحث نہیں کرتے جن کی بنیاد پر انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تنظیم عمل میں آتی ہے۔ لہٰذا ان کے ذریعہ مسلمان کا عقیدہ بگڑ جانے اور اس کے جاہلیت کی طرف پلٹ جانے کا اندیشہ نہیں۔

جو علوم فرد و جماعت کے اعمال و احوال کی جامع تعبیر کو اپنا موضوع بناتے ہوں۔ یعنی جن کا موضوع انسان کا "نفس" اس کی تاریخ کا عمل اور کائنات، حیات اور انسان کے آغاز کا وہ پہلو ہے جس کا تعلق ماوراء الطبیعیات سے ہے (جس سے مجرّد سائنس مثلاً کیمسٹری، فزکس، آسٹرانومی، بیالوجی، طب وغیرہ نہیں بحث کرتے) ان کی نوعیت بھی وہی ہے جو قانونی احکام، اور نظامِ زندگی کے اصولی ڈھانچہ اور بنیادوں کی ہے، یہ علوم بھی عقیدہ سے وابستہ ہیں۔ ایک مسلمان ان علوم میں صرف اس مسلمان سے رہنمائی حاصل کرسکتا ہے جس کی دین داری اور تقویٰ پر اعتماد کیا جاسکے اور یہ معلوم ہو کہ وہ ان علوم میں بھی ہدایتِ الٰہی سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مسلمان کو اس امر کا احساس ہونا چاہیئے کہ یہ مسائل اس کے عقیدہ سے مربوط ہیں اور اس کے صرف خدا کا بندہ ہونے کا، یعنی اس کے اسلام کا تقاضا ہے کہ ان میں ہدایتِ الٰہی کی طرف رجوع کیا جائے۔

ان علوم کا ایک مسلمان طالبِ علم جاہلیت کے پیدا کیے ہوئے پورے لٹریچر کا مطالعہ کریگا اس لیے نہیں کہ اس مطالعہ سے ان امور کی بابت اپنا فکر بنائے بلکہ صرف اس لیے کہ یہ جان سکے کہ جاہلیت کس طرح گمراہ ہوئی اور ان علوم کو اسلامی فکر کی بنیادوں پر مرتب کرکے انسانیت کی

اس گمراہی کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔

قدیم و جدید غیر اسلامی جاہلی فکر کے پروردہ ان علوم کے مجموعی رجحانات پر جاہلیت کے تصورات کا گہرا اثر پڑا ہے، اور یہ انہی تصورات پر مبنی ہیں۔ یہ بات فلسفہ، فلسفہ تاریخ، نفسیات (باستثناء مشاہدات و تجربات کے، نہ کہ تجربات سے مستنبط نظریات کے) اخلاقیات، مذاہب کے تقابلی مطالعہ، اور (اعداد و شمار اور واقعاتی معلومات کو مستثناء کرتے ہوئے، ان سے اخذ کیے جانے والے عام نتائج کے لحاظ سے) سماجیات سب کے بارے میں درست ہے۔ ان تمام علوم یا کم از کم ان میں سے اکثر کے اصول تحقیق میں دینی فکر بالخصوص اسلامی تصور کی دشمنی کھلے طور پر یا مخفی طور پر موجود ہے۔ اس قسم کی علمی اور فکری کوششوں کا معاملہ کیمسٹری، فزکس، آسٹرونومی اور طب جیسے علوم سے یکسر مختلف ہے ——— اس وقت تک جب تک یہ مؤخر الذکر علوم علمی تجربات کے دائرہ میں رہیں اور واقعی نتائج ریکارڈ کرنے پر قناعت کریں، ان سے آگے بڑھ کر کسی نوع کی فلسفیانہ تعبیر نہ پیش کریں۔ اس طرح کے تجاوز کی ایک مثال ڈارونزم ہے جو بیالوجی میں مشاہدات اور اُن کی ترتیب و تجزیہ سے آگے بڑھ کر بغیر کسی علمی ضرورت اور دلیل کے صرف مخصوص میلانات کے تحت یہ رائے بھی ظاہر کرتا ہے کہ زندگی کے آغاز اور ارتقاء کی توجیہہ کے لیے عام طبیعی سے ماوراء کسی خارجی وجود کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک مسلمان کے لیے ایسے تمام اُمور کی بابت اُس کے سچے آقا و پروردگار کا بیان کافی ہے اور اس بیان کے مقابلہ میں ان موضوعات پر ساری انسانی کوششیں ہیچ اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ مسئلہ عقیدہ سے براہ راست تعلق رکھتا ہے ——— اس عقیدہ سے کہ الوہیت صرف اللہ کی ہے اور اسی کی مکمل بندگی کی جانی چاہیے۔ یہی عقیدہ اسلامی تصور کی بنیاد اور اس کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ثقافت پوری انسانیت کی میراث ہے۔ اس کی نہ کوئی قومیت ہے نہ وطن نہ مذہب۔ یہ بات مجرد سائنس اور اس کے عملی استعمال کی حد تک درست ہے۔ بشرطیکہ یہ علوم اپنے دائرہ سے تجاوز کر کے اپنے نتائج تحقیق کی فلسفیانہ تعبیریں نہ پیش کرنے لگیں اور نفس انسانی، انسانی اعمال و حرکات، تاریخ، آرٹ، ادب اور اظہار جذبات کی مختلف ہیئتوں کی فلسفیانہ تشریح کا ذمہ

نہ لے لیں۔ لیکن اس دائرہ سے باہر اُمور و مسائل کی بابت یہ کہنا دراصل اس عالمی یہودیت کا ایک فریب ہے جو ہر رکاوٹ کو، بالخصوص فکر و عقیدے کے روڑے کو، اپنی راہ سے ہٹا کر پوری دنیا میں یہودیوں کے نفوذ کے لیے راہ ہموار کرنا چاہتی ہے۔ یہودیت انسانیت کو یہ مغالطہ دے کر اپنے شیطانی منصوبوں کو عمل کا جامہ پہنانا چاہتی ہے۔ اس کی اولین اسکیم اس کی سُودی سرگرمیاں ہیں جس کے نتیجہ میں پوری انسانیت کی جدّوجہد کے ثمرات یہودیوں کے قائم کردہ سود پر مبنی مالی اداروں کی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں۔

اسلام کا موقف یہ ہے کہ مجرد تجربی علوم اور اُن کی عملی تطبیقات کے علاوہ ثقافت کی دو قسمیں ہیں؛ اسلامی ثقافت جو اسلامی تصور پر مبنی ہے، اور مختلف طریقوں پر مبنی جاہلی ثقافت، جس کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ کی رہنمائی کو نظرانداز کرتے ہوئے انسانی فکر کو الٰہ کا درجہ دے دیا جائے۔ اسلامی ثقافت انسان کی تمام فکری اور عملی سرگرمیوں کے لیے ایک وسیع میدان فراہم کرتی ہے اور ایسی بنیادیں، طریقے اور خصوصیات رکھتی ہے جو اِن سرگرمیوں کی ترقی اور ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کی ضامن ہیں۔

یہ جان لینا کافی ہے کہ تجربی طریقِ تحقیق نے جس پر جدید یورپ کا صنعتی تمدن قائم ہے ابتداءً اسلامی درس گاہوں میں جنم لیا تھا۔ وہاں اس طریقے کے اصول اسلامی تصورِ زندگی اور کائنات، اُس کی اصل و ماہیت اور اُس کے وسائل و ذخائر کی جانب اس تصور کے پیدا کردہ رویّہ سے اخذ کیے گئے تھے۔ پھر اسی طریقہ پر یورپ کی نشأۃِ ثانیہ ہوئی جس نے اسے مسلسل پروان چڑھایا اور مزید ترقی دی جب کہ اسلامی دنیا میں اس طریقہ کے استعمال میں پہلے تو ٹھہراؤ پیدا ہوا، پھر اُسے بالکل ترک کر دیا گیا۔ اس ترک کا سبب یہ تھا کہ بعض داخلی اسباب و عوامل کی بنا پر نیز خارج سے صیہونیت اور صلیبیت کے حملوں اور سازشوں کے نتیجہ میں اسلامی ممالک رفتہ رفتہ اپنے عقیدہ و تصور اور بنیادی طریقِ کار سے دور ہوتے چلے گئے۔ اُدھر یورپ نے اِن سے سیکھے ہوئے اس طریقِ تحقیق اور اس کی اعتقادی اسلامی بنیادوں کا رشتہ منقطع کر دیا۔ یورپ نے کلیسا سے بغاوت کی، کیوں کہ کلیسا خدا کا نام لے کر انسانوں پر ظالمانہ دست درازی کر رہا تھا۔ مگر اس نے کلیسا سے دوری اختیار کرنے کے ساتھ ہی اس طریقۂ تحقیق کو بھی اللہ سے اس کا رشتہ کاٹ کر بہت دور کر دیا۔

چنانچہ ہر زمانہ اور ہر ملک کے جاہلی فکر کے نتائج کی طرح یورپین فکر کے نتائج بھی مجموعی طور پر اسلامی تصور کی بنیادوں سے بالکل مختلف اور جداگانہ مزاج کے حامل ہو گئے۔ اب یہ ضروری ہے کہ مسلمان

صرف اپنے تصور کی بنیادوں کی طرف رجوع کرے، اور اگر وہ ایسا کرسکتا ہو تو خود براہ راست ہدایت الٰہی سے رہنمائی حاصل کرے، ورنہ کسی متقی مسلمان سے سیکھے جس کی دین داری اور تقویٰ پر اُسے اتنا اعتماد ہو کہ وہ اطمینان کے ساتھ اس سے تعلیم حاصل کرسکتا ہو۔

جہاں تک تصورِ زندگی کی بنیادوں سے تعلق رکھنے والے علوم کا تعلق ہے۔ اسلام علم کو صاحب علم سے الگ کرکے نہیں دیکھتا۔ ان بنیادوں کا اثر اس نقطۂ نظر پر پڑتا ہے جس سے انسان کائنات، حیات انسانی سرگرمیوں، اداروں، قدروں، معیاروں اور عادات و اطوار اور ان اُمور سے متعلق انسانی زندگی کے ہر پہلو کو دیکھتا ہے۔ اسلام اس بات کو گوارا کرسکتا ہے کہ ایک مسلمان کسی غیر مسلم یا کسی غیر متقی مسلمان سے کیمسٹری، فزکس، آسٹرونومی، طب، اصولِ صنعت وزراعت، یا اڈمینسٹریشن اور حساب و کتاب کی تعلیم حاصل کرے۔ ایسا کرنا بھی اسی حال میں مناسب ہے جب ان کی تعلیم دینے کے لیے تقویٰ شعار مسلمان نہ مل سکیں جیسا کہ آج کل ہے۔ یہ موجودہ صورت حال اس وجہ سے رُونما ہوئی ہے کہ ہم اپنے دین اور طریقِ کار، نیز زمین میں اللہ کے اِذن سے اس کی نیابت کے منصب اور اس کے تقاضوں سے دور ہوگئے ہیں اور ان ذمہ داریوں کو بھول گئے ہیں جو اس نیابت کی وجہ سے ان علوم و فنون کے سلسلہ میں ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اسلام کبھی اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ ہم غیر اسلامی لٹریچر سے، یا دین دار اور تقویٰ شعار مسلمانوں کے علاوہ کسی اور فرد سے اسلامی عقیدہ کے اصول، اُسکے تصورِ زندگی کی بنیادیں، اس کے قرآن کی تفسیر، اس کے نبیؐ کی احادیث اور اس کی سیرت یا اسلام کی تاریخ، اس کے معاشرہ کا طرزِ زندگی، اس کا نظامِ حکومت اور طرزِ سیاست یا آرٹ اور ادب کے سلسلہ میں اس کے اشارات کی تعلیم حاصل کریں۔

جو شخص یہ باتیں لکھ رہا ہے اس نے پورے چالیس سال پڑھنے میں گذارے ہیں۔ اس پورے عرصہ میں اس کا اصل کام یہ رہا ہے کہ انسانی علوم کے اکثر شعبوں کا مطالعہ کرے اور یہ جانے کہ اُن میں کیا باتیں مخصوص علم کا درجہ رکھتی ہیں اور کیا باتیں تہذیبی میلانات کی آئینہ دار ہیں۔ پھر اس نے خود اپنے عقیدہ و تصورِ حیات کے مآخذ کا مطالعہ کیا تو اس زبردست خزانہ کے سامنے اُسے جو کچھ اس نے اب تک پڑھا تھا ہیچ اور معمولی نظر آیا ــــــ ہونا بھی یہی چاہیے تھا ــــــ مگر اس نے اپنی عمر کے چالیس سال جس کام میں صرف کیے اس پر اسے چنداں پشیمانی نہیں، کیوں کہ اس نے جاہلیت کو اچھی طرح سمجھ لیا،

اس کی حقیقت جان لی اور یہ دیکھ لیا کہ اس میں کتنا بگاڑ، کتنی کج روی، اور کتنی پستی ہے۔ اختلاف و انتشار اور پراگندہ خیالی کس حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ جاہلیت کو اپنے بارے میں کتنا مغالطہ ہے اور اس کے بلند بانگ دعوے کتنے بے بنیاد ہیں۔ اسے اپنے ذاتی مطالعہ کی بنا پر کامل یقین ہوگیا کہ ایک مسلمان کے لیے علم و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ان دونوں مآخذ ـــــ اسلامی اور غیر اسلامی ـــــ کو ایک ساتھ اختیار کرنا ناممکن ہے۔

یہ بات میں نے اپنی طبیعت سے نہیں کہہ دی ہے۔ کیونکہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس میں ذاتی رائے کو فیصلہ کن بنانا جائز نہیں۔ اللہ کے حضور بھی یہ معاملہ اتنا دور رس ہے کہ مسلمان اس بارے میں کسی ذاتی رائے پر پورا بھروسہ نہیں کر سکتا۔ ہم نے اس مسئلہ میں اللہ سبحانہٗ کے فرمان اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو فیصلہ کی بنیاد بنایا ہے۔ اہلِ ایمان کا طریقہ یہ ہے کہ اگر وہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہوں تو جس مسئلہ میں ان کے درمیان اختلاف رائے ہو اس میں اللہ اور رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں چنانچہ ہم بھی اس مسئلہ میں اللہ اور رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اللہ سبحانہٗ مسلمانوں کے سلسلہ میں یہود و نصاریٰ کے منتہائے مقصود کے بارے میں عمومی انداز میں فرماتا ہے:

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿البقرہ: ۱۰۹﴾

"اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے، مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمہارے لیے ان کی خواہش یہ ہے۔ اس کے جواب میں تم عفو و درگذر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے (مطمئن رہو کہ) اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ الَّذِي

جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ٥ (البقرہ: ۱۲۰)

" یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔ کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔ ورنہ اگر اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے، تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ٥ (آل عمران: ۱۰۰)

" اے ایمان لانے والو! اگر تم نے ان اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔"

جب مسلمانوں کے سلسلہ میں یہود و نصاریٰ کا آخری مقصود اتنی قطعیت کے ساتھ متعین ہو گیا تو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال کرنا حماقت ہو گی کہ وہ اسلامی عقیدہ یا اسلامی تاریخ پر بحث کرتے وقت یا مسلم معاشرہ اور اس کی سیاست و معیشت کا جائزہ لیتے وقت کوئی مفید اور صحیح بات کہہ سکیں گے یا کوئی موزوں رہنمائی کر سکیں گے۔ اللہ سبحانہٗ کے اس واضح بیان کے بعد بھی جو لوگ ان کے ارادوں اور سرگرمیوں کے بارے میں کسی خوش گمانی میں مبتلا ہیں وہ صحیح معنی میں غافل لوگ ہیں

ہر خطا سے پاک خدا کے ارشاد " قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى " سے وہ واحد ماخذ متعین ہو جاتا ہے جس کی طرف ایک مسلمان کو ان تمام مسائل میں رجوع کرنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ کی رہنمائی کے ماسوا بجز گمراہی اور کچھ نہیں، اور کوئی ہدایت کسی دوسرے ماخذ سے نہیں مل سکتی۔ جیسا کہ آیت " قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى " میں حصر کے صیغہ کا استعمال واضح کرتا ہے۔ اس نص کا منشاء و مطلب واضح اور کسی دوسری تاویل سے بالا ہے۔

اسی طرح قطعی حکم دیا گیا ہے کہ جو آدمی اللہ کی یاد سے رُوگردانی کرے اور جس کی ساری تگ و دو دنیوی زندگی کے معاملات و مسائل تک محدود ہو اس سے کنارہ کشی لازم ہے۔ یہ بات منصوص ہے کہ ایسا آدمی ظن کے سوا کچھ بھی نہیں جانتا اور مسلمان کو ظن و گمان کی پیروی سے منع کیا گیا ہے۔ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ایسا آدمی صرف دنیوی زندگی کی سطحی باتیں جانتا ہے اور علم صحیح سے محروم ہے:

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی لا عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ۝
ذٰلِکَ مَبْلَغُھُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ط اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ
عَنْ سَبِیْلِہٖ لا وَھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اھْتَدٰی ۝ (النجم: ۲۹-۳۰)

"پس (اے نبی)، جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں، اسے اس کے حال پر چھوڑ دو ___ ان لوگوں کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے یہ بات تیرا رب ہی زیادہ جانتا ہے کہ اس کے راستہ سے کون بھٹک گیا ہے اور کون سیدھے راستے پر ہے۔"

یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ج وَھُمْ عَنِ الْاٰخِرَۃِ
ھُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (الروم: ۷)

"یہ لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں۔"

جو خدا کی ہدایت سے غافل ہے اور صرف دنیوی زندگی کو مقصود بناتا ہے ___ اور ظاہر ہے کہ آج سارے ماہرینِ علوم کا یہی حال ہے ___ وہ صرف اس ظاہری پہلو کا علم رکھتا ہے۔ یہ وہ علم نہیں جس کے ماہر پر مسلمان اعتماد کر سکے اور اپنے جملہ اُمور میں اُس سے رہنمائی حاصل کر سکے۔ ایسے آدمی سے صرف اس کے مادی علم کی حد تک کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ زندگی کی عمومی توجیہہ و تعبیر یا اس کے نظریاتی مسائل میں اُن سے رہنمائی نہیں حاصل کی جا سکتی۔ یہ وہ علم نہیں جس کی طرف قرآن کی آیات اشارہ کرتی ہیں اور جس کے ماہر کی وہ تعریف کرتی ہیں۔ ہر وہ علم گمراہ اور گمراہ کن ہے جو اللہ سے ہدایت طلبی نہ سکھائے۔ اور جس کی تہہ میں یہ احساس نہ کام کر رہا ہو کہ اللہ نے انسان کو وہ کچھ سکھا کر جو اُسے معلوم نہ تھا، اُسے شعور و احساس کی نعمت عطا فرما کر، نیز نوامیسِ قدرت کی تسخیر کا ملکہ عطا فرما کر اس پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ قرآن کی آیات میں جس علم کی طرف اشارہ ہے جس کی وہ تعریف کرتی ہیں وہ ایسا نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے جو آیاتِ قرآن کے سیاق و سباق سے ہٹا کر اُن سے غلط استدلال کرتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ علم صرف عقیدہ یا دینی فرائض کے علم کا نام نہیں بلکہ اس کے دائرہ میں ہر چیز شامل ہے۔ علم کا تعلق قوانینِ قدرت اور خلافتِ ارضی میں اُن کے استعمال سے بھی اتنا ہی ہے جتنا

عقیدہ اور دینی فرائض سے ۔ لیکن قرآن میں جو علم مراد ہے اور جس کے جاننے والوں کی تعریف کی گئی ہے وہ ایسا علم نہیں جو اپنی ایمانی بنیادوں سے کٹ چکا ہو ، آسٹرونومی ، بیالوجی ، فزکس کیمسٹری ، طب اور نوامیسِ قدرت اور اُصولِ صحت سے متعلق علوم اور ایمانی بنیاد کے درمیان بھی ایک رشتہ ہے یہ سارے علوم اللہ کی طرف لے جاتے ہیں بہ شرطیکہ گمراہ میلانات انھیں خدا سے دور کرنے کے لیے نہ استعمال کریں ۔ افسوس کہ یورپ نے اپنی علمی ترقی میں یہی رُخ اختیار کیا ، جس کا سبب وہ منحوس کشمکش ہے جو ہمیں خاص طور پر یورپ کی تاریخ میں ملتی ہے ۔ اس کش مکش نے یورپ کے طرزِ فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے اور اسے ایک مخصوص مزاج کا حامل بنا دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دینی تصور کی بنیاد پر ـــــــــ نہ کہ صرف کلیسا یا کلیسائی تصور کی بنیاد پر ـــــــــ زہریلے حملے فکرِ یورپ کے پیدا کردہ تمام شعبہ ہائے علم میں عام ہو گئے خواہ مابعد الطبیعی فلسفہ ہو یا خالص سائنٹفک تحقیقات ہوں جن کا بظاہر دینی موضوع سے کوئی تعلق نہ ہو ۔

یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ مغربی فکر کا طرز اور علم و معرفت کے تمام میدانوں میں اس فکر کے نتائج دینی تصور کی بنیاد پر زہریلے حملوں پر قائم ہیں ، یہ بات بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ طرز اور اس کے نتائج اسلامی تصور کے خاص طور پر دشمن ہیں ، کیونکہ یہ اُن کا خصوصی ہدف رہا ہے ۔ اکثر وہ اس بات کی دانستہ اور بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی عقیدہ اور تصور اور اسلامی مفہومات و معانی کو فنا کے گھاٹ اُتار دیں اور ان بنیادوں کو مٹا دیں جن پر مسلمان معاشرہ کا امتیاز قائم ہے ۔ اسی وجہ سے اسلامی مطالعہ و تحقیق میں مغربی طرزِ تحقیق اور مغرب کے نتائج افکار پر بھروسہ کرنا بڑی نادانی کی بات ہوگی ۔ اسی طرح مجرد سائنس کے مطالعہ میں بھی ، جن میں ہم بحالاتِ موجودہ مغربی مآخذ سے بے نیاز نہیں ہو سکتے ، اس کی پوری احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ ان کے فلسفیانہ پہلو سے پرہیز لازم ہے ۔ کیونکہ یہ فلسفیانہ تاثرات بنیادی طور پر دینی تصور ، بالخصوص اسلامی تصور ، کے دشمن ہیں اور اُن کا شائبہ بھی خالص اسلام کے چشمۂ صافی کو مسموم کر دینے کے لیے کافی ہے ۔

ذیل میں ہم خاص طور پر ادب اور تاریخ کے بارے میں تفصیلی اظہارِ خیال کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ ان کے مطالعہ کا وہ محفوظ طریقہ کیا ہے جو مسلمان بنانے اور مسلمان کے ضمیر کو اُس جاہلیت کے اثرات سے پاک کرنے کا کام کر سکتا ہے جو آج پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہے ۔

اسلامی ادب

ادب زندگی کی وہ تفسیر ہے جو ہمارا جذبہ و ادراک کرتا ہے۔ یہ اس منبع سے نکلتا ہے جس میں کسی مخصوص ماحول میں سارے فلسفے، مذاہب، تجربات اور دوسرے عوامل کے دھارے آ کر مل جاتے ہیں۔

زندگی کے بارے میں ایک وجدانی تصور کی تشکیل اور انسان کے مزاج کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں ادب مؤثر ترین عامل واقع ہوا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے پاس ایک ایسا ادب ہو جو اسلامی فکر سے ابھرا ہو۔ مناسب ہو گا کہ یہاں ہم اسلامی ادب کے منہاج پر قدرے تفصیلی گفتگو کریں۔

دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح ادب بھی ان زندہ قدروں کی، جن سے فنکار کا ضمیر متأثر ہوتا ہے، ترجمانی کا نام ہے۔ یہ اقدار مختلف افراد، مختلف حالات اور مختلف زمانوں کے لیے مختلف ہو سکتی ہیں، لیکن ان کا منبع بہرصورت زندگی کے کسی مخصوص تصور کی روشنی میں استوار ہونے والے وہ رشتے ہیں جو انسان اور کائنات، نیز انسان اور انسان کے درمیان پائے جاتے ہیں۔

ادب یا کسی بھی فنِ لطیف کو ان قدروں سے مجرّد کر کے دیکھنے کی کوشش لاحاصل ہے، جن کی وہ براہ راست ترجمانی کرنے کی یا ان تأثرات کے اظہار کرنے کی کوشش کرتا ہے جو انسان کا احساس ان سے قبول کرتا ہے۔ اگر ہمیں اس کارِ محال میں کامیابی ہو سکتی کہ ہم ان اقدار سے مجرّد کر کے دیکھ سکیں تو ہمیں بجز کھوکھلی عبارتوں، خالی خولی خطوط و نقوش، مبہم و لایعنی آوازوں اور بے ڈول اور گم سم اجسام کے اور کچھ نظر نہ آتا۔

اسی طرح خود ان اقدار کو زندگی کے بارے میں کلی فکر اور اس کی روشنی میں استوار ہونے والے ان رشتوں سے جو انسان اور کائنات، انسان اور واقعات یا انسان اور انسان کے درمیان پائے جاتے ہیں، علیحدہ کر کے دیکھنے کی کوشش بھی بے سود ہے۔ یہ بات کہ انسان کو اس کا شعوری احساس ہے کہ نہیں کہ وہ زندگی کا کوئی مخصوص تصور رکھتا ہے چنداں اہم نہیں۔ کیونکہ یہ تصور بہر حال اس کے داخل میں موجود ہوتا ہے۔ یہی اس کی نظر میں قدروں کی تعیین کرتا ہے اور وہ تأثرات بھی اس کے رنگ میں رنگے

ہوئے ہوتے ہیں جو انسان ان قدروں سے قبول کرتا ہے۔

اسلام زندگی کا ایک مخصوص تصور ہے اور اس تصور سے چند مخصوص قدریں ابھرتی ہیں۔ فطری طور پر ان اقدار کی ترجمانی یا فن کار کے داخل پر ان کے اثر کی ترجمانی ایک مخصوص مزاج کی حامل ہوگی۔

اسلام کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک عظیم، ٹھوس، فعّال اور تخلیقی قوت رکھنے والا عقیدہ ہے جو فرد کے داخل اور اس کی عملی زندگی پر پوری طرح چھا جاتا ہے اور انسان کی تمام عملی اور جذباتی قوتوں کو اپنا لیتا ہے۔ اس کے بعد کوئی ایسا خلا باقی نہیں رہتا جس میں اضطراب اور حیرت کو کوئی جگہ مل سکے یا جہاں وہ ناکارہ غور و فکر جاگزیں ہو سکے جس کا نتیجہ بجز تفکرات اور خیالی شکلوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اسلام میں سب سے نمایاں چیز اس کی ہمہ گیر عملی حقیقت پسندی ہے جو غور و فکر اور میلانات پر بھی حاوی رہتی ہے۔ اسلام میں ہر غور و فکر انسانی اور کائناتی رشتوں کا ایک ادراک یا اس ادراک کی ایک کوشش ہوتا ہے۔ وہ خالق اور مخلوق یا کائنات کی مختلف اکائیوں کے درمیان پائے جانے والے رشتوں کی تقویت اور استحکام کا باعث بنتا ہے۔ اس کا ہر میلان ایک ہدف کی تمہید یا کسی ہدف کے حصول کی کوشش ہوتا ہے خواہ وہ ہدف کتنا ہی بلند ہو۔

اسلام زندگی کو نشو و نما اور ترقی دینے کے لیے آیا ہے نہ کہ کسی خاص زمانہ اور خاص مقام پر زندگی عملاً جیسی کچھ ہو اس پر قانع کر دینے کے لیے۔ اسلام کا منشاء صرف اتنا ہی نہیں کہ انسانی زندگی میں عملاً جو محرکات یا موانع یا رجحانات و قیود کسی مخصوص عرصہ یا مدتِ طویل میں پائے جاتے ہوں ان کی ایک روئیداد پیش کر دی جائے۔

اسلام ہمیشہ زندگی کو ترقی، نشو و نما اور نئے انداز اختیار کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ انسانی قوتوں کو آزادی بخشتا ہے، اُبھارتا ہے اور بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اسلامی تصورِ حیات سے اُبھرنے والا ادب، یا آرٹ انسانی کمزوریوں کی عکاسی کا بہت زیادہ اہتمام نہیں کرتا۔ نہ اس کے پیش کرنے میں زیادہ تفصیل سے کام لیتا ہے وہ اِن کمزوریوں کو سندِ جواز عطا کرنے کی کوشش مطلق نہیں کرتا۔ کجا کہ انھیں اس دلیل کی بنا پر پسندیدہ بنا کر پیش کرے کہ یہ کمزوریاں عملاً موجود ہیں لہٰذا اُن کو چھپانے یا اُن کے وجود سے انکار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اسلام اس حقیقت کا منکر نہیں کہ انسانیت میں کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اُسے اس

بات کا بھی احساس ہے کہ انسانیت خوبیاں بھی رکھتی ہے۔ اس کا احساس یہ ہے کہ اس کا اصل کام کمزوریوں کو خوبیوں پر غالب کرنا اور انسانیت کو بلندی کی طرف لے جانا، اس کا نشوونما اور اُسے ترقی دینا ہے نہ کہ ان کمزوریوں کو سندِ جواز عطا کرنا یا اُن کو پسندیدہ بنا کر پیش کرنا۔

اسلامی تصورِ حیات سے اُبھرا ہوا ادب یا آرٹ کبھی کبھی انسان کے کمزور لمحات پر بھی رکتا ہے لیکن وہ اُن پر ٹھٹک کر نہیں رہ جاتا بلکہ اُن کی طرف اتنی ہی توجہ کرتا ہے جتنی کہ انسانیت کو ان کمزوریوں کے گڑھے سے نکالنے اور مجبوریوں کے پھندے اور دباؤ سے آزاد کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اسلیے نہیں کہ اسلامی ادب محدود معنٰی میں اخلاق کا پابند ہے، بلکہ یہ اسلامی تصورِ حیات کے مزاج کا اثر ہے اور اس حقیقت کا کہ اسلام کا منشاء زندگی کو نشوونما دینا اور ترقی بخشنا ہے۔ وہ کسی لمحہ یا عرصہ میں زندگی کی عملی صورت حال پر قانع ہو جانا نہیں جانتا۔

اسلامی نظریہ اس زمین پر انسان کی کم مائیگی اور زندگی کو آگے بڑھانے میں فرد کے حصہ کی بے حقیقتی کا قائل نہیں۔ چنانچہ اسلامی تصور سے اُبھرنے والے ادب یا آرٹ کا کام یہ نہیں ہوتا کہ وہ انسان کو اسکی کمزوریاں، خامیاں اور پستی یاد دلاتا رہتا ہے اور اس کی زندگی اور جذبات میں جو خلا پائے جاتے ہوں اُن کو حسّی لذائذ کے خوابوں اور ایسی آرزوؤں سے پُر کرتا ہے جو اضطراب، حیرت، حسد اور سلبی جذبات کے سوا اور کچھ نہیں عطا کر سکتے۔ وہ انسان کو اس کے ایسے میلانات یاد دلاتا ہے جو بلندی کی طرف لے جانے یا وسعتوں کی طرف مائل کرتے ہیں۔ وہ اس کی زندگی اور جذبات کے خلاؤں کو اُن انسانی مقاصد سے پُر کرتا ہے۔ جو زندگی کو آگے بڑھاتے اور ترقی دیتے ہیں۔ یہ مقاصد فرد کے داخل سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور عملی زندگی سے بھی۔

اسلامی فکر سے اُبھرنے والے ادب یا آرٹ کا مظہر پند و مواعظ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اظہارِ خیال کے یہ سادہ طریقے فن کاری نہیں قرار دیے جا سکتے۔

اس ادب یا آرٹ کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ انسانی شخصیت یا سماجی زندگی کو کچھ کا کچھ بنا کر پیش کرے اور انسانی زندگی کی ایسی مثالی تصویر سامنے لائے جو کوئی وجود نہ رکھتی ہو۔ وہ دیانتداری کے ساتھ انسان کی پوشیدہ اور ظاہر دونوں طرح کی صلاحیتوں کو سامنے لاتا ہے۔ وہ زندگی کے ایسے مقاصد کی ٹھیک ٹھیک تصویر کشی کرتا ہے جو انسانوں کی دنیا کے شایانِ شان ہو نہ کہ بھیڑ د ل

کے گلہ کی۔

اسلامی فکر سے اُبھرنے والا ادب یا فن مقصدی ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلام زندگی کو مسلسل آگے بڑھاتے رہنے کی ایک تحریک ہے۔ وہ کسی مخصوص دور یا کسی خاص لمحہ میں عملاً جو صورتِ حال ہو اس پر قانع ہو جانا نہیں جانتا، نہ وہ صرف اس لیے اِس صورتِ حال کو سندِ جواز عطا کرتا یا پسندیدہ بنا کر پیش کرتا ہے کہ وہ عملاً موجود ہے۔ اس کا اصل کام ہی اس عملاً موجود کو بدلنا اور بہتر بنانا ہے۔ اس کا مستقل پیغام یہ ہے کہ زندگی کی تعمیرِ نو اور تشکیلِ جدید کا کام ہر آن جاری رہے۔

اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے وہ اس مقصدی ادب اور آرٹ کی طرح ہے جو تاریخ کی مادّی تعبیر سے اُبھرتا ہے۔ مگر یہ مماثلت عارضی ہے، پھر دونوں کی راہیں بالکل جدا ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اس فن میں زندگی کو آگے بڑھانے والی قوت کا مدار طبقاتی کش مکش ہے۔ اسلام طبقاتی کشمکش کو اتنی اہمیت نہیں دیتا کیونکہ انسانی مقاصد کے بارے میں اس کا تصور اس سے بہت زیادہ بلند اور وسیع ہے۔ وہ سماجی ظلم کو نہ گوارا کرتا ہے نہ جائز قرار دیتا ہے، اور نہ انسانوں کو اس پر راضی رہنے اور اس سے "لُطف اندوز" ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس ظلم کا مقابلہ کرنا اور اس کے ازالہ کی جدّوجہد بھی اس کی جملہ مساعی میں شامل ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ اپنی انقلابی تحریک کو طبقاتی حسد کی بنیاد پر نہیں بلکہ انسان کو اوپر اٹھانے اور ضروریات کی غلامی سے نجات دلا کر شرف و عزت کا مالک بنا دینے کی خواہش پر اٹھاتا ہے، اس خواہش پر کہ انسان کی بے نظیر انسانیت کو کھانے پینے اور جسمانی ضروریات کی تکمیل میں انہماک کے پھندے سے آزاد کیا جائے۔

اسلامی تصور میں زندگی کو آگے بڑھانے کی تحریک کا مدار ساری انسانیت کو آگے بڑھانے اُوپر اُٹھانے، آزاد کرنے اور نئی تخلیقی سرگرمیوں میں لگا دینے کے عزم پر ہے۔ اس راہ میں یہ فکر مختلف طبقات کے آلام و مصائب اور مشکلات و موانع کی طرف بھی توجہ کرتا ہے تاکہ ان مشکلات کو رفع کرے اور ان مصیبتوں کا ازالہ کرے۔ وہ انسان کی مصیبتوں کو معمولی چیز نہیں سمجھتا۔ لیکن وہ ان کے ازالہ کے لیے حسد و کینہ کے ذرائع استعمال نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حسد خود ایک زنجیرِ پا ہے جو اکثر انسان کو بلندیوں کی طرف پرواز سے روک دیتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ صرف نظریاتی بحثوں اور پند و نصائح کے میدان میں نہیں بلکہ عملی زندگی میں

ان مصائب و آلام کو واقعتہً کس طرح دور کیا جائے تو ہم نے اس موضوع پر دوسری جگہوں پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یہاں ہم صرف اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی ادب یا اسلامی آرٹ، مقصدی ادب اور مقصدی آرٹ ہے۔ حیات اور انسانی تعلقات کی بابت اسلامی فکر کے مزاج کا تقاضا ہے کہ وہ مقصدی ہو۔ یہ مزاج ایک تحریکی مزاج ہے جو تخلیق و تعمیر کی طرف لے جاتا ہے اور بلند پروازی سکھاتا ہے۔ مقصدیت سے میری مراد یہ نہیں کہ تاریخ کی مادی تعبیر پر یقین رکھنے والوں کی طرح اس مقصد کو جبراً نافذ کیا جائے گا، بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسلامی تصورِ حیات انسان کے داخل کو ایک خاص کیفیت عطا کردے جس کے طفیل اس سے آرٹ کے ایسے اسالیب جنم لیں گے جو مادی تصورِ حیات یا کسی دوسرے تصورِ حیات کے پیدا کردہ آرٹ سے بالکل مختلف ہوں گے۔

اسلام فی نفسہٖ فنونِ لطیفہ کا دشمن نہیں، البتہ وہ اِن قدروں اور تصورات میں سے بعض کا مخالف ہے جن کی ترجمانی فنونِ لطیفہ آج کر رہے ہیں۔ وہ ان کی جگہ داخل کی دنیا میں، کچھ دوسرے تصورات اور دوسری قدروں کو لاتا ہے جو اس بات کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں کہ جمالیاتی تصور کا فنکارانہ اظہار کریں اور زیادہ آزادی اور بہتر حسن کاری کے ساتھ آرٹ کے نئے مظاہر سامنے لائیں جو اسلامی تصور کے مزاج سے اُبھرتے ہوں اور اس کی امتیازی خصوصیات کے حامل ہوں۔

اس سے یہ مطلب نہ اخذ کیا جائے کہ نئی پود کے لیے یورپ کا لٹریچر حرام ہے۔ ہم صرف حسنِ انتخاب اور خُذ ما صفا ودع ما کدر کی دعوت دے رہے ہیں۔ کیوں کہ اس لٹریچر میں ایسی چیزیں بھی ملیں گی جو اسلامی اسپرٹ سے ہم آہنگ ہیں۔ اس لیے نہیں کہ ان میں فضائلِ اخلاق کی تلقین اور رذائل کی مذمت کی گئی ہے، کیونکہ ادب منبر وعظ و ارشاد نہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ زندگی کو مادیت سے بلند ہوکر روحانی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اور زندگی کی معنوی قدروں کو تسلیم کرتا ہے۔ اس قسم کا ادب اپنی روح کے اعتبار سے اسلامی تصورِ حیات سے ہم آہنگ ہے، اور سلیقہ کے ساتھ انتخاب سے کام لیتے ہوئے اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ

تاریخ بھی درحقیقت ادب کی ایک شاخ ہے۔ مگر یہ ایک مخصوص مزاج کی حامل اور خاص

اہمیت کی مالک ہے۔ تاریخ واقعاتِ حیات کی تشریح و تعبیر کا نام ہے۔ اس کا فلسفہ اور زندگی کے بارے میں عمومی تصوّر سے متاثر ہونا لازمی ہے۔ ان بنیادوں پر کی ہوئی تعبیر زندگی کے بارے میں ایک ایسا تصوّر عطا کرتی ہے جو زندگی اور تاریخ کے رُجحان کی بابت اسلامی تصوّر سے بالکل مختلف ہے۔

مزید برآں چونکہ یہ مؤرخین زیادہ تر یورپین رہے ہیں لہٰذا انھوں نے عالمی تاریخ کا محور یورپ کو قرار دے رکھا ہے۔ اگر ہم مغرب کے غرورِ نفس اور خود پسندی سے چشم پوشی برتیں تو انسان کی فطری کمزوری کے پیشِ نظر انھیں ایسا کرنے میں معذور سمجھیں گے۔ اس روح کی حامل اور ایسا طریقہ اختیار کرنے والی تاریخ کے مطالعہ کے نتیجہ میں ہماری نوخیز نسلیں دو غلط نظریات لے کر آگے بڑھتی ہیں۔

پہلا نظریہ یہ ہے کہ رفتارِ زمانہ اور تاریخ پر روحانی عوامل کا ذرا بھی اثر نہیں پڑتا، یا اگر پڑتا ہے تو بہت کمزور اور خفیف۔

دوسرا یہ کہ زمانہ کو آگے بڑھانا اور اُس کا رُخ متعین کرنا صرف یورپ کا کام ہے۔ خود اسلام کو اس میں بہت حقیر اور معمولی سا دخل ہے۔

اِن دونوں تصورات کا اثر انتہائی خطرناک اور مہلک ہوتا ہے۔ حیات، کائنات اور طرزِ زندگی کے بارے میں ایک ہمہ گیر تصوّر کی تخلیق پر بھی یورپ کے جارحانہ اقدام کے بالمقابل اسلامی عزّت و مرتبہ کے شعور پر بھی۔

اپنی نوخیز نسلوں کے ذہن کو اس خطرہ سے بچانے کے لیے ذیل کے دو اقدامات ناگزیر ہیں۔

پہلا کام یہ ہے کہ ہم سارے عالم کی تاریخ، واقعات و حوادث کی تعبیر کو اسلامی نقطۂ نظر سے مرتب کرنا شروع کر دیں۔ تاکہ یہ عظیم کام صرف یورپین طرزِ فکر و نظر کا اجارہ ہو کر نہ رہ جائے۔ اِس تاریخ میں ہمیں یورپ کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا ہوگا اور اُسے مبالغہ آمیز اہمیّت نہ دیتے ہوئے تاریخ کی حرکت میں عام طور پر ساری انسانیت نے اور خاص طور پر اسلام نے جو حصّہ لیا ہے اسے نمایاں کر کے سامنے لانا ہوگا۔

اِسلامی تاریخ کی تدوینِ جدید

تاریخ واقعات کا نہیں بلکہ ان واقعات کی تعبیر کا نام ہے۔ اس کا کام ان مخفی یا ظاہر رشتوں کی دریافت ہے جو ان مختلف واقعات کو باہم مربوط کر کے ایک ہی سلسلہ کی کڑیوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس سلسلہ کے مختلف اجزاء ایک دوسرے سے متأثر ہوتے اور اُن پر اثر ڈالتے ہیں، اور یہ زمانہ اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ اسی طرح پھیلتے اور بڑھتے رہتے ہیں جس طرح کسی خاص زمان و مکان میں کوئی جسمِ نامی نشو و نما کے مراحل سے گزرتا ہے۔

کسی واقعہ کو سمجھنے، اس کی تعبیر کرنے اور اُسے اس کے ماقبل اور مابعد ہونے والے واقعات سے مربوط کر کے دیکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی یہ صلاحیت رکھتا ہو کہ انسان کے داخل کی تمام روحانی، فکری اور حیاتیاتی اقدار اور تشکیلی قوتوں کا احاطہ کر سکے، اور انسانی زندگی میں کارفرما معنوی اور مادی تشکیلی قوتوں کو سمجھ سکے۔ اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ اپنی روح، عقل اور احساسات کے دروازے واقعہ کے اثرات کے لیے کھول دے۔ اس کا شعور اس واقعہ سے جو تأثرات قبول کرتا ہو ان میں سے کسی کو رد کرنے سے پہلے اُسے کافی چھان بین اور احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

اسلامی تاریخ کو بالکل نئے انداز سے اور نئی بنیادوں پر دوبارہ مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی زندگی کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے اور بالکل نئی روشنی میں دیکھنا چاہیے تاکہ اس کے تمام راز کھل سکیں۔ اس کے جملہ انوار طلوع ہو سکیں اور وہ اپنی تمام عناصر اور تشکیلی قوتوں سمیت واضح ہو سکے۔

اس ازسرِ نو مطالعہ میں اوّلین اہمیت اسلامی مآخذ کو دینی چاہیے۔ کام کی تفصیلات میں داخل ہونے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ محقق اپنی عقل، روح اور احساسات کو اس فضا سے پوری طرح مانوس کرے اور اسی میں سانس لینے لگے جو اسلام ایک عقیدہ، ایک تحریک، ایک نظریہ اور نظامِ زندگی کی حیثیت سے رکھتا ہے، اور جو فضا اس اسلامی زندگی کی ہے جو عالمِ واقعہ میں انسانی زندگی کا ایک باب ہے۔ محقق کا اس فضا میں جا بسنا اس کے فہم و ادراک کے تمام دریچے کھول دینے کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ اس زندگی کو نہ صرف سمجھ سکے بلکہ اس کی زندہ ہستی کا ادراک کر سکے اور مختلف حوادث و واقعات کو اس ہستی میں جو مقام حاصل ہے اُسے پوری طرح سمجھ سکے۔

کسی محقق کے لیے انسانی زندگی کے کسی دور کا گہرا اور حقیقی فہم حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اپنی پوری شخصیت کو اس کے سپرد کر دے، اس کی فضا میں جا بسے، اس کے ہر اشارہ کو سمجھے اور ہر اثر کو قبول کرے۔ یہ شرط اسلامی زندگی کے مطالعہ کے ساتھ مخصوص نہیں لیکن اسلامی زندگی کے سلسلہ میں یہ ضرورت زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ اس زندگی کی تشکیلی قوتیں اپنی نوعیت اور ماہیت کے اعتبار سے دورِ جدید کی تشکیلی قوتوں سے بالکل مختلف واقع ہوئی ہیں۔

ہمارے نزدیک اسلامی زندگی کا مکمل مطالعہ اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ اسلامی عقیدہ اور الوہیت، حیات، کائنات اور انسان کی بابت اسلامی تصور کے مزاج کا صحیح شعور نہ حاصل ہو جائے۔ جب تک یہ بات نہ سمجھ لی جائے کہ اس عقیدہ کا ردِ عمل قلبِ مومن پر کیا ہوتا ہے اور اس کے زیرِ اثر ایک مسلمان زندگی کے مختلف عوامل کے جواب میں کیا روش اختیار کرتا ہے۔ یہ خصوصیات صرف کسی ایسے مسلمان محقق کے اندر پائی جا سکتی ہیں جو اسلامی تحریک کا علمبردار بھی ہو۔ اسلامی تاریخ کی تدوینِ جدید میں یہ خصوصیات پوری طرح موجود ہونی چاہئیں۔

اس بات کا پتہ لگانا چاہیے کہ تاریخ بیان کے اس اسلامی دور میں لوگوں کی سرگرمیوں کے اصل محرکات کیا تھے۔ اور ان محرکات کا ان واقعات، انقلابات اور تغیرات سے کیا رشتہ تھا جو اس دور میں رُونما ہوئے۔ یہ چیزیں لازماً اسلامی تصور کے مزاج سے مربوط نظر آئیں گی۔ اسلام میں جو انقلابی روح اُس کی خارجی اور عملی زندگی ہی میں نہیں بلکہ انفرادی، اجتماعی اور کائناتی تعلق کے اندر بھی پائی جاتی ہے، اُن سے بھی ان کا ربط ہوگا اسلام نے نظامِ حکومت، طرزِ معیشت، قانون سازی کے طریقوں اور قانون کو نافذ کرنے کے ذرائع وغیرہ کے باب میں جو نقشے پیش کیے ہیں اُن سے بھی یہ واقعات و تغیرات مربوط ہوں گے۔ یہ ساری چیزیں زندگی کی . . . . لہٰذا اس مخصوص زندگی کی تاریخ بنانے میں حصہ لیتی ہیں۔

جنگیں، سیاسی معاہدے، بین الاقوامی تعلقات وغیرہ جن کو تاریخ دوسرے اُمور

سے زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ چند دوسرے عوامل کے تابع ہیں جن کو تاریخ مرتب کرتے وقت نمایاں کرنا ضروری ہے۔ محققین کے درمیان اختلاف انھیں عوامل کے ادراک اوران کے اثر کا اندازہ لگانے میں ہوتا ہے۔ ہر ایک ان کو اس فلسفہ کی عینک سے دیکھتا ہے جو اس کے طرزِ فکر یعنی زندگی کے بارے میں اس کے زاویۂ نظر پر غالب ہوتا ہے۔ مسلمان محقق کو اسلامی زندگی کے مطالعہ میں ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ کیونکہ زندگی کے بارے میں اس کا زاویۂ نگاہ تاریخ کے عمل پر اثرانداز ہونے والے ان عوامل سے یک گونہ مناسبت رکھتا ہے۔ اس کی گہرائیوں میں اُترنے، اس کے انداز پہچاننے اور اس کا صحیح تأثر قبول کرنے کی صلاحیت وہ غیروں سے زیادہ رکھتا ہے۔

عقیدۂ اسلامی کے مزاج اور اس تأثر کے فہم کی روشنی میں جو مسلمان اس سے قبول کرتے ہیں، محقق تاریخ کے اس مخصوص دور میں اسلامی زندگی کے محرکات، اس میں مضمر انسانی قدروں اور مختلف مراحل پر اس کی فتح وشکست کے اسباب کا صحیح اندازہ لگا سکے گا اور تصور کر سکے گا کہ اسلام کے اوّلین گہوارہ میں اور ان ملکوں میں جن میں وہ بعد کو پھیلا، انسانی گروہوں کی ظاہری اور باطنی زندگی کیسی رہی ہوگی، پھر وہ ظاہری پہلوؤں پر، جن کے علاوہ اکثر مغربی مؤرخین کو کچھ اور نظر نہیں آتا۔ ان روحانی پہلوؤں کا اضافہ کر سکے گا جنھیں اسلام حقیقتِ واقعہ کا ایک جزو شمار کرتا ہے۔ وہ یہ دریافت کر سکے گا کہ اس پہلو نے زمانہ کی رفتار متعین کرنے اور مختلف زمان ومکان میں زندگی کی تشکیل میں کیا حصہ لیا ہے۔

اسلامی تاریخ کو انسانی تاریخ سے علیحدہ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کیونکہ اسلامی زندگی انسانی زندگی کے ایک مخصوص دور کا نام ہے۔ مسلمان مخصوص زمان ومکان میں رہنے والے انسان تھے اور اسلام زمان ومکان کی قیود سے آزاد ایک آفاقی اور انسانی پیغام ہے۔ اِس دَور کی تاریخ پر بلاشبہ اس بات کا اثر پڑا ہے کہ اسلام کو جاہلیت کا مقابلہ کرنا پڑا اور اس وقت جو عوامل کارفرما تھے ان سے عہدہ برآ ہونا پڑا۔ پھر اسلام نے خود بھی انسانی تجربات میں حصہ لے کر ان کو متأثر کیا خاص کر اُن علاقوں میں جہاں اس کے قدم پہنچے یا جن کے قریب جا پہنچا تھا۔ لہٰذا امر ضروری ہے کہ اسلامی تاریخ مرتب کرتے وقت یہ بھی بتایا جائے کہ ظہورِ اسلام سے قبل انسانی تجربات کہاں تک پہنچے تھے۔

دنیا کے مختلف انسانی معاشروں کی حالت کیا تھی؟ خاص طور پر دینی عقائد اور ان سے وابستہ افکار و نظریات کیا تھے۔ مختلف معاشروں کے نظامِ حکومت، اقتصادیات، اجتماعی رشتے اور اخلاق و عادات سامنے لائے جانے چاہئیں۔ ان اُمور کی روشنی میں یہ واضح ہو سکے گا کہ اسلام نے تاریخ میں جو عمل انجام دیا اس کی نوعیت اور اصلیت کیا تھی۔ دنیا پر اس نئے نظام کے قبول کرنے یا ٹھکرانے کا ردِّ عمل کیوں مرتب ہوا۔ کش مکش کے اسباب کیا تھے۔ اور فتح و شکست کن عوامل کی بنا پر ہوئی۔ ان چیزوں کے پس منظر میں یہ واضح ہو سکے گا کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ عمل اور ردِّ عمل، تاثیر اور تاثر، اور تعاون اور کش مکش کا سلسلہ کس طرح جاری رہا۔

اگر اس دور کے عالمی احوال کا بیان ضروری ہے تو جزیرۂ عرب کے احوال سامنے لانا اور عرب کے تصورِ حیات کے ہر پہلو کی وضاحت اس سے زیادہ ضروری ہے۔ عرب اسلام کا اوّلین گہوارہ تھا۔ پھر وہ اس کی قوتوں کا مرکز رہا۔ اور اسی مرکز سے اسلام دوسرے ملکوں میں پھیلا۔

کیا یہ ایک اتفاقی امر تھا کہ یہ رسولؐ اس دین کو لے کر زمین کے اس مخصوص علاقہ میں ایک خاص زمانہ میں حاضر ہوا؟ یا ایسا شروع ہی سے ایک منصوبے کے تحت، ایک خاص ارادے کے ساتھ اور ایک باقاعدہ اسکیم کے مطابق ہوا۔؟ تاکہ یہ سارے عوامل جس طرح یکجا ہوئے اسی طرح یکجا ہو کر تاریخِ انسانی میں ایک خاص حصّہ ادا کریں۔ جس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ دنیا کا نقشہ صفحۂ قرطاس پر بھی اور انسانی ذہنوں میں بھی اس طرح مرتب ہوا جیسا کہ بعد کی تاریخ نے ظاہر کیا

یہ بات ہمیں تاریخ کے اس ازلی سیاق میں خود محمد رسول اللہ کی شخصیت کے مطالعہ کی طرف لے جاتی ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) غالباً آپؐ کی شخصیت، حسب ونسب، ماحول اور اس معاشرے کی روایات میں اور ان عوامل میں جو بحیثیت ایک فرد کے آپ کے گرد کام کر رہے تھے، پہلے سے ہی ایک مقصد کے تحت سازگاری پیدا کی جا رہی تھی۔ یہ محض اتفاق نہ تھا کہ سارے انسانوں کے درمیان آپ کو اشارہ کیا گیا اور آپؐ نے اٹھ کر ایک عظیم آفاقی موقف اختیار کیا جس کی نظیر نہ ماضی میں ملتی ہے نہ مستقبل میں مل سکے گی۔ قبل اس کے کہ اس عظیم واقعہ کی بنا پر آنے والے انقلابات وحوادث کا مطالعہ کیا جائے۔ ہمیں خود اس واقعہ کی نوعیت کا اور اس کُلّی تصوّر کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ جس کا یہ واقعہ حامل ہے۔

اسلامی تاریخ اگر اس طرح مرتب کی جائے تو اس کے پڑھنے والے کے سامنے ظہورِ اسلام کے فوراً بعد کے دَور کے سارے واقعات کی ایک مکمل اور جامع تصویر آ جائے گی اور وہ ردِّ عمل بھی سامنے آجائیگا جو ان احوال و واقعات سے معاشرہ پر مرتب ہوا۔ وہ اس ردِّ عمل کی صحیح تعبیر کر سکے گا اور ان کے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکے گا۔

اس طرزِ تحقیق کی رُو سے اشیاء و افراد اور واقعات اور زمانے کی گہرائیوں میں اُترنے اور اُن سے تاثر قبول کرنے کے عمل کا نام تاریخ قرار پائے گا۔ تاریخ قانونِ فطرت اور انسانیت کے اقدام سے مربوط ہو کر ایک زندہ ہستی اور زندگی کی ایک قوت بن جائے گی۔

جب تحقیق کا وہ منہاج اختیار کیا جائے گا جس کی ہم نے اوپر وضاحت کی ہے اور اس کے نتیجہ میں چند بنیادی قوتیں اور قدریں سامنے آجائیں گی تو تاریخ کا فہم، اس کے عمل اور صحیح عمل اور اسکے تدریجی ارتقا کا مطالعہ آسان ہو جائے گا۔ یہ وہ بنیادی قدریں ہیں جو دعوتِ اسلامی کے مزاج، رسولؐ کے مزاج اور اس ماحول کے مزاج میں پائی جاتی تھیں۔ جس نے اس دعوت کو قبول کیا اور اس رسولؐ کا خیر مقدم کیا۔ یہ وہ قدریں اور تشکیلی قوتیں ہیں جو ظہورِ اسلام کے وقت انسانی برادری میں کارفرما تھیں اور ان افکار و عقائد پر حاوی تھیں جو اس وقت انسانوں میں رائج تھیں۔ ان قدروں اور قوتوں کی دریافت کے بعد یہ ممکن ہو جائے گا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دعوتِ اسلامی کے مختلف مراحل سے گزرنے کا ٹھیک ٹھیک نقشہ سامنے لایا جا سکے۔ یہ مراحل ان تشکیلی قوتوں اور ان کے باہم تاثیر و تاثر سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم اور اس دَور کے دوسرے انسان یہ معلوم کر سکیں گے کہ رسولؐ نے اپنے کارکنوں کا انتخاب کس طرح کیا؟ یہ افراد کس مٹی کے بنے تھے۔ ؟ رسولؐ اللہ نے ان کی تربیت کس طرح کی اور انہیں اس عظیم مشن کی انجام دہی کے لئے کس طرح تیار کیا؟ رسولؐ اللہ نے زندگی کی تعمیر کس طرح کی اور یہ تعمیر کن بنیادوں پر کی گئی تھی؟ کس طرح جزیرۂ عرب اس نئے دین یا نئے نظام کے گہوارہ میں تبدیل ہو گیا؟ اہلِ عرب کے مزاج، احوال و ظروف، افراد و قبائل اور خاندانوں میں نیز ان کے اجتماعی رشتوں، معاشی حالات اور جغرافیائی اور حیاتیاتی ساخت میں کون سے عناصر تھے جنھوں نے اس نئی بات پر لبیک کہنے یا اس کی مخالفت کرنے پر آمادہ کر دیا؟ یہ اور اس طرح کے دوسرے موضوعات جن پر روشنی ڈال کر ہم اسلامی زندگی یا تاریخِ اسلام کے پہلے

دَور کی پوری تصویر سامنے لا سکتے ہیں۔ مذکورۂ بالا طرزِ تحقیق اختیار کرنے کے بعد بآسانی برتے جا سکتے ہیں۔ تاریخِ اسلامی کے اس پہلے مرحلہ کو "اسلام عہدِ رسالت میں" کا نام دینا زیادہ موزوں رہے گا۔

اِس مرحلے کے بعد دوسرا دَور آتا ہے جسے "اسلام کے پھیلاؤ" کا مرحلہ کہنا چاہیئے۔ یہ وہ دَور ہے جس میں اسلام مشرق و مغرب ہر طرف پھیل گیا۔ وہ انوکھا فیض ہر طرف عام ہو گیا جس کی قوت اور سُرعتِ فیضان کی دنیا میں کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ یہ بات صرف فوجی فتوحات پر صادق نہیں آتی بلکہ روحانی، فکری اور سماجی اثرات کے اعتبار سے بھی دُرست ہے۔ ساری انسانیت نے یہ دیکھ لیا کہ اس نئے دین کے ظہور اور اس کے حیرت انگیز پھیلاؤ کے نتیجہ میں تاریخ کا رُخ بالکل بدل گیا۔

ہمارے تجویز کردہ طریقِ مطالعہ کی اصل قدر و قیمت اِسی سیاق میں ظاہر ہوتی ہیں اس کے ذریعہ یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ ہم ان تعمیری اور تخریبی کاموں کا مطالعہ کر سکیں جو اسلام نے اپنے زیرِ اثر آجانے والے وسیع خطۂ زمین میں انجام دیئے۔ ہم یہ دریافت کر سکیں گے کہ زمین کے ان زرخیز ترین علاقوں اور اس زمانہ کے سب سے زیادہ متمدّن ملکوں میں جو افکار و عقائد چھائے ہوئے تھے۔ جو اجتماعی نظام قائم تھے، جو معاشی حالات پائے جاتے تھے، ماضی کی تاریخ نے ان کو جو ورثے دیئے تھے اور وہ جن انسانی رشتوں میں مربوط تھے ان کے اور اسلام کے درمیان تاثیر و تاثر کا کیا عمل انجام پایا۔

اسلام کا پھیلاؤ ان ہی حدود تک محدود نہیں رہا۔ جہاں تک اس کی فوجی فتوحات پہنچ سکیں۔ بلکہ اس کی بنائی ہوئی تہذیب اور فکری تحریک اسلامی دنیا کے باہر بھی پہنچی۔ اسلامی مملکت کے باہر اسلام کے پھیلاؤ کے اثرات کی تحقیق بہت اہم ہے۔ ہمیں یہ دریافت کرنا ہوگا کہ ان اثرات نے جواباً خود... عالمِ اسلامی کی زندگی کو کس طرح متاثر کیا۔ دنیا نے اسلام سے اخذ بھی کیا ہے اور اُسے کچھ دیا بھی ہے۔ اس سے متاثر بھی ہوئی ہے اور اس پر اثر انداز بھی ہوئی ہے۔ ہمارے تجویز کردہ طریقہ پر اس تاثیر و تاثر کا مطالعہ ایک ایسی تاریخ کی ترتیب عمل میں لائے گا جو اب تک مرتب نہیں کی جا سکی ہے۔ اس تاریخ میں ایک خاص جان ہوگی۔ اس کا ایک مخصوص مزاج ہوگا۔ اس کے ذریعہ انسانی دنیا کی اور اس کی زندگی کے مراحل کی ایک نئی تصویر سامنے آئے گی جو اس تصویر سے مختلف ہوگی جسے اہلِ مغرب پیش کرتے رہتے ہیں اور جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد اسلام کا پھیلاؤ رک جانے کا دور آتا ہے۔ مذکورہ بالا طرزِ تحقیق اور اسلامی تاریخ کے گزشتہ مراحل کے مطالعہ کی روشنی میں ہمارے لئے یہ ممکن ہوگا کہ ہم اس زوال کے اسباب بیان کرسکیں اور اس کے داخلی اور خارجی عوامل دریافت کرسکیں۔ ان عوامل میں کون سے عوامل عقیدہ اسلامی اور نظامِ اسلامی کے مزاج میں شامل تھے، کون سے عوامل مسلمانوں نے خود پیدا کردیے تھے اور کون سے عوامل اسلام کے ردِ عمل میں غیر اسلامی دنیا میں ابھرے تھے۔ یہ زوال ہمہ جہتی تھا کہ جزئی سطحی تھا یا گہرا۔ اس زوال کا اثر تاریخِ انسانی پر کیا پڑا؟ انسانی امور پر اسلام کی اثراندازی میں کیا فرق واقع ہوا۔ اس سے فکر وعمل کے طریقوں اور بین الاقوامی تعلقات میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان افکار وعقائد اور نظاموں کی قدر وقیمت کیا ہے جو انسانیت نے اسلامی افکار وعقائد اور نظاموں کے بالمقابل تراش لئے۔ اسلامی اثرات کے زوال اور ان یورپین اثرات کے عروج سے انسانیت نے کیا پایا، کیا کھویا جن کا سایہ اب ہم پر بھی پڑ رہا ہے۔

قدرتی طور پر اس کے بعد دورِ حاضر کے عالمِ انسانی پر گفتگو کی جانی چاہیے۔ یہ مطالعہ جذبات یا تعصب و جانب داری کے ساتھ نہیں بلکہ واقعاتی بنیادوں پر کیا جانا چاہیئے۔ ہمارے طرزِ تحقیق کے نتیجہ میں انسانی تاریخ مسلسل اور مربوط ہوکر سامنے آئے گی۔ اس تاریخ میں ماضی اور حال میں اسلام کے واقعی حصہ کی نشان دہی کی جائے گی۔ اور اس ماضی اور حال کی روشنی میں اس کے مستقبل پر بھی روشنی پڑے گی۔

اسلام کو عملاً وجود میں لانے کے لئے تیاری کے طور پر جو فکری کام کرنے ہیں ان کے سلسلہ میں یہ چند مجمل اشارات تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی اس وقت تک کسی قدر وقیمت کی حامل نہ ہوگی جب تک اس زمین پر بسنے والے اہلِ ایمان اس حقیقت کو نہ پالیں کہ یہ دین ایک عقیدہ ہے جو الوہیت کو اللہ سبحانہٗ کے لئے مخصوص جاننے لہٰذا صرف اسی حاکم کو تسلیم کرنے سے عبارت ہے، اور زندگی کا ایک طریقہ ہے جو ایک ایسے نظام سے عبارت ہے جو اس عقیدہ کا ترجمان ہو۔ ساتھ ہی ان کے لئے اس حقیقت کا ادراک بھی ضروری ہے کہ اسلام کا وجود موقوف ہوگیا ہے اور اوّلین کام یہ ہے کہ اسلام کو بطور عقیدہ از سرِ نو راسخ کیا جائے تاکہ وہ ایک نظام کی صورت میں قائم ہوسکے۔ انہیں اس امر کا بھی یقین ہونا چاہیئے کہ مستقبل اسی دین کے لئے ہے۔ اللہ ہمارا مددگار ہے۔

باب نہم

دوراہے پر

دوراہے پر

اب سوال یہ ہے کہ ہم کدھر جائیں؟

ایک لمحہ کے لیئے ٹھہر کر ہمیں خود سے اِس سوال کا جواب حاصل کر لینا چاہیئے اور اپنی زندگی کو اِس سمت میں لے جانا چاہیئے جدھر ہم جانتے ہوں۔

یکے بعد دیگرے دو جنگوں کے بعد آج دُنیا دو مستقل بلاکوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ مشرق میں اشتراکی بلاک، اور مغرب میں سرمایہ دارانہ بلاک۔ بظاہر صورتِ حال یہی ہے۔ ہر زبان پر یہی بات ہے اور ہر ذہن پر یہی نقش مرتب ہو چکا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ تقسیم بالکل ظاہری اور سطحی ہے حقیقی نہیں۔ یہ تقسیم مفادات پر مبنی ہے نہ کہ اُصولوں پر۔ یہ سامانِ تجارت اور بازاروں کے لیئے جنگ ہے نہ کہ عقائد و افکار کی۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے امریکہ اور یورپ کا طرزِ فکر روسی طرزِ فکر سے ذرا بھی مختلف نہیں۔ دونوں زندگی کے مادّی نقطۂ نظر پر ایمان رکھتے ہیں۔ روس اشتراکی ہو چکا ہے۔ مگر یورپ اور امریکہ بھی اِس راہ پر جا رہے ہیں۔ یہ بات بالکل یقینی ہے کہ اگر کوئی خاص گڑبڑ نہ ہوئی تو وہ بھی اس منزل پر پہنچیں گے۔

آج مغرب پر جو مادّی طرزِ فکر چھایا ہوا ہے وہ اخلاق کی بنا منفعت کو قرار دیتا ہے۔ اور مفادات اور تجارتی بازاروں کے لیئے ایک دوسرے کا گلا کاٹنا سکھاتا ہے۔ یہ فکر زندگی سے روحانی عنصر کو بے دخل کر دیتا ہے۔ اور تجربہ گاہوں میں نہ دریافت کیئے جا سکنے والے ایمان کا منکر ہے۔ یہ مجرّد اعلیٰ مقاصد کا قائل نہیں اور فلسفۂ عملیت کی طرح اشیاء کی حقیقت کا وجود نہیں تسلیم کرتا۔ صرف ان کے عملی وظیفہ Function

پر نگاہ رکھتا ہے۔ یہ طرزِ فکر بھی مارکسی مادیت کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔

روس اور امریکہ کے فکر میں کوئی مزاجی فرق نہیں۔ فرق صرف ان کے معاشی اور سماجی حالات میں ہے۔ آج جو چیز ایک عام امریکی کو اشتراکی ہونے سے باز رکھتی ہے۔ وہ کوئی ایسا نظریہ حیات نہیں جو حیات کائنات اور انسان کی مادی تعبیر کو غلط قرار دیتا ہو۔ بلکہ صرف یہ بات ہے کہ اس کے سامنے مالدار بننے کی مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ اور مزدور کی اُجرت کی شرح بھی اونچی ہے۔

پس مشرقی اور مغربی بلاکوں کے درمیان کش مکش کی شدت سے ہمیں دھوکے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے دونوں مادی نظریات کے حامل ہیں۔ اور یکساں فکری مزاج رکھتے ہیں۔ اُن کی کش مکش کسی اُصول یا نظریہ پر نہیں بلکہ اصل جنگ دنیا میں نفوذ اور بازار کے منافع کے لیئے ہے۔ اور وہ بازار خود ہم ہیں۔

حقیقی اور گہری کش مکش صرف اسلام اور ان دونوں بلاکوں کے درمیان ہے۔ یورپ، امریکہ، چین اور روس جس مادی فکر پر ایمان رکھتے ہیں اس کے مقابلے پر آنے والی واحد حقیقی قوتِ اسلام ہے۔ اسلام ہی کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں ایک ہمہ گیر اور ہم آہنگ فکر کا حامل ہے۔ وہ انسانی معاشرے میں کش مکش اور نزاع کی جگہ تکافل کی فضا پیدا کرتا ہے۔ وہ زندگی کو ایک روحانی تصور عطا کرتا ہے جو اسے آسمان پر فروکش خالق سے جا ملاتا ہے اور ساتھ ہی زمین پر اس کے رجحانات کی تعیین کرتا ہے۔ یہ تصورِ زندگی کو صرف مادی اغراض کی تکمیل کی مشین بنا کر نہیں رکھ دیتا۔ اگرچہ پیداواری سرگرمیاں اسلام کی عبادات میں سے ایک عبادت تسلیم کی گئی ہیں۔

درحقیقت تمام روحانی مذاہب جن میں مسیحیت پیش پیش ہے۔ امریکہ اور یورپ کی مادیت کو بھی اس طرح باطل سمجھتے ہیں جس طرح روس کی اشتراکی مادیت کو، کیونکہ دونوں کا مزاج ایک ہے اور زندگی کے روحانی تصور کے منافی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مسیحیت کو ایسی ثبت قوت شمار نہیں کیا جاتا جو جدید مادی افکار کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ مسیحیت ایک انفرادی، گوشہ گیر اور سلبی مذہب بن چکی ہے۔ اس کے زیرِ سایہ زندگی کو دائمی اور فعال نشو و نما نہیں نصیب ہو سکتا۔ پشتہا پشت سے وہ عملی زندگی کا ساتھ دینے اور اس پر حکمرانی کرنے سے قاصر رہی ہے۔ کیونکہ کلیسا اور مقدس کانفرنسوں نے اسے جو شکل دے دی ہے اس شکل میں وہ زندگی کے عملی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

بلا کسی جھجک کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مسیحیت اپنی اس شکل میں جو اسے بالآخر دے دی گئی ہے

ہر آن متغیرہ معاشی اور سماجی نظاموں کے قدم بہ مقدم نہیں چل سکتی۔ کیونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ عملی زندگی کے بارے میں کوئی جامع نظریہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام ایک کامل آفاقی نظام ہے جس میں عقیدہ بھی ہے۔ اور قانون بھی۔ وہ سماجی اور معاشی زندگی کی تنظیم ضمیر اور قانون دونوں کے ذریعہ عمل میں لاتا ہے۔ اس کا یہ نظام جزئیات اور اصولوں کی تطبیق میں نشوونما کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

وہ انسانیت کو کائنات وحیات کے بارے میں ایک جامع ہمہ گیر اور مکمل فکر عطا کرتا ہے۔ اور معاشرہ کو ایک عملی اور حقیقت پسند نظام اور ایک ایسی تفصیلی شریعت دیتا ہے جو معاشرہ کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق نئے فروعی احکام پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

اسلام اپنے نظام کی بنیاد ایک ایسے جامع تصورِ زندگی پر رکھتا ہے جو مادی طرزِ فکر کی یکسر نفی کر دیتا ہے۔ وہ عمل کی بنیاد روحانی اور اخلاقی عنصر پر رکھتا ہے اور فوری منفعت کے نظریہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس طرح وہ بیک وقت مشرقی اور مغربی دونوں بلاکوں میں چھائی ہوئی مادی عقلیت کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ وہ زندگی کو ان پست مقامات کی غلامی سے نکال کر آج جن کو یورپ، امریکہ اور روس سب یکساں طور پر اپنا آئیڈیل بناتے ہیں۔ بلند مقامات کی طرف لے جاتا ہے۔

اِس سرسری جائزہ سے واضح ہے کہ مستقبل میں حقیقی ٹکراؤ سرمایہ داری اور اشتراکیت یا مشرقی اور مغربی بلاکوں کے درمیان نہیں۔ بلکہ دنیا پر چھائی ہوئی مادیت اور اسلام کے درمیان ہوگا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ معنی خیز اور درست ہوگا کہ یہ کش مکش بندگی کو صرف اللہ کا حق قرار دے کر انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ کا بندہ بنانے والے نظام اور ان سارے انسانی نظاموں کے درمیان ہوگی جو بندوں کی بندگی کرنے پر مبنی ہیں۔ مشرقی اور مغربی دونوں بلاک اس حقیقت سے آگاہ ہیں اور اپنے باہمی اختلافات اور آویزشوں کے باوجود دونوں مل کر ہر جگہ احیاءِ اسلام کی تحریکوں کو کچلنے اور اسلام پر ہر طرف سے حملے کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ بات اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کو خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ تاکہ وہ مختلف بلاکوں اور نظامہائے زندگی کے درمیان ظاہری کش مکش سے دھوکہ نہ کھائیں۔ اسلام ہی وہ حقیقی قوت ہے جسے دونوں بلاک اہمیت دیتے ہیں، اہلِ اسلام کو اس حقیقت کے شعور کے ساتھ اپنا طریقِ کار طے کرنے کی ضرورت ہے۔

آج احیاءِ اسلام کی تحریکیں ایک دوراہے پر کھڑی ہیں۔ صحیح راستہ پر صحیح قدم اُٹھنے کا انحصار

اس بات پر ہے کہ یہ بنیادی شرط واضح ہو جائے کہ اسلام موجود ہے یا نہیں موجود ہے۔ ان تحریکوں کو یہ مان لینا چاہیئے کہ آج اسلام کا وجود موقوف ہو چکا ہے اور اس حقیقت سے اتنا خائف نہ ہونا چاہیئے کہ اسے دیکھنے اور تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ ان تحریکوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کا مقصد اسلام کو ازسرِ نو وجود میں لانا ہے۔ یا یہ کہنا زیادہ دُرست ہوگا کہ اسلام کا وُجود عارضی طور پر موقوف ہو گیا ہے اور اُسے دوبارہ وجود میں لانا مقصود ہے۔

ایک راہ یہ ہے اور دوسری راہ یہ ہے کہ ۔۔۔ ایک لمحہ کے لیئے بھی ۔۔۔ یہ تحریکیں یہ سمجھ بیٹھیں کہ اسلام قائم ہے اور وہ لوگ جو اسلام کا دعوی کرتے ہیں اور مسلمانوں جیسے نام رکھتے ہیں عملاً بھی مسلمان ہیں۔ نیز یہ کہ ساری دنیا میں جو سیکولر طریقے رائج ہیں، مثلاً اتاترک کا رائج کردہ نظام یا اسی طرح کے دوسرے نظام، وہی اسلامی طور طریقے بھی ہیں۔ جیسا کہ ولفرڈ کینٹویل اسمتھ اور اُن جیسے دوسرے لوگ اور اُن سے فریب کھانے والے اور ان کی طرح فریب دینے والے افراد عوام کو باور کرانا چاہتے ہیں۔

ایک راستہ یہ ہے اور ایک راستہ وہ ہے اور احیاءِ اسلام کی تحریکیں آج اسی دوراہے پر کھڑی ہیں۔ اگر وہ پہلے راستہ پر قدم بڑھاتی ہیں۔ تو اللہ کی اور ہدایتِ الٰہی کی راہ پر آگے بڑھیں گی۔ اور یہ سمجھ کر آگے بڑھیں گی کہ آج خود اسلام کا وجود موقوف ہے۔ اور انہیں بعینہٖ آج وہی کام کرنا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلی مسلمان جماعت کے پیشِ نظر تھا۔ انہیں جان لینا ہوگا کہ انہیں بھی اسی طرح کا ظلم وستم سہنا پڑے گا۔ جس طرح اللہ کے رسولؐ اور ان کے صحابہؓ پر کیا گیا تھا۔ ان ہی کی طرح صبر و استقلال سے کام لینا ہوگا۔ پھر اسی طرح اللہ کی نصرت و تائید حاصل ہوگی اور بالآخر زمین پر غلبہ نصیب ہوگا۔

اگر وہ اس دوسری راہ پر چلتے ہیں جو مسٹر ولفرڈ کینٹویل اسمتھ، ان سے فریب کھانے والے اور اُن کی طرح فریب دینے والے دکھلا رہے ہیں تو وہ ایک سرابِ محض کے پیچھے دوڑیں گے۔ اس سراب میں دُور سے چند علماء ضرور نظر آئیں گے جو باتوں کو ان کے اصل منشاء سے پھیرنے اور آیاتِ الٰہی کو تھوڑے دامو بیچتے ہوں گے۔ یہ لوگ مسجدِ ضرار جیسے مراکز قائم کر کے اُن پر اسلام کا جھنڈا بلند کریں گے اور فسق و فجور کے اڈوں پر اسلامی پرچم لہرائیں گے۔

آج اسلام کی سربلندی چاہنے والی تحریکیں زمین کے کونے کونے میں پھیل چکی ہیں۔ صلیبیت اور صیہونیت

نے اِن تحریکوں کو مٹانے کے لیے جو حالات پیدا کر رکھے ہیں اور جو ادارے قائم کر رکھے ہیں ان کے علی الرغم یہ تحریکیں آج یورپ اور امریکہ میں صلیبیت کو اس کے مراکز میں چیلنج کر رہی ہیں، اور ایشیا اور افریقہ میں قبولِ عام حاصل کر رہی ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تحریکیں پُرفریب سراب کے پیچھے جا پڑیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صحیح راہ اختیار کریں۔ اللہ عزوجل سے امید ہے اور ہم اس کے لیے دست بدعا ہیں کہ آنکھوں کو حقیقتِ واقعہ کے دیکھنے اور دلوں کو حق بات سمجھنے کی توفیق دے۔ اللہ ہی راہ دکھانے والا اور توفیق دینے والا ہے اور وہی ہمارا مددگار ہے۔

محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

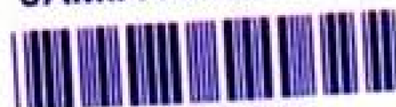
مؤلفہ: نعیم صدیقی

نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ انقلابی نقطۂ نظر سے، جسمیں حضورؐ کی اعلیٰ درجہ کی قائدانہ صلاحیت ○ خداداد سیاسی بصیرت ○ حکیمانہ تشریع و اصلاحات اعلیٰ ترین روایات، عدل و انصاف کا دلآویز اور پاکیزہ عکس پیش کیا گیا ہے

○ سیرتِ محمدیؐ کے مستند واقعات ایک نئے انداز میں۔ اُردو میں ایک منفرد کتاب۔ حصہ اوّل و دوم یکجا جلد میں۔

قیمت: ۳۳/۵۰ روپے

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶









دین میں امامت صالح کس طرح قائم کی جا سکتی ہے ● معاملاتِ دُنیا میں زمام کار کی اہمیت ● اسلامی اخلاق کی خصوصیات اور اس کے اثرات ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی مفصل تشریح ● دین کا حقیقی اور گہرا شعور بخشنے کے لیے بے مثال کتاب۔

عبادات کے جاہلی اور اسلامی تصورات کا فرق ● اسلام میں عبادات کا حقیقی مقام ● اسلام کا فلسفۂ عبادت نماز کی حقیقت اور اس کے زندگی پر اثرات ● روزہ کی اہمیت اور اسلامی زندگی میں اس کا مقام ● دین سے آگہی اور اس کا شعور حاصل کرنے کیلئے ایک بیش قیمت کتاب۔

معروف و منکر

مولانا صدر الدین اصلاحی

اُمتِ مُسلمہ کا مقصدِ زندگی کیا ہے؟ ● اُمتِ مُسلمہ کا حقیقی مقام کیا ہے؟ فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت ● اس فریضہ کو ادا نہ کرنے کے نقصانات ● ایک انقلاب آفریں عالمانہ پیش کش۔

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی